DUE DATE

Cl. No. *Acc. No.*

Late Fine Ordinary books 25 **Paise** per day. Text Book **Re. 1/-** per day. Over Night book **Re. 1/-** per day.

MAY, 1940

ادبی و طبی ماہوار مصور رسالہ

"مشہور"

مرتبہ

حکیم محمد تقی دہلوی

مقام اشاعت: ممتاز منزل فراشخانہ دہلی

سالانہ ایک روپیہ

احترام الدولہ عمدۃ الحکما معتمد الملک حاذق الزماں
حکیم محمود احسن اللہ خانصاحب مرحوم ثابت جنگ بہادر



وزیر اعظم و طبیب خاص خلد آشیاں ابوظفر محمد سراج الدین بہادرشاہ

اُردو کا ادبی و طبی ماہوار مصور رسالہ

ماہنامہ مشہور دہلی

جو ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو پابندی سے شائع ہوتا ہے

مرتبہ۔ حکیم محمد تقی دہلوی

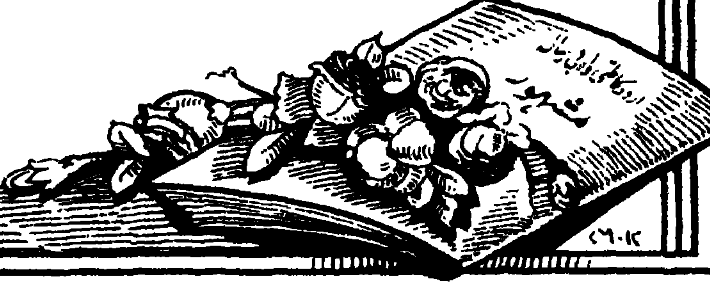
جلد (۱) بابت ماہ مئی سنہ ۱۹۴۰ء نمبر (۲)

قیمت سالانہ ایک روپیہ
اعزازی، سالانہ پانچ روپے

مقام اشاعت۔ ممتاز منزل، فراشخانہ، دہلی

ممالک غیر سے تین شلنگ
فی پرچہ، دو آنے (۲/)

قدردانوں سے ضروری گزارش



رسالہ "مشہور" اپنی تمام ظاہری اور معنوی خوبیوں اور گوناگوں دلچسپیوں کے ساتھ قدردانوں کی خدمت میں حاضر ہے۔ ہم ان قدردانوں سے استدعا کرتے ہیں کہ اس پرچے کا مطالعہ کرنے کے بعد وہ خود فیصلہ فرمائیں کہ اردو کے بلند ترین علمی و ادبی رسائل میں "مشہور" کا درجہ کیا ہے۔ ہم نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی ہے کہ یہ رسالہ بھی اپنے موقر معاصرین کی صفِ اوّل میں دیکھا جاسکے ہم یہ نہیں کہتے کہ اس میں ترقی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ جس طرح دنیا کی کوئی چیز تبدیلی و ترقی کے اٹل قانون سے باہر نہیں ہو سکتی اسی طرح رسالہ "مشہور" بھی ہماری کوششوں اور آپ کی اعانتوں سے ترقی کی بلند تر منزلوں کی طرف گامزن رہے گا، خدا کے فضل سے اس کی مالی اساس بھی بہت مضبوط ہے اور اگر قدردانوں کی نظرِ عنایت اس کے شامل حال رہی تو علم و ادب کی بڑی بڑی خدمتیں اس رسالہ کے ذریعے انجام پائیں گی اور ہم اپنے مقاصد میں ضرور کامیاب ہونگے۔

اتنا کہہ کر ہم اپنے قدردانوں سے یہ اُمید رکھتے ہیں کہ وہ اس کے خریدار بن جائیں گے اور سالانہ چندہ صرف ایک روپیہ بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمادیں گے۔ منی آرڈر نہ آنے پر ہم رسالہ "مشہور" کا آئندہ پرچہ ان کی خدمت میں بذریعہ وی۔ پی بھیجیں گے اور یہ اُمید رکھیں گے کہ علم و ادب کی اس خدمت میں شریک ہونے اور ہمارا ہاتھ بٹانے کے لیے وہ اپنے اخلاقی فرض کو ضرور محسوس فرمائیں گے اور وی۔ پی وصول کرلیں گے۔

اگر ہمارے قدردان اپنے اعزّا و احباب کے حلقے میں بھی رسالہ "مشہور" کی توسیع اشاعت کی کوشش فرمائیں گے تو ہمارے لیے مزید تشکر کا باعث ہوگا۔

خاکسار

"مینجر"

جامِ جمشید

اس اشاعت میں سرورق کے اندر معتمد الملک احترام الدولہ جناب حکیم احسن اللہ خاں صاحب کی تصویر ہے۔ آپ آخری شہنشاہ دہلی بہادر شاہ ظفر کے طبیب خاص اور وزیر اعظم تھے۔ قلعہ معلیٰ کے اندر دربار میں آپ کا جو اثر و اقتدار تھا وہ آپ کے رتبے ہی سے ظاہر ہے۔ آپ کے فنی کمالات اور علم و حکمت اور خزینہ مجربات سے صرف بادشاہِ وقت اور قلعۂ معلیٰ کے باشندے ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے امیر و غریب سب فیض یاب ہوتے تھے۔ آپ سراج الاطبا فخر الحکما عالی جناب خان صاحب حکیم محمد سراج الدین خاں صاحب دہلوی کے جدِ امجد تھے۔ جناب خان صاحب حکیم سراج الدین خاں صاحب کی ذات بابرکات بھی اسی خاندان کی روایاتِ مسیحانہ اور فیوض حکیمانہ کی یادگار ہے جس کے آپ چشم و چراغ ہیں۔ اس وقت بھی دہلی اور سارے ہندوستان کے باشندے آپ کے طبی کمالات اور شاہی مجربات سے مستفیض ہو رہے ہیں۔ خان صاحب حکیم سراج الدین صاحب صرف طبِ یونانی کے محسنِ اعظم ہی نہیں بلکہ صاحبِ معرفت بھی ہیں آپ حضرت خواجہ عبید اللہ رحمۃ اللہ کے خاندان اور سلسلہ نقشبندیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

آل انڈیا آیورویدک اینڈ یونانی طبی کانفرنس دہلی کے آنریری سکریٹری جناب حکیم محمد الیاس خاں صاحب نے ہمیں ایک مراسلہ کے ذریعے اطلاع دی ہے اور ملک کے اخبارات اور رسائل میں بھی یہ خبر شائع ہو چکی ہے کہ آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کی جدید تنظیم کا کام از سرِ نو شروع کر دیا گیا ہے اور ملک کے ہر حصے میں اس کا پُرجوش خیر مقدم کیا جا رہا ہے۔ ہمارے لیے یہ امر باعث مسرت ہے کہ ہمدردیِ فن کے خیال سے جناب مولوی حکیم عطاء الرحمٰن صاحب قاسمی، ہاؤس فزیشن شفاخانہ و پروفیسر جامعہ طبیہ دہلی نے بطور اسسٹنٹ سکریٹری کانفرنس کی خدمات کو انجام دینا منظور کر لیا ہے۔ اب جامعہ طبیہ کا دفتر پورے طور پر تنظیم کے کام میں مصروف ہے۔ تمام اطبا اور وید صاحبان کو اپنے فن عزیز کی بقا و ترقی کے لیے جلد سے جلد دفتر کانفرنس سے قواعد و فارم ممبری منگا لینا اور طبی برادری میں شریک ہو جانا چاہیئے۔ ممبروں کی ایک خاص تعداد درج رجسٹر ہونے کے بعد ایک عام جلسہ طلب کیا جائے گا جس میں عہدے داروں اور اسٹینڈنگ کمیٹی کا انتخاب عمل میں آئے گا۔

اخبار بین حضرات اچھی طرح واقف ہیں کہ دنیا کے اسی حصے میں جو کاغذ سازی کا سب سے بڑا مرکز ہے آج کل جنگ ہو رہی ہے۔ ناروے سویڈن اور فن لینڈ کے کاغذ ہی زیادہ تر ہندوستانی اخبارات و رسائل میں لگائے جاتے ہیں ـــــ چونکہ ان ممالک کی صنعتیں آج کل جنگ کے باعث مبتلائے تباہی ہیں اور وہاں سے کاغذ بہت کم آ رہے ہیں۔ اس لیے ہندوستان کی فرموں نے بھی کاغذ کی قیمت میں بڑا اضافہ کر دیا ہے اور ان کے علاوہ سلسلہ طباعت کی تمام دوسری چیزیں گراں ہو گئی ہیں۔ ایسی حالت میں آپ سے ہم اپنی ہمت اور اپنے استقلال کی

داہ چاہتے ہیں کہ ہم نے صرف ایک روپیہ سالانہ چندہ رکھ کر یہ شاندار رسالہ جو آپ نظروں کے سامنے ہے، جاری کیا ہے۔ اسی لیے ہم ناظرین سے یہ بھی توقع رکھتے ہیں کہ وہ "مشہور" کے خریدار ہو کر اور اس کی توسیع اشاعت کی کوشش فرما کر ہماری طرف مدد کا ہاتھ بڑھائیں گے "مشہور" کو ترقی کی بلند ترین منزلوں تک پہنچانے کے لیے ہم نے "اعزازی خریداروں" کی فہرست بھی جاری کی ہے۔ ایسے حضرات سے جو صاحب ثروت ہوں "مشہور" کی درخواست یہ ہے کہ "اعزازی چندہ" مبلغ پانچ روپے سالانہ ارسال فرما کر اس مخصوص فہرست میں جو مشہور کے صفحات پر شائع کی جائے گی، داخل ہو جائیں۔

مشہور کی اعانت صرف انہیں اصحاب پر فرض نہیں ہے جو اس کے خریدار یا اعزازی خریدار بن جائیں بلکہ اس کو منزل مقصود تک پہنچانے کے لیے ہم ملک کے بلند پایہ اور صاحبِ ذوق ادیبوں، مضمون نگاروں، افسانہ نویسوں اور شاعروں سے بھی استدعا کرتے ہیں کہ اردو علم و ادب کی اس خدمت میں ہمارا ساتھ دیں اور مشہور کے صفحات کو رونق بخشیں۔ ہمیں یقین ہے کہ علم نواز حضرات ہماری اس درخواست کو ضرور اور بخوشی قبول فرمائیں گے۔

اردو زبان و ادب کو ترقی دینے کے لیے جناب مولوی ڈاکٹر عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو جو گرانقدر خدمات انجام دے رہے ہیں ان کا نتیجہ یہ ہے کہ حامیان و ہمنوایان اردو کی تعداد تیزی سے بڑھتی جا رہی ہے اور ہمیں یقین ہے کہ اگر اردو کی ترویج و ترقی کی رفتار یہی رہی تو بہت ہی جلد اس مقبول عام اور خالص دیسی زبان کا پرچم ملک کے ہر گوشے پر لہراتا ہوا نظر آئے گا۔

جن معترضین کا یہ خیال ہے کہ اردو صرف درباری زبان ہے ان کے لیے غالباً مولوی عبدالحق صاحب کا یہ جواب کافی ہوگا:-

"اردو بے شک درباری بھی ہے اور بازاری بھی۔ یہ عالموں کی زبان بھی ہے اور عامیوں کی بھی۔ شہریوں کی بھی ہے اور دیہاتیوں کی بھی۔ فلسفیوں کی بھی ہے اور سائنس دانوں کی بھی، افسانوں کی بھی ہے اور داستانوں کی بھی اور قصیدوں اور غزلوں کی بھی، اور یہی اس کی سب سے بڑی فوقیت اور سب سے بڑی وجہ ترجیح ہے۔

حکیم محمد تقی

اِلتجائے شاعر

جنکا ہے طیبہ مقام اُن پہ درود اور سلام　　جو ہیں رسول انام اُن پہ درود اور سلام

حامئ عالم ہیں وہ ہادئ اعظم ہیں وہ　　کیوں نہ کہیں خاص و عام اُن پہ درود اور سلام

جنکے ہیں یہ دو جہاں جنکے ہیں کون و مکاں　　جنکے ہیں یہ صبح و شام اُن پہ درود اور سلام

مالک جنّ و بشر۔ باعث نور قمر　　میم سے ہی جنکا نام اُن پہ درود اور سلام

جو ہیں شہ دوسرا۔ جو ہیں حبیب خدا　　جنکی ہے دنیا غلام اُن پہ درود اور سلام

زائرِ ارض رسول التجا کرے قبول　　اتنا ہے میرا پیام اُن پہ درود اور سلام

روتا ہوں بہزاد میں کرتا ہوں فریاد میں
بھیجتا ہوں صبح و شام اُن پہ درود اور سلام

بہزاد لکھنوی

اصلاحی مضمون

اصلاحِ تمدّن

گذشتہ سے پیوستہ

عالمگیر برادری

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجتہ الوداع کے موقع پر کوہ عرفات کی بلندی سے عالمگیر اخوت و برادری پر ایک خطبہ فرمایا تھا جس کے چند الفاظ مطہرہ ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔

> "یاد رکھو تم سب آپس میں بھائی بھائی ہو۔ سب آدمی خدا کی نظر میں یکساں ہیں۔ آج نسل رنگ اور قوم کے امتیاز کو اپنے پاؤں کے نیچے میں کچلے دیتا ہوں۔ سب آدمی آدم کی اولاد ہیں اور آدم خاک تھے۔"

انسانی برادری تو خدا کی وحدانیت کا ایک ضروری نتیجہ ہے کیوں کہ سب کا وہی خالق ہے۔ پس انسان کی برادری اور مساوات ایسا مذہبی مسئلہ ہے جس کو بڑے فخر و مباہات کے ساتھ اسلام نے دنیا کے روبرو پیش کیا۔ لیکن افسوس کہ یہی وہ اعلیٰ اور ارفع تخیل ایسا ہے کہ ہم اس سے کوسوں دور جا پڑے ہیں۔

اصلاح معاشرت

اصلاح معاشرت کا میدان نہایت وسیع ہے اور اس میں حسب ذیل شعبے ہیں:

(۱) تعلیم۔ اشد ضروری ہے جب کہ قوم اس سے دور ہو۔

(۲) مذہب۔ جب کہ باطل پرستی۔ ضعف اعتقادات اور بد عادات کا دور کرنا ہو۔

(۳) صنعت و حرفت۔ جبکہ اقتصادی ترقی مطلوب ہو۔

(۴) سیاسیات۔ جب کہ تمدنی ضروریات پر حکومت سے مرافعہ کرنا لازمی ہو۔

مگر سب سے زیادہ مہتم بالشان اصلاح تعلیم نسواں ہے۔ ہم نے علوم مغربی حاصل کرنے ایک پشت بعد شروع کیے اور اپنی جماعتی پس ماندگی کے باعث آج ایذا اٹھا رہے ہیں۔ افسوس ہے کہ نسوانی تعلیم کے اعتبار سے ہم دو پشت پیچھے ہو گئے۔ اس سے ہماری ترقی پر نہایت برا اثر پڑے گا۔ یہ مسئلہ چوں کہ دوسرے مقدمات کا موضوع ہے میں اس پر بحث نہ کروں گا۔ اسی طرح مذہب، صنعت و حرفت، سیاست یہ سب موجودہ موضوع سے باہر کی بحثیں ہیں۔

صرف اصلاحِ تمدّن کو لیتے ہوئے پہلا مسئلہ یہ ہے کہ تمدّن و معاشرت کا مدعا اور مفہوم کیا ہے؟ اصل تعریف تو بہت دشوار ہے۔ لیکن کہا جا سکتا ہے کہ ہم جماعت کو افراد کا ایسا گروہ سمجھتے ہیں جو خاص ملک میں خاص وقت پر سکونت پذیر ہو اور باہمی امداد اور نفع رسانی کی خاطر اس کا آپس میں تعلق ہو۔ مشترک عنصر ایک جماعت میں رشتہ داری یا قومیت کا ایک ہونا ہے۔ مذہب بھی مشترک ہو۔ قومیت ایک ہو۔ حکومت ایک ہو اور زبان بھی مشترک ہو۔ مگر جماعت کے لیے یہ لازمی اور ضروری نہیں ہے کہ یہ تمام باتیں اس میں پائی جائیں۔ جماعت کے لیے یہ بھی اشد ضروری نہیں ہے کہ اس میں صرف ایک ہی نسل کے لوگ ہوں۔ نہ یہ ضرورت ہے کہ وہ مکمل قوم ہو۔ نسل اور قوم ایک ہی چیز نہیں ہیں۔ واقعی دنیا میں خاص ایک نسل کے لوگ دنیا میں کہیں موجود نہیں۔ اور نہ ہمیشہ کسی قوم کی صرف ایک امتیاز کرنے والی زبان ہی ہوتی ہے۔ قوم ایک جماعت ہے جو علیحدہ حکومت کے ماتحت ہو۔ سوئٹزرلینڈ کے باشندے کئی زبانیں بولتے ہیں مگر وہ ایک قوم نہیں۔ اور ایک سے زیادہ قوموں کا

ہندوستان کی مسلم جماعت نہ ایک نسل ہی سے ہو اور نہ وہ ایک جُدا حکومت کے ماتحت ہے۔

پس ایسی ہی جماعت کی اصلاح کا نام "اصلاحِ تمدن" ہوگا اور گمان غالب ہے کہ اگر اصلاح عمل میں لائی جائے تو جماعت کا ایک فرد دوسرے فرد کے واسطے مفید و کارآمد ہو جائے۔ جماعت کے باہم مفید و کارآمد ہونے سے مراد وہ سائنٹفک انتظام ہے جس کے تحت بہتر عام بہبودی حاصل ہو۔ اس کے لیے طریق کار میں اصلاح کرنی ہوگی۔ اور کارگر طریقے کام میں لانے پڑیں گے۔ اور "تضیع" سے بچنا ہوگا۔ مقصد یہ ہوگا کہ محنت میں کفایت کی جائے۔ وقت رائگاں نہ ہو۔ محنت اور روپیہ کا بچت جائے۔ ایک معینہ وقت کی سعی اور محنت سے سب سے زیادہ مالی نفع ہاتھ آئے اور پیداوار جماعت کے ہر فرد کے حصّے میں مساوات کے ساتھ پہنچے اس اہلیت کے حصول کا بہترین طریق کار ان مختصر الفاظ میں سمجھیے کہ "ایک کام کا ایک خاکہ بناؤ اور خاکے پر کام کا آغاز کردو" تضیع سے بچنے کے لیے اسی نقشے کو چار فروعی اصولوں میں پھیلاؤ۔

(الف) ہمارا مطمح نظر محدود ہو اور پہلے ہی سے اس کا محدود خاکہ بنالیں۔

(ب) کام کرنے کے لیے ہم اپنے وقت۔ مال اور محنت کا نظام العمل بنالیں۔

(ج) تمام کام ختم کر دینے کی ہم عادت ڈالیں اور کام کو تعویق میں نہ چھوڑیں۔

(د) تمام کاموں کا ہم ایک معیار قائم کریں۔

ہر شخص یہی کوشش کرتا ہے کہ اس کی پالیسی کچھ ہو۔ وہ کچھ کرے۔ اور وہ کچھ ہو لیکن حصول مدعا میں معدودے چند کامیاب ہوتے ہیں۔ کوئی شک نہیں کہ بڑا مقصد اصلاحِ تمدن کا جماعت کی حفاظت ہے اسی طرح اس کی عام خوشحالی اور جائز حقوق و استحقاق کی حفاظت و بقا۔ اور تمدنی بھلائی میں خوراک۔ کپڑا۔ اور آسائش اور افراد جماعت کی ضروری تعلیم شامل ہے۔ مطمح نظر عام بہبود۔ خیریت کی عام شرائط اور فوری برآمد ہونے والے نتائج ہونے چاہئیں۔ آخری نتائج شخصیت سے نکلا کرتے ہیں۔ یعنی بلند وضع کا پاکیزہ ہونا اور افضل تہذیب و شائستگی کا ارتقا آخری نتائج ہیں۔

معاشرت کی قابلیت جس سائنٹفک عمل سے وجود میں آسکتی ہے وہ یہ ہے کہ ہم اپنے ماحول کو جانچیں اور جائزہ لیں اور موجودہ نظام کی خامیاں دریافت کرکے سب سے بہتر ذرائع سے جو مہیا ہو سکیں چارہ جوئی کریں۔ اس سے قبل تحقیق پڑتال کرنی ہوگی۔ پھر بڑے غور سے ایک خاکہ تیار کیا جائے گا۔ نظام العمل نہایت منتخب قائم کرنا ہوگا کہ کار کی حفاظت۔ محنت کی تقسیم۔ کام کی درجہ وار ترتیب۔ باہمی امداد اور اتحادِ عمل ایسے عنوان ہیں جن سے اصلاح کار کا راستہ ظاہر ہوتا ہے۔ پس ہمارے روبرو حسب ذیل دشوار کام ہیں۔

(۱) اپنی موجودہ حالت کا جائزہ لینا اور موجودہ خامیوں کا دریافت کرنا

(۲) خامیوں کی علت کا دریافت کرنا۔

(۳) خامیوں کو دور کرنے کے بہترین طریق کار کا سوچنا۔

(۴) ضروری اصلاحوں کو عمل میں لانا۔

میں چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کے طریقہ معاشرت کی خرابیوں اور انکے اسباب و طریقہ علاج سے بحث کروں اور یہ خرابیاں چار اقسام کی ہو سکتی ہیں۔ اس لیے میں ان میں سے ہر ایک مندرجہ ذیل عنوان پر جداگانہ بحث کروں گا۔

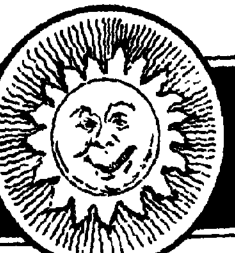
(۱) وہ عادات جن کا اثر ہماری خانگی زندگی پر ہو۔

(۲) وہ رسوم جن کا اثر ہماری اخلاقی زندگی پر ہو۔

(۳) وہ رواج جن کا اثر ہماری اقتصادی زندگی پر پڑتا ہے

(۴) وہ مسائل جن کا اثر ہماری جماعتی زندگی پر پڑتا ہے۔

(باقی آئندہ)



سورج دیوتا

سائنس بھی عجیب و غریب چیز ہے۔ اسے پرانی شکستہ حال اور زنگ خوردہ چیزوں کی مرمت کرنی خوب آتی ہے اور کمال یہ ہے کہ اس طرح مرمت شدہ چیزوں کو نئے ملبوس میں ذرا بنا سنوار کر پیش کر دینے کے بعد سائنس کا دعوےٰ یہ بھی ہوتا ہے کہ یہ "جدید ترین تحقیقات" ہے۔ لوگوں کی انگلی میں چوٹ لگ جاتی ہے تو وہ فوراً اُسے دوسرے ہاتھ سے دبا کے گرم گرم پھونکیں مارنی شروع کر دیتے ہیں اور اس ترکیب سے انہیں آرام محسوس ہوتا ہے۔ کسی کی آنکھ میں چوٹ لگ جاتی ہے تو وہ فوراً رومال کی یا کرتے کے دامن کی ایک گدی سی بنا کے اسے اپنی سانس سے گرم کرتا ہے اور پھر یہ گرم گرم گدی آنکھ پر رکھ لیتا ہے، اور اس طرح چھوٹی موٹی چوٹ چند منٹوں میں اچھی ہو جایا کرتی ہے۔ سائنس نے اس عجیب و غریب طریقہ علاج کو حیرت سے دیکھا، فرصت کے اوقات میں بیٹھ کر اس پر غور کیا اور جب مسلسل غور و فکر کے بعد یہ بات سمجھ میں آئی کہ چوٹ کے اثرات کو سانس کی گرمی دور کر دیا کرتی ہے تو وہ بے اختیار کرسی سے اچھل پڑی۔ اور اس "جدید ترین تحقیقات" کا کہ گرمی اور سینک سے چوٹیں اچھی ہو جاتی ہیں بہ بانگ دہل اعلان کر دیا۔ اعلان ہونے کی دیر تھی کہ دنیا بھر کے بالوں سے معرّیٰ سروالے فیلسوف کہ جنہیں دنیا میں بیٹھے بیٹھے کرسیاں توڑنے کے سوا اور کوئی کام ہی نہیں ہے۔ اسے لے دوڑے۔ کسی نے بلّی کی ٹانگ توڑ دی۔ کسی نے خرگوش کا کان کاٹا، اور کسی نے چوہے کی آنکھ [illegible] نئے نئے بیانات کے اعلان اخباروں میں شائع [illegible] ایک مدت کے بعد جا کر یہ بات طے پائی کہ گرمی کے اثر سے [illegible] والی عروق کشادہ ہو جاتی ہیں اور دوران خون میں [illegible] خون کا اجتماع [illegible]

اپنا بوجھ ڈال کر شدید درد کا باعث بنتا اور دوسری طرف جمع شدہ خون میں تعفن پیدا ہو کر پیپ بن جاتی جو اپنے نکلنے کے رستے کی تلاش میں جلد کو پھاڑ کر اچھا خاصہ بڑا زخم پیدا کر دیتی۔ لیکن اس تمام تحقیقات اور جستجو کے بعد اگر کوئی نادان عامی ان ماہرین سائنس سے یہ پوچھ بیٹھے کہ کیوں حضرت یہ گرمی کی وجہ سے رگوں میں کشادگی اور وسعت کیوں پیدا ہو جاتی ہے تو ان کے پاس سر کھجلانے اور عینک کے شیشے رومال سے صاف کرنے کے سوا اگر کوئی جواب ہوتا ہے تو بس یہ کہ قدرت کا قانون ہے، اور اس کے بعد وہ جاہل بیچارہ گھنٹوں اسی سوچ میں پڑا رہتا ہے کہ آخر ان کرسی نشینوں اور عالیشان لیبوریٹریوں کے مکینوں کی فوج نے نئی بات کونسی دریافت کی۔ یہ تو انہوں نے مجھی سے سیکھا ہے کہ گرمی اور سینک سے چوٹ اچھی ہو جاتی ہے۔

سائنس اور اس کی تمام پرشکوہ اور بلند بانگ ترقیاں اسمیں ذرا شک نہیں کہ ایک بہت بڑی حد تک وحشی اور غیر متمدن انسان کی قدرتی عقل کی رہین منت ہیں اور اس حقیقت سے کسی طرح انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس قدر ترقی کر لینے کے باوجود انسانی عقل نے جو کچھ بھی دریافت کیا ہے وہ سب کچھ ایک وحشی انسان کو بھی معلوم تھا لیکن بالکل اسی طرح کہ جیسے ہم آج یہ تو اچھی طرح جانتے ہیں کہ بیج کو اگر زمین میں دبا دیا جائے تو پیڑ نکل آئیگا، لیکن یہ کچھ نہیں معلوم کیوں ایسا ہو جاتا ہے۔ جتنے جو کچھ سیکھا ہے اپنے انہیں اسلاف سے سیکھا ہے جنہیں آج کی [illegible] تحقیقات بندروں اور لنگوروں کا مماثل بتاتی ہے۔ ممکن ہے درست ہی ہوں۔ لیکن وہ جانور تھے یا انسان۔ بہر صورت مادر فطرت انہیں [illegible] دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لیے اچھی طرح تیار کر کے بھیجتی تھی [illegible] طرح کتے ضرورت کے وقت ایک خاص قسم کی گھاس کو تلاش [illegible] مرض کا علاج کر لیا کرتے ہیں۔ اسی طرح انسان بھی اپنی ضرو[illegible]

لائق علم طب قدرت سے سیکھ کر آتا ہے۔ اس قسم کی قدرتی عقل یا فطرت کے سکھائے ہوئے علم طب کی ایک بہت ہی دل چسپ مثال "سورج کی روشنی سے علاج کرنا" ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر جانور جب بیمار ہوتے ہیں تو وہ کھانا پینا سب کچھ چھوڑ کر دھوپ میں لیٹ جاتے ہیں۔ قدرت نے انہیں سکھا دیا ہے کہ سورج کی روشنی میں جان بخش، اور دافع امراض اثرات موجود ہیں۔

ابتدائی زمانہ کے انسان کی کوئی صحیح تاریخ موجود نہیں ہے۔ لیکن ہم قیاسات سے بہت سی باتیں بالکل صحیح طور پر معلوم کر سکتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ قدیم ترین زمانہ سے سورج کی پرستش کا رواج انسانوں میں چلا آرہا ہے اور کون نہیں جانتا کہ پرستش صرف اسی ہستی کی کی جاتی ہے جسے ہم اپنے سے بہت زیادہ صاحب قوت اور فیض رساں خیال کرتے ہوں۔ بالکل ابتدا میں، تب انسان کی عقل بندر اور لنگور سے کچھ زیادہ نہ تھی وہ قدرت کے سکھائے سبق کے مطابق دکھ درد کے وقت دھوپ میں لیٹ کر فائدہ اٹھایا کرتا تھا جب اس کی عقل نے کسی قدر ترقی کی تو اس نے سمجھا کہ اسے سب سے زیادہ فائدہ سورج ہی سے پہنچتا ہے۔ رات دن کے مشاہدے اور مختلف قسم کے تجربوں نے اسے بتایا کہ کھیت میں اناج اور جنگل میں پھل سورج کی ہی گرمی اور روشنی سے پکتے ہیں اور اس طرح اس نے سورج کو اپنا ان داتا تسلیم کر لیا اس نے یہ بھی دیکھا کہ جب کسی وجہ سے وہ بیمار ہو جاتا ہے، اور اس کے ہاتھ پیر اور اس کی طاقت سب جواب دے دیتے ہیں تو یہی سورج دیوتا اپنی روشنی اور گرمی کے اثر سے کسی طرح پھر اسکے مردہ اعضا میں جان ڈال دیتے ہیں۔ اس طرح اسے یقین آگیا کہ زندگی اور صحت بھی سورج ہی کے اختیار میں ہے اور اب کوئی وجہ نہ تھی کہ ایک ایسی طاقت ور ہستی کے آگے اس کا سر عبودیت نہ جھک جاتا۔

مصر کی تہذیب بہت پرانی تہذیب ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ آج سے کم از کم دس ہزار سال پہلے مصر میں تمدن اور تہذیب کی روشنی موجود تھی۔ ہمارے پاس اس امر کے ثبوت موجود ہیں کہ دس ہزار برس پہلے مصر کی یہ تہذیب یافتہ قوم "را" کی پرستش کیا کرتی تھی اور "را" انکی زبان میں سورج ہی کا نام تھا۔ وہ اس "را" کے متعلق یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ وہ بخشندۂ حیات اور بخشندۂ قوت ہے نیز یہ کہ آسمان زمین، اور حیات کا خالق بھی وہی ہے اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو دس ہزار سال کے بعد زمانہ موجودہ کی ترقی یافتہ سائنس بھی گو سورج کو خدا کہنے سے انکار کرے لیکن اس طرف جو صفت منسوب کرتی ہے۔ وہ تقریباً بالکل وہی ہیں جو دس ہزار برس پہلے کے مصری انسان نے کی تھیں، سائنس کے عقیدے میں سورج زمین کا خالق ہے کیوں کہ یہ اسی کے جسم کا ایک ٹکڑا ہے جو لاکھوں برس پہلے ٹوٹ کر اس سے جدا ہو گیا تھا۔ سائنس کے نزدیک سورج بخشندۂ حیات بھی ہے اور بخشندۂ قوت بھی اور اب کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم سائنس کی کونسی نئی تحقیق پر فخر کر کے اپنے ان "بوزنہ صفت" اسلاف کو تحقیر کی نگاہ سے دیکھیں جو کاغذ، سیاہی، مطبع اور کتابوں کی ایجاد سے پہلے اور خوردبینوں اور دوربینوں کی امداد کے بغیر بھی یہی سب کچھ جانتے تھے۔ اس بات کے بھی ثبوت موجود ہیں کہ اہل مصر سورج کی روشنی سے علاج کرنیکے طریقوں سے بھی واقفیت رکھتے تھے۔

بابل کی تہذیب بھی بہت پرانی تہذیب خیال کی جاتی ہے اور وہاں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ "بعل" کے نام سے یہی سورج دیوتا موجود ہیں اور اہل بابل کا سر نیاز ان کے حضور میں خم ہے۔

قدیم آریہ بھی سورج کو "دیایوش" کہتے تھے۔ وہ اسے خالق کل تصور کرتے تھے۔ اسی لفظ "دیایوش" سے لاطینی لفظ "دیوس" اور فرانسیسی لفظ "دیو" نکلے ہیں جن کے معنے خدا کے ہیں۔

ایران قدیم کا تو مذہب ہی آفتاب پرستی تھا۔ اور اسی خداوند آفتاب کی ایک نشانی آگ کو تصور کر کے پارسی قوم آج تک آتش پرستی ہی کو بہترین مذہب تصور کرتی ہے۔

ہندوستان کو آج غیر مہذب، وحشی، جاہل سب کچھ کہہ لیا جائے لیکن دنیا جانتی ہے کہ اس کا بھی ایک دور ہو چکا ہے وہ تلک الایام نداولھا بین الناس کے مطابق یہاں تہذیب اور تمدن اپنی پوری جلوہ گری کے ساتھ تاباں و درخشاں رہ چکے

ہیں۔ ویدوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بھی سورج دیوتا قاضی الحاجات سمجھے جاتے تھے۔ یجر وید میں سورج کو ہر متحرک اور غیر متحرک شے کی آتما کہا گیا ہے۔ سورج کے متعلق ویدک تخیل بہت دلچسپ ہے ویدک کے خیال کے مطابق سورج ایک رتھ میں سوار ہے جس کا صرف ایک پہیا ہے جو فضا میں بغیر کسی سہارے کے معلق اڑا چلا جا رہا ہے اس کا رتھ بان ایک بے ٹانگوں کا انسان ہے۔ اس میں ایک ہی جوئے میں سات گھوڑے جتے ہیں۔ اور ان گھوڑوں کی باگیں زندہ سانپ ہیں۔ اب کون کہہ سکتا ہے کہ اس زمانے میں سورج کے متعلق اس تخیل کا کیا مطلب تھا۔ لیکن اگر اس کا یہی مطلب تھا کہ سات گھوڑوں سے وہ سات رنگ مراد تھے جن سے مل کر سورج کی روشنی بنی ہے اور سانپ ان لہروں کے قائم مقام تھے جو ان رنگوں کی شعاعوں سے پیدا ہوتی ہیں جب کہ وہ فضا سے گذریں۔ اور رتھ میں صرف ایک پہیئے کی موجودگی اس بات پر دلالت کرتی تھی کہ اس کی رفتار کی سرعت بے اندازہ ہے تو اب ہم نہیں سمجھ سکتے کہ سورج کے متعلق ضروری معلومات میں وہ کونسی چیز تھی جو ان "بوزنہ صفت" بزرگوں کو معلوم نہ تھی اور اب انسان صفت اخلاف نے وہ کونسی نئی بات دریافت کر لی ہے جس پر سائنس کو اس درجہ ناز ہو۔

ہندو سنیاسیوں کو دریاؤں کے کنارے صبح کے وقت ہر شخص نے دیکھا ہوگا کہ وہ پہلے تھوڑی دیر تک سورج کیطرف منہ کیے کھڑے رہتے ہیں اور کچھ اوراد و وظائف پڑھتے رہتے ہیں۔ پھر گھوم کر ایک پہلو سورج کی طرف کر دیتے ہیں۔ پھر پشت اور دوسرا پہلو اور اس طرح وظیفہ ختم کرنے تک وہ اپنے جسم کو ہر چہار جانب سے آفتاب کی جاں بخش شعاعوں کے مقابل کر کے جو ہر قوت و حیات اچھی طرح جذب کر لیا کرتے ہیں۔ سائنس بیشک ہمیں آفتاب پرستی نہیں سکھاتی بلکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ تو شاید خدا پرستی سے بھی باز ہی رکھنا چاہتی ہے لیکن حصول قوت اور تقویت حیات کے لیے وہ ہمیں یہی طریقہ بتاتی ہے کہ اپنا برہنہ جسم سورج کی شعاعوں کے سامنے کر کے اس کی مافوق البنفسجی و زیر احمر شعاعیں جذب کیا کریں۔

پرانی تہذیبوں میں ہمیں سب سے زیادہ واقفیت ہند و تہذیب ہی سے ہے کیوں کہ اس تہذیب کا بہت کچھ مواد کتابی صورت میں دستیاب ہو سکتا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ سنسکرت ادب میں بالکل صاف اور واضح طریق پر جا بجا اس قسم کے اشارات موجود ہیں کہ سورج کی شعاعیں جذام اور جلدی امراض کے لیے نافع ہیں۔ سنسکرت کے ایک مشہور شاعر مایور کی ایک نظم کے متعلق جو اس نے سورج کی تعریف میں لکھی تھی ایک عجیب و غریب افسانہ مشہور ہے۔

مایور کی ایک بہن تھی جس کا نام بانا تھا، اس کی شادی پردیس میں ہوئی تھی۔ اتفاق سے پھرتے پھرتے مایور اسی شہر میں جا نکلا کہ جہاں اسکی بہن رہتی تھی لیکن اُسے معلوم نہ تھا کہ یہ اس کی بہن کا شہر ہے۔

وہ ٹھہرا بھی ایک ایسے مکان میں کہ جو بانا کے مکان کے بالکل متصل تھا رات کو جب گھوم گھام کر اپنی قیام گاہ پر آ رہا تھا تو راستے میں اس نے دیکھا کہ ایک مکان کی کھڑکی میں ایک نوجوان عورت کھڑی ہے اور اس کا خاوند انتہائی عاجزی اور لجاجت کے ساتھ اسے منا رہا ہے۔ مگر وہ کچھ پروا نہیں کرتی۔ مایور نے کچھ توجہ نہ کی اور جاکر اپنے گھر سو رہا صبح کو جب وہ مکان سے نکلا تو اس نے دیکھا کہ وہ عورت اسی طرح اور اسی جگہ کھڑی ہے اور اس کا خاوند اب بھی انتہائی محبت کے فقرے اسے منانے کے لئے استعمال کر رہا ہے۔ اس کے مردانہ غرور کو صدمہ پہنچا اور اس نے خیال کیا کہ اس عورت نے ساری رات اپنے خاوند سے خوشامد کرائی ہے یا تو اسے اب سے بہت پہلے خاوند کے گلے سے لپٹ جانا چاہیئے تھا یا پھر یہ ہونا چاہیئے تھا کہ اس کا خاوند اسے کھڑکی میں سے نیچے پھینک دیتا اور اس کی ہڈی پسلی سب چور ہو جاتی۔ اس غصے کی حالت میں مایور نے اس عورت کو "چنڈال" کہہ دیا۔ عورت اپنی اس توہین کو برداشت نہ کر سکی اور اس نے گالی کے جواب میں پان کا اگال جو رات بھر اس کے منہ میں دبا رہا تھا، مایور کے اوپر تھوک دیا، اور مایور کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے یہ دیکھا کہ اس کے جسم پر جس جگہ وہ اگال گرا تھا فوراً کوڑھ پیدا ہو گئی۔

مایور بہت پریشان ہوا، اور اب جو اس نے تحقیقات کی تو معلوم ہوا کہ وہ عورت اس کی بہن بانا تھی، اور وہ درحقیقت قصوروار نہ تھی کیونکہ اس کے خاوند نے جو ایک زبردست ادیب اور شاعر تھا شام سے جس خوشامدانہ فقرے کا آغاز کیا تھا وہ صبح تک ختم ہی نہیں ہوا تھا اور اس مسلسل اور لامتناہی فقرے کے دوران میں بانا کو اتنا موقع ہی نہ ملا تھا کہ کچھ جواب دیتی یا من جاتی۔ مایور نے سورج دیوتا کی طرف رجوع کیا اس نے ایک مچان بنوایا جسے ایک بہت ہی اونچے درخت میں ایک سو رسیوں کے ذریعہ سے لٹکایا گیا۔ اور وہ اس پر چڑھ کر بیٹھ گیا اور سورج کی تعریف میں ایک شعر کہنے کے بعد وہ چاقو سے اپنے مچان کی ایک رسی کاٹ دیتا تھا۔ اور یہ ارادہ کر لیا کہ اگر سورج دیوتا نے اسے اچھا نہ کر دیا تو اسی طرح ہر شعر پر ایک رسی کاٹ کر تمام رسیاں کاٹ دیگا اور اس طرح اتنی بلندی سے گر کر ہلاک ہو جائیگا۔

بچانوے شعر لکھے جا چکے تھے۔ اور بچانوے رسیاں کٹ چکی تھیں کہ سورج دیوتا کو اپنے قصیدہ خوان شاعر کے حال پر ترس آگیا اور وہ اچھا ہو گیا۔ اس نظم میں ایک سو چھ اشعار ہیں۔

اسلامی تہذیب کی عمر زیادہ نہیں ہے اس لئے ایسی مادی چیزوں کی طرف لوگوں کے رجحان کا کوئی امکان نہیں لیکن اس دین حنیف کے بانی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فطرتاً پہلے چاند تاروں اور بعد میں آفتاب ہی پر یہ گمان کیا تھا کہ وہ خدا ہیں۔

یونان کی تہذیب بھی جدید تہذیبوں میں قدیم ترین ہے۔ وہاں بھی ہیلیوس کے نام سے سورج کی پرستش کی جاتی تھی۔ پیرو میں سورج کے بچوں کا نام انکس رکھدیا گیا تھا اور انہیں دیوتا خیال کیا جاتا تھا پیرو میں مرض آتشک کا علاج بھی سورج کی شعاعوں سے کیا جاتا تھا۔

اس طویل تمہید سے ہمیں یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ دنیا میں تقریباً ہر قوم نے ہر زمانے میں سورج کو قابل تعظیم اور اس کی روشنی کو دافع امراض خیال کیا ہے اور جہاں تک کہ دھوپ کے صحت بخش اثرات کا تعلق ہے یہ کوئی جدید انکشاف نہیں ہے آیئے اب ایک نظر لیبوریٹریوں کے جملہ نشینوں کے کارناموں پر بھی ڈال دیں۔

ماہرینِ طب سب سے پہلے یونانیوں کو سورج کی شعاعوں سے حصول صحت کا خیال آیا۔ بقراط کا زمانہ قبل مسیح ۴۶۰ء سے ۳۷۷ء تک گذرا ہے۔ حکماء بالعموم اسی کو موجودہ طب کا بانی قرار دیتے ہیں۔ بقراط اپنے مریضوں کا باقاعدہ علاج شعاع آفتاب سے کیا کرتا تھا۔ جالینوس جو اس سے تقریباً چار سو برس بعد ماہر طب ہوا آفتابی شعاعوں سے دوا کا کام لیتا رہا۔ آفتابی غسل کی ابتدا بھی یونانیوں ہی سے ہوئی اور اسکی صورت یہ تھی کہ سر کو کپڑے یا ٹوپی سے ڈھک کر باقی تمام جسم کو سورج کے سامنے کر دیا جاتا تھا۔ اور ہر حصہ جسم پر شعاعیں ڈالی جاتی تھیں۔ روم والوں نے اس پر اتنا اضافہ اور کیا کہ گھروں میں جس طرح معمولی غسلخانے

ہوتے ہیں اسی طرح آفتابی غسل خانے بنوانے شروع کر دیئے۔ تاکہ آرام سے پوری پردہ داری کے ساتھ اس غسل سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔

اس کے بعد اٹھارویں صدی تک اس طریق علاج کے متعلق کوئی خاص ترقی ظہور میں نہ آئی۔ اگرچہ یہ ضرور ہے کہ ۱۶۶۶ء میں سر آئزک نیوٹن کی ایجاد نے (سر آئزک نے یہ دریافت کیا تھا کہ سورج کی روشنی کو تکونے شیشے سے گذارا جائے تو وہ سات مختلف رنگوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ رنگ کی ان پٹیوں کا نام اسپیکٹرم ہے) اور ۱۶۷۸ء میں کرسچین ہائجنس کی اس تحقیق نے کہ روشنی کی شعاعیں لہر کی صورت میں نشیب و فراز پیدا کرتی ہوئی چلتی ہیں۔ سائنس کے ماہرین کی توجہ موج اور سورج کی روشنی کی طرف منعطف کر دی ۱۷۳۳ء دوفے کا یہ تحقیق کر لینا کہ بجلی دو قسم کی ہوتی ہے آگے چلکر روشنی کے ذریعہ سے علاج کرنے میں بہت ممد ثابت ہوا۔

۱۷۷۴ء میں ڈاکٹر فورنے پرانے زخموں کا علاج سورج کی شعاعوں سے شروع کیا اور اس کے چند ہی روز بعد دوسرے ڈاکٹروں نے آتشی شیشہ کی مدد سے سورج کی شعاعوں کو زخموں پر مرکوز کر کے ایک نئے طریقہ علاج کی بنیاد ڈالی۔ ۱۸۰۰ء میں پروفیسر ہرشیل نے اپنے تجربات کے دوران میں یہ معلوم کیا کہ سورج کی روشنی کو جب منشور مثلثی کے ذریعہ سے پھاڑا جاتا ہے۔ تو وہ سات مختلف رنگوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ تو ان نظر آنے والی سات رنگین شعاعوں کے علاوہ بالکل سرے پر یعنی سرخ رنگ کی شعاع کے برابر ایک غیر مرئی شعاع اور بھی ہوتی ہے۔ اور اس کا نام انہوں نے انفرا ریڈ یعنے تحت الاحمر شعاع رکھا۔ ۱۸۰۱ء میں ایک دوسرے پروفیسر نے جن کا نام ریٹر تھا اسی قسم کی ایک غیر مرئی شعاع کی موجودگی رنگین شعاعوں کے دوسرے سرے پر یعنی بنفشی شعاع کے برابر معلوم کی جس کا نام انہوں نے الٹرا وایولیٹ یعنی مافوق البنفشی شعاع رکھدیا۔ نظر نہ آنے والی یہی دونوں شعاعیں امراض کے علاج میں سب سے زیادہ کار آمد ثابت ہوئی ہیں۔

۱۸۰۲ء میں بجلی کے متعلق ایک نئی چیز یہ دریافت ہوئی کہ آرک لائٹ کا پیدا کرنا ممکن ہو گیا اور اس آرک لائٹ کی مدد سے مصنوعی طور پر روشنی کے ذریعہ سے علاج کیا جانے لگا۔ انیسویں صدی کے اختتام پر فنسن نے جس کا نام روشنی کے سلسلے میں کافی شہرت پا چکا ہے۔ اس بات کا اعلان کیا کہ مافوق البنفشی شعاعوں کے ذریعہ سے لیوپس ولگیرس (جلد کی دق) کا بالکل استیصال ہو جاتا ہے۔ فنسن کے بعد ڈاکٹر [illegible] نے سوئزرلینڈ میں ایلپس کے سلسلہ کوہ پر شعاعی علاج کا ایک ہسپتال کھولدیا اور انہیں بیمار قلت دم رکٹس (ہڈیوں کا نرم ہونا۔) پرانے زخم۔ اور جوڑوں کی، ہڈیوں کی، غدودوں کی، اور جلد کی دق کے علاج میں نمایاں کامیابی ہوئی۔

۱۸۹۳ء موسیو اور مادام کیورے نے ریڈیم کی دریافت کی اور اس کے دو ہی برس بعد رونجن نے ایکس ریز (عکس ریز شعاعیں) دریافت کر لیں۔ جن کی مختلف اجسام میں نفوذ کی قوت بہت زیادہ ہے مختصر یہ کہ بیسویں صدی کے شروع ہوتے ہوتے شعاعوں کے ذریعہ سے علاج کرنے کے لئے کافی ذرائع مہیا ہو گئے۔

اس وقت تک سائنس نے روشنی کی شعاعوں سے امراض کا علاج کرنے کے متعلق جتنی ضروری تحقیقاتیں یا ایجادیں کی ہیں انکا اس جگہ ذکر کر دینا نامناسب نہ ہوگا۔

(۱) اسپیکٹرم (طیف) کی ایجاد جس کی بدولت روشنی کو پھاڑ اور اس کے اجزائے ترکیبی کا معلوم کرنا ممکن ہو گیا۔

(۲) مختلف قسم کی شعاعوں کے جسم انسانی پر اثرات کی تحقیق جسکی بدولت ان شعاعوں سے مختلف امراض کے علاج میں کام لیا جا سکتا ہے۔

(۳) ان بہت ہی نازک آلات کی ایجاد کہ جن کے ذریعہ سے شعاعوں کی پیمائش اور ان کے اثرات کا اندازہ صحیح طور پر ہو سکے۔ انہی آلات کے ذریعہ سے یہ ممکن ہے کہ مقررہ مقدار میں کسی روشنی کی شعاع مریض کے جسم میں پہنچائی جا سکے۔

(۴) روشنی پیدا کرنے کے دوسرے وسائل کی ایجاد جس کی وجہ سے اب سورج کی محتاجی باقی نہیں رہی ہے۔ بلکہ سورج کے بغیر بھی وہی شعاعیں مریضوں کے جسم میں پہونچائی جاسکتی ہیں۔

(۵) فضائے بسیط کے حالات کا علم۔

(۶) اس بات کی تحقیق کہ سورج کی روشنی کے انحلال سے جو سات رنگ بنتے ہیں ان کے علاوہ کچھ شعاعیں اور بھی ہیں جو ہمیں نظر نہیں آتیں ان میں سے جو شعاعیں بنفشی رنگ کی جانب ہیں۔ انہیں کیمیاوی یا بنفشی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ جسم پر ان کا اثر کیمیاوی ہوتا ہے اور جو شعاع سرخ کے بعد ہے۔ اسے لیف محرور کہا جاتا ہے۔ کیونکہ اسے پہچاننا ہی اس حرارت کی وجہ سے جاتا ہے جو وہ پیدا کرتی ہے۔

سائنس کی ان تھک اور مسلسل کوششوں نے اب ہمیں اس قابل کردیا ہے کہ اسی سورج کی روشنی سے جس سے سارا عالم مستفیض ہوتا ہے ہم خاص خاص بیماریوں کی حالت میں صرف وہی خاص شعاع یا شعاعیں مریض کے جسم میں داخل کریں کہ جن کی اسے ضرورت ہے اور اتنی تحقیق و تدقیق کے بعد سائنس کو جائز طور پر یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ دھوپ میں پلنے بڑھنے والے ان عامیوں پر ہنسے کہ نہیں اس سے زیادہ کچھ نہیں معلوم ہے کہ سورج کی روشنی ان کے جسم کو آرام اور صحت پہونچاتی ہے بالوں سے خالی سر اور عینک پوش آنکھیں اب انتہائی فخر کے ساتھ عوام سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر تمہیں سورج کی روشنی اپنے مرض کے لئے درکار ہے اور موسم کی خرابی کی وجہ سے چار چھ روز سورج نہ نکلا تو تم کیا کروگے۔ اس وقت تمہیں ہماری ان لیبوریٹریوں کی قدر معلوم ہوگی کہ جن پر ہنسا کرتے تھے۔ انہی لیبوریٹریوں میں وہ ساز و سامان رکھا ہوا ہے جو تمہارے مریضوں کے لئے رات کے وقت بھی سورج کی شعاعیں بہم پہنچا سکتا ہے۔

ماہرین سائنس کو اب یہ کہنے کا بھی موقع مل گیا ہے کہ دھوپ میں لیٹ کر تم اس بات پر مجبور ہو کہ سورج کی مفید اور مضر سب شعاعوں کو اپنے جسم میں بھرو، لیکن ہماری لیبوریٹری کے اندر اگر تم آؤگے تو ہم تمہارے جسم میں سورج کی بھی صرف وہی شعاعیں داخل کریں گے جو تمہارے مرض کے لیے مفید ہیں۔

عوام ان تعلیوں کو سنتے ہیں اور خاموش ہو جاتے ہیں اگرچہ کبھی کبھی کوئی گستاخ اور بے ادب آہستہ سے اتنی بات ضرور کہہ دیتا ہے کہ قدرت نے جو چیز جس طرح پر پیدا کردی ہے اس میں کاٹ چھانٹ درست نہیں، آپ نے گیہوں سے میدا بنا کر استعمال کرنا شروع کیا تھا اور سمجھتے تھے کہ ہم نے اصل چیز لے لی ہے اور بھوسی کو جو ایک فضول چیز ہے الگ کردیا ہے لیکن چند ہی روز بعد آپ کو معلوم ہوگیا کہ آپ نے غلطی کی تھی اور اب آپ خود اپنے قبض کے مریضوں کو ہدایت کیا کرتے ہیں کہ بغیر چھنے آٹے کی روٹی کھاؤ۔ کہیں ایسا نہو کہ آگے چل کر سورج کی روشنی کے متعلق بھی آپ کو یہ تسلیم کرنا پڑے کہ اسے چھاننا پھٹکنا ٹھیک نہیں ہے۔ اور بہترین طریقہ یہی ہے کہ وہ جیسی ہے اسی طرح اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔

بہرحال سائنس کے پروفیسروں کی بات بالا رہے یا عوام کالانعام کی، ہمیں تو یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ طب اب قدرت کے پیدا کیے ہوئے اس طریق علاج کی طرف متوجہ ہوگئی، اور چاہے لیبوریٹری کی چھت پر مریضوں کو لٹا کر دھوپ میں سینکا جائے یا کمروں کے اندر بجلی کے لیمپوں اور مافوق البنفسجی شعاعوں سے اسے غسل دیا جائے۔ بہرصورت اس طریق علاج سے فائدہ اٹھایا جانے لگا۔

اس سے بھی زیادہ مسرت بخش یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان میں بھی جام صاحب نوانگر کی فیاضی کی بدولت ایک آفتابی صحت گاہ بڑے اعلیٰ پیمانہ پر تعمیر ہوگئی ہے جہاں روشنی کے ذریعے سے ہر قسم کے علاج کے لیے ضروری آلات فراہم کردئے گئے ہیں بیان کیا جاتا ہے کہ اس وقت تمام دنیا میں اس سے بہتر اس قسم کی صحت گاہ کوئی نہیں ہے۔ اس صحت گاہ میں اگرچہ مصنوعی روشنی سے علاج کے تمام جدید ترین ذرائع موجود ہیں، لیکن خاص

طور سے یہ اسی لیے بنائی گئی ہے کہ سورج کی روشنی سے فائدہ اٹھایا جائے۔ مصنوعی روشنی سے علاج پر مصارف بہت زیادہ پڑتے ہیں اور غریب لوگ اس سے مستفید نہیں ہو سکتے اور پھر یہ بھی ہے کہ ایک ایسے ملک میں جہاں سال کے بیشتر حصہ میں نہایت صاف شفاف دھوپ میسر آسکتی ہے مصنوعی روشنیوں سے کام لینا ایک فضول سی بات ہوگی۔

اس حکیم مطلق نے اس ضعیف البنیان انسان کے لیے کیسی کیسی عجیب وغریب نعمتیں پیدا کی ہیں۔ یہ تو صرف اس ایک سورج کی برکتیں ہیں جو ہماری زمین سے قریب ہے اور جس کے گرد ہماری زمین طواف کیا کرتی ہے۔ ابھی ہمیں ان ہزار در ہزار سورجوں کے متعلق تو کچھ معلوم ہی نہیں ہے جو فضائے عالم میں پھیلے ہوئے ہیں اور جن کی شعاعیں لاکھوں برس سے خدا جانے کیا کیا کچھ ہمارے لیے کر رہی ہیں۔

(ڈاکٹر سعید احمد بریلوی)



اک تیرِ جاں نواز اِدھر اور بھی سہی
دِل نذر ہو چکا ہے جگر اور بھی سہی

غصّے کی بازگشت اِدھر اور بھی سہی
ہاں ایک دِل خراش نظر اور بھی سہی

گلچینیٔ جمال سے روکو نہ صبحِ وصل
گلگشتِ باغ وقتِ سحر اور بھی سہی

دلمیں ملال۔ آنکھ میں غصہ جبیں پہ بل
ان سب کے ساتھ تیز نظر اور بھی سہی

سمجھے ہوئے ہیں وہ مجھے مظلوم دادخواہ
اک آہ ناشناسِ اثر اور بھی سہی

اب مسکرا بھی دیجئے ترچھی نظر کیساتھ
اوچھا سا ایک زخمِ جگر اور بھی سہی

تجھ کو بھی۔ تیرے غصّے کو بھی۔ دیکھ لینگے ہم
پردے میں اک حجاب نظر اور بھی سہی

تکلیفِ عشق سے کبھی بھرتا نہیں ہے جی
کافی ہے دل میں درد مگر اور بھی سہی

لیکر شمیمِ گل کبھی میرے قفس میں آ
ایک تیرا اے نسیمِ سحر اور بھی سہی

کعبہ ہے۔ بتکدہ ہے۔ کلیسا ہے۔ دیر ہے
مسجودِ خلق آپ کا در اور بھی سہی

پہلے سے نازکی میں اضافہ ہوا تو ہے
غائب جہاں دہن ہے۔ کمر اور بھی سہی

شرما کے تم سے آنکھ بھی اونچی نہ ہو سکی
مجھ ناتواں نے۔ تیغِ نظر اور بھی سہی

بیخودؔ نواز چشم کے دو جام اور دے
گو چھک گیا ہوں خوب۔ مگر اور بھی سہی

حضرت بیخودؔ دہلوی

افسانہ

کلثوم کی شادی!

فہمیدہ :۔ آپا یہ صبح ہی صبح کس پر خفا ہو رہی ہو۔ خیر تو ہے۔

حمیدہ :۔ خفا کیا ہو رہی ہوں۔ اپنی پھوٹی تقدیر کو رو رہی ہوں۔ یہ نا شدنی پیدا ہوتے ہی مر جاتی تو اچھا تھا۔ جی کا جلاپا تو نہ ہوتا۔

فہمیدہ :۔ ہے ہے نوج۔ دور پار، مرتے اس کے دشمن معلوم تو ہو کیا کیا اس نے۔ ایسی نیک فرمانبردار لڑکی تو ہونی مشکل ہے۔

حمیدہ :۔ نوج کسی ماں باپ کی ایسی بے غیرت بیٹی ہو۔ دیکھو نا کیسی دیدہ دھوئی ہے۔ آنکھ میں تو شرم و حیا نام کو نہیں۔ پتھر پڑے اس تعلیم پر۔ مُوا لگے اس نئی روشنی کو۔ بُوا ہم نے تو آج تک نہ آنکھوں سے دیکھا نہ کانوں سنا کسی لڑکی نے اپنی شادی میں دخل دیا ہو اور اس طرح منہ پھوڑ کر جواب دیا ہو۔ دنیا جہان میں دستور ہے۔ ماں باپ نے جسے ہاتھ پکڑا دیا اسی کے ہو رہے ہنسی خوشی گھر آباد کیا۔ غضب۔ اندھیر۔ اس بے غیرتی کو تو دیکھو کہتی ہے "کامل کے ساتھ ہرگز شادی نہیں کروں گی"۔ کیوں ری کامل میں کیا عیب ہے۔ لنگڑا ہے؟ لولا ہے؟ شرابی ہے؟ جواری ہے؟ چور ہے؟ بدمعاش ہے؟ کیسا ہے؟......... بتا......... منہ سے پھوٹ......... جواب دے...... اب للو کہاں چلی گئی۔ ادھوری مکار کیا خالہ پھپھی کے سامنے مسمسی صورت بنائے مسکین بلی بنی بیٹھی ہے۔ کوئی جانے بڑی شرمیلی اور غیرت دار لڑکی ہے۔

غضب خدا کا نو مہینے تک بوجھ باندھے پھرے۔ دکھ درد جھیلے۔ برسوں گُو موت دھوئے۔ پیر پیغمبر کی منتیں مانیں۔ پال پوس کر بڑا کیا۔ ہم کچھ بھی نہ ٹھیرے۔ ہمیں کوئی اختیار ہی نہ رہا۔ کیا خوب۔ لو بُوا ہم نے تو اللہ آمین کر کے یہ دن دیکھا۔ اب ٹبیا خیر سے جوان ہوئیں تو اپنے بیاہ کی آپ مختار بن بیٹھیں صد رحمت ہے اس دیدہ دلیری پر۔ اور شاباش ہے اس بے حیائی پر۔

میرے میکے والوں سے خدا جانے کیا باپ مارے کا بیر ہے اور نہیں معلوم کیا اللّٰہی بغض ہے کہ سسرال والے جلتے ہی رہے۔ بُوا زبیدہ بُرا نہ ماننا تمہارے بھائی بھی ان کی روح نہ شرمائے ہمیشہ میرے باپ بھائی سے نفرت ہی کرتے رہے۔ کبھی سیدھے منہ بات بھی نہ کی۔ ہمیشہ اپنوں ہی کو چاہا انھوں ہی کو بھرا۔ آخر کلثوم بھی تو اسی باپ کی بیٹی ہے۔ وہ کامل کو کیوں پسند کرنے لگی۔ اس کے من میں تو سعید بسا ہوا ہے اور کیوں نہ ہو چچا کا بیٹا جو ہے۔ کامل ٹھیرا ماموں کی اولاد اس غریب کو کب خاطر میں لانے لگی۔ آخر مجھ کرموں پھوٹی کو معلوم تو ہو کہ سعید میں کیا لال لگے ہیں اور کامل میں کیا عیب بھرے ہیں۔ خیر وہ بُرا ہے تو بھلا ہے تو چاہے اس کان سنو چاہے اس کان سنو۔ اب تو سب باتیں طے ہو چکیں ہیں شادی ہوگی تو کامل ہی کے ساتھ ہوگی۔

زبیدہ :۔ توبہ ہے بھابی جان تم تو جس کے سر ہوتی ہو ایسی پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑتی ہو کہ جان چھڑانی دو بھر ہو جاتی ہے۔ صبح سے جو صلواتیں سنانی شروع کی ہیں تو یہ وقت آ گیا۔ ایک تو بچی کا ہلکا خون دوسرے رات دن کے کچوکے اس ہر وقت کے جلاپے نے اس کی اچھی بھلی جان کو روگ لگا دیا۔ دیکھو نا کیا حال ہو گیا ہے بدن میں خون ہی نظر نہیں آتا۔ ہلدی کی سی رنگت ہو گئی۔ سو بیماروں کی ایک بیمار معلوم ہوتی ہے۔ ہر وقت کی کل کل کیا اچھی ہوتی ہے۔ میں کہتی ہوں کہ اس نے انکار کیا تو کیا گناہ کیا، یہ تو خدا اور رسول کا حکم ہے۔ لڑکے لڑکی کو اپنی شادی کا اختیار ہے چاہے جہاں کریں۔

حمیدہ :۔ ہاں بُوا تمہاری تو بھتیجی ہے تم اس کی حمایت نہ لو گی تو اور کون لیگا لو بُوا دیکھو اندھیر۔ لڑکی کو سمجھانے سے تو رہیں الٹا مجھی پر الزام دھرتی ہیں۔ اب نند بنا رکھو چھپر پر۔ وہ دن گئے۔ مر گئے تمہارے بھیّا جن کے برتے پر تم نکتوڑے تو ڑتی تھیں اور مجھے آٹھ آٹھ آنسو رلاتی تھیں اب بندی کسی کی سننے والی نہیں۔

زبیدہ :۔ لو اور سنو بیٹی پر گرجتے گرجتے مجھ پر برسنے لگیں۔ ہاں بھابی جان ذرا بتانا میں نے کون سے دن تم سے نند پنا برتا ہے۔

حمیدہ :۔ ایک دفعہ نہیں ہزار دفعہ۔

فہمیدہ :۔ توبہ ہے آپا تم نے تو سب سے لڑنے کی ٹھان لی۔ ایک ذرا سی بات کا بتنگڑ بنا دیا ان جھگڑوں سے کیا نتیجہ۔ ختم کرو اس قصے کو۔

حمیدہ کا غصہ ایسا نہ تھا جو آسانی سے ٹھنڈا ہو جاتا۔ بھری ہوئی تو تھیں ہی۔ بہن کے سمجھانے سے اور بھی بھڑک اٹھیں۔ ترنخ کر بولیں۔

میں ہی خطا وار ہوں۔ میرا ہی قصور ہے۔ اسے تو جب سگی بھتیجی بھی مجھی کو کہے تو نند تو پھر نند ہے۔ وہ کیوں کسر کرنے لگی۔ دنیا میں کوئی ماں ایسی بھی ہے جو اپنی اولاد کا بُرا چاہے۔ اس نے اپنی جندڑی کو آپ روگ لگایا۔ میں نے

کیا کیا۔ جس روز سے منگنی ہوئی ہے بی بی بنّوں نے کھانا پینا تک چھوڑ دیا۔ اب یہ کوئی ننھی سی تو ہے نہیں کہ میں اسے چڑیا کی طرح بھراؤں یا منہ چیر چیر کر حلق میں ٹھونسوں۔ آخر اور بھی تو لڑکیاں ہیں جہاں اپنی شادی کی بات سنی خوشی سے پھول کر کپّا بن گئیں۔ ایک یہ ہے کہ اسے سوکھا لگ گیا۔ نہ کسی سے بات کرتی ہے نہ ہنستی ہے۔ گویا گونگی کا گڑ کھا لیا۔ گونگی ہڑپ کر رکھی ہے ہر وقت کمرے میں بند منہ تھتائے اٹوائی کھٹوائی لیے پڑی رہتی ہے۔ رات دن آنسو بہاتی ہے۔ آنکھیں ہیں کہ ہر وقت کبوتر کے خون کی طرح سرخ۔ اب بتاؤ اس میں میرا کیا قصور ہے۔ زمانے بھر میں ماں باپ اولاد کا بیاہ کرتے ہیں۔ کیا میں دنیا جہان سے انوکھی بیٹی کی شادی کر رہی ہوں۔ نند بھی مجھی کو کہنے لگیں بہن بھی میرا ہی قصور بتانے لگیں۔ اس مردار کو کوئی نہیں سمجھاتا۔ اب تمہیں کیا معلوم نہیں جہان بھر میں چرچا ہے۔ میر شرافت علی کی لڑکی نے اپنا بر آپ پسند کر کے شادی کی۔ سارے زمانے میں تھڑی تھڑی ہوئی۔ کیا میں بھی ان کی طرح ناک کٹوا لوں۔ تم جانتی ہو کہ اس کی مرضی کے مطابق سعید سے شادی کر دوں سو یہ ان ہونی تو ہونی نہیں چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے۔

فہمیدہ :- بس آپا اس قصّے کو چھوڑو۔ سنتے سنتے سر چکرا گیا۔ تم خاموش ہو جاؤ ہم اسے سمجھائیں گے۔

حمیدہ :- اے تو سمجھاؤ گی کب۔ تمہیں کیا معلوم نہیں آج رات کو مانیوں بٹھانا ہے تھوڑی دیر بعد مہمان آنے شروع ہو جائیں گے اس وقت کیا کرو گی اس ٹینگ برابر چھوکری کے آگے ہاتھ جوڑ دگی منتیں کرو گی۔ اس نے تو کہدیا مانیوں بٹھانا بیہودہ رسم ہے۔ لو اب سمجھاؤ اس نئی روشنی کی اندھی کو۔ بوا تم اس کے گنوں کو کیا جانو۔ انگریزی تعلیم نے اسے جاہل بنا دیا ہے۔ جب سوجھتی ہے الٹی ہی سوجھتی ہے ہر بات میں کاٹ چھانٹ کرتی ہے۔ رات دن یہی رونا۔ یہ رسم بیہودہ ہے۔ یہ رواج بُرا ہے۔ بڑوں کو ہر بات میں برائی ہی نظر آتی ہے نئی روشنی نے زمانے میں اندھیر کر دیا ہے۔ لڑکوں کو دیکھو تو وہ شتر بے مہار۔ لڑکیاں ہیں وہ اللہ بچھڑی۔ ان کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ بزرگوں کو احمق گردانتے ہیں اپنے تئیں عقل کا پتلا جانتے ہیں آج کل کی تانتی کا ڈھنگ ہی انوکھا ہے۔ قسم لے لو مجھے تو سعید ایک آنکھ نہیں بھاتا جس پر یہ بنّو ریجھی ہوئی ہیں۔ جب وہ کوٹ پتلون پہنتا ہے تو اچھا خاصا لنگور معلوم ہوتا ہے فقط دُم کی کسر رہ جاتی ہے۔

فہمیدہ :- بس آپا خدا کے لیے معاف کرو۔ میں کہتی تو ہوں سب معاملہ مجھ پر چھوڑ دو میں ذمہ لیتی ہوں تمام کام ٹھیک ہو جائیں گے۔

غنیمت ہوا کہ خادمہ نے کھانا تیار ہونے کی اطلاع کی۔ فہمیدہ نے فوراً طلب کیا اور اس جھگڑے کا خاتمہ ہو گیا۔ کھانا کھا کر کلثوم بالا خانے پر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ چونکہ بہت دیر سے بھری بیٹھی تھی خوب پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ رونا بند ہوا تو خیالات پریشان کا ہجوم ہوا۔ سعید کی یاد نے ستایا۔ کلثوم انہیں پریشانیوں میں مبتلا تھی کہ مہمانوں کی آمد شروع ہو گئی۔ ہم عمر لڑکیاں اور برابر کی سہیلیاں ڈولیوں سے اترتے ہی سیدھی کلثوم کے پاس پہنچیں اور چھیڑ چھاڑ شروع کر دی جس نے کلثوم کے زخموں پر نمک پاشی کا کام کیا۔ رات کو کچھ تو خالہ اور پھپی نے سمجھایا، کچھ سہیلیوں کی چھیڑ چھاڑ نے تنگ کیا۔ آخر مجبور ہو کر برابر والیوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے اس نے اُبٹنہ مل ہی لیا۔

اس کے بعد جو دھما چوکڑی ہوئی معاذ اللہ۔ خدا ان قبیح رسموں سے بچائے۔ آپس میں ایک دوسرے کے زبردستی اُبٹنہ ملا گیا جس کا یہ نتیجہ ہوا کسی کی لونگ بچ گئی کسی کے جھومر کی لڑیاں ٹوٹ کر موتی بکھر گئے، کسی کے کان چر کر خونا خون ہو گئے۔ کسی کا زردوری جوڑا اُبٹنہ میں لتھڑ کر ناس ہو گیا۔ کسی کے کپڑے پھٹ گئے کوئی کسی کے پیچھے اُبٹنہ ملنے جو دوڑی ٹھوکر لگ کر گری۔ دو چار نے قہقہہ لگایا۔ کوئی لنگڑی ہو گئی کسی کی کہنی اتر گئی۔ قیامت کا ہنگامہ اور شور برپا تھا۔ آخر دو چار بڑی بوڑھیوں نے اُٹھ کر روک تھام کی جب کہیں یہ طوفان بے تمیزی رکا۔ اس کے بعد رات بھر ڈومنیوں کا گانا ہوتا رہا۔ تمام رات جاگنے کے بعد کلثوم نے صبح سونے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ پیش آنے والے واقعات اور نشتر غم کی خلش ایسی تھی جو دل میں سکون پیدا ہونے دیتی اور پل کی پل آنکھ جھپک جاتی۔ بار بار آنکھیں بند کر کے سونے کا ارادہ کیا لیکن نیند نہ آنی تھی نہ آئی۔ آخر کچھ خیال جو آیا تو پلنگ سے اٹھی۔ میز کی دراز کھولی کاغذ لفافہ نکالا۔ کرسی پر بیٹھ کر چند منٹ سوچا اور لکھنا شروع کیا۔

کلیجہ تھام لو گے جب سنو گے
نہ سنوائے خدا شیون کسی کا

پیارے سعید۔ حالات تم سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ تم سب کچھ جانتے ہو۔ جب سے والدہ نے تمہارا یہاں آنا بند کیا ہے اس وقت سے جو کچھ دل پر بیت رہی ہے خدا کو روشن ہے۔ والدہ اب تک اپنی ضد پر اڑی ہوئی ہیں۔ رات کو مانیوں کی رسم بھی ادا ہو چکی۔ اتوار کی صبح نکاح کے لیے مقرر ہے جس کے آج سے پورے چھ دن ہیں۔ پرسوں ماموں جان کے ہاں بھی اُبٹنہ کی رسم ہے۔ اب کیا کسر رہ گئی تمام کام مکمل ہو گئے۔ اب امید کو دل میں جگہ دینی گویا پانی پر عمارت چننی ہے۔ ہماری کامیابی مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ پانی سر سے گزر چکا ہے۔ ساحل مراد تک پہنچنے کی کوئی توقع نہیں کشتی عمر بحر یاس کے بھنور میں پھنس کر چکرا رہی ہے نکلنے کی آس نہیں۔ اس لیے میرا یہ آخری خط اور آخری سلام ہے۔

والدہ کی ہٹ اور دن رات کے کچوکے ایسے نہ تھے جنکی میرے دل کو سہار ہوتی۔ اس صدمے نے دم پر بنا دی ہے۔ حالت روز بروز بدتر ہوتی

جاتی ہے ۔ اب زندگی کی اُمید نہیں اور نہ جینے کی آرزو ہے ۔ میری غیرت گوارا نہیں کرتی کہ تمہارے سوا کسی دوسرے کیلئے زندہ رہوں غیر کے پہلو سے موت کا آغوش بہتر ہے۔ آہ سعید ہزاروں امیدیں تم سے وابستہ تھیں ایک بھی پوری نہ ہوئی ۔ لاکھوں ارمان نکلنے کے لیے مچل رہے تھے افسوس دل کے دل ہی میں گھٹ کر رہ گئے ۔ کیا میں اسی لیے پیدا ہوئی تھی کہ دنیا سے نامراد و حسرت جاؤں گیا اس لیے بڑی ہوئی تھی کہ جوان مرگ خطاب پاؤں ۔ ہائے آخری وقت تمہارے دیدار سے بھی محروم رہوں گی ۔ یہ حسرت بھی میرے ساتھ قبر میں دفن ہوگی ۔ اف دل بھر آیا آنسوؤں نے تار باندھ دیا ۔ بدن میں تھرتھری ہے ہاتھ میں لرزش ہے ۔ اب لکھا بھی نہیں جاتا اور لکھنا بہت کچھ باقی ہے ۔ ذرا آنسو تھم جائیں ہوش ٹھکانے ہو جائیں تو پھر لکھنا شروع کروں ۔

پیارے سعید میں جانتی ہوں جو حال میرا ہے وہی تمہارا بھی ہوگا اس خط کا ایک ایک لفظ تمہارے لیے تیر اور نشتر بن جائے گا ۔ لیکن خدا کے لیے اسے پڑھ کر آپے سے باہر نہ ہونا ۔ ہوش و حواس نہ کھونا ۔ صبر و ضبط سے کام لینا آخر تک ذرا ٹھنڈے دل سے پڑھنا ۔

جان سے زیادہ پیارے سعید اگر میرے متعلق کوئی خبر سنو تو صبر سے کام لینا ۔ عورتوں کی طرح آنسو نہ بہانا ۔ خدا نے تمہیں مرد بنایا ہے مردوں کا دل مضبوط ہوتا ہے تم ضبط کر سکتے ہو ۔ تم کو اپنی محبت کی قسم دیتی ہوں سعید میرے مرنے کا غم نہ کرنا ورنہ میری روح بے چین رہے گی ۔ دیکھو خودکشی حرام ہے ۔ اگر کسی ایسے کام کا ارادہ کیا تو حشر میں دامنگیر ہوں گی ۔ پیارے سعید زندہ رہو ۔ میں بدنصیب کشتۂ رسم ہوں ۔ میرے بعد تمہارا فرض ہے کہ مظلوم و بے زبان لڑکیوں کی تحریر و تقریر سے مدد کرو اور ان مہلک رواجوں کا انسداد کرو جن کی بدولت آج میری زندگی خطرے میں ہے میں پُر ارمان اس دنیا سے جانے والی ہوں ۔ ہر مسلمان جانتا ہے خدا کا صاف اور صریح حکم ہے کہ نکاح لڑکی اور لڑکے کی مرضی سے ہونا چاہیئے خواہ ماں باپ کی نظروں میں دوسری جگہ اس سے بہتر ہی کیوں نہ ہو لیکن اس کو کوئی کیا کرے کہ رواج کو خدا کے حکم پر ترجیح دی جاتی ہے اور بھولی بھالی لڑکیوں کو خواہی نخواہی زبردستی کسی کے پلّے باندھ کر ان کی زندگی خراب کی جاتی ہے ۔ کیا حکم خدا اور فرمانِ رسول اللہ کے خلاف نہیں ۔

سعید یقین جانو میں اس صدمے کو برداشت نہیں کر سکتی میرا جانبر ہونا مشکل ہے ۔ اب چند ہی دن کی دنیا میں مہمان ہوں ۔ میرے بعد تنہائی کی زندگی بسر نہ کرنا ۔ ایک میں نہ ہوں گی نہ سہی ۔ دنیا میں حسین تعلیم یافتہ اور سلیقہ مند لڑکیوں کی کمی نہیں کوئی اپنے لیے انتخاب کر لینا ۔ دعا ہے کہ خدا تمہیں صبر کی توفیق عطا فرمائے تم کو مجھ سے زیادہ محبت کرنے والی بیوی ملے ۔ تم صد و سی سال زندہ رہو ۔ بیوی کا سکھ اور بچوں کی بہار دیکھو ۔ میں اپنے ہاتھ کا گندھا ہوا رومال بطور نشانی بھیجتی ہوں اور تمہاری نشانی داغ محبت میرے دل پر ہے

پیارے سعید میری وجہ سے تمہارے دل کو جو صدمات پہنچے اس کی میں معافی مانگتی ہوں اور جو کچھ مجھ سے خطائیں سرزد ہوئی ہوں وہ بھی عنداللہ معاف کرنا ۔

کیا بھروسہ ہے زندگانی کا،
آدمی بلبلا ہے پانی کا

میں قبر کے کنارے تک پہنچ چکی ہوں خدا جانے موت کس وقت آ کر زندگی کا خاتمہ کر دے ۔ دعا کرو ۔ خدا کرے وہ وقت جلد آئے مجھے دنیا کے رنج و الم سے نجات ملے اور ابدی سکون و راحت نصیب ہو ۔

اگر غم و آلام اور پریشانیاں اجازت دیں اور تم بھی مناسب سمجھو تو چند سطریں لکھ کر اسی فہیمن کے ہاتھ روانہ کر دو تاکہ میرے دل کو کسی قدر تسلی ہو جائے فقط اس ناکام محبت کا آخری سلام قبول کرو ۔

کشتۂ رسوم
بدنصیب کلثوم

کلثوم نے خط اور رومال فہیمن کو دے کر جواب لانے کی تاکید کر کے روانہ کیا ۔

خط ایسا نہ تھا جو دل پر اثر نہ کرتا خاص کر اس صورت میں جہاں "دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی" ۔ ایک فریق دوسرے کو یا مطلوب طالب کو ایسا المناک خط لکھے تو پڑھنے والے کی حالت کا اندازہ وہی خوب کر سکتا ہے جس کی طبیعت میں اس قسم کا لگاؤ ہو یا جس کے سینے میں درد بھرا دل ہو ۔ ورنہ اس کا تصور محال اور اس کا بیان ناممکن ۔ سننے والوں کا سینہ شق ہوتا ہے پتھر کا دل ٹکڑے ٹکڑے اور فولاد کا جگر پانی پانی ہو جاتا ہے ۔ سخت سے سخت دل بھی اپنے آنسو نہیں روک سکتا ۔ سعید کا کیا حال ہوا ہوگا ۔ دل تو پہلے ہی زخمی تھا کلثوم کی تحریر نے اور بھی نشتر چبھوئے گویا موئے پر سو درّے ۔ خط پڑھ رہا تھا آنکھوں سے آنسو جاری تھے ۔ دل دور غم سے پاش پاش ہو رہا تھا چوں کہ عقیل و فہیم تھا فوراً طبیعت کو سنبھالا آنسوؤں کو ضبط کیا اول سے آخر تک ایک ایک لفظ پڑھا سکون تو کیا نصیب ہوتا دل پر جبر کر کے جواب لکھنا شروع کیا ۔

دیکھا آخر نہ کہ پھوڑے کی طرح پھوٹ بہے
ہم بھرے بیٹھے تھے کیوں آپ نے چھیڑا ہم کو

پیاری کلثوم
تمہارا خط ملا جو لفظوں سے نہیں بلکہ تیر و نشتر سے بھرا ہوا تھا

دل پاش پاش اور جگر چھلنی ہو گیا۔ میں ہی ایسا سخت جان تھا جو پڑھ کر زندہ رہا۔ تم خشک لکڑیوں کے انبار میں آگ لگا کر توقع رکھتی ہو کہ دھواں نہ ہو۔ ساز کے تاروں کو چھیڑ کر خواہش کرتی ہو کہ آواز نہ نکلے یہ کیوں کر ممکن ہے۔ تم نے تو یقیناً روتے روتے آنکھیں سوجھالی ہوں گی اور میرے سینے ... تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے۔ کیوں کیا میرے سینے میں دل نہیں پتھر ہے۔

تم پیش از مرگ واویلا کر رہی ہو۔ دیکھو کلثوم خدا کی رحمت سے مایوس ہونا کفر ہے۔ ہمیں آخر تک خدا کی ذات سے امید رکھنی چاہیئے۔ وہ بڑا مسبب الاسباب ہے ممکن ہے ہماری کامیابی کا کوئی سبب پیدا کر دے۔ اکثر دیکھا گیا ہے آن کی آن میں بڑے بڑے انقلابات پیدا ہو گئے ہیں۔ ابھی تو تمہاری شادی میں چھ دن باقی ہیں۔ اتنے عرصے میں تو ہزار مرتبہ دنیا ادھر سے ادھر ہو سکتی ہے۔ کیا بعید ہے کہ ہماری محبت کی دنیا میں بھی کوئی خوشگوار انقلاب رونما ہو کر ہمارے غم کو خوشی سے بدل دے۔

پیاری کلثوم، محبت ایک پاک، لطیف اور غیر فانی شے ہے اسے ازدواجی تعلق سے کوئی واسطہ نہیں۔ ہمارا رشتۂ محبت میں منسلک ہونا ہی کامیابی کی دلیل ہے۔ رشتۂ مناکحت جب چاہیں توڑ سکتے ہیں۔ لیکن رشتۂ محبت کا توڑنا انسانی طاقت سے بعید ہے۔ محبت میں ایک دوسرے سے روحانی وابستگی دائمی استواری کے ساتھ پیدا ہوتی ہے اور مناکحت میں جسمانی تعلق عارضی و ناپائیدار ہوتا ہے۔ اس لیے پیاری کلثوم اگر ہماری شادی نہ ہو تو اسے ناکامی سمجھنا غلطی ہے۔

دیکھو دنیا میں ایک دل بھی امیدوں سے خالی نظر نہیں آتا ہوش سنبھالتے ہی آرزوؤں کا تانتا لگ جاتا ہے۔ دل ہزاروں امیدوں سے بھر جاتا ہے اگر ایک تمنا پوری ہوتی ہے تو دوسری فوراً اس کی جگہ موجود ہو جاتی ہے اور یہ سلسلہ انسان کے آخری سانس تک جاری رہتا ہے کسی شخص کی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اسے عمر بھر میں ایک مرتبہ بھی حقیقی مسرت اور راحت نصیب ہوئی ہو کوئی انسان کامیاب نظر نہیں آتا۔ لاکھوں حسرتیں دل میں پیدا ہوتی ہیں اور بغیر پوری ہوئے فنا ہو جاتی ہیں۔ کس کس کا رنج کیجئے۔ کس کس کو روئیے۔ اس لیے پیاری کلثوم تمہارا اس پر ملال کرنا اور رونا لاحاصل ہے۔

تم مجھے زندہ رہنے کی وصیت کرتی ہو۔ یہ کیوں کر ممکن ہے کہ تمہارے بعد میں زندہ رہوں۔ تم میری روح ہو۔ تم نہ رہو گی تو میرا جسم کس کام کا۔ دیکھو شیریں کے مرنے کی جھوٹی خبر سن کر فرہاد نے جان دے دی۔ لیلےٰ کے بعد مجنوں زندہ نہ رہ سکا۔ تعجب ہے کہ تم مجھ سے ایسی توقع رکھتی ہو۔ تم نے مجھے محبت کی قسم دے کر زندہ رہنے کی تاکید کی ہے۔ میں تم کو اپنی جان کی قسم دیتا ہوں خدا کے لیے ان خیالات اور صدمات کو دل سے نکال ڈالو۔ جو تمہاری زندگی کا خاتمہ کیے دیتے ہیں۔ للہ جس طرح بھی ہو سکے اپنا دل بہلاؤ۔ ہمت و استقلال کے ساتھ دنیا کے مصائب برداشت کرو۔

کیا اصلاح قوم اور مہلک رسم و رواج کا انسداد صرف میرا ہی فرض ہے اور تم اس سے بری الذمہ ہو۔ اس معاملہ میں مجھ سے زیادہ تمہارا حصہ ہے اور تم ہی کو کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔ اس لیے کہ تمام رسم و رواج عورتیں ہی جاری کرتی ہیں اور مردوں سے زیادہ حصہ لیتی ہیں۔ اولاد کی شادی میں جتنا ماں کو دخل ہے اتنا باپ کو نہیں ہوتا۔ اس لیے پیاری کلثوم اصلاح قوم کی خاطر زندہ رہنے کی کوشش کرو اور اپنی اولاد کو ازدواجی آزادی دے کر دنیا میں مثال قائم کرو کیونکہ تحریر و تقریر سے عمل کا اثر زیادہ ہوتا ہے۔

خدا سے دعا ہے کہ وہ تمہیں ہمت و استقلال عطا فرمائے خصوصاً نکاح کے وقت ضبط و صبر کی توفیق دے۔ تم حوصلہ مندی سے تمام کام انجام دو اور اپنے ہونے والے شوہر کی وفاداری کے ساتھ اطاعت کرو۔ فقط

محبت کا شہید

نامراد سعید

فہیمن وہیں موجود تھی۔ سعید نے خط لفافے میں بند کر کے اس کو ہاتھ روانہ کیا۔ جس وقت خادمہ نے کلثوم کو خط دیا اسی وقت زبیدہ کمرے میں داخل ہوئیں۔

لڑکی ہوش میں آ۔ میں نے دیکھ لیا ہے اب چھپانے سے کیا ہوتا ہے تم اسے ضرور پڑھو گی۔ لا خط ادھر لا ..... سعید کا معلوم ہوتا ہے .. ..
اچھا تو خیر سے نوبت یہاں تک پہنچی کہ دشمنوں کی جان پر آ بنی۔ خبر نہیں تو نے اس اس غریب کو کیا لکھ مارا خط پر آنسوؤں کے نشان موجود ہیں۔ خدا جانے اس بدنصیب کا کیا حال ہوا ہوگا۔ لے پڑھ ....

میری بچی بس اب گریہ و زاری موقوف کر۔ تو جو اندر ہی اندر گھٹتی ہے غم کھاتی ہے اس سے کیا حاصل ہوگا۔ گھل گھل کر چوتھائی بھی نہیں رہی۔ ہڈی سے چمڑا لگ گیا۔ دن بدن سوکھتی ہی جاتی ہے۔ ذرا باہر نکل کے بیٹھ۔ ہجولیوں میں دل بہلا۔ تو اطمینان رکھ میں تیرے معاملہ میں اپنی جان لڑا دوں گی۔ میں نے اور تیری خالہ نے جو تجویز سوچی ہے۔ انشاءاللہ پوری ہوگی۔

کچھ تو سعید کے خط سے اطمینان ہوا۔ کچھ زبیدہ کی باتوں سے تسلی ہوئی اور کسی قدر کلثوم نے بھی خیال بٹانے اور دل سے غم کا اثر زائل کرنے کی کوشش کی۔ کبھی ہجولیوں میں دل بہلاتی۔ کبھی تنہائی میں کوئی کتاب دیکھتی۔ اس کوشش کا یہ نتیجہ ہوا کہ اس کی طبیعت کسی قدر سنبھل گئی۔

آج رات کو کلثوم کے ماموں محمد عاقل کے ہاں مائیوں کی رسم ہے حمیدہ بانو پینڈیاں اور اُبٹنہ وغیرہ کامل کے لیے بھیجنے کی تیاری میں مصروف ہیں فہمیدہ اور زبیدہ دوپہر ہی کو ان کے ہاں جا پہنچیں۔

رضیہ (کامل کی والدہ) فہمیدہ اور زبیدہ ایک کمرے میں بیٹھی ہوئی کچھ باتیں کر رہی تھیں۔ سعید کے ہاں سے خادمہ آئی۔ زبیدہ سے کہا۔ آپ کے بھائی جان نے بلایا ہے۔

زبیدہ :- کیوں خیر تو ہے۔

خادمہ :- سعید میاں کی طبیعت ذرا خراب ہے۔

زبیدہ :- اچھا میں چلتی ہوں جاؤ ڈولی لے آ۔ بوا رضیہ جو کچھ میں نے کہا ہے اس پر اچھی طرح غور کرنا۔ دیکھنا خدا کے لیے میرا سوال رد نہ کرنا۔

رضیہ :- بُوا میرا کیا اختیار ہے۔ ان سے کہوں گی اگر وہ رضامند ہو گئے تو مجھے بھی کوئی انکار نہ ہو گا۔

زبیدہ :- کامل کے ابا سمجھ دار آدمی ہیں جب وہ سنیں گے تو یقیناً منظور کریں گے۔ بوا فہمیدہ تم بھی اپنے بھائی کو سمجھانا۔ کوشش کر کے یہ کام ضرور کرا دینا۔

فہمیدہ :- بے فکر رہو۔ میں کوئی کسر نہیں کروں گی۔ جہاں تک میرا بس چلے گا میں بھائی جان کو راضی کروں گی۔

خادمہ :- بیوی ڈولی آگئی۔

زبیدہ :- بوا رضیہ مجھے اجازت دو۔ خبر نہیں سعید کا کیا حال ہے۔

رضیہ :- اچھا بوا۔ اللہ بیلی۔

زبیدہ :- معاف کرنا میں کامل کی مائیوں میں شریک نہ ہو سکی۔ مجبور ہوں موقع ہی ایسا ہے کہ میں رک نہیں سکتی۔

رضیہ :- خیر اس کا خیال نہ کرو۔ مجبوری ہے کیا کیا جائے۔ مجھے کوئی شکایت نہیں۔ میری طرف سے بھی پوچھ لینا جو حال ہو کہلا بھیجنا۔

زبیدہ :- بوا فہمیدہ ذرا خیال رکھنا جس طرح بنے معاملہ طے کر لینا۔ میں کل پھر آؤں گی۔ اللہ بیلی۔

فہمیدہ :- دیکھنا جاتے ہی سعید کی خیریت بھیجنا۔ کبھی بھول جاؤ۔ چلتی تو میں بھی کیا کروں مجبور ہوں یہ کام بھی ضروری ہے

زبیدہ ڈولی میں سوار ہو کر اپنے بھائی کے ہاں روانہ ہو گئیں۔

شام کو حمیدہ بانو کامل کے لیے اُبٹنہ، پینڈیاں وغیرہ لے کر آئیں۔ رات کو دھوم دھام سے مائیوں کی رسم ادا ہوئی۔ حمیدہ بانو کو بہت زیادہ خوشی تھی جتنی دیر رہیں بار بار کامل کی بلائیں لیتی رہیں۔

دوسرے دن زبیدہ پھر محمد عاقل کے ہاں آئیں۔ آتے ہی فہمیدہ سے پوچھا۔ کہو کیا ہوا۔ فہمیدہ نے کہا سب کام ٹھیک ہو گیا۔ میں نے اور بھابی جان نے رات ہی کو بھائی جان سے کہہ دیا تھا آج صبح پھر سمجھایا۔ وہ فرمانے لگے "تم نے پہلے سے کیوں نہ کہا۔ یہ نوبت ہی نہ آتی۔ خیر اب بھی تم نے کہہ دیا تو غنیمت ہے میں اس کام کو خود انجام دوں گا۔" لو اب مٹھائی کھلواؤ۔ میں نے بڑی مشکل سے بھائی جان کو راضی کیا ہے۔ یہ سنتے ہی زبیدہ خوشی خوشی ڈولی منگا کر اپنے بھائی کے ہاں چلی گئیں اور فہمیدہ اپنی بہن حمیدہ بانو کے گھر روانہ ہوئیں۔

اتوار کی صبح برات آئی۔ نکاح کے بعد دولہا زنانہ مکان میں گیا۔ عورتوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا جس نے دیکھا محو حیرت ہو گئی حمیدہ بانو بھیڑ کو چیرتی ہوئی عورتوں کو دھکیل دھکیل کر ہٹو بچو کرتی ہوئی مشکل سے داماد تک پہنچیں۔ دولہا نے جھک کر سلام کیا۔ حمیدہ بانو کی زبان سے دعا نکلی ہی تھی اور بلائیں لینے کے لیے ہاتھ بڑھے ہی تھے کہ چہرے پر نظر پڑی۔ جھجک کر فوراً ہاتھ کھینچے۔ آنکھیں ملیں۔ پھر دولہا کی طرف غور سے دیکھا۔ بے ساختہ زبان سے نکلا .....

ہیں۔ کون سعید .... تم دولہا .... چکر آیا اور سر تھام کر وہیں بیٹھ گئیں +

(مجنوں دہلوی)

مزاحیہ

منکہ ایک ڈنگر ڈاکٹر

افراد

رحمت اللہ .... ڈاکٹر
قلندر بخش .... کمپاؤنڈر
بیوی جی .... ڈاکٹر صاحب کی گھر میں سے
نورا .... ملازم
چند مریض، کتے، گدھے، بھینس، گائے وغیرہ وغیرہ
مقام :- قصبہ نرپلا - عہد حاضر

منظر اوّل

(ایک پرانی طرز کا دالان جس کے بائیں پہلو میں ایک دروازہ جو باہر کے کمرے میں کھلتا ہے جہاں ڈاکٹر صاحب کا مطب ہے۔ بائیں طرف ایک تاریک سی کوٹھری۔ دالان میں ایک طرف کوئی سی چیز کے گرد دو کرسیاں جن کی بید کثرت استعمال سے غائب ہو گئی ہے۔ بیچ میں گاؤ تکیہ ہے اور ایک پرانی سی سوزنی بچھی ہوئی ہے ایک زنگ آلود لوہے کا پان دان رکھا ہوا ہے۔ طاق میں کاغذ کے پھول، خالی بوتلیں، شیشیاں۔ آئینہ اور ایک گھنٹہ رکھا ہے جس میں چوبیس گھنٹے ساڑھے تین بجے رہتے ہیں۔)

نورا۔ (میلے کپڑے پہنے، سیہ فام چھوکرا داہنی طرف کے دروازے سے داخل ہوتا ہے) بیوی جی! ..... بیوی جی!! ..... بیوی جی!!!

بیوی جی (ادھیڑ عمر کی گھناونی حسینہ۔ کانوں میں دو دو سیر کی چاندی کی لاتعداد بالیاں پہنے۔ لال، پیلے، نیلے اور سبز رنگ کی عجیب قسم کی دیہاتی پوشاک زیب تن کیے بائیں طرف کی کوٹھری سے ایک کنستر لئے داخل ہوتی ہے)۔ کیا ہے رے نپوتے! چلا تا رہے ہے بولے کیوں نا؟ کیوں رولا مچا وے ہے؟ (کنستر فرش پر رکھ کر اس میں سے کپڑے نکالتی ہے۔)

نورا۔ بیوی ڈاکٹر صاحب دہی منگا رہے ہیں۔

بیوی جی۔ تو لا دے میرے سے کیا کہوے ہے۔ (کپڑوں کی اُلٹ پلٹ جاری ہے)

نورا۔ بیوی! پیسے؟؟

بیوی جی۔ (ایک دم سے کپڑوں کو چھوڑ کر نوکر کے پیچھے خالی کنستر لے کر دوڑتی ہے) پیسے! پیسے! اے پیسے!! نپوتے! مری لئے!! دھرا ہے نا میرے پاس کھجانا۔ چاندی برسے ہے ادھر آ میں دوں تجھے پیسے!!

(دو چار کنستر نورا کی پیٹھ پر پڑتے ہیں۔ وہ چلاتا ہوا دائیں طرف کے دروازے سے نکل جاتا ہے۔ بیوی جی زور سے اس کے پیچھے کنستر پھینکتی ہے دھماکے کے ساتھ ہی ڈاکٹر رحمت اللہ خوش رو۔ میانہ قد۔ سفید صافہ باندھے ہوئے، سوٹ پہنے۔ ہاتھ میں لوہے کی سینی لیے حواس باختہ داخل ہوتے ہیں بیوی جی غصہ سے دیوانی ہو رہی ہے۔ کنستر پھینکنے کے بعد جھاڑو اٹھا کر دے مارتی ہے جو ڈاکٹر صاحب کی ناک پر لگتی ہے۔ سینی ان کے ہاتھ سے چھوٹ جاتی ہے نورا ڈاکٹر صاحب کی پشت پر سے جھانکتا ہے)

ڈاکٹر صاحب۔ ڈیم یو۔ یہ کیا۔ ارے ہیں، کیا ہوا کیا..... کیا؟

بیوی جی۔ (جوتی اُٹھاتے ہوئے) آ میں دوں تجھے دوں پیسے جوا مرگ!

ڈاکٹر صاحب۔ آخر کیا ہوا۔ بولتی کیوں نہیں؟ نورا او نورا۔ کیا ہوا ہے؟؟ نورا کہاں گیا؟

بیوی جی۔ کیا کہاں۔ وہ لنگا کھڑا ہے تمہارے پیچھے پیسے دیدو

بیوی جی۔ ہوں! سن لو جی۔ دہی منگانی ہو تو اپنے کھیسے سے نکالو پیسے۔ بڑی کمائی کر رہے ہو نا۔ بیسیوں مریج آ رہے ہیں کیا ٹھیک ہے۔ روج روج دہی

کھا دینگے سو کھا تُکڑا تو جڑتا نہیں۔ بیس سے کہہ یا ہے۔ نہیں تو سنبھالو اپنا گھر میں تو یہ چلی پیہر کو......

ڈاکٹر صاحب۔ ڈیم یو۔ بات بات پر غصہ۔ کیا ہوا جو اس نے ایک پیسہ مانگ لیا۔ اب نہیں جانتی ڈاکٹری تو کیا کروں۔ گھاس کھودوں ہوکی کروں۔ نورا۔ تو نے بیوی جی سے پیسے کیوں مانگے۔ چھوٹے لال حلوائی کے ہاں سے ہمارا نام سے گڑ ہی لے آ۔

نورا۔ سامنے آتے ہوئے میں گیا تھا جی وہ بولا کہ پہلے کے ساڑھے سات آنے لاؤ۔ ڈانگڈر سے کہنا کہ میں ادھار نا دوں۔

ڈاکٹر۔ ڈیم یو.......

بیوی جی۔ ہوں مجھے پتہ تھا کہ ادھار ہی کرنے لگے۔ کھوب دی کھاؤ۔ اب تمہے باجی ہوگی اس دہی کے پیچھے میں کہوں ہوں تمہیں ہوس (ہوش) آویگا کہ نہیں؟

ڈاکٹر صاحب۔ ڈیم یو میری تو قسمت پھوٹ گئی تمہارے ساتھ نکاح کرکے۔ کیا خبر تھی کہ زمیندار کی بیٹی ایسی بدزبان نکلیں گی لاحول ولا! گوارن کہیں کی۔ تم کیا جانو شہر والوں کو تمیز چھو نہیں گئی۔ لٹھ.. ..

بیوی جی۔ تو کیوں لائے بیاہ کر۔ لاتے کسی موٹی کالی میم کو۔ یا کسی سہ جادی (شہزادی) کو۔ بیگم کو۔ بڑے دہن والے ہونا...... جو میں نہ ہوتی تو آج یہ سفید چیتھڑے بھی تن پر نہ ہوتے۔ لنگوٹی لگی ہوتی دہی کے پیچھے

....

ڈاکٹر صاحب۔ شٹ اپ! تم نے آخر سمجھ کیا رکھا ہے جب میں فوج (فوج) میں تھا تو لاکھوں کمائے اور اب بھی دیکھو ایسا پانسہ پھینکتا ہوں کہ پانچوں گھی میں ہوں گی۔ بالکل ہی پاجامہ سمجھا ہے ہم کو! ڈیم یو!! ہم روز دہی کھائیں گے۔ تم کون۔ مت دو۔ بڑی پیسے والی آئی ہیں کہیں سے۔ میں نے بھی طے کرلیا ہے کہ اب مویشیوں کا علاج شروع کروں گا۔ پھر دیکھو کتنی آمدنی ہوتی ہے۔ روز دہی!!! ڈیم یو۔ قہ قہ قہ قہ (ہنستے ہیں)

بیوی۔ نوج! ڈنگر ڈانگڈر!! آدمیوں کے علاج میں تو پوری پڑی نہیں۔ ڈنگروں کا علاج کریں گے جانے کیا مت ماری گئی ہے۔ (بڑبڑاتی ہوئی بائیں طرف والی کوٹھری میں چلی جاتی ہے۔)

ڈاکٹر صاحب۔ روز دہی۔ روز دہی۔ قہ قہ قہ قہ اے نورا اب ہم ڈنگر ڈاکٹر بنیں گے۔ کیوں بے؟

نورا۔ ہیں جی؟؟

ڈاکٹر صاحب۔ ڈیم یو۔ قہ قہ قہ قہ۔ پردہ

منظر دوم

(کچھ دن بعد)

(ڈاکٹر رحمت اللہ خاں صاحب کا مطب۔ سامنے چمکدار سائن بورڈ پر جلی حروف میں لکھا ہوا ہے "یہاں مردوں، عورتوں اور بچوں اور مویشیوں کا علاج ہوتا ہے" بیس سال کا جنگی تجربہ رکھنے والے پنجاب کے ہر دل عزیز ڈاکٹر رحمت اللہ خاں آر۔ یو۔ ایس۔ این ڈبیو۔ آر۔ بی۔ بی اینڈ سی، آئی آر۔ این، ڈبیو، الیف۔ بی۔ وغیرہ"۔ درمیان میں ایک بڑی میز کے پیچھے ڈاکٹر رحمت اللہ بیٹھے ہیں۔ میز پر مختلف قسم کا سامان رکھا ہے۔ بائیں طرف کا در زنانے میں کھلتا ہے۔ دائیں طرف دو لمبی لمبی چیزوں پر شیشیاں بوتلیں وغیرہ رکھی ہیں۔ قلندر بخش کمپونڈر۔ دراز قد۔ گھناؤنی شکل سرخ رنگ کا صافہ باندھے ڈھیلی سی شلوار پہنے کچھ سر پٹر کر رہے ہیں اور گنگناتے بھی جاتے ہیں ڈاکٹر صاحب کے بائیں ہاتھ کو بنچ پر ایک بڑے میاں بیٹھے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد کمپونڈر بڑے میاں کو دوا کی شیشی دیتا ہے۔ بڑے میاں کچھ پیسے نکال کر دیتے ہیں۔)

بڑے میاں۔ کھانے کو کیا ڈاکٹر صاحب؟

ڈاکٹر صاحب۔ یہی ہلکا پھلکا، کھچڑی، ساگو دانہ وغیرہ۔

بڑے میاں۔ (کھانستے ہوئے) کھانسی بہت ہے۔

ڈاکٹر صاحب۔ سب آرام ہو جائے گا۔

بڑے میاں۔ رات بھر جاگتا رہتا ہوں۔ پیٹ میں گولا.... بہت تکلیف.....آہ!! ہوتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب۔ سب آرام ہو جائے گا۔ یہ دوا پیو۔ دو دن میں بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔

بڑے میاں۔ یہ کتنی خوراکیں ہیں۔ کیسے پیوں؟

ڈاکٹر صاحب۔ چار خوراکیں۔ دو دو گھنٹے بعد پیو۔ شام تک آرام ہو جائے گا۔

بڑے میاں۔ کھانسی بہت ہے۔

ڈاکٹر صاحب۔ سب آرام ہو جائے گا۔

بڑے میاں۔ کھانے کو کیا کھاؤں کس وقت؟ (دوسرا مریض داخل ہوتا ہے۔ سلام کرتا ہے)

ڈاکٹر صاحب۔ بندگی۔ بندگی ٹھاکر صاحب! آئیے۔ آئیے!!

بڑے میاں۔ کھانے کو؟

ڈاکٹر صاحب۔ کہیے گھر میں سے کیا حال رہا؟ ارے بھائی

شوربا، چپاتی، کھچڑی کھاؤ۔

ٹھاکر صاحب۔ آپ کی کرپا سے اب تو آرام ہے۔ پرنتو دور نہیں جاتا کسی طرح بھی۔

بڑے میاں۔ کیوں جی کس وقت کھاؤں، کس وقت؟

ڈاکٹر صاحب۔ تو آپ نے وہ تیل ملا تھا یا نہیں۔ جب خوب بھوک لگے۔ مالش بھی؟

(بڑے میاں جاتے ہیں)

ٹھاکر صاحب۔ ہاں جی تین وقت خوب مالش کی تھی اور سینکائی بھی کی تھی۔

ڈاکٹر صاحب۔ قلندر! پیسے دے دیئے بڈھے نے؟

قلندر بخش۔ ہاں جی۔ آٹھ آنے، اور دو دو پیسے اس بنیئے کے بھی آگئے ہیں بھینس کے۔

ڈاکٹر صاحب۔ اچھا اچھا۔ تو خوب مالش کی۔ میں آج دوسرا تیل دوں گا۔ اس سے ضرور فائدہ ہوگا۔ دیکھنا قلندر ٹھاکر صاحب کو وہ نیا امبروکیشن دینا جو دہلی سے منگوایا ہے۔ نا یئے نسخہ۔

(ایک شخص گائے لیے داخل ہوتا ہے)

ڈاکٹر صاحب۔ کہو بھئی نتھو خاں! کیا حال رہا گائے کا؟

نتھو خاں۔ اجی وہ کیا نام اس کا وہی حال ہے چارہ منہ پر بھی نہیں ڈالتی۔ کھڑے کھڑے دھڑ سائی گر پڑتی ہے۔ اور وہ کیا نام اس کا جی وہ کل دو مجھے بھی بچی رہو گئیں۔

ڈاکٹر صاحب۔ کوئی فکر نہیں۔ لیجئے ٹھاکر صاحب یہ میں نے دوسرا نسخہ لکھ دیا ہے۔ ہاں تو بخار جاڑا دے کر آتا ہے۔ بھوک نہیں لگتی۔ سر بھاری معلوم ہوتا ہے۔ ٹٹی نہیں ہوتی! کیوں؟؟

نتھو خاں۔ ہاں جی۔ کل دن میں بس چار ہی دفعہ ٹٹی ہوئی اور کل صبح میرے سے چھ۔ دتی سے زیادہ کھایا ہی نہ گیا۔ شام کو بھی کیا نام اس کا دو روٹیاں کھائی تھیں۔ باجرہ کی ہیں۔ بخار کسی وقت اترتا ہی نہیں۔ ہاتھ دکھاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نبض دیکھتے ہیں)

ڈاکٹر صاحب۔ (نبض دیکھتے ہوئے) تو چارے پر منہ نہیں ڈالتی (ڈاکٹر صاحب کی نظریں گائے پر جمی ہوئی ہیں) کھڑے کھڑے دھڑ سائی گر پڑتی ہے کیوں؟ اچھا یہ تھرما میٹر منہ میں رکھو۔ لے لی دوا آپ نے ٹھاکر صاحب! زبان کے نیچے رکھنا (نتھو خاں بڑھکر تھرما میٹر گائے کے منہ میں ڈال دیتا ہے۔)

ٹھاکر صاحب۔ (کچھ پیسے ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ میں دیتے ہوئے) تو یہ کس وقت پلانی ہے؟

ڈاکٹر صاحب۔ (پیسے جیب میں ڈالتے ہوئے) اس کی کیا ضرورت تھی ٹھاکر جی۔ کاہے کو تکلیف کی آپ نے۔ دن میں تین مرتبہ ذرا سے پانی کے ساتھ دے دیجئے گا۔ اور یہ تیل خوب مالش کیجئے گا۔ کل صبح تو آپ آئیں گے نا حال کہنے۔ ہاں بھئی نتھو چل تیری گائے بھی دیکھوں۔ ٹھاکر صاحب اتنی کرپا کیجئے گا کہ اپنے آدمیوں کو بتا دیجئے کہ ڈنگر ڈھور کا علاج یہاں سب سے اچھا ہوتا ہے۔ آپ کے سہارے یہاں ہم بھی دن کاٹ رہے ہیں (گائے کے قریب آتے ہوئے) قہ قہ قہ قہ۔ دلیپ آپ ہی دیا چاہیئے! قہ قہ قہ!!

ٹھاکر صاحب (مزدور سے)۔ بندگی! (جاتا ہے)

ڈاکٹر صاحب (اسٹیتھسکوپ کانوں میں لگا کر گائے کی ناک پر رکھتے ہیں) قلندر! ذرا یہ پیسے دیکھنا کتنے ہیں (قلندر پیسے لیتا ہے) ہاں تو بخار جاڑا دے کر آتا ہے۔ ٹٹی نہیں ہوتی۔ سر بھاری معلوم ہوتا ہے۔ کیوں جی؟؟

نتھو خاں۔ ہیں جی؟؟؟

قلندر۔ سوا روپیہ ہے جی!

ڈاکٹر صاحب۔ (گائے کا سینگ پکڑتے ہوئے) سوا روپیہ! ڈیم یو!! مزا آگیا۔ جاؤ پوتی تمہیں انعام میں دی۔ آج خوب دہی کھایا جائیگا قہ قہ! بلاؤ نورا کو۔ نورا۔ ابے نورا!!

قلندر۔ ابے نورا! نورا ہوت!!

نورا (اندر سے) آیا جی!

ڈاکٹر صاحب۔ (واپس میز پر آتے ہوئے) ہاں جی۔ (نسخہ لکھتے ہوئے) کیا نام ہے گائے کا؟؟

نتھو خاں۔ اجی کیا نام اس کا میرا نام نتھو خاں ولد دلاور خاں قوم پٹھان پیشہ کاشتکاری ساکن زیلا ڈاک خانہ خاص ....

ڈاکٹر صاحب۔ اوہو میں بھولا۔ تو تم بیمار ہو یا گائے؟

نتھو خاں۔ اجی وہ کیا نام اس کا۔ دونوں!!

ڈاکٹر صاحب۔ ہاں، ہاں ٹھیک ہے دونوں کو بدہضمی کی شکایت ہے

نتھو خاں۔ کیا نام اس کا۔ کھڑے کھڑے گر پڑتی ہے۔ چارہ پر منہ ....

ڈاکٹر صاحب۔ ٹھیک ہے۔ بخار جاڑے سے آتا ہے نا۔ (نسخہ لکھتے ہیں) ہاں! وہ تھرما میٹر کہاں ہے؟ دیکھیں کیا ٹمپریچر ہے .....

نورا۔ (بائیں طرف سے آتا ہے) کیا کہو ہو جی؟ (نتھو خاں گائے کا منہ دیکھتے ہیں۔ گائے نے تھرما میٹر چبا ڈالا)

ڈاکٹر صاحب۔ ابے نورا!! ڈیم یو۔ لویہ روپیہ چھوٹے لال حلوائی سے کہنا اپنے پچھلے کے پیسے لے لیں باقی بچے ساڑھے چھ آنے۔ دو پیسے تمہارے انعام کے۔ خبردار جو بیوی سے کچھ ذکر کیا۔ چھ آنے کا دہی لاؤ۔ عمدہ، فرسٹ کلاس ڈیم یو۔ اندر مت لے جانا یہیں رکھنا۔ خوب مرچیں ڈال کر رائتہ بناؤ۔ فرسٹ کلاس خوب مرچیں سمجھ گیا۔ (نورا روپیہ لے کر جاتا ہے)

قلندر!! لینا بھئی یہ نسخہ بنا دینا۔ دو بوتلوں میں اور اپنے خاں صاحب سے پیسے دا جبی ہی لینا۔ قہ قہ قہ!! (ایک شخص گدھا لیے داخل ہوتا ہے)

ڈاکٹر صاحب۔ ابے کس کا گدھا ہے یہ؟

شخص۔ جی کلن کمہار کا ہے کل یہاں آیا تھا حضور کے پاس حضور نے کہا تھا ہم مرہم لگا دیںگے۔

ڈاکٹر صاحب۔ اوہو۔ اچھا یہ وہ ہے جس کی پسلیوں پر زخم ہیں۔ ٹھیک ہے۔ ہماری فیس لائے ہو۔ سارے کا سارا گدھا زخمی ہو رہا ہے تین سیر پکا مرہم لگے گا؟؟

شخص۔ حضور کی جے ہو۔ غریب آدمی کے پاس تمہارے لائک دینے کو کیا ہے۔ ہاں، کچھ تھوڑی گھٹی فیس لایا ہوں۔

ڈاکٹر صاحب۔ خیر ہم غریبوں کے ساتھ رعایت کرتے ہیں کمپونڈر صاحب کو دو۔ کیا نام؟؟

شخص۔ جی اسے "منگو" کہویں ہیں۔ غریب نے بڑا دکھ جھیلا ہے اب تو حضور ہی اس کے مائی باپ ہیں۔ (ایک جنٹلمین کتے کو بغل میں اٹھائے داخل ہوتے ہیں۔)

جنٹلمین۔ گڈ مارننگ، ڈاکٹر صاحب۔

ڈاکٹر صاحب۔ وعلیکم۔ ار۔ گڈ مارننگ، گڈ مارننگ۔

نتھو خاں۔ (دوا لیتے ہوئے) اجی وہ کیا نام اس کا، یہ دوا...

جنٹلمین۔ ڈاکٹر صاحب۔ ذرا ہمارے کتے کو دیکھیے گا۔ ہر وقت سست پڑا رہتا ہے۔ بالکل کچھ نہیں کھاتا۔ کل دو ایک دفعہ قے ہوئی، اور ....

نتھو خاں۔ اجی وہ یہ دوا.......

ڈاکٹر صاحب۔ دیکھیں (کتے کا معائنہ کرتے ہیں۔ اس کی دم کٹی ہوئی ہے۔ اوہو (کتا کچھ غراتا ہے)

جنٹلمین۔ جیک۔ جیک (چمکارتا ہے)

ڈاکٹر صاحب۔ اب دیکھیے۔ آپ لوگ بھی تو غضب کرتے ہیں ..... ڈاکٹر کیا خاک آپ تو پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہیں سب جانتے ہیں کہ ان جانوروں کی نبض دم پر ہوتی ہے۔ اب آپ نے اس غریب کی دم کاٹ ڈالی میں کس طرح مرض کی تشخیص کر سکتا ہوں۔

جنٹلمین۔ جناب.....

نتھو خاں (ڈاکٹر کا ہاتھ ہلاتے ہوئے) کیا نام اس کا یہ دوا۔

ڈاکٹر صاحب۔ ہاں ہاں۔ دو دو گھنٹے بعد۔ تو کچھ اور حال تو ہے معلوم ہوتا ہے کچھ پیٹ کی خرابی ہے۔

نتھو خاں۔ کھانے کو کیا۔ اجی وہ۔ کھانے کو کیا کھاؤں (نورا دہی لیے داخل ہوتا ہے)

ڈاکٹر صاحب۔ کل دوپہر تک کچھ نہیں کھانا۔ خوب دست ہونگے ۲ بجے کھچڑی۔ ابے نورا کمپونڈر صاحب کی میز پر رکھیو رائتہ۔ سمجھا۔

نتھو خاں۔ اجی وہ کیا نام اس کا، کھانے کو بھی کھچڑی؟؟ اور وہ آلہ۔ اس کے کھلانے سے فائدہ ہوگا؟

ڈاکٹر صاحب۔ ہاں، ہاں۔ نورا، خوب مرچیں ڈالیو۔ (نتھو خاں کمپونڈر کو پیسے دے کر گانے لے جاتا ہے)

شخص۔ جی وہ "منگو" کا مرہم!!

جنٹلمین۔ میری رائے میں آپ اسے جلاب دیدیں، اور کوئی طاقت کی دوا۔

ڈاکٹر صاحب۔ ابے بھئی قلندر۔ ایک پونڈ بورک آئنٹمنٹ بنانا کلن کے گدھے کے لیے۔ جناب آپ کے جیک کو کچھ زکام کی شکایت ہو میں ابھی دوا لگا دیتا ہوں۔ جلاب آپ خود دیدیجے گا۔ کل صبح کو۔ (کمپونڈر ایک تھال میں مرہم بناتا ہے اور نورا دوسرے تھال میں رائتہ بنانے میں مصروف)

ڈاکٹر۔ (کچھ کی پھریری کتے کی ناک پر لگاتے ہوئے) زکام کو ابھی فائدہ ہو جائیگا۔ (کتا غراہٹ کے ساتھ دو ایک چھینکیں لیتا ہے) یہ دیکھ دیکھا آپ نے۔ میں نے کہا نا آپ سے یہ خاص آزمودہ نسخہ ہے کتے کو کبھی زکام ہو۔ دو سکنڈ میں اچھا کر دوں گا۔ جب میں فوز (فوج) میں تھا تو لاکھوں کتے ٹھیک کر دیے۔ لاکھوں کتے۔ قہ قہ قہ!!

جنٹلمین۔ تھینک یو، تھینک یو۔ وہ جلاب کی دوا ابھی تو دیجئے گا مجھے ذرا جلدی ہے (ایک شخص داخل ہوتا ہے)

ڈاکٹر صاحب۔ کہیے جاگیر دار صاحب کے مزاج کیسے ہیں تمہاری آنکھ کا کیا حال ہے رام سنگھ؟؟

رام سنگھ۔ اب تو اچھی ہے۔ اور وہ جاگیر دار صاحب نے کہلا بھیجا ہے۔ کہا ہے کہ بھینس بیاہنے والی ہے آپ کو تکلیف کرنی ...

ڈاکٹر صاحب۔ (مغرورانہ انداز سے) بھائی مجھے کہاں فرصت
تم لوگوں کی مہربانی سے اب اتنے مریض آنے لگے ہیں کہ بات کرنے کی فرصت
نہیں ہوتی۔ ہاں کمپونڈر کو بھیج دوں گا۔

جنٹلمین۔ جلاب کی دوا!!!

رام سنگھ (رازدارانہ لہجے میں) اجی آپ کی بات اور ہے کہاں
آپ اور کہاں کمپونڈر!! آپ ہی تکلیف کریں۔

نورا۔ تیار ہو گیا جی وہ!.....

ڈاکٹر صاحب۔ اچھا ٹھیک۔ بھائی رام سنگھ! جاگیردار صاحب
کو ہاتھ جوڑ کر میرا سلام کہنا۔ اور کہنا بڑی تھوڑی ہے اس حاضر نہ ہو سکا تو اطمینان
رکھو بہت ہوشیار آدمی ہے۔ میرے ساتھ فوج میں تھا۔ لاکھوں بھینسوں کو چیر پھاڑ
قہ قہ قہ۔ لاکھوں بھینسیں قلندر دو مرتبہ بنا یا بس تو تم جاگیردار صاحب کے
ہاں جاؤ۔ اور دیکھنا ہوشیاری سے کام کرنا۔ آپ کو ایک ٹن میگنیشیا دیتے
جانا۔ رام سنگھ۔ جناب کی فیس تو جانتے ہی ہوا ہاں دو انیں۔ جی
رام سنگھ۔ اجی فیس کی آپ نے بھلی فکر کی۔ قہ قہ قہ!!

ڈاکٹر۔ قہ قہ قہ۔

(قلندر بخش جنٹلمین کو میگنیشیا کی پڑیا دیکر پیسے لیتا ہے رام سنگھ
سلام کہہ کر جاتا ہے۔ قلندر اس کے پیچھے پیچھے جاتا ہے)

ڈاکٹر۔ (رازداری سے) قلندر فیس لے لینا۔

جنٹلمین۔ ہاں جناب تو.....

ڈاکٹر صاحب۔ ہاں جناب تو بس کل صبح گرم پانی کے ساتھ یہ
دیدیجئے گا۔ دوپہر تک پیٹ صاف ہو جائے گا۔ کھانے کو ہلکی غذا۔ شوربا چپاتی
کھچڑی وغیرہ۔

جنٹلمین۔ ٹھیک ہو۔ گدھا ہی رہ گئے کو گود میں اٹھا کر لیجاتا ہے)

شخص۔ جی وہ "منشو" کا کام!!

ڈاکٹر صاحب۔ ہاں ابھی۔ لنٹ کہاں ہے (بکس میں سے نکال
کر) لا ہو بھی نورا۔ اسے یہاں رکھدے۔ میں ابھی پلستر بناتا ہوں (نورا راہتہ
کا تھال ڈاکٹر صاحب کے سامنے رکھتا ہے) کلمن سے کہہ دیجیو کتنی محنت اور
تجربے سے مرہم بنا ہے اور اس نے پیسے تھوڑے دیئے۔ (لنٹ پر راہتہ پر لگاتے
ہوئے) باقی پیسے کل لیتا آئیں۔

شخص۔ پیسوں کی کیا کمی۔ حضور اسے اچھا کر دیں تو.....

ڈاکٹر۔ اچھا کیسے نہیں ہو گا (لنٹ پر سارا راہتہ مل دیتا ہے)
لے اب پکڑ گدھے کو۔ (ڈاکٹر گدھے کے دونوں پہلوؤں پر راہتہ کا پلستر
لگاتا ہے۔ مرچوں کی تیزی کے سبب گدھا چیختا ہے۔ دولتیاں جھاڑتا ہے۔ کاٹنے
کی کوشش کرتا ہے۔ بالآخر رسی کو تڑا کر چیختا ہوا بھاگ جاتا ہے۔)

ڈاکٹر صاحب۔ قہ قہ قہ۔ دیکھا کیسی تیز دوا تھی۔ فوراً آرام ہو گا بیسیوں
گدھے ٹھیک کر دیے۔ نورا میں۔ (گدھے کا مالک سلام کر کے جاتا ہے) ۔ نورا۔ لا بھی
کھانا لا۔ (دوڑ کر نورا اندر جاتا ہے ڈاکٹر صاحب میز پر طبلہ بجاتے ہوئے گاتے ہیں۔
"ان یہ شاہیوں کا تھا۔ ی ی ی گلہ نہیں۔ ں ں ان سے.....)

نورا۔ (اندر سے داخل ہوتا ہے) بہو جی نے تیار ہی رکھ چھوڑا تھا۔

ڈاکٹر صاحب۔ شاباش۔ اب وہ لا (خوشی کے مارے باچھیں
کھلی پڑ رہی ہیں۔ نورا۔ مرہم والا تھال آگے رکھتا ہے) مرچیں نہیں ڈالیں اس میں

نورا۔ جی خوب ڈالیں تھیں۔ پر۔ وہ تو۔!!

ڈاکٹر صاحب (بسم اللہ کہہ کر کھانے پر تلتے ہیں۔ پہلے ہی لقمہ پر
بلبلا کر لیکر اٹھتے ہیں) ابے یہ کیا۔ آخ۔ آخ۔ آں تھو ابے یہ وہی ہے؟؟؟

نورا۔ جی وہ۔ وہی تو آپ نے۔ آپ نے گدھے کے لگا دیا۔

ڈاکٹر صاحب۔ (مرہم کو دیکھ کر اور سونگھ کر) ارے ہات۔ تیری
بدمعاش کی ایسی تیسی۔ تو نے کہا کیوں نہیں ہم سے (مرہم کا تھال اٹھا کر نورا
کی طرف دوڑتے ہیں۔ نورا بھاگنا چاہتا ہے لیکن ایک قدم اٹھاتے ہی چیخ
کے ساتھ پاؤں پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے)

ڈاکٹر صاحب۔ (حواس ہو کر) کیا ہوا؟

نورا۔ جی شیشہ۔ کانچ!! ہائے۔ ہائے رے۔ ہائے میں مرا۔

ڈاکٹر صاحب۔ (جھک کر نورا کے پاؤں میں سے شیشہ نکالتے
ہیں) ارے یہ کیا۔ یہ تھرمامیٹر!!

(چیخوں کی آواز سن کر بیوی جی اندر سے آتی ہے)

ڈاکٹر صاحب۔ (جھنجھلا کر) بدمعاش میرا تھرمامیٹر!! (مرہم کا تھال
نورا کی طرف پھینکتا ہے جو بیوی جی کے سر پر لگتا ہے۔ بیوی جی "ہائے اللہ"
کہہ کر اندر دوڑتی ہے)

ڈاکٹر صاحب۔ (میز پر سر پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے) ہائے رے
میرا راہتہ۔ میرا راہتہ!! ہائے میرا تھرمامیٹر!!

(پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے)

(انصار ناصری بی۔ اے دہلوی)

نوٹ: خریداران رسالہ "مشہور" سے التماس ہے کہ خط و کتابت کے
وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔ "مینجر"



اگر قدم نہ محبت کا درمیاں ہوتا
تو یہ زمین ہی ہوتی نہ آسماں ہوتا

صراحیوں کی ہر اک بوند اشک بنجاتی
جوانیوں کا ہر اک عشوہ رائگاں ہوتا

نہ یہ خرام نسیم بہار کو ملتا
نہ یہ نظام ستاروں کے درمیاں ہوتا

نہ عقل، عشق و جوانی کے بھید پا سکتی
نہ علم لالہ رخوں کا مزاج داں ہوتا

بلند و پست کی نبضیں چھٹی چھٹی ہوتیں
حیات و موت کا چہرہ دھواں دھواں ہوتا

(جوش ملیح آبادی)

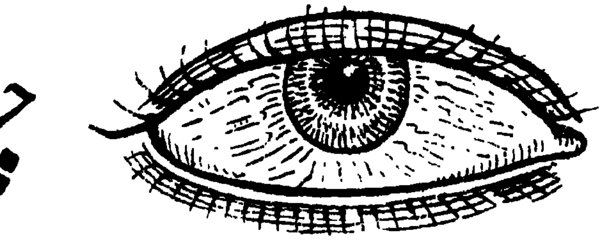
بقیہ صـ ۲۹

پرہیز:۔ دھوپ اور سرد ہوا میں نہ پھریں۔ کوئی ایسا کام نہ کریں جس سے آنکھوں پر زور پڑے۔ گرم، ترش اور تیل کی چیزوں سے پرہیز کریں۔

غذا ہلکی زود ہضم اور معتدل المزاج نوش فرما قبض ہو تو حب مسکین نواز ایک عدد رات کو سوتے وقت کھائیں۔

(حکیم محمد تقی)

آشوبِ



چشم

آنکھ کیا ہے؟

چشم یعنی آنکھ کو قوت بصارت (بینائی) کا ذریعہ یعنی کائنات عالم کے مشاہدے کا ایک سبب قرار دیجیے۔ خداوند عالم کی اتنی بڑی نعمت ہے کہ اس کے بغیر عالم ہیچ ہے۔ اعضائے شریفہ میں سے ایک عضو مرکب ہے۔ کسی شاعر نے خوب کہا ہے ؎

یہ نہیں تو کچھ نہیں اندھیر ہے سارا جہاں
دیکھیے تو سارے عالم کی بہار آنکھوں سے ہے

آنکھ کی تشریح

سات پردے، سات سطحیں، تین رطوبتیں اور دو ندیاں ہر ایک آنکھ میں ہوتی ہیں۔ شریانیں اور وریدیں ان کے علاوہ ہیں۔ وہ سخت اور مضبوط پردہ جو رنگ سفید باہر کے رخ دکھائی دیتا ہے طبقہ ملتحمہ کہلاتا ہے۔ محدب سطح کا شیشے کی مانند شفاف پردہ جو طبقہ ملتحمہ سے اوپر کے رخ ملا ہوا ہوتا ہے، اسے طبقہ قرنیہ کہتے ہیں۔ اور وہ گول گول سوراخ دار پردہ (یعنی پتلی جس میں الاسٹک ہوتی ہے یعنی سکڑتا اور پھیلتا ہے) اس کا نام طبقہ عنبیہ ہے۔ آنکھ کے پچھلے حصے میں ایک کالا سا سوراخ دار پردہ اور ہوتا ہے اس کو طبقہ مشیمہ کہتے ہیں۔ اشیائے عالم کا عکس جس پردہ پر پڑ کر ہمیں نظر آتا ہے وہ پردہ طبقہ شبکیہ کے نام سے موسوم ہے۔ اور چھٹا پردہ وہ ہے جو باریک باریک رگوں کا ایک جال سا ہے۔ اسے طبقہ عنکبوتیہ کہتے ہیں۔ ساتواں وہ سوراخ دار و مضبوط پردہ ہے جو نازک ریشوں سے بنا ہے۔ اس کا نام طبقہ صلبیہ ہے۔

رطوبتیں تین ہیں۔ زجاجیہ، بیضیہ، جلیدیہ۔ عربی زبان میں زجاج کانچ کو، بیضہ انڈے کو، جلد کھال کو کہتے ہیں۔ علی الترتیب اوّل رطوبت کانچ کی مانند شفاف ہوتی ہے، دوم انڈے کی سفیدی کی طرح، سوم مثل کھال کے سخت اور ایک نازک جھلی میں ملفوف ہوتی ہے۔

علامت مرض

کبھی گرمی کبھی سردی کی وجہ سے طبقہ ملتحمہ ورم کر آتا ہے۔ اگر یہ مرض گرمی سے ہوتا ہے تو سرخی اور خشکی زیادہ ہوتی ہے کنپٹی کی رگیں ابھر آتی ہیں۔ رطوبت کثرت سے بہتی ہے۔ سردی کی وجہ سے ہوتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے آنکھ میں کنکر بھرے ہوئے ہیں۔ اور چیپڑ خاص طور پر سو کر اٹھنے کے بعد زیادہ ہوتے ہیں لیکن رطوبت اور سرخی کم ہوتی ہے۔ روشنی کی برداشت نہیں ہوتی۔

علاج

سب سے پہلے آپ پوست کو کنارے سے کوٹ کر اور آب نیم گرم مصفّیٰ سے آنکھ کو دھوئیں۔ پھر مریض کو جہاں روشنی کم ہو اس مقام پر آرام سے لٹا دیں۔

اس کے بعد بکری کے دودھ میں کپڑا تر کر کے سر پر رکھیں اور حسب ذیل لیپ آنکھوں کے پپوٹوں پر کریں۔ رسوت، پھٹکری، ہلیلہ سیاہ، گل ارمنی، صندل سرخ ہر ایک تین ماشے، افیون ۶ سرخ، زعفران ۶ سرخ۔ دواؤں کو پانی میں پیس لیں۔ نیز شیرہ مکھی کوار کا ایک قطرہ آنکھ کے اندر ٹپکانے سے ڈھلکہ، سرخی اور حرارت چشم دور ہوتی ہے

نیز ملیٹھی دو ماشہ پیس کر روئی اس میں آلودہ کر کے آنکھوں کی پلکوں پر پھیریں۔ سرخی چشم دور ہوگی۔

اگر آشوب چشم نزلہ اور برودت کی وجہ سے لاحق ہو تو:

ترپھلہ نو ماشے رات کو پانی میں بھگو کر صبح کو اس کے زلال سے آنکھوں کو دھوئیں اور پٹھانی لودھ ۶ ماشے، پھٹکری بریاں ۲ ماشے، پوست ہلیلہ زرد ۶ ماشے، افیون ۱۰ ماشے پیس کر نرم ململ کے کپڑے میں پوٹلیاں بنا کر آنکھوں پر پھیریں۔

اور پارہ گجراتی ۳ ماشے، پھٹکری بریاں ۲ ماشے، افیون ایک ماشہ، روغن گاؤ ۱۰ تولے گرم کر کے سب دوائیں اس میں ملا کر بیرون چشم ضماد کریں۔

(بقیہ مضمون ص ۲۸ پر)

جدید جنگ اور کبوتر!

دُنیا میں کبوتر نے زمانہ قدیم سے عاشقوں کی نامہ بری کے فرائض انجام دیے ہیں۔ اب اس کی جگہ ڈاکیے نے اور تار برقی نے اور ٹیلی فون نے لے لی ہے۔ لیکن جب یہ چیزیں عالم وجود میں نہ آئی تھیں تو نامہ بر کی حیثیت میں کبوتر کی اہمیت بہت زیادہ تھی اور مشرقی شاعری کا ایک بڑا حصہ بھی کبوتر کی ہستی کا مرہون منت تھا۔ کبوتر عاشق کا خاص نامہ بر تھا، اس لیے معشوق کا یہ فرض سمجھا جاتا تھا کہ وہ اس نامہ بر کو اپنی خلوت گہِ ناز تک پہنچنے ہی نہ دے۔ مثلاً یہ شعر ملاحظہ فرمایئے ؂

خط کبوتر کس طرح لیجائے بامِ یار پر
پر کترنے کو لگی ہیں قینچیاں دیوار پر

اسی طرح کے سینکڑوں اور ہزاروں اشعار آپ کو شعراء کے دیوانوں میں ملیں گے، جن سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حسن و عشق کی دنیا میں کبوتر کا رتبہ کیا تھا۔

اب کہ زمانہ بدل گیا ہے اور دنیا نے ایک جدید زندگی کا لباس پہن لیا ہے، کبوتر کے فرائض بھی بدل گئے ہیں اور عاشقوں کی نامہ بری کرنے کی بجائے اب یہ میدان جنگ میں اہم ترین خبریں ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے ہیں۔ جنگ میں کبوتروں کا استعمال مختلف طریقوں پر اور مختلف مقاصد کے لیے کیا جاتا ہے۔ گذشتہ جنگ عظیم میں کبوتروں نے بہت سی اہم شخصیتوں اور فوجی دستوں کی جان بچائی تھی۔ موجودہ جنگ میں اتحادی اور جرمنی دونوں فریق کبوتروں سے بہت مفید کام لے رہے ہیں۔

جنگ کے جدید سائنس نے اس بات کو تسلیم کر لیا ہے کہ سپاہی اور مشین کی طرح کبوتر بھی اپنی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس لیے اب کسی میدان جنگ میں یا کسی مخصوص محاذ پر صرف فوجیں اور توپیں اور ٹینک اور مشین گنیں اور ہوائی جہاز ہی نہیں جاتے بلکہ ساتھ ساتھ کبوتروں کی ایک بڑی تعداد بھی جاتی ہے۔ یہ تمام کے تمام کبوتر اچھی طرح سکھلائے ہوئے اور سدھائے ہوئے ہوتے ہیں، اور ہر ترقی یافتہ اور جنگ آزما ملک میں کبوتروں کو "تعلیم" دینے کا ایک محکمہ قائم ہے۔ گذشتہ جنگ عظیم میں ایک شخص نے برطانی محکمہ جنگ کو یہ لکھا تھا کہ کبوتروں کو ایسی تعلیم دینی چاہیئے کہ وہ پرواز کر کے جرمن "زیپلینوں" (ہوائی جہازوں) میں سوراخ کر دیا کریں۔

گذشتہ جنگ میں کبوتروں نے جو کارنامے پیش کیے تھے اُنکے افسانے بہت دلچسپ ہیں۔ جب دوسرے سلسلۂ رسل و رسائل ختم ہو گئے تھے تو مختلف جنگی مورچوں میں کبوتر کی "ڈاک" سے کام لیا جاتا تھا۔ دریائے ارگون کے ساحل سے پرے امریکن فوج کا ایک دستہ دشمنوں میں گھر کر لاپتہ ہو گیا تھا۔ ایک کبوتر نے جس کا نام "چیر آمی" تھا ان کی موجودگی کا صحیح پتہ مرکزی مقام تک پہنچا دیا، اور اس طرح وہ دستہ امدادی کمک بھیج کر بچا لیا گیا۔ جنگ کے بعد یہ کبوتر امریکہ پہنچایا گیا اور جب وہاں یہ مر گیا تو اسے بہ حفاظت تمام واشنگٹن کے عجائب خانے میں رکھا گیا۔

کبوتر کا استعمال اس وقت بھی کیا جاتا ہے جب کسی ہوائی جہاز کا وائرلس آلہ خراب یا تباہ ہو جاتا ہے اور کوئی ضروری پیغام مرکز تک بھیجنا ہوتا ہے۔ مشہور جنگ سومے میں فرانسیسیوں نے پانچ ہزار کبوتر خبر رسانی کے لیے استعمال کیے تھے جن میں سے چار ہزار نو سو کبوتروں نے اپنے فرائض صحیح طور پر انجام دئے اور صرف ایک سو واپس نہ آئے۔ گذشتہ جنگ عظیم میں خندقوں سے فوجی ہیڈ کوارٹر تک بھی بہت سے کبوتروں نے اہم ترین خبر رسانی کا کام کیا۔

کبوتر جاسوس کی حیثیت میں

کبوتروں کا سب سے زیادہ دلچسپ استعمال جاسوسوں کے

حیثیت میں کیا جاتا ہے۔ گذشتہ جنگ عظیم میں بھی جرمنی اور اتحادیوں نے اپنے بہت سے کبوتروں سے جاسوسوں کا کام لیا تھا۔ کبوتر کے ذریعے پیام بھیجنا اس لیے آسان ہے کہ یہ بہت بلندی پر اڑتے ہیں۔ راہ میں بہت کم ٹھیرتے ہیں اور ان کو شناخت کرنا بھی ممکن نہیں ہوتا یہی سبب ہے کہ جنگ کے زمانے میں یورپین ممالک کا کوئی باشندہ حکومت کی اجازت کے بغیر کبوتر نہیں پال سکتا۔

کبوتر کو جاسوس کی حیثیت میں اس طرح استعمال نہیں کیا جاتا کہ میدان جنگ کا یا کسی مورچے کا یا دشمن کی موجودگی کا کوئی اہم راز اس کے کانوں میں پھونک دیا جائے۔ بلکہ یہ کیا جاتا ہے کہ ایک چھوٹے سے پرچے پر کوئی خبر لکھ کر اس کے بازو سے باندھ دی جاتی ہے اور وہ پرواز کرتا ہوا سیدھا اپنی منزل مقصود تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ کام ایسے کبوتروں سے لیا جاتا ہے جن کو "ہومنگ" کبوتر کہتے ہیں یعنی جن کی عادت یہ ہوتی ہے کہ اڑتے ہی براہ راست اپنے "گھر" کی طرف جاتے ہیں۔ اس طرح جس مرکزی مقام سے وہ لائے گئے تھے وہاں تک پیام پہنچا دیتے ہیں۔ ایسے کبوتر زیادہ تر دن ہی کو پرواز کرتے ہیں، رات کو بہت دور تک نہیں جا سکتے۔

کبوتروں کا "دستہ"

برطانیہ کے فوجی محکمہ میں ایک حصہ ہے۔ جسے "کبوتروں کا دستہ" کہتے ہیں۔ ان کبوتروں کو میدان جنگ میں حیرت انگیز فرائض انجام دینے کے لیے مکمل تعلیم دی جاتی ہے اور یہ ایسے ایسے کام کرتے ہیں جو مشین یا انسان نہیں کر سکتے۔ ۱۸۷۰ء میں جب پیرس کا محاصرہ ہوا تھا تو باہر کی دنیا سے سلسلۂ رسل و رسائل قائم رکھنے کے لیے صرف کبوتر ہی باقی رہ گئے تھے۔

اب یہ انتظام کر لیا گیا ہے کہ فوج کے ہر دستے کے ساتھ کچھ کبوتر ہوتے ہیں۔ ان کا استعمال محاذ جنگ سے فوجی ہیڈ کوارٹر تک خبر بھیجنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ یہ کبوتر جب محاذ جنگ سے چھوڑے جاتے ہیں تو براہ راست ہیڈ کوارٹر کی طرف پرواز کرتے ہیں۔ اگر وائرلس کے ذریعے پیغامات بھیجے جاتے ہیں تو کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ راہ میں روک لیے جاتے ہیں۔ لیکن اڑتے ہوئے بلند پرواز کبوتر روکے نہیں جا سکتے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ جنگ کرنے والے مختلف دستوں کے درمیان ہمیشہ تار اور ٹیلیفون کے ذریعے پیغامات کا سلسلہ نہیں قائم کیا جا سکتا۔ اس لیے ایسے موقعوں پر کبوتر ہی کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔

خبر رساں اور جاسوس کبوتروں کا استعمال جنگ کے تینوں شعبوں میں یعنے بری فوج، بحری فوج، اور ہوائی بیڑے میں ہوتا ہے اور ہر جنگی طیارے میں اب چند یا کم از کم ایک دو کبوتر ضرور ہوتے ہیں جو وقتِ ضرورت پر پیغام پہنچا دیتے ہیں۔ دشمن کے ملک کی حالت، یا مورچہ بندیوں کے متعلق اطلاعات یا فوجوں کی نقل و حرکت کی خبریں بہ آسانی کبوتروں کے ذریعے بھیجی جا سکتی ہیں۔ اور بعض حالتوں میں ایک بہت ہی چھوٹا سا "فوٹو کیمرہ" بھی کبوتر کے سینے پر باندھ دیا جاتا ہے جس میں حرکت کرنے والا فلم کبوتر کی پرواز کے دوران میں نیچے کے تمام حالات کی تصویریں لیتا ہے۔ ایسی حالت میں یہ کہنا جائز ہوگا کہ جنگ کے موجودہ تین شعبوں یعنے بری، بحری اور ہوائی طاقتوں میں کبوتر نے ایک نئے شعبے کا اضافہ کر دیا ہے۔

(پروفیسر موہن سنگھ امرتسری)

بیمار

"اس گھر کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ ہر چیز آنکھوں میں سے غائب ہو جاتی ہے۔ ابھی رکھی ذرا بھی پلٹ۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ زمین کھا گئی یا آسمان؟ بھلا غضب خدا کا۔ رات کو اپنے ہاتھ سے دودھ کی بھری ہوئی لٹیا رکھی تھی اس کے بینڈے میں ایک پیلو بھی نہیں ہے اور یہ کوئی نئی بات نہیں بلکہ فقیر کی دعا ہے کہ جس روز لٹیا گنجینہ کے باہر رہ گئی۔ اسی دن دودھ غائب۔ سوائے نوکروں کے اور کون ہو سکتا ہے۔ گھر کے آدمیوں کو کیا ضرورت کہ رات کے وقت چوری چھپواں دودھ ڈکوسیں۔ ان کے واسطے اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ کسی چیز کی بندی ہو تو وہ ایسا کریں بھی۔"

بھاتی جان کی اس آندھی بوچھاڑ کو سن کر ماما سے سمائی نہ ہو سکی ہاتھ کا کام کاج چھوڑ کر فوراً کمرے میں آئی اور اس طرح گرجنے لگی گویا مردہ کفن پھاڑ کر بولا "بس بیوی جی بس! زبان سنبھال کر بولو۔ یہ الزام کسی اور کو دینا جو تمہاری ٹیڑھی سیدھی باتیں سہ سکتی ہو۔ ہم نے نوکری کی ہے ہاتھ بیچے ہیں۔ ذات نہیں بیچی۔ لو اور سنو۔ یہ بھی کوئی قرینہ ہے۔ کہ مفت خدا میں ہم کو دباتی ہو۔ سچ کسی نے کہا ہے کہ غریب کی جورو سب کی بھابی لیکن نہ بیوی جی۔ ہم نہیں سن سکتے۔ تم رئیس زادی ہو تو اپنے گھر کے لیے میں غریب ہوں تو اپنے گھر کے لیے۔ تیس دن کولھو کے بیل کی طرح اپنی ھنڈری کو پیلتی ہوں تب کہیں جا کر پانچ روپلی مہینہ اور صبح و شام چار روٹیاں کٹورہ بھر سالن نصیب ہوتا ہے۔ تم کونسے نوے ٹکے پر کھا دیتی ہو جو اتنا اغماز جتاتی ہو۔ بس آج بابو جی آجائیں۔ یہی صاف صاف کہدوں گی کہ مجھ سے تمہاری نگوڑ غلامی نہیں ہوتی۔ کوئی اور انتظام کر لو مجھے نوکریاں بہت۔ تمہیں مامائیں بہت۔ خدا سب کا رزاق ہے۔"

اب بھابی جان کو یہ فکر ہوئی کہ اگر ماما نے نوکری سے جواب دے دیا تو غضب ہو جائیگا ابھی دو دن کے لیے وہ نہیں آئی تھی۔ تو اُنہوں نے ہزاروں نکھوڑے توڑ توڑ تنور کے ٹکڑ چبائے تھے۔ اب اس کو رام کرنا ضروری تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی خیال تھا کہ اپنی بات در رہے اور چھوٹے باپ کی بیٹی بننا نہ پڑے۔ لہذا مصنوعی طور پر اظہار ناراضگی کرتے ہوئے کہا "کیا خوب! ذرا سی بات پر تم کھا تو بہت لگ جاتا ہے لیکن کبھی ٹھنڈے دل سے یہ بھی سوچا۔ کہ آخر دودھ کہاں چلا جاتا ہے کل تمہارے ہی سامنے لٹیا رکھی تھی۔ بتا دُوہ خالی کیوں ہو گئی؟"

ماما نے تڑخ کر جواب دیا "جانے میری جوتی میں اس کی رکھوالی تھوڑی کرتی ہوں جو مجھ سے پوچھا جا رہا ہے۔ پی گئی ہو گی بلی مردار۔ مجھے کیا خبر۔"

"بلّی" بھابی جان نے قطع کلام کرتے ہوئے حیرت سے کہا "خوب۔ مجھے اس گھر میں آئے مہارجب (ماہِ رجب) میں گیارہ مہینے ہو جائیں گے میں نے تو یہاں آجتک بلّی کی شکل بھی نہیں دیکھی یہ دوسری بات ہے کہ وہ ازغیبی گولا بن کر آتی ہو گی جو کسی کو دکھائی نہیں دیتی اور اپنا کام کر جاتی ہے۔"

اس افلاطونی بحث کا سلسلہ ابھی یہیں تک پہنچا تھا کہ چڑیوں کی "چوں چوں" اور بلّی کی "میاؤں میاؤں" سنائی دی۔ بھابی جان اور ماما کی نظریں بیک وقت صحن کی طرف اُٹھ گئیں۔ ایک عجیب نظارہ تھا جس سے بھابی جان محجوب ہو گئیں اور ماما کے چہرے پر مسرت کی لہریں دوڑ رہی تھیں۔ ماما نے ناک پر انگلی رکھ کر طنزاً کہا "اے لو۔ اب بتاؤ کہ یہ بلّی ہے یا ہاتھی کا بچہ؟ تم تو کہتی تھیں کہ بلّی دکھائی نہیں دیتی۔ اب یہ کہاں سے آگئی۔ ذرا اچھی طرح دیکھ لو۔ اسی جانور کو بلّی کہتے ہیں نا" بھابی جان کھسیانی ہنسی ہنس رہی تھیں۔ اور بلّی اپنے

شکار کی تاک میں پنجے جمائے بیٹھی تھی۔ کھسیانی ہنسی کا انجام عموماً غصے کی شکل میں ہوتا ہے۔ چنانچہ بھابی جان کا پارا بھی حد اعتدال سے بڑھ گیا انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ قریب پڑا ہوا ایک بیٹرا اٹھایا اور تان کر بلی پر دے مارا۔ نشانہ چوک گیا اور بجائے بلی کے گھڑونچی پر رکھی ہوئی مراحی کو لگا۔ چونکہ وہ بیٹرا اتنی گھوڑوں کی طاقت سے پھینکا گیا تھا۔ اس سبب مراحی کا ٹوٹ جانا زیادہ تعجب کی بات نہیں ہے۔ لیکن یہ امر کس قدر مضحکہ خیز ہے کہ مراحی کتھے کے پیالے پر گری جس کو گھڑونچی کے نیچے اس غرض سے رکھ دیا گیا تھا کہ ٹھنڈک سے جم جائے گا۔ پانی مل کر کتھے کی چھینٹیں ادھر ادھر الگنی پر پھیلے ہوئے دوپٹے پر افشاں ہو گئیں۔ بلی ڈر کر بھاگی اور جلدی سے غسل خانے کے اندر گھس گئی۔

ایک تو کریلا دوسرے نیم چڑھا۔ غصہ پہلے ہی کیا کم تھا کہ۔

چھوڑ تین چیزوں کے نقصان نے اور بھی آگ لگا دی۔ اور بھابی جان جل بھن کر کوئلہ ہو گئیں۔ آتش انتقام کو سرد کرنے کے لیے اٹھیں اور لپک کر غسل خانے کے کواڑ بند کر دیے۔ پھر دوڑی دوڑی باورچی خانے میں گئیں تاکہ بلی کی خوب دھن کٹی بنانے کے لیے کوئی موٹی سی لکڑی لے آئیں۔ مگر واپسی میں اتفاق سے پھٹے ہوئے ٹاٹ میں ٹانگ الجھی۔ اور قلابازیاں کھاتی ہوئی چاروں شانے چت جا پڑیں۔ دن کے وقت تارے نظر آنے لگے۔ ہاتھ میں سے لکڑی چھٹ کر باورچی خانے میں ماما کی کمر پر لگی۔ وہ جو گھبرا کر اچھلی تو گھی کی قلفی الٹ گئی۔ گھی پگھلا ہوا تھا۔ سب بہہ گیا۔ اس اثنا میں خالہ بی بلی جن کے پکڑنے کی اتنی کوشش کی جا رہی تھی غسل خانے کے روشندان میں سے نکل کر ملحقہ چھت پر چھلانگ مار چکی تھی۔ بھابی جان منہ تکتی رہ گئیں اور بلی تو بلی اس کی مونچھ کا ایک بال بھی ہاتھ نہ آیا۔ اب بھابی جان کو ضد ہو گئی کہ میں بلی کو ضرور ماروں گی ورنہ یونہی نقصان ہوتے رہیں گے فوراً ایک بڑے گھونس دان میں جس کے اندر بلی آسانی سے بند ہو سکتی تھی گوشت کا پارچہ لٹکا کر صحن میں رکھ دیا کہ رات کو بلی اس کی خوشبو پر آئے اور بند ہو جائے۔

دوسرے دن صبح سویرے حمید صاحب اٹھے اور ناشتے کا سامان لینے کے لیے بازار میں چلے گئے۔ انہوں نے صحن میں رکھے ہوئے گھونس دان پر نگاہ بھی نہیں ڈالی۔ کیونکہ عموماً وہ ایسی باتوں میں دلچسپی نہیں لیتے۔ کچھ دیر بعد بھابی جان بھی اٹھیں اسٹوو (STOVE) روشن کیا اور چائے کے لیے کیتلی میں پانی میں رکھ دیا۔ یکایک انہیں چوہے دانی کا خیال آیا۔ انہیں کامل یقین تھا کہ بلی ضرور بند ہو گئی ہو گی اور اسی امید میں باہر آئیں۔ لیکن توقعات کی پامالی ہوئی۔ اصل بات یہ تھی کہ بلی کے مقررہ وقت پر آنے سے پہلے ایک موٹے چوہے نے اندر گھس کر گھونس دان کا دروازہ بند کر دیا تھا اور ایک کونے میں سہما ہوا بیٹھا تھا کیونکہ خالہ بلی اپنے پنجے کی مدد سے گوشت کا پارچہ نکال کر تو ہڑپ کر ہی چکی تھیں اور اب اسے پکڑنے کی کوشش میں تھیں۔ وہ سلاخوں میں سے اپنا پنجہ اندر ڈالتی۔ لیکن چوہا پھدک کر دوسری طرف چلا جاتا۔ آخر "میاؤں" کہہ کر نئی ترکیب لڑائی۔ پھر کیا تھا۔ بھابی جان کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ لکڑی لے کر اسے مارنے کے لیے لپکیں۔ عجیب تماشہ تھا۔ آگے آگے بلی اور پیچھے پیچھے بھابی جان۔ تمام گھر میں "آل انڈیا ریس ٹورنامنٹ" کا مزا آ رہا تھا۔ لیکن بلی کسی طرح ہاتھ نہ آتی تھی کبھی کمرے میں کبھی باہر کبھی اوپر کبھی نیچے۔ اسی دوڑ دھوپ میں تین چار چینی کے پیالے، رکابیاں۔ شیشے کے گلدان، عطردان وغیرہ ٹوٹ گئے۔ تیل کے کنستر نے سنگار میز سے لڑھک کر تمام چاندنی کو چکنا کر دیا۔ بچی جاگ اٹھی اور بسور بسور کر رونے لگی۔ آخر بلی نے باہر کے دروازے کا رخ کیا۔ بھابی جان تعاقب میں تھیں۔ عین اس وقت حمید صاحب کچھ انڈے حلوا کچوریاں وغیرہ لے کر اندر داخل ہو رہے تھے دونوں کی زور سے ٹکر ہوئی اور قلابازیاں کھاتے ہوئے دھڑام سے زمین پر آ رہے۔ گھر کے سب چھوٹے بڑے مدد کے لیے بھاگے۔ صحن میں کیلے کا چھلکا پڑا ہوا بھابی جان کی نند صاحبہ کا اس پر پاؤں پڑا اور پھسل گیا۔ وہ بھی لڑھکتی ہوئی ان ہی دونوں میں جا ملیں۔ بچوں نے جب یہ روح فرسا منظر دیکھا تو چلا چلا کر رونا شروع کر دیا۔ محلہ کی عورتوں نے بھی اس شور و غل کی

آواز سنی اور اپنی اپنی چھتوں پر چڑھ کر جھانکنے لگیں کہ آخر صبح ہی صبح یہ کیا قیامت برپا ہو رہی ہے کسی نے اظہار تاسف کیا اور کسی نے قہقہہ لگا کر زخموں پر اور بھی نمک چھڑک دیا۔

حمید صاحب کپڑے جھاڑتے ہوئے اُٹھے اور بھابی جان کو قہر آلود نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کمرے میں چلے گئے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ بھڑوں کا چھتہ ہے زبان ہلاتے ہی غضب ہو جائے گا۔ اس لیے خاموشی اختیار کرنی بہتر تھی۔ لیکن سلطانہ (بھابی جان کی نند) سے کیوں کر سہانی ہوتی۔ بجلی کی مانند کڑکیں اور بادل کی طرح برس پڑیں۔ "توبہ ایسی بھی کوئی ڈھیٹ عورت ہو۔ ہزار مرتبہ کہا۔ لاکھ مرتبہ سمجھایا۔ کہ دلہن یہ بچپن چھوڑ دو۔ زمانہ نام دھرے گا کہ عمو کے خاندان کی بہو کیسی بڑ دنگی ہے۔ لیکن ان کے کان پر جوں نہ چلی اب جو بلی مارنے کی سوجھی ہے تو بلی مار کر رہیں گی۔ خواہ زمانہ ادھر سے ادھر ہو جائے لیکن اپنی ہٹ دھرمی سے باز نہیں آئیں گی۔ ان کے کارن آج سویرے سویرے بھائی کے بھی چوٹ لگ گئی۔ اور وہ بھی کم بخت سر ہی کی چوٹ۔"

"چوٹ لگ گئی تو ہماری بیزار سے" بھابی جان نے جل کر کہا "ہم نے تھوڑی کہا تھا کہ خدا کے لیے ہمیں اٹھا دو۔ ہم مرتے ہیں۔ تم کیوں اندھے بگلوں کی طرح جو گر پڑیں۔ قصور تمہارا ہے۔ کیوں کہ خود تمہاری جوتی میرے منہ پر آلگی۔ اور ... ..

"کیا خوب!" سلطانہ نے قطع کلام کیا "گدھے کی آنکھوں میں نون دیا اس نے کہا۔ کہ میری آنکھیں پھوڑ دیں۔ خیر بی خیر۔ قصور ہوا۔ معاف کرو۔ اب جو کچھ ہوا سو ہوا آئندہ کو کان پکڑا۔ کہ پھر ایسی خطا نہیں ہوگی۔ اگر ایک لفظ بھی زبان سے نکالیں تو جو چور کا حال سو ہمارا حال۔ کیوں کہ ہمیں معلوم ہو گیا۔ کہ آج کل کے زمانے میں نیکی کا بدلہ بدی ہے۔"

اسی روز شام کو میں حمید صاحب کے ساتھ صحن میں بیٹھا گفتگو کر رہا تھا۔ سلطانہ سوجھی اپھری منہ تھتائے ایک کونے میں اٹھوائی کھٹوائی لیے پڑی تھیں۔ اور بھابی جان دھویا دیدہ صاف رسالہ پڑھنے میں مشغول تھیں۔

گویا چکنا گھڑا تھا کہ بوند پڑی اور پھسل گئی۔ میں نے چپکے سے کہا "بھابی جان ذرا کمرے میں دیکھنا۔ وہ کون ہے"۔ اُنہوں نے اچک کر اندر کی طرف دیکھا۔ خالہ بلی نہایت متانت سے بیٹھی اپنے شکار کا انتظار کر رہی تھیں۔

وہ مسکرائیں لیکن اس سے پہلے کہ اُٹھ کر بلی کو پکڑیں حمید صاحب نے ڈپٹ کر کہا۔ "بس! کہاں چلیں؟ ابھی صبح کو اتنی جھک جھک ہو چکی ہو لیکن اپنی ضد سے باز نہیں آتی ہو" مگر جناب بھابی جان پھر بھابی جان تھیں۔ اُنہوں نے ایک کان سے سنا دوسرے سے اڑا دیا اور بس ایک ہاتھ میں موٹی سی بید اور دوسرے میں رضائی لے کر دبے پاؤں اندر گئیں۔ بلی اس قدر محو تھی کہ اسے بالکل خبر نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ بھابی جان نے جلدی سے رضائی اس پر ڈال دی۔ اور دھنا دھن لکڑی سے مارنا شروع کر دیا۔ بلی کی شرافت دیکھئے کہ اس نے چوں بھی نہ کی۔ اور مار کھائے گئی۔ جب بھابی جان کا سانس پھول گیا۔ تب کہیں اپنا ہاتھ روکا۔ انہیں یقین تھا کہ بلی کبھی کی مر چکی ہے تاہم رضائی کو ہٹاتے ہوئے ڈر لگتا تھا کہ کہیں وہ زندہ ہو اور پلٹ کر کاٹ لے۔ کچھ دیر کھڑی سوچتی رہیں۔ لیکن جب بلی نے جنبش نہیں کی تو لکڑی کے سرے سے رضائی کو پلٹا اور ڈرتے ڈرتے نگاہ ڈالی۔

"ادئی یہ کیا؟" بھابی جان نے تعجب سے کہا۔ اور مری ہوئی بلی کو ایک ہاتھ میں اٹھا کر باہر نکل آئیں۔ اس کا پیٹ پھٹ چکا تھا اور اندر بھرا ہوا گودڑ اور گھاس پھونس باہر نکل آیا تھا۔

حمید صاحب نے کہا "ایں! یہ بلی کیسی؟" اچھا اچھا میں سمجھ گیا کہ یہ کپڑے کی بنی ہوئی مصنوعی بلی تھی۔ بھئی واللہ کمال ہے"۔ ہنستے ہنستے انکے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ بھابی جان نے قہر آلود نگاہ سے میری طرف دیکھا کیوں کہ وہ اپنے قیافہ سے یہ معلوم کر چکی تھیں کہ یہ کارستانی سوائے میرے اور کسی کی نہیں ہو سکتی۔ میں نے مسکرا کر کہا "بھابی جان! بس تمہاری قسم پوری ہو گئی۔ تم نے اپنی دانست میں بلی کو مار دیا۔ اب اسکی قسمت وہ مرے یا نہ مرے جس طرح حضرت ابراہیم ؑ کی چھری کے نیچے جنت سے دنبہ آگیا تھا۔ اسیطرح تمہاری لکڑی کے سامنے بجائے اصلی کے مصنوعی بلی آگئی۔ بھابی جان کی نند صاحبہ بھی انتہائی ضبط کے باوجود مسکرائے بغیر نہ رہ سکیں۔ (فضل حق قریشی، دہلوی)

جذباتِ فراق

بیخودی میں اک خلش سی بھی نہ ہو ایسا نہیں
تو نہ آئے یاد لیکن یہ تجھے بھولا نہیں

ہوش و غفلت، رنج و راحت، وصل و فرقت کچھ نہیں
کون کہتا ہے کہ رہنے کی جگہ دنیا نہیں

عشق ہے غافل وہ رنگارنگ کیفیت نہ ڈھونڈھ
درد کا اٹھنا نہ بیچ و ناز کا اٹھنا نہیں

ایسی بھی کیا احتیاطیں اے نگاہِ شوخِ یار
نہ کہ ندا مسکرانا تیرے بس میں کیا نہیں

دل ہو یا آنکھیں ہوں کیفِ غم ہو یا کیفِ نشاط
کون پیمانہ تھا جو اس بزم میں چھلکا نہیں

حسن کی بیگانگی پر غم کی گو یا حد نہیں
نہیں لیکن سوچئے تو عشق خود اپنا نہیں

کیا خبر ہم کو وہ چشمِ آشنا کیوں پھر گئی
بیخودی غم کی حریفِ رنجشِ بے جا نہیں

آج تو حسن و محبت ہو گئے تھے مل کے ایک
تو نے وہ عالم نگاہِ ناز کا دیکھا نہیں

اک جہاں لاکھوں فسانے عشق تصویرِ سکوت
درمیاں رسوائیاں ہیں رازِ دل افشا نہیں

یوں بھی آتی ہے قیامت اے خرامِ ناز بار
سب کے بھی دنیا محبت کی تہ و بالا نہیں

چل نہیں سکتے یہاں خوش بختیوں کے بھی فریب
عشق کی ناکامی تقدیر کا رونا نہیں

ہیں فریبِ احساسِ پنہاں کے سکونِ اضطراب
عشق ہے وہ درد جو گھٹتا نہیں بڑھتا نہیں

اک اداسی ہے نگاہِ ناز پر چھائی ہوئی
یہ پیامِ زندگی شاید کوئی سنتا نہیں

حسن سرتاپا تمنا عشق سرتاپا غرور
اس کا اندازہ نیاز و ناز سے ہوتا نہیں

اے نگاہِ بے محابا تو نے تو یہ کیا کر دیا
آج دل کو دیکھ کر میں نے بھی پہچانا نہیں

اہلِ غم تم کو مبارک یہ فنا آمادگی
لیکن ایثارِ محبت جان دے دینا نہیں

ہاں اٹھا آنکھیں کہ جو کچھ پردہ داری عشق کی
اتنی رسوائے جہاں یہ نرگسِ رسوا نہیں

زندگیٔ عشق میں بھی انقلاب آ ہی گیا
آج اس کو دیکھ کر دل کا سکوں دیکھا نہیں

لے اڑی تجھ کو نگاہِ شوق کیا جانے کہاں
تیری صورت پر بھی اب تیرا گماں ہوتا نہیں

ایک حالت پر زمانے میں نہ گذری عشق کی
درد کی دنیا بھی اب وہ درد کی دنیا نہیں

دل بھی کہتا ہے ٹھہرنا عشق میں دشوار ہے
میں بھی کہتا ہوں کہ یہ اندازِ غم اچھا نہیں

عشق جو چاہے کہے تیرے نہ سننے کو مگر
دل کو جو کہتا ہے وہ کچھ راز بھی ایسا نہیں

سرحدِ جذب و اثر سے حسنِ جاناں دور ہے
دل کی دنیا بن محبت کی مگر دنیا نہیں

غور کر اس کیفیت پر کچھ سمجھ یہ سوز و ساز
عشق میں دل درد کو ملتا ہے دل دکھتا نہیں

جلوہ دار و رسن آئینۂ رنگِ سکوت
لب کشائی کو حقیقت کا کچھ اندازہ نہیں

جس کے شعلوں سے تھی کل تک گرمیٔ بزمِ حیات
آج اس خاکسترِ دل سے دھواں اٹھتا نہیں

تفرقوں سے پاک ہیں آنسو محبت کے فراق
حسن سرتاپا تغافل دوست و دشمن کا نہیں

پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری

افسانہ

سود در سود

(۱)

آج سے ایک چوتھائی صدی بیشتر ایک کمسن لڑکا جسے سب گنگو کہہ کر پکارتے تھے۔ سبزی منڈی کے دروازے پر ٹاٹ کا ایک ٹکڑا بچھا کر بیٹھتا تھا۔ اور کوڑیوں کی صرّافی کرتا تھا۔ اسے اس الٹ پھیر میں صبح سے شام تک تین چار پیسے ملجاتے تھے۔ ایک سال کے بعد لوگوں نے دیکھا تو کوڑیوں کی جگہ اس نے بیسوکل کا کام شروع کیا تھا۔ اور خالی وقت میں تختی پر ہندی حساب کی مشق کیا کرتا تھا۔ اس کے بعد اس نے اپنے ایک رشتہ دار بنیے کی دوکان پر سودا بیچنے کی نوکری کر لی اور کم و بیش دو برس اس کام میں مصروف رہا۔ اب اس کی عمر ۱۵، ۱۶ سال کے قریب تھی اور لوگ اسے گنگو کی بجائے گنگا کہتے تھے۔ اس کے پاس غالبؔ کافی سرمایہ فراہم ہو گیا تھا کیوں کہ اس نے کچھ دنوں کے بعد پنساری کی ایک چھوٹی سی دوکان کھول دی۔ گنگا بڑا لسان۔ چرب زبان۔ گاہک کی سائکالوجی سے فوراً واقف ہو جانے والا اور ہوش مند دوکاندار تھا۔ تھوڑے عرصے میں اس کی دوکان چل نکلی۔ ہر وقت گاہکوں کا ہجوم رہنے لگا اور مالی حالت روز بروز ترقی کرنے لگی۔ گنگا نہایت صحیح النسب بنیا تھا۔ اس کے قول و فعل۔ حرکات و سکنات غرض ہر بات میں ایک مکمل بنیے کا کیرکٹر پایا جاتا تھا۔ اس نے اپنی فطرتی مناسبت کی بنا پر چند باتوں میں ایسا ملکہ اختیار کیا تھا کہ بڑے بڑے تجربے کار بنیے اس کا لوہا مانتے تھے۔ مثلاً ڈنڈی پر اسے پوری حکومت حاصل تھی وہ اپنے تمام منصوبے ڈنڈی کے ذریعے سے پورے کرتا تھا۔ ڈنڈی اس کے اہم ترین جذبات انتقام کو تسکین دیتی تھی۔ جب گاہک تیز زبانی دکھاتا تھا تو گنگا بالکل خاموش رہتا تھا لیکن ڈنڈی کے ذریعے ضرب کاری لگاتا تھا۔ ایک دن ایک بگڑے خان صاحب آئے اور کسی بات پر ناخوش ہو کر گنگا کے ایک چانٹا رسید کیا۔ غریب گنگا نے اپنی زبان سے کچھ نہ کہا لیکن خان صاحب کو سیر بھر بادام اس طرح تول کر دئے کہ ڈنڈی جھکتی رہی۔ لیکن پھر بھی بادام ڈیڑھ چھٹانک کم تھے۔ گنگا نے ڈنڈی کے ذریعے سے اپنے گاہکوں کو تسخیر کر لیا تھا۔ جو چیز بازار میں روپے سیر ملتی تھی اسے گنگا گاہک کے اصرار پر چودہ آنے سیر فروخت کرتا تھا۔ اور دو آنے کی کسر ڈنڈی کے ذریعے سے پوری کر لیتا تھا۔ گنگا آٹھوں گانٹھ کمیت تھا وہ ہر چیز دو قسم کی رکھتا تھا۔ ناواقف اور اناڑی گاہکوں سے پورے دام لے کر کم قیمت چیزیں دیتا تھا۔ جب دیکھتا تھا کہ مفر کا پہلو نہیں ہے تو اچھی چیز نکالتا تھا۔ اس کی فطرت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب گاہک کو روپے کے باقیماندہ پیسے دیتا تھا تو چھانٹ چھانٹ کر گھسے ہوئے پیسے اور ریزگاری دیتا تھا لیکن روپے کو اس طرح ٹھونک بجا کر لیتا تھا کہ گویا گاہک گھر سے بنا کر لایا ہے۔ اس کا اصول تھا کہ فرمائش کے ساتھ ہی مال کے لیے گاہک کی طرف ہاتھ بڑھاتا تھا اور ایک سے پیسے لے کر دوسرے کی طرف متوجہ ہو جاتا تھا تاکہ ہر گاہک پھنسا رہے اور تاخیر ہو جائے نیز کوئی اس کے دام بقالی سے باہر نہ جا سکے۔ وہ ادھار بہت کم دیتا تھا اور اگر ایسی ہی مجبوری ہوتی تھی تو دگنی قیمت وصول کر لیتا تھا۔ قرض کے متعلق اس کا حافظہ غیر معمولی قوت رکھتا تھا۔ جہاں کسی گاہک نے اسے روپیہ دیا کہ فوراً اس نے چھ ماہ پہلے کا ایک پیسہ اگر گاہک قرض کر گیا ہے تو اسے یاد دلا دیا۔ گنگا دوکانداری کی اس شدید مصروفیت کے باوجود اپنے گھر کے انتظام سے بھی غافل نہیں رہتا تھا۔ دوکان پر بیٹھے بیٹھے وہ ترکاری خرید لیتا تھا اور حتی المقدور سبزی فروش کو نقد قیمت کی جگہ ہلدی مرچ سے تبادلہ پر رضامند کر لیتا تھا۔ کپڑے کی اسے بہت کم ضرورت پڑتی تھی۔ اس کی ماں چرخہ کاتا کرتی تھی اور یہ چرخہ سارے گھر کے لیے مانچسٹر کے ایک مل کا

حکم رکھتا تھا۔ یہ سوت جو شبانہ روز کی محنت میں تیار ہوتا تھا ایک جولاہے کی معرفت کپڑے میں بدل جاتا تھا اور کپڑا بُننے کی اجرت ہمیشہ نمک مرچ وغیرہ سے ادا ہوتی تھی۔

(۲)

صرف پانچ سال کی دوکانداری نے گنگا کی حالت کچھ سے کچھ کر دی۔ دوکان میں کافی سامان اور ہر قسم کا میل ہونے کے باوجود اس کے پاس ہزار پانچ سو کی رقم ہر وقت موجود رہتی تھی۔ اس رقم کو وہ سود پر چلانے لگا۔ سودی لین دین نے اسے بہت فائدہ پہنچایا۔ وہ جب دیکھ لیتا تھا کہ قرضدار کافی جائداد رکھتا ہے اور بلا شرکت غیرے اس جائداد کا مالک ہے یا جب قرضدار رقم مطلوبہ سے دگنی قیمت کا زیور اس کے پاس لاتا تھا تو وہ قرض دیتا تھا۔ سود کی شرح تقریباً تمام سودخواروں سے زیادہ تھی۔ پھر خوفناک شرطیں بالائے سود تھیں، مثلاً یہ کہ فلاں تاریخ تک روپیہ نہ ملا تو سود شامل اصل ہو کر سود در سود دینا ہوگا۔ ان سختیوں کے باوجود لوگ اس سے قرض لیتے تھے۔ قرض لینے والے زیادہ تر مسلمان تھے۔ مسلمان کیوں قرض لیتے تھے؟ اس لیے نہیں کہ انہیں کسی تجارتی کاروبار میں لگانا تھا اور یہ امید تھی کہ تین روپے سینکڑہ سود میں دے کر تیس روپے سینکڑہ تجارت میں وصول ہو جائے گا۔ وہ اس لیے قرض لیتے تھے کہ کسی کو بچوں کی بسم اللہ اور ختنہ کے لیے قرض کی ضرورت تھی۔ کسی کو بیٹا بیٹی کی شادی میں روپیہ خرچ کرنا تھا۔ کسی کو عیش پرستی کا سلسلہ قائم رکھنے کے لیے بیوی کا زیور خاک میں ملانا تھا۔ الغرض گنگا کو اپنی سخت شرائط کی بنا پر خاطر خواہ فائدہ ہوا۔ بعض اشخاص کا زیور خارج المیعاد ہونے کی وجہ سے اسکے تصرف میں آیا۔ بعض لوگ مر گئے اور چونکہ ان کے وارثوں کے پاس کوئی ثبوت نہ تھا اس لیے ان کے مال پر اس نے قبضہ حاصل کیا۔ بعض لوگوں سے سود در سود وصول کر کے اس نے مکانات اور جائدادیں نیلام کرائیں۔ الغرض دو تین سال کے عرصے میں وہ ہزاروں روپے کا آدمی بن گیا۔ اب گنگا کے لیے پنساری کی دوکان میں کچھ دلچسپی باقی نہیں رہی تھی اس لیے دوکان فروخت کر دی۔ اپنے رہنے کے لیے ایک خوب صورت مکان بنوایا۔ ایک منیب اور ایک کہار ملازم رکھا۔ لین دین کی باقاعدہ کوٹھی قائم کی۔ اب

گنگا گنگا نہ تھا بلکہ لالہ گنگا رام کے معزز نام سے پکارا جاتا تھا۔ وہ ہمیشہ اس تاک میں رہتا تھا کہ کوئی مسلمان رئیس فوت ہو اور اس کے نوعمر وارث ناعاقبت اندیشیوں میں روپیہ صرف کر کے اس کی طرف متوجہ ہوں۔ چنانچہ کئی مسلمان رئیس زادوں کو اس نے قرض دے رکھا تھا اور جس طرح ایک مکڑا تاروں کا جال پھیلائے ہوئے اس تلاش میں خاموش بیٹھا رہتا ہے کہ کوئی مکھی یا چھوٹا کیڑا جال کے قریب آ جائے اور وہ اسے تاروں میں جلد جلد جکڑ کر خون چوس لے اسی طرح لالہ گنگا رام [illegible] کرتے تھے، اور رئیس زادوں کے خون کے پیاسے اپنی گدی پر بیٹھے رہتے تھے۔ آخرکار ان کو اپنے وار میں کامیابی ہوئی۔ ایک رئیس زادہ پر سود در سود کا حساب پھیلا کر انہوں نے پچیس ہزار کا دعویٰ کیا اور رقم مذکور کی معہ خرچہ ڈگری حاصل کی۔ جائداد نیلام پر چڑھی اور پچاس ہزار کی حیثیت لالہ گنگا رام کی مخفی ریشہ دوانیوں اور کوششوں کی بدولت بیس ہزار میں نیلام ہوئی۔ نیلام لالہ گنگا رام کے حق میں ہوا اور عذرداری کی میعاد گزرنے پر جائداد ان کے قبضے میں آ گئی۔ رئیس زادہ مذکور کے چچا پردیس میں برسرکار تھے جب ان کو معلوم ہوا تو بہت متاسف ہوئے اور قدامت پرستی کے جذبات نے انہیں ایسا مجبور کیا کہ انہوں نے اپنی خاندانی جائداد بہ صد مشکل ۴۵ ہزار روپے دیکر لالہ گنگا رام سے واپس لی۔ اتنی بڑی نقد رقم کوٹھی کے کاروبار میں شامل ہو جانے سے لالہ گنگا رام ایک دم لکھپتی بن گئے اب لین دین اور بیاج ادھار سے انہیں جو آمدنی ہوتی تھی اس کی مقدار کسی طرح ایک ہزار روپے ماہوار سے کم نہ تھی۔ انہوں نے نیلام میں ایک گاڑی گھوڑا بھی مول لے لیا۔ انکم ٹیکس کی بدولت حکام سے بھی ملنے لگے اور رفتہ رفتہ میونسپل کمیٹی کے ممبر بھی ہو گئے اور اب شہر میں ان کا کافی اقتدار و اثر تھا اور وہ جستجو میں تھے کہ کسی طرح شہر کے خزانچی یا کم از کم آنریری مجسٹریٹ بنا دیئے جائیں۔

(۳)

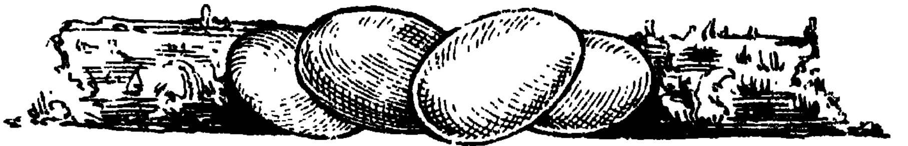
خوش قسمتی سے لالہ گنگا رام کو بیوی بھی ہم رنگ و ہم خیال ملی تھی اور کیوں نہ ملتی۔ جو شخص سودی مادۂ تولید سے پیدا ہو۔ سودی بطن میں نشوونما پائے۔ سودی آغوش میں پرورش ہو اس کو دنیا کے نشیب فراز اور

زبان و فریب کیا واسطہ۔ لالہ گنگا رام کی کوٹھی سے تھوڑے فاصلہ پر ایک نواب صاحب کا عالی شان محل تھا۔ نواب صاحب دو لاکھ کی جائداد بھی رکھتے تھے جس کی آمدنی پندرہ سولہ سو روپے ماہوار سے کم نہ تھی۔ لیکن آمد و خرچ کی بے قاعدگی اور فضول خرچی کی وجہ سے نواب صاحب ہمیشہ مقروض رہتے تھے۔ قرض کے سلسلہ میں نواب صاحب اور لالہ گنگا رام کے تعلقات ہو گئے۔ تعلقات اتنے بڑھے کہ لالہ گنگا رام کے بیوی بچے بھی نواب صاحب کے ہاں جانے لگے۔ نواب صاحب کی سن رسیدہ بیوی نے رکمنی (گنگا رام کی بیوی) کو بیٹی بنا لیا۔ نواب صاحب خوش تھے کہ ان کو ایک ہمدرد دوست مل گیا جو انہیں تقریبوں اور ضرورتوں کے موقع پر بے آبرو نہ ہونے دیگا اور لالہ گنگا رام اس تاک میں تھے کہ کسی طرح نواب صاحب کی جائداد اور عالی شان محل پر قبضہ کریں اس معاملہ میں لالہ گنگا رام کی بیوی نے ان کی بہت مدد کی۔ جب نواب صاحب کے ہاں کوئی تقریب ہوتی تو وہ بیگم صاحبہ کو بڑھاوے دیکر دس کی جگہ پچاس خرچ کراتی اور کہتی کہ روپے کا تو آپ فکر ہی نہ کریں۔ ہم لوگ کس دن کام آئیں گے۔ چنانچہ روپوں کی تھیلیاں وہ اپنے ہمراہ لا کر بیگم صاحبہ کے سامنے ڈال دیتی۔ نواب صاحب اور بیگم صاحبہ لالہ گنگا رام اور انکی بیوی کے حد سے زیادہ شکر گذار اور رہین منت تھے۔ لالہ گنگا رام نے وقتاً فوقتاً نواب صاحب کے دوسرے قرضداروں کا روپیہ بھی ادا کر دیا۔ اس طرح چند سال کے عرصے میں نواب صاحب پر ایک لاکھ پچیس ہزار روپیہ قرض ہو گیا۔ لیکن لالہ گنگا رام نے کچھ اس طرح حساب بنایا اور ابتدائی تاریخوں سے سود در سود کا ایسا جال پھیلایا کہ ایک لاکھ پچیس ہزار کی رقم دو لاکھ تک پہنچ گئی۔ جب مطالبہ اس قدر ہو گیا تو لالہ گنگا رام نے نواب صاحب کے پاس اپنے منیب کو بھیجا جس نے نہایت متانت اور عاجزی کے ساتھ کہا کہ آج کل کوٹھی میں روپے کی سخت ضرورت ہے آپ اپنا حساب بے باق کر دیں نواب صاحب اپنی سادہ لوحی سے سمجھ رہے تھے کہ زیادہ سے زیادہ پچیس تیس ہزار کا مطالبہ ہو گا کیوں کہ بہت سی رقوم لالہ گنگا رام اور ان کی بیوی نے اس طرح دی تھیں کہ گویا قرض نہیں دے رہے ہیں لیکن اپنے بہی کھاتے میں ایک ایک پیسہ درج کر لیا تھا

الغرض بوڑھے نواب نے جب دو لاکھ کا نام سنا تو بجلی سی گر پڑی۔ اسی وقت منیب کے ہمراہ کوٹھی پر گئے لیکن انہیں پہلی نظر میں معلوم ہو گیا کہ گنگا رام اب ان کا نیازمند نہیں ہے بلکہ خونخوار سود خوار قرض خواہ ہے۔ آخرکار نالش دائر ہوئی۔ نواب صاحب نے وہ سب کچھ جو ان کے مشیروں نے بتایا تھا کیا بیگم صاحب نے اپنے مہر کا دعوے کیا۔ لیکن سب کوششیں بیکار ثابت ہوئیں چند سال مقدمہ لڑتا رہا۔ بالآخر ڈگری ہوئی۔ مکان اور جائداد نیلام پر چڑھی نواب صاحب کو بروقت کوئی خریدار نہ ملا۔ ڈیڑھ لاکھ میں مکان اور جائداد سب کچھ خاک میں مل گیا اور لالہ گنگا رام کا مطالبہ باقی رہا۔ نواب صاحب اس صدمۂ بربادی کی تاب نہ لا کر راہی ملک بقا ہوئے۔ بیگم صاحبہ تارک الدنیا ہو کر اپنے ایک بھانجہ کے ہاں جا پڑیں۔ نواب صاحب کا عالی شان محل اور تمام علاقہ لالہ گنگا رام کے قبضے میں آ گیا اب لالہ گنگا رام سیٹھ گنگا رام کے نام سے موسوم کیے جاتے تھے۔ انہوں نے سواریوں میں ایک موٹر کا بھی اضافہ کر لیا تھا۔ کیوں کہ موٹر حکام رسی کا ایک بہترین ذریعہ ہے اور چوں کہ انکے مقدمات آئے دن عدالتوں میں دائر رہتے تھے اس لیے ان کو حکام رسی کی بھی ضرورت تھی۔ اب سیٹھ گنگا رام شہر میں چوٹی کے رئیس تھے۔ بیرونی شعراء ان کی تعریف میں قصیدے لکھتے تھے گشتی تاجران کا پتہ پوچھتے پھرتے تھے ملک کی قومی اور ملکی انجمنوں کے کارکن ان کے پاس چندہ کے لیے پہنچتے تھے یہ سب کچھ تھا لیکن دولت نے سیٹھ صاحب کے کیرکٹر میں کوئی فرق پیدا نہیں کیا وہ پہلے سے اب کچھ زیادہ جز رس تھے۔ ہمیشہ روکھا سوکھا کھاتے اور سستا کپڑا پہنتے۔ جب ان کو کوئی اشتعال دلاتا اور اپنی حیثیت کے مطابق خرچ کرنے کی ترغیب دیتا تو وہ جوش میں آ کر فخریہ کہتے کہ "مہاراج آپنے سمجھا کیا ہے میں بنیے کا بیٹا ہوں" +

ظہور احمد وحشی

انڈے



انڈوں میں وہ تمام اجزا موجود ہیں جو اعضا کے نشو و نما اور زندگی قائم رکھنے کے لیے ضروری ہیں۔ غذا کے ذریعے امراض کے علاج میں بالخصوص ان چند امراض میں جو بچپن اور جوانی میں پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی کیمیاوی ساخت کی ترکیب سے یہ اچھی طرح ثابت ہو چکا ہے کہ اعلیٰ قسم کی خوراک گیوں ہیں۔

اوسط درجے کے پتلے گوشت اور انڈوں کے پرورشی اجزا کا تقابل حسب ذیل ہے

	اوسط درجے کا دبلا گوشت	انڈا
پانی	۷۳٫۰۰	۷۳٫۷
اجزائے لحمیہ	۲۱٫۰۰	۱۳٫۸
چربی	۵٫۵	۱۰٫۵
اجزائے خاکستری	۱٫۰	۱٫۰

انڈے اور گوشت میں پرورشی اجزا تقریباً یکساں ہیں اور انڈے میں اجزائے لحمیہ کم ہونے کے ساتھ ہی چربی زیادہ ہے۔

انڈے کی زردی اور سفیدی کی غذائیت حسب ذیل ہے

	زردی	سفیدی
پانی	۵۰٫۹	۸۵٫۷
اجزائے لحمیہ	۱۶٫۲	۱۲٫۶
چربی	۳۱٫۷۵	۶٫۲۵
اجزائے خاکستری	۱٫۰۹	۰٫۵۹

انڈے کی سفیدی پھینٹ لیے جانے پر وہ زود ہضم ہو جاتا ہے نقشہ مذکورہ بالا سے واضح ہوتا ہے کہ انڈے کی زردی میں پرورشی اجزا بہت زیادہ ہیں اور اس کے اجزائے خاکستری میں بھی بہ نسبت سفیدی کے چند ضروری معدنی اجزا زیادتی کے ساتھ شامل ہیں۔ مثلاً فاسفورک ایسڈ، چونہ اور فولاد وغیرہ۔ فاسفورس اور فولاد کی تقریباً پوری مقدار اس میں عنصری مرکب کی شکل میں موجود ہیں۔ جب معدنی اجزا عنصری جوہر کی صورت میں ہوتے ہیں تو وہ غذا کو بآسانی اور زود ہضم بنا دیتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انڈے کی زردی خونی مریضوں نیز ان مریضوں کے لیے بے حد مفید ہے جن کی جسمانی پرورش ناقص رہتی ہے اور فاسفورس، چونہ اور فولاد کی موجودگی کی وجہ سے یہ کلوروسس، انیمیا (کمی خون) اور رکٹس تنقیص عظام کے مریضوں کے لیے مفید ہے۔

انڈوں میں مکھن کی چربی بھی موجود ہوتی ہے۔ مگر چونکہ انڈے کا قوام محلل ہے اس لیے بہ آسانی سے ہضم ہو جاتا ہے۔ انڈے کی بناوٹ میں جو کیمیاوی اجزا ہیں ان کو مدنظر رکھتے ہوئے ضروری ہے کہ اس کو شکر و نشاستے والی اشیا کے ساتھ استعمال کیا جائے۔ انڈے کو دودھ میں پھینٹ کر اور اس میں چاول، نشاستہ اراروٹ یا میدا ملا کر اس کا حلوا تیار کرنا بہترین غذا ہے۔ ایک انڈے کی پرورشی طاقت دودھ کے نصف گلاس یا ۱/۲ ۱ اونس یعنی پون چھٹانک گوشت کی برابر ہوتی ہے تجربے سے یہ بھی ثابت ہوا ہے کہ کچا انڈا بہ نسبت جوش کیے ہوئے انڈے کے دیر ہضم ہوتا ہے اور وہ معدہ سے بغیر کسی تبدیلی کے آنتوں میں پہنچ کر جذب ہو جاتا ہے۔ اسی لیے جن کمزور معدوں کو قوتِ عمل سے بچانے کی ضرورت ہوتی ہے اس کے لیے کچا انڈا ہی بہترین غذا ہے۔

اسی طرح پورا جوش دیا ہوا انڈا کم جوش دئے ہوئے انڈے کی نسبت دیر ہضم ہوتا ہے اور بعض آدمیوں کے لیے انڈا قابض

بھی ہے جس کی وجہ یہ ہے انڈے میں چونے کی مقدار بہت زیادہ ہو
نیز یہ انتڑیوں میں زیادہ تر جذب ہو جاتا ہے اور فضلہ بہت کم بنتا ہے
بعض طبائع ایسے بھی ہیں جن کے معدے اور امعاء میں انڈے کو استعمال
سے خرابی پیدا ہو جاتی ہے اور بعض کو معمولی طور پر استعمال کرنے میں
تکلیف دیتا ہے۔ مگر حلوے اور کیک کی صورت میں کوئی نقصان نہیں
پہنچاتا۔ اگر انڈے کے انتڑیوں میں جذب ہونے میں دیر ہو جاتی ہے
تو اس میں عفونت پیدا ہو کر وہ سلفیوریٹیڈ ہائیڈروجن (گندھک
کا گیس) اور امونیا (ایک اور تیز گیس) کے تولید کا باعث بن جاتی ہے
اور یہ گیسیں امعاء میں خرابی پیدا کر دیتی ہیں۔

اووو۔ یہ ایک قسم کا سفوف ہے جو بازاروں میں فروخت
ہوتا ہے۔ اس کا ہر ایک پیکٹ (پڑیہ) ایک انڈے کی برابر طاقت رکھتا
ہے۔ دراصل یہ خشک کیا ہوا انڈا ہے جو پانی میں حل ہو جاتا ہے۔ اگر انڈے
دستیاب نہ ہوں تو ان کی جگہ یہ سفوف استعمال کیا جا سکتا ہے۔

تپ دق کے علاج میں انڈوں کی غذا خاص طور پر مفید
ہے جس کے استعمال کے طریقے حسب ذیل ہیں۔

انڈے کی سفیدی کا عرق۔ ایک انڈے
کی سفیدی میں دو گنی مقدار کا پانی ملا کر کپڑے میں چھان لیا جائے۔
یہی عرق جو قریباً ڈیڑھ چھٹانک ہوتا ہے استعمال کیا جاتا ہے۔ کبھی اس
میں گوشت کا ست یا یخنی بھی ملا دیتے ہیں۔ یہ مرکب عرق لیکو کے
نام سے بازار میں بنا ہوا بھی فروخت ہوتا ہے جو نہایت عمدہ اور
پرورش کرنے والا عرق ہے۔ اس میں اور یخنی میں امتیاز کرنا دشوار
ہے اور کم قیمت بھی ہے۔

(۲) اگر انڈے کی سفیدی کا عرق کسی شربت میں ملا دیا جائے
تو وہ بھی ایک عمدہ اور مفید غذا کا کام دے سکتا ہے۔

(۳) تازہ انڈا ایک عدد، سرکہ سوا تولہ۔ انڈے کو سرکے میں حل
کر کے اگر استعمال کیا جائے تو بہت ہی زود ہضم غذا اور سرد و مفرح ہے۔

کچے انڈوں کے استعمال کے چند طریقے ذیل میں بیان
کیے جاتے ہیں:۔

(۱) **انڈے کا مشروب**۔ انڈا ایک عدد، دودھ
ایک پیالی، شکر ایک چمچہ، شیری شراب سوا تولہ۔ انڈے کو پھینٹ
کر اس میں شراب اور شکر ملا کر کانٹے سے آہستہ آہستہ پھینٹیں۔
اس کے بعد اس کو ایک عمدہ تار کی چھلنی میں چھان لیں۔ پھر دودھ کو
کسی چھوٹے برتن میں جوش دیں۔ جب اس میں جوش آنے لگے تو مرکب
مذکور کو اس میں تھوڑا تھوڑا ملا کر چمچہ سے چلاتے رہیں۔ جب سب مل کر
یک جان ہو جائیں تو اتار لیں اور نیم گرم پی لیں۔ اس کو بغیر شراب کے
اس طرح بنا سکتے ہیں کہ بجائے شراب کے دارچینی یا عرق لیموں ڈالیں
اور دودھ کی جگہ سوڈا واٹر سے کام لیں۔ مگر اس صورت میں صرف انڈے کی
زردی استعمال کی جاتی ہے۔

(۲) دودھ ایک پیالی، شکر ایک چمچہ، سفیدی انڈا ایک عدد۔ پہلے انڈے
کی سفیدی کو پھینٹ کر علیحدہ رکھیں۔ پھر دودھ کو جوش دے کر گرم کر لیا جائے
اور اس کو انڈے کی سفیدی میں آہستہ آہستہ ملا لیا جائے۔ پھر شکر ڈال کر استعمال
کیا جائے۔

(۳) سفیدی انڈا ایک عدد، بالائی سوا تولہ، برانڈی شراب سوا تولہ،
شکر بقدر ضرورت۔ انڈے کی سفیدی کو پھینٹ کر اس میں برانڈی اور
بالائی ملائی جائے۔ پھر شکر ملا کر استعمال کیا جائے۔

انڈوں کو پکانے کے طریقے

(۱) **انڈے اُبالنا**۔ برتن میں اس قدر پانی ڈالا جائے کہ انڈا
اس میں پوری طرح ڈوب جائے اور اس کو جوش دیا جائے۔ جب اچھی طرح
جوش آ جائے تو اس میں آہستہ سے انڈا چھوڑ دیا جائے اور اس کو قریباً آٹھ منٹ
تک پانی میں رہنے دیا جائے۔ اس کے بعد نکال کر فوراً استعمال کیا جائے۔

(۲) **پانی میں انڈوں کا تلنا**۔ انڈا، جوش دیا ہوا پانی،
عرق لیموں، نمک کی چٹکی سب بقدر ضرورت۔ انڈے کو توڑ کر پیالی میں
اس طرح رکھا جائے کہ اس کی زردی سالم رہے۔ ٹوٹنے نہ پائے۔ پھر پانی

کو کسی چھوٹے برتن میں جوش دے کر اس میں نمک اور عرق لیموں ملا لیا جائے پھر اسی جوش کھاتے ہوئے پانی میں آہستہ سے انڈے کو چھوڑ دیا جائے۔ اور تین منٹ تک اس میں رہنے دیا جائے جب سفیدی بالکل جم جائے تو سفید کے ٹکڑوں کو ملٹ دیا جائے۔ پھر اس کو کسی چیز سے نکال کر تازہ توس کے ساتھ کھایا جائے۔ اگر توس مکھن لگا ہوا ہو تو اور بھی قوی ہو جائے گا۔ بجائے مکھن کے گرم بالائی بھی استعمال کر سکتے ہیں۔

(۳) انڈا ایک عدد، دودھ آدھا اونس، نمک و کالی مرچ بقدر ضرورت، مکھن ۱ ماشہ۔ دودھ کو کسی چھوٹے برتن میں گرم کیا جائے۔ اور انڈے کو کسی پیالی میں نمک اور کالی مرچ سمیت پھینٹ کر اس کو گرم دودھ میں ڈال دیا جائے۔ پھر اس کو آنچ پر رکھ کر برابر چلایا جائے جب سب یکجان ہو جائیں اور اس میں گاڑھا پن آنے لگے تو اس کو اتار کر توس کے ساتھ گرم گرم استعمال کیا جائے۔ اگر زیادہ گاڑھا ہو گیا تو چمڑے کی طرح سخت ہو کر ہضم کے قابل نہ رہے گا۔

(۴) دو انڈوں کی زردی ایک پیالی چینی میں، مع کالی مرچ اور نمک کے ملائیں پھر ایک پیالے میں مکھن لگا کر مرکب مذکور اس میں ڈالدیں اور اس کو ابلتے ہوئے پانی کے برتن میں رکھ دیں۔ اور جب وہ جم جائے تو استعمال کریں۔

ڈاکٹر محیب الدین احمد فانی

جدید ایران اور اُس کا فرمانروا

ایران کی ترقی کا دورِ جدید اور اس کے فرمانروا رضا شاہ پہلوی کے عہد حکومت سے شروع ہوتا ہے۔ اور گذشتہ دس سال میں ایران نے ترقی کا قدم اور بھی تیزی سے بڑھایا ہے جس روز رضا شاہ نے ایران کی عنان حکومت اپنے ہاتھوں میں لی اسی روز سے ایران کا ستارۂ اقبال چمکنے لگا۔ اس سے پہلے یہ ملک بھی مشرق قریب کے دوسرے ممالک کی طرح یوروپین طاقتوں کی جولانگاہ بنا ہوا تھا۔ رضا شاہ نے اپنی تخت نشینی کے بعد ایران کی تمدنی زندگی اور حکومت کے رنگ و روپ کو بالکل اسی طرح بدل دیا جیسے کہ مصطفےٰ کمال پاشا (اتاترک) نے ترکی کے قالب میں ایک نئی روح پھونک دی تھی۔

اس وقت ایران کی ترقی کا یہ حال ہے کہ سارے ملک میں ریلوے لائنیں بچھی ہوئی ہیں۔ اس کے ہر گوشے تک ریل گاڑیاں پہنچتی ہیں۔ ہر سڑک پر موٹر کاریں اور لاریاں دوڑتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اور ملک کا کوئی حصہ اب ایسا نہیں ہے جہاں تک پہنچنا دشوار ہو، اور جہاں بہترین سڑکیں دکھائی نہ دیتی ہوں۔ ایک وہ زمانہ تھا جب ایران کے ہر صوبے کا لباس جداگانہ تھا۔ (آج ہندوستان میں بھی یہی حال ہے۔ ایڈیٹر) اور آپ صرف کسی شخص کا لباس دیکھ کر یہ کہہ سکتے تھے کہ یہ شیرازی ہے یا اصفہانی ہے یا کرمانی ہے۔ لیکن اب یہ امتیاز قطعاً باقی نہیں رہا۔ تمام ایرانیوں کا لبوس ایک جیسا ہے اور اکثر لوگوں نے ترکی کی تقلید کر کے مغربی لباس اختیار کر لیا ہے۔

ایران کے دارالحکومت طہران کا ہر منظر ایک انقلاب کا پتہ [illegible] پرانے وقتوں کی عمارتیں اب وہاں موجود نہیں ہیں اور ان کی [illegible] نے لی ہے۔ شہر کے مختلف حصوں میں بہت سے باغ اور پارک اور جدید قسم کی تفریح گاہیں بنا دی گئی ہیں۔ لڑکوں کے لیے اب قدیم وضع کے مدرسے بھی دیکھنے میں نہیں آتے بلکہ امریکن اور انگریزی طرز کے اسکول قائم کر دئے گئے ہیں اور نوجوانوں کی تعلیم کے لیے کالجوں اور یونیورسٹیوں کی شاندار عمارتیں ایران کی ترقی کا افسانہ کہہ رہی ہیں۔

رضا شاہ پہلوی نے ایران کے فوجی محکمہ میں بھی بہت سی اہم اصلاحات جاری کی ہیں جس میں سب سے زیادہ اہم یہ ہے کہ ایرانی فوج میں اب کوئی غیر ملکی افسر موجود نہیں ہے۔ فوجی وردیاں بھی جدید قسم کی بنوائی گئی ہیں اور فوج کو طاقتور و رسیلی بنانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایران کی جدید تاریخ خود رضا شاہ کی زندگی کی تاریخ سے وابستہ ہے۔ وہ پہلے خود ایک فوجی سپاہی تھے لیکن اپنی ہمت، استقلال اور قابلیت کے باعث ترقی کرتے کرتے وزیر جنگ بن گئے تھے۔ آخر سنہ ۱۹۲۳ء میں ان کی فوجیں طہران میں داخل ہوئیں، اور تمام ایرانی خواص و عوام کے زبردست اصرار سے رضا شاہ کو ایران کا تاج و تخت قبول کرنا پڑا۔ اب ساری دنیا نے تسلیم کر لیا ہے کہ اس شخص میں ایک بہترین فرمانروا ہونے کی تمام مخصوص صفات موجود تھیں، اور ایران کی جدید نشو و نما اور رفتارِ ترقی اسی کی مرہونِ منت ہے۔

ماسٹر برجموھن، نیپال

ممسک خاص

وطن کے نوجوانوں میں سرعت انزال کا مرض عام طور پر پھیل گیا ہے اور اس کی وجہ سے وہ مباشرت کی طبعی لذت سے محروم ہیں۔ وہ باغ حسن کے ایسے مالی ہیں جو گل چین نہیں کرسکتے اور ندامت سے سر نہیں اٹھا سکتے۔ علاوہ ازیں سرعت انزال استقرار حمل کا بھی دشمن ہے۔ سلسلہ پیدائش منقطع ہو جاتا ہے۔ لہٰذا مشہور دواخانہ دہلی نے اس عظیم تباہی کا خیال کرتے ہوئے ممسک خاص کے نام سے ایسی دوا ایجاد کی ہے جس سے سرعت انزال کا قطعی خاتمہ ہو جاتا ہے اور ہر شخص بے کھٹکے وظیفہ زوجیت ادا کر سکتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی یہ انتباہ ضروری ہے کہ عیاشی کے لیے یہ دوا ہرگز طلب نہ کی جائے +

قیمت ایک درجن گولی ایک روپیہ (عہ)

ترکیب استعمال کا پرچہ ہمراہ ہوگا +

شربت صدر جدید

آج کل نزلہ و زکام کی کثرت وبائی صورت اختیار کر چکی ہے۔ ہر شخص بچے، جوان، بوڑھا اس مرض کا شکار ہو رہا ہے۔ چونکہ اس مرض میں پھیلنے کی صلاحیت موجود ہے بدیں وجہ سل و دق جیسے خطرناک امراض کے لاحق ہو جانے کا ہر وقت خطرہ ہے۔ ہیں

مشہور دواخانہ دہلی نے یہ ایسا مرکب شربت کی صورت میں تیار کیا ہے جو ہوائی نالیوں سے جمے ہوئے بلغم کو فوراً نکال دیتا ہے۔ نزلہ کی آمد کو روکتا ہے۔ پھیپھڑوں سے خون جاری ہو تو بند کر دیتا ہے۔ حلق کی سوزش کو دفع کرتا ہے۔ گلے آگئے ہوں تو انہیں مناسب حالت پر لے آتا ہے۔ نمونیہ اور دمہ جیسے خوفناک مرض میں اس کا استعمال آب حیات سے کم نہیں ہے۔ لہٰذا نزلہ زکام کھانسی وغیرہ میں اس دوا کا استعمال کرکے فوری شفا حاصل کیجئے۔ قیمت فی شیشی آٹھ آنے (۸/)

(ترکیب استعمال کا پرچہ ہمراہ ہوگا)

فوزی

یہ عجیب و غریب دوا ہے اور بڑا سے سوزاک کے لیے اکسیر صفت ہے

ادھر ایک خوراک حلق سے اتری اور ادھر شفا حاصل ہونے لگی اسی لیے اس کا نام "فوزی" ہے۔ سوزاک کا ایسا مریض جو شدت درد سے تڑپ رہا ہو پیشاب میں جلن ہو مثانہ میں ٹیس ہو اور ریم بکثرت بہتی ہو "فوزی" کی ایک خوراک دے کر تجربہ کر لیجئے کہ کس قدر سکون حاصل ہوتا ہے۔ یہ انمول اور نایاب دوا سراج الاطباء عالیجناب حکیم حاجی محمد سراج الدین خان صاحب کا عطیہ ہے اور ہزاروں مریض اس دوا کی بدولت سوزاک جیسے موذی مرض سے نجات حاصل کر چکے ہیں +

قیمت فی بکس دو روپیہ (عہ)

اخراجی

زمانۂ حال کی ایک کامیاب اور سائنٹیفک دوا ہے +

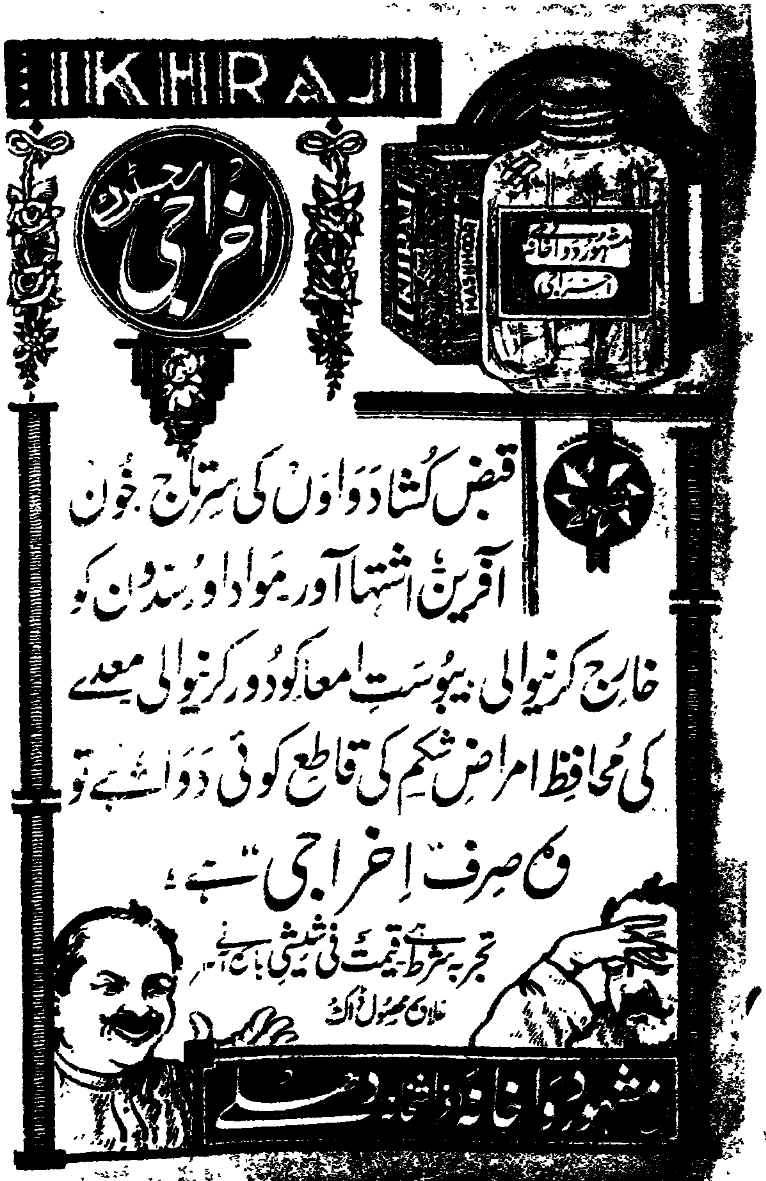
تمام قبض کشا دواؤں کی سرتاج۔ مواد اور سدوں کو خارج کرنے والی یبوست امعا کو دور کرنے والی۔ خون آفریں۔ اشتہا اور معدے کی محافظ اور امراض شکم کی قاطع ہے۔ آنتوں میں خراش کیے بغیر اجابت لاتی ہے بھوک بڑھاتی ہے۔ اگر آپ دائمی قبض کا شکار ہیں تو اس دوا کا استعمال کرکے ہمیشہ کے لیے نجات حاصل کریں۔

حکمائے شاہی دہلی نے "اخراجی" کو طبی کرامت کہا ہے +

قیمت فی شیشی سہ درجن قرص صرف بارہ آنہ

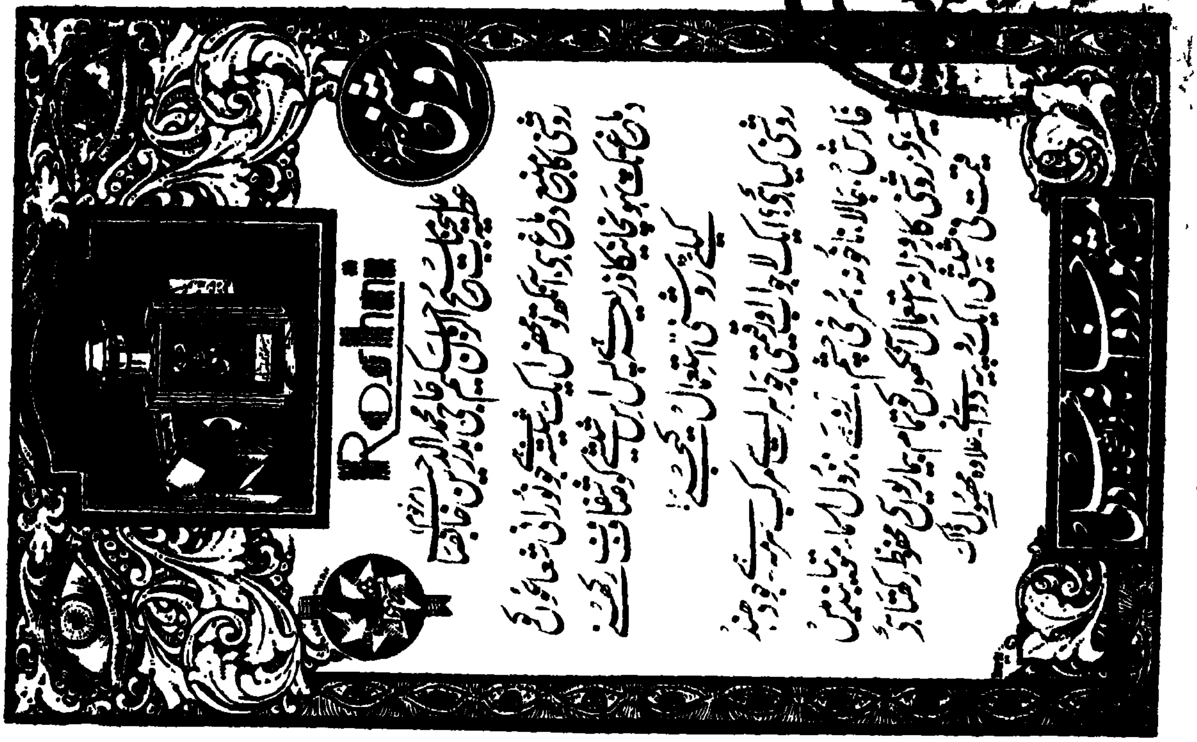
ترکیب استعمال کا پرچہ ہمراہ ہوگا

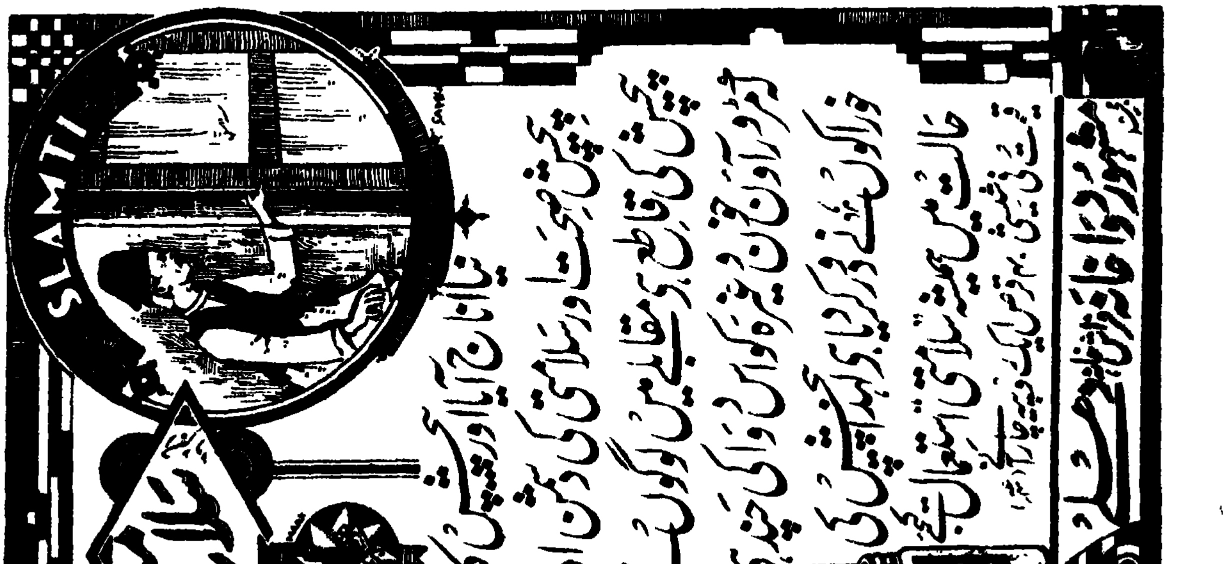
مشہور دواخانہ دہلی


IKHRAJI
اخراجی رجسٹرڈ
قبض کشا دواؤں کی سرتاج خون
آفرین اشتہا آور مواد و سدوں کو
خارج کرنیوالی یبوست امعا کو دور کرنیوالی معدے
کی محافظ امراض شکم کی قاطع کوئی دوا ہے تو
وہ صرف اخراجی ہے
مشہور دوا خانہ دہلی


DAWAE
KAILA
دوائی کیلا
سیلان الرحم
نجات حاصل
ایام حیض کی بے قاعدگی
کی خون کی شکایت بھی رفع
کرتی ہے قیمت ۲۰ خوراک
مشہور دوا خانہ دہلی

Regd. L. No. 46





Only Title printed at the Label Art Press, Frashkhana, Delhi.

JULY, 1940

ادبی و طبی ماہوار مصور رسالہ

"مشہور" دہلی

(۶)۱

مرتبہ

حکیم محمد تقی دہلوی

مقام اشاعت: ممتاز منزل فراشخانہ دہلی

سالانہ ایک روپیہ

مجنیۂ



خواجہ محمد شفیع دہلوی

دہلی کے مشہور جدت پسند اور سحر طراز انشا پرداز

جو ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو پابندی سے شائع ہوتا ہے

اردو کا ادبی و طبی ماہوار مصور رسالہ

ماہنامہ "مشہور" دہلی

مرتبہ حکیم محمد تقی دہلوی

جلد (۱) بابت ماہ جولائی سنہ ۱۹۴۰ع نمبر (۴)

قیمت سالانہ ایک روپیہ ۸؍

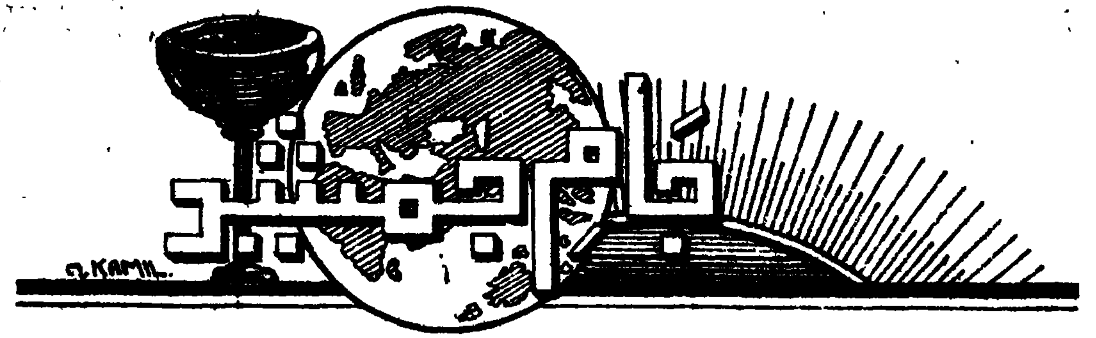
ممالک غیر سے تین شلنگ

اعزازی چندہ پانچ روپے سالانہ

فی پرچہ دو آنے

مقام اشاعت: ممتاز منزل، فراشخانہ دہلی

حکیم محمد تقی پرنٹر و پبلشر نے جدید برقی پریس دہلی میں چھپوا کر ممتاز منزل فراش خانہ دہلی سے شائع کیا



یورپ کی جنگ بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہے اور جرمن نازیوں کے ہاتھوں ملک کے بعد ملک تباہ ہوتے جا رہے ہیں۔ ہٹلر چاہتا ہے کہ جرمن قوم کو ساری دنیا پر اقتدار حاصل ہو جائے۔ لیکن یہ دنیا اور اس کے تمام ممالک کبھی کسی ایک فرد واحد یا ایک قوم کے زیر نگیں نہیں رہے ہیں اس لئے ظاہر ہے کہ ہٹلر کا خواب کبھی ممنون تعبیر نہ ہوگا۔ لیکن سر دست ہٹلر کے مظالم نے یورپ کے بہت سے ممالک کی زمین خون سے رنگدی ہے۔ ہزاروں عورتیں بیوہ اور لاکھوں بچے یتیم ہو گئے ہیں۔ اور قدرت ایک ظالم کی بے پناہ خونریزیوں کا تماشہ دیکھ رہی ہے۔ اس وقت تک جبکہ یہ تحریر سپرد قلم کی جا رہی ہے نازیوں نے فرانس کے دارالحکومت پیرس پر بھی قبضہ کر لیا ہے، اور جنوبی فرانس میں دفاع کی نئی مورچہ بندیاں یہ بتلاتی ہیں کہ فرانس کا کوئی وسیع حصہ اب ہٹلری دست برد سے باقی نہیں رہا ہے۔ پھر بھی اتحادیوں نے ہمت نہیں ہاری ہے۔ اور برطانیہ اور فرانس کی جمہوریتیں نازیوں کو آخری شکست دینے پر تلی ہوئی ہیں۔ اب جبکہ اٹلی بھی اس جنگ میں شریک ہوا ہے اور بحر روم بھی "میدان جنگ" بن گیا ہے اس نئی صورت حال نے مشرقی ممالک کو بھی جنگ کے خطرے میں ڈال دیا ہے۔ اس سلسلہ میں ہندوستان کی جو نوعیت ہے وہ ظاہر ہے۔ اس وقت تمام ہندو مسلم برادران وطن کا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے اختلافات کو دور کر دیں اور متحد ہو کر نازیوں کے پیدا کئے ہوئے خطرات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو جائیں، ورنہ یہ ایک یقینی امر ہے کہ نازیوں کی فتح ساری دنیا کے لئے ایک مستقل عذاب بن جائے گی۔ اور آزادی و جمہوریت کا چراغ گل ہو جائے گا۔

ہم "مشہور" کی گذشتہ اشاعتوں میں کاغذ کی قیمت پر اس جنگ کے اثرات کا تذکرہ کر چکے ہیں۔ حالت یہ ہے کہ کاغذ کی گرانی روز بروز بڑھتی چلی جا رہی ہے اور بہت سے اخبارات و رسائل نے مجبور ہو کر بہت ہی ادنےٰ درجہ کا کاغذ لگانا شروع کر دیا ہے ہم سر دست اپنی جگہ سے ایک قدم بھی پیچھے ہٹنا نہیں چاہتے بلکہ یہ بہتر سمجھتے ہیں کہ چندہ میں تھوڑا سا اضافہ کر کے، کاغذ کی غیر معمولی گرانی سے جو خسارہ ہو رہا ہے اسے کچھ کم کر لیں۔ اس لئے ہم اعلان کرتے ہیں کہ ماہ اگست میں رسالہ "مشہور" کا سالانہ چندہ ڈیڑھ روپیہ ہو جائے گا۔ لیکن جو صاحب آخر جولائی تک خریدار بن جائیں گے ان سے موجودہ چندہ یعنی ایک روپیہ ہی لیا جائے گا۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ہمارے قدرداں جلد از جلد اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے۔ رسالہ "مشہور" میں روز بروز جو ترقی ہو رہی ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔

انجمن ترقی اردو کے مرکز دفتر واقع دہلی سے ایک ہدایت نامہ شائع کیا گیا ہے، جس پر عمل کرنا یقیناً زبان اردو کی توسیع اشاعت کا باعث ہوگا ہم اس ہدایت نامہ کو ذیل میں درج کرتے ہیں تاکہ ناظرین بھی اس پر عمل کریں اور اپنی پیاری زبان کو توسیع و ترقی میں انجمن ترقی اردو کا ہاتھ بٹائیں وہ ہدایت نامہ یہ ہے :-

(۱) خطوط پر پتے اردو میں لکھے جائیں (۲) محکمۂ ریڈیو کو برابر خط لکھے جائیں کہ اردو کا پروگرام زیادہ سے زیادہ ہو (۳) منی آرڈر اور رجسٹری کے اردو فارم طلب کئے جائیں۔ اور اردو ہی میں ان پر پتے لکھے جائیں اور اگر کوئی ڈاکخانہ لینے سے انکار کرے تو اس کا تحریری بیان لے کر میرے پاس

بھیجیں (۴) سینما وغیرہ کے اشتہارات اور پوسٹروں میں مرہٹی۔ گجراتی اور کنٹری کے ساتھ ساتھ اردو کی شمولیت کا بھی مطالبہ کیا جائے (۵) صائن بورڈ میں تجارتی خطوط کے کاغذات اور لفافوں پر دوسری زبانوں کے ساتھ اردو میں بھی پتے چھاپے جائیں (۶) اپنے شہروں کی سڑکوں کے ناموں کے تختوں پر اردو کو بھی جگہ دلائی جائے (۷) اپنے ریلوے اسٹیشن کے نام کے تختے پر بھی اردو میں نام لکھوایا جائے اور اپنے علاقے کے ریلوے حکام سے مطالبہ کیا جائے کہ ٹائم ٹیبل اور دوسرے اعلانات اردو میں بھی ہوں نیز ٹکٹوں پر بھی سٹیشنوں کے نام اردو میں چھاپے جائیں۔

ہر شاخ کو چاہیئے کہ جلد ایک جلسہ کر کے ریلوے سے متعلق ایسی تجاویز منظور کرے اور ان کی ایک نقل ایجنٹ ریلوے اور دوسری اس دفتر کو بھیجدے۔

آیندہ مردم شماری کے موقع پر کوشش یہ کی جائے کہ ہر شخص اپنی مادری زبان اردو لکھائے اور اس چیز کا بھی بندوبست کیا جائے کہ لکھنے والا اس خانہ میں اردو ہی لکھتا ہے

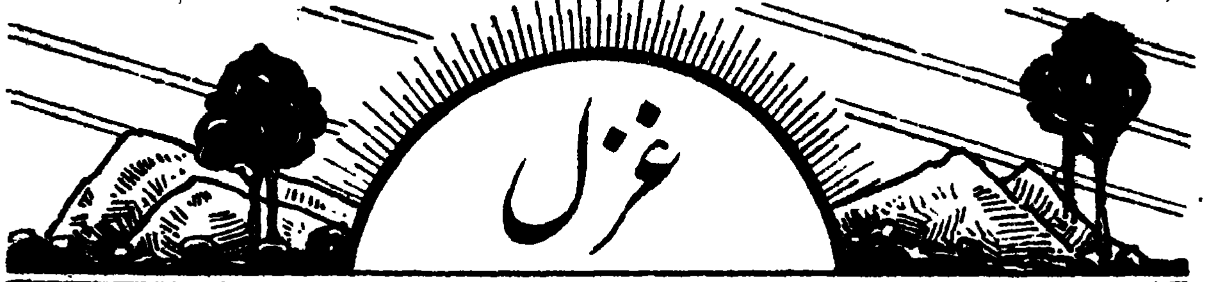
آپ کے علاقے میں جن مقامات پر اردو کے مدارس نہیں ہیں وہاں ان کی تحریک کی جائے۔

ماہ مئی کے آخری ہفتہ میں دہلی کے ایک مشہور و برگزیدہ بزرگ اور صاحب دل صوفی جناب پیرجی عبدالصمد صاحب اس جہان فانی سے اٹھ گئے۔ آپ حضرت شیخ سلیم چشتی اور حضرت بابا فریدالدین گنج شکر کی اولاد میں تھے اور خواجہ الٰہ بخش صاحب تونسوی کے خلیفہ تھے دہلی جے پور اور بنگال میں آپ کے مریدوں کی ایک بڑی جماعت ہے۔ پیرجی عبدالصمد صاحب بہت متین اور سنجیدہ بزرگ تھے، اور نہایت دانشمند و انصاف پسند درویش تھے۔ روزانہ دعا تعویذ وغیرہ کے لئے سینکڑوں مسلمان اور ہندو آپ کے پاس جمع ہوتے تھے۔ آپ کے ایک صاحبزادے حیدرآباد میں ملازم ہیں اور دو صاحبزادے دہلی میں رہتے ہیں۔ پیرجی کی وفات پر ہم رنج و افسوس کا اور ان کے پس ماندگان سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔

حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب نے اردو کی تبلیغ کے لئے ایک اپیل اپنے اخبار "منادی" میں شائع فرمائی ہے جس میں ہندوستان کے تقریباً تمام صوبوں کے حامیان اردو کو مخاطب کر کے یہ کہا گیا ہے کہ وہ اردو کی حمایت کے زبانی دعوے کے ساتھ کچھ عملی کام بھی شروع کریں اور اردو کی کتابیں مکتبوں اور اسکولوں اور خاص و عام باشندوں میں تقسیم کریں تاکہ جب ہندوستان آزاد ہو تو اردو کو کہیں خود ہماری غفلتوں کا شکار نہ ہونا پڑے۔ ہم خواجہ صاحب موصوف کی اسی اپیل کی پرزور تائید کرتے ہیں۔

ہم نہایت مسرت کے ساتھ دہلی کے نامور ادیب خواجہ محمد شفیع صاحب کی عکسی تصویر اس ماہ کے رسالے میں شائع کر رہے ہیں۔ خواجہ صاحب موصوف خواجہ عبدالمجید صاحب سابق امیر جامعہ ملیہ کے فرزند ارجمند ہیں اور دہلی کے ادبی حلقوں میں کافی شہرت رکھتے ہیں اور نہایت خلیق و متواضع نوجوان ہیں آپ کے دولت کدہ پر ہر اتوار کو ۵ بجے شام سے ۱۱ بجے شب تک اردو ادب کی مجلس قایم رہتی ہے جس میں دہلی کے مشہور ادبا اور ممتاز شعرا شریک ہوتے ہیں بالخصوص مولانا حسن نظامی صاحب مولانا واحدی صاحب پنڈت برجموہن صاحب کیفی وغیرہ اپنا کلام نظم و نثر سنا کر حاضرین کو محظوظ فرماتے ہیں۔ خواجہ صاحب موصوف کا پایۂ علم و فضل کے لحاظ سے بہت بلند ہے چنانچہ آپ نے متعدد کتابیں تصنیف فرمائی ہیں ان میں سے "دلی کا سنبھالا" "میونسپل الیکشن" "مغلوں کا مد و جزر" "گناہ" "میلاد شریف" وغیرہ کتابیں مشہور و مقبول ہو چکی ہیں۔

حکیم محمد تقی



یادِ جاناں بھی عجب روح فزا آتی ہے — سانس لیتا ہوں تو جنت کی ہوا آتی ہے

میری جانب نگہ ہوش رُبا آتی ہے — پھر وہی ظالم مظلوم نما آتی ہے

جا بھی اے ناصح ناداں نہ کر اسکو بدنام — ان جفاؤں سے تو خوشبوئے وفا آتی ہے

نہیں معلوم وہ خود ہیں کہ محبت ان کی — پاس ہی سے کوئی بے تاب صدا آتی ہے

میں تو اس سادگیٔ حسن پر اس کی صدقے — نہ جفا آتی ہے جس کو نہ وفا آتی ہے

ہائے کیا چیز ہے یہ تکملۂ حسن و شباب — اپنی صورت سے بھی اب انکو حیا آتی ہے

مرگِ ناکام محبت مری تقصیر معاف — زندگی بن کے مرے حق میں قضا آتی ہے

اُٹھ گیا کیا جگر دردبہ دل شعلہ بہ جاں

در و دیوار سے ماتم کی صدا آتی ہے

حضرت جگر مرادآبادی

"تیرے بغیر"

خاک اُڑتی ہے چمن میں چار سو تیرے بغیر — موجۂ طوفاں ہی، موجِ رنگ و بو تیرے بغیر

دامنِ فردوس تھیں جو اکتسابِ حسن سے — رو رہی ہیں اب وہی آنکھیں لہو تیرے بغیر

ہر طرف مایوسیاں ہیں، ہر طرف اندھیر ہے — الغرض ناقص ہے ذوقِ جستجو تیرے بغیر

کون میرے اشکِ غم کی داد دے تیرے سوا — خاک ہے عشق و وفا کی آبرو تیرے بغیر

آ، کہ تیرے حُسنِ معنی خیز سے ہو کچھ قرار — نامکمل ہے حدیثِ آرزو تیرے بغیر

دہر میں وجہ سکوں تیرے علاوہ کون ہے — مضطرب ہے اشعرِ دیوانہ خو تیرے بغیر

جناب اشعر

رحمت کے فرشتے

آج کالج میں موسم گرما کی تعطیل کا اعلان ہوا۔ کلاس روم سے حامد و ناصر جو آپس میں گہرے دوست تھے باتیں کرتے ہوئے نکلے۔

حامد: مسٹر یہ فیصلہ کرنے یا سوچنے کے لیے آپ اپنے دماغ کو تکلیف نہ دیں۔

ناصر: تو کیا آپ نے فیصلہ کر لیا ہے۔

حامد: ہاں کل ہی ابا جان کا خط آیا ہے لکھا ہے "چھٹیوں میں میرے پاس شملے چلے آؤ۔ وہاں جانا اس لیے بھی ضروری ہے کہ میری بہن بیمار ہے

ناصر: یار یہ تو بری سنائی۔

حامد: کیوں تمہیں کیا عذر ہے۔

ناصر: اے میاں وہی مثل ہے "عصمت بی بی بے چادری" دل تو ارمانوں سے بھرا ہے لیکن جیب خالی ہے۔ نہ ابا جان اتنا خرچ دیں گے نہ میرے پاس ہے۔ تم جانتے ہو کہ شملے میں کس قدر خرچ کی ضرورت ہے

حامد: باتیں بنانے کی ضرورت نہیں فوراً سفر کی تیاری کرو، ہم آج ہی روانہ ہو جائیں گے۔

ناصر: بھئی میرے خرچ کا بار تم کیوں برداشت کرو خواہ مخواہ میری وجہ سے تمہیں اور تمہارے گھر والوں کو تکلیف ہوگی۔

حامد: اچھا تکلفات تو چھوڑو اب گھر جا کر فوراً بوریا بستر باندھ کر تیار ہو جاؤ۔

صبح کا سہانا وقت ہے آسمان پر ابر چھایا ہوا ہے، حامد و ناصر حسب معمول کلائیوں پر برساتیاں ڈالے قدرتی مناظر کے لطف اٹھاتے ہوئے پہاڑیوں میں چلے جا رہے تھے۔ آج کے دل کش اور نظر فریب مناظر نے دونوں کو اس قدر محو کیا کہ آبادی سے بہت دور نکل گئے اور انہیں خبر بھی نہ ہوئی۔ کچھ فاصلے پر ایک جھونپڑی نظر آئی اس کے قریب پہنچے تو دیکھا ایک شاہ صاحب جھونپڑی کے دروازے پر کھڑے ہوئے آسمان کی جانب دیکھ رہے ہیں فقیر اپنے دل کا حال بادلوں سے بیان کر رہا تھا۔ دونوں دبے پاؤں اس کے قریب گئے اور ایک پتھر پر بیٹھ کر فقیر کی صدا سننے لگے۔

جا رہا ہے کس طرف ابر بہار — باد کے گھوڑے پہ تو ہو کر سوار
ساری دنیا میں پھرا کرتا ہے تو — ایک جا رہتا نہیں تجھ کو قرار
کہتی ہے خلق خدا رحمت تجھے — تو ہے بیشک رحمت پروردگار
خشک کھیتی تجھ سے ہوتی ہے ہری — تیرے ہی دم سے ہیں جاری آبشار
دشت کو گلزار کر دیتا ہے تو — تجھ سے ہیں سرسبز ساری کوہسار
تجھ سے دنیا ہو رہی ہے فیضیاب — خشک جنگل بن رہے ہیں سبزہ زار
میرا بھی اک کام ہے کر دے اگر — تجھ کو دوں گا میں دعائیں بے شمار
جانتا ہوں تجھ کو عجلت ہے بہت — ہے تری رفتار سے یہ آشکار
ٹھیر جا دم بھر خدا کے واسطے — تجھ سے کہنا ہے مجھے کچھ حال زار
سوز الفت سے جلا جاتا ہے دل — ہو گیا ہے غم سے سینہ داغ دار
آتش فرقت سے جلتا ہے جگر — اشک جاری ہیں مثال آبشار
خار ہے عیش گلستان جہاں — ہو نگاہوں سے عیاں اک گلعذار
اک شہ خوباں کی ہے مجھکو تلاش — رات دن پھرتا ہوں میں دیوانہ وار
اس سے یہ کہدے تو ہو احساں ترا — تجھ کو مل جائے اگر وہ گلعذار
مر رہا ہے چاہنے والا ترا — بے مروت۔ بیوفا۔ غفلت شعار
کچھ بھروسا زندگانی کا نہیں — پھر دکھا دے روئے زیبا ایک بار

صرف آنکھوں میں ہے دم اٹکا ہوا
تیرے مجنوں کو ہے تیرا انتظار

ایک تو آواز سریلی پھر دل میں سوز الفت۔ پُر درد لہجہ میں درد دل کا اظہار سن کر حامد و ناصر پر وجدانی کیفیت طاری ہو گئی۔ دونوں بے خودی کے عالم میں بیٹھے تھے۔ شاہ صاحب خاموش ہو گئے لیکن یہ دونوں اسی طرح مدہوش تھے۔ اگر بجلی نہ کڑکتی اور بارش نہ آتی تو نہیں معلوم یہ دونوں کب تک محو رہتے۔ شاہ صاحب اپنی جھونپڑی میں جانے کے لیے مڑے ان پر نظر پڑی دونوں نے نہایت ادب سے سلام کیا۔ شاہ صاحب نے سلام کا جواب دیکر

جی تو نہیں چاہتا۔ جائیے اللہ اور رسول کو سونپا۔
دونوں نے چہروں پر نقابیں ڈال لیں گھر کی طرف روانہ ہو گئیں۔
میں کھڑا ہوا دیکھتا رہا۔ رضیہ کے خرام ناز سے دل پامال ہو رہا تھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا اس کے قدم زمین پر نہیں میرے دل پر پڑ رہے ہیں جب وہ قدم اٹھاتی تھی زمین پر رکھنے سے پہلے میرا دل اس کے پاؤں کے نیچے آجاتا تھا
مجھے اس قدر محو دیکھکر اخلاق نے بازو پکڑ کر جھنجوڑا
میاں اب گھر بھی چلو گے یا یہیں چھاؤنی چھاؤ گے۔
میں نے ایک لمبا سانس لیتے ہوئے کہا چلو بھائی چلو۔ آہ رضیہ کتنی خوبصورت ہے؟
اخلاق:۔ اچھا یہ کہئے خیر سے آپ عاشق ہو گئے ہیں رضیہ پر۔
میں:۔ کس قدر حسین پیاری پیاری اور بھولی بھولی صورت ہے کیا وہ حسن کی دیوی پرستش کے قابل نہیں؟
اخلاق: اونہہ ہوگی۔ مجھے تو ایک آنکھ نہیں بھاتی۔
میں:۔ ہاں سچ ہے۔ ؎ دیدۂ کور کو کیا آئے نظر کیا دیکھے
اخلاق:۔ خیر میں اندھا ہی سہی اب زیادہ نہ گرماؤ ٹھنڈے ٹھنڈے گھر کو سدھارو۔ کل آنا اور خوب جی بھر کر دیکھ لینا۔
ہم دو مہینے تک شملہ رہے دوسرے تیسرے دن رضیہ سے ملاقات ہوتی رہی محبت کی پینگیں بڑھتی رہیں۔ کالج کھلنے کا وقت آگیا چھٹیاں ختم ہو گئیں۔ ابا جان کا خط بھی آیا۔ لیکن دل نہ چاہتا تھا کہ شملہ سے جاؤں۔ آہ آخری ملاقات کا کیا حال بیان کروں وہ دن قیامت کا دن تھا وہ ملاقات آخری اور بالکل آخری تھی۔ ہم آج سویرے سے اس چٹان پر جا بیٹھے جہاں ہماری ملاقات ہوا کرتی تھی۔ ہمیں زیادہ انتظار کرنا نہیں پڑا فاطمہ اور رضیہ بھی خلاف معمول آج وقت سے پہلے آگئیں۔ میں نے ان کو دیکھکر رنج کے آثار مٹانے کی کوشش کی لیکن تاڑنے والے تاڑ گئے۔
رضیہ:۔ کہئے نصیب دشمناں مزاج کیسا ہے؟ آپ کچھ رنجیدہ معلوم ہوتے ہیں۔
میں نے لبوں پر مصنوعی تبسم پیدا کرتے ہوئے کہا۔ یہ صرف آپ کا خیال ہے میں اچھا ہوں۔
رضیہ:۔ آپ دلی صدمہ چھپانے کی کوشش نہ کیجیے بتلائیے کیا بات ہے۔ کیوں وہ لب پر ہنسی نہیں ہے آج میں نے رنج کا سبب بتایا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے فاطمہ اور اخلاق حسب دستور ہمیں تنہا چھوڑ کر دوسری چٹان کی طرف چلے گئے۔ ہر ملاقات میں ہم کو آزادی سے گفتگو اور اظہار خیال کا موقع مل جاتا تھا دونوں کے دل محبت سے لبریز تھے آج آخری دن تھا دونوں نے خوب دل کھول کر محبت کا اظہار و اقرار کیا ملاقات کے آخری لمحے تک ہماری آنکھوں سے اشک جاری رہے۔ آہ جدائی کے صدمے سے اتنا بھی کسی کو ہوش نہ آیا کہ ایک دوسرے کا پتہ لکھ لیا جاتا۔ وہ گھڑی قیامت کی گھڑی تھی غم سے دل چور چور ہو رہا تھا ایک ایک پاؤں من من بھر کا ہو گیا بمشکل گھر پہنچے اور دوسرے دن شملہ سے روانہ ہو گئے۔
ہر وقت رضیہ کی یاد دل میں چٹکیاں لیتی رہتی تھی رات دن اسی کا تصور نہ پڑھنے میں دل لگتا تھا نہ کہیں اور دل بہلتا تھا اماں جان نے میری یہ حالت دیکھ کر خدا جانے کیا سمجھا میری شادی کی تجویز شروع کر دی ایک جگہ جو ان کی نظر میں بہت اچھی تھی منگنی کر دی گئی۔ مجھ سے ذکر بھی نہ کیا جب مجھے معلوم ہوا تو میں نے کہا
اما جان کیا کر رہی ہیں آپ۔
فرمایا بیٹا جو ماں باپ اولاد کے لئے کیا کرتے ہیں۔ تم خود جانتے ہو۔ اللہ رکھے سمجھدار ہو کوئی نادان تو ہو نہیں۔
میں:۔ آپ نے مجھ سے بھی پوچھا؟
اماں:۔ اے ہے بیٹا تو یہ کیا کہہ رہا ہے؟ کوئی شادی کے معاملے میں بیٹا بیٹی سے بھی پوچھتا ہے؟
میں:۔ اماں جان وہ زمانہ گیا۔ جب ماں باپ چپ چاپ اولاد کے گلے پر چھری پھیرتے تھے اور انہیں تڑپنے کا بھی حکم نہ تھا۔
اماں:۔ اوئی بچے آج تجھے کیا ہو گیا۔ کبھی تو نے ہماری باتیں دخل نہ دیا تھا۔
میں:۔ ہاں۔ یہ معاملہ خاص میری زندگی سے تعلق رکھتا ہے میں اپنی زندگی برباد کرنا نہیں چاہتا۔ اس لئے عرض کرتا ہوں مجھے یہ شادی منظور نہیں ہے۔
اماں:۔ نہ بیٹا ایسی باتیں نہ کر۔ کوئی سن لے گا تو جگ ہنسائی ہوگی۔
میں:۔ مجھے جگ ہنسائی کی پروا نہیں۔ یہ زندگی اور موت کا معاملہ ہے ایسی دو ہستیوں کو جو ایک دوسرے سے بالکل واقف نہیں ازدواجی شکنجے میں کس کر ان کی زندگی برباد کرنی کس خدا نے بتایا ہے۔ سوچو تو سہی اگر شادی کے بعد دلوں میں محبت اور مزاجوں میں موافقت نہ ہو تو کیا نتیجہ ہوگا۔

[illegible] بھائیو، اندر چلو، بارش آگئی ۔"

جھونپڑی اندر سے نہایت صاف ستھری تھی۔ تینوں مرگ چھالوں پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔ شاہ صاحب نے فرمایا۔

"کہیئے اس طرف کیسے آنا ہوا"

ناصر: پیرو مرشد آج مناظر ایسے دلکش تھے کہ محویت کے عالم میں رستہ طے کرتے چلے گئے اور ہم کو خبر بھی نہ ہوئی

شاہ صاحب: تعجب ہے اس قدر دشوار گزار رستے کو آپ نے کیوں کر طے کیا۔ اس مقام پر لوگوں کا گذر کم ہوتا ہے

حامد: ہمیں آپ سے زیادہ تعجب ہے کہ آپ کو محبوب دل نواز کی تلاش ہے پھر بھی آبادی سے اتنی دور رہتے ہیں جہاں مرد کا پہنچنا آپ کے خیال میں مشکل ہے وہاں ایک صنف نازک کے پہنچنے کی آس لگائے بیٹھے ہیں آپ۔

شاہ صاحب: میں روزانہ سہ پہر کو آبادی کے قریب اس کی تلاش میں جاتا ہوں

ناصر: حضرت یہ تو معلوم ہو گیا کہ آپ کسی پر عاشق ہیں۔ اگر تکلیف نہ ہو تو کچھ حالات سنائیے۔

شاہ صاحب: ایک ناکام محبت کی الم ناک داستان سن کر آپ کو کیا فائدہ ہوگا۔

حامد: ہمیں تو کوئی فائدہ نہ ہوگا ممکن ہے آپ کو کوئی فائدہ پہنچ سکے

شاہ صاحب: آپ مجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔

حامد: تعجب ہے کہ بے جان بادلوں کو آپ اپنا افسانہ سنا کر ان سے پیغام رسانی کی آرزو کرتے ہیں لیکن انسانوں سے آپ کو کوئی امید نہیں۔

شاہ صاحب: آہ بد قسمتی نے مجھے مایوس کر دیا ہے۔

ناصر: واقعات سنانے سے اگر فائدہ نہیں تو کچھ نقصان بھی نہ ہوگا۔

شاہ صاحب: خیر میں سنائے دیتا ہوں۔

حضرت قصہ یہ ہے کہ میں ہر سال گرمیوں کی تعطیل کے موقع پر والد صاحب کے پاس نینی تال جایا کرتا تھا کیوں کہ ہماری کوٹھی وہیں ہے لیکن ہونی شدنی بات جب میں بی۔ اے کے امتحان سے فارغ ہوا تو میرے دوست اخلاق احمد نے کہا کہ ابکے شملے چلو۔ ہم ایم۔ اے میں داخل ہو چکے تھے تعطیل کا اعلان ہوتے ہی ہم نے ایک دن بھی ضائع نہ کیا فوراً شملے روانہ ہو گئے۔

مجھے خوب یاد ہے یہی اتوار کا دن اور صبح کا وقت تھا آسمان پر گھٹا چھائی ہوئی تھی نسیم سحر کے ٹھنڈے ٹھنڈے روح پرور جھونکے مردہ دلوں میں جان ڈال رہے تھے۔ خوش الحان پرندوں کے نغمے غمگین دلوں میں شادمانی کی روح پھونک رہے تھے یہ پر کیف و سرور افزا سماں دیکھ کر ہم دونوں تفریح کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ دل کش مناظر اور سبزہ زار کے نظارے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے چلے جا رہے تھے ننھی ننھی بوندیں پڑنے لگیں۔ اخلاق نے کہا ہم کافی دور آ گئے ہیں واپس چلنا چاہیئے اگر بارش زیادہ آگئی تو رستہ چلنا دوبھر ہو جائے گا۔ ہم نے برساتیاں پہن لیں اور گھر کی طرف واپس ہوئے بارش رفتہ رفتہ زیادہ ہوتی گئی۔ ہم ابھی سڑک سے دور تھے کہ موسلا دھار مینہ پڑنے لگا۔ بارش کا زور۔ ہوا کے جھکڑ نا ہموار مقام۔ رستہ چلنا مشکل ہو گیا میں نے کہا "ارے بھئی کوئی پناہ کی جگہ دیکھو"

بجلی اس زور سے کڑکی کہ ہم دونوں اچھل پڑے اور خوف سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ اسی وقت کسی کے چیخنے کی آواز آئی۔

اخلاق کچھ سنا تم نے؟

اخلاق: ہاں ایک ہلکی سی چیخنے کی آواز کسی عورت کی آواز تھی

اخلاق: کیا مرد بھی کے خوف سے چلایا کرتے ہیں؟ بے وقوف کہیں کے

نہیں جناب چلاتے نہیں صرف اچھل پڑتے ہیں

اخلاق: اوہو یہ اتفاقی بات تھی بے اختیاری میں ایسا ہو گیا۔

"خیر چلو دیکھیں کیا معاملہ ہے کدھر سے آواز آئی تھی۔ شاید بجلی سے ڈر کر کسی کے منہ سے چیخ نکل گئی" ایک چٹان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اخلاق نے کہا۔ ہم اسی طرف دوڑے۔ دھواں دھار پانی برس رہا تھا ہوا کے تیز جھونکوں سے قدم اکھڑے جاتے تھے۔ جا بجا گڑھوں میں پانی بھرا ہوا تھا ہم طوفان کا مقابلہ کرتے ہوئے چٹان کی طرف برابر بڑھتے رہے آخر بمشکل وہاں پہنچے۔ چٹان کی آڑ میں دو عورتیں گھٹنوں میں منہ چھپائے بیٹھی تھیں۔ ہوا اور بارش سے تو محفوظ تھیں لیکن خوف اور سردی سے ان کے جسم کانپ رہے تھے "جل تو جلال تو صاحب کمال تو آئی بلا کو ٹال تو" دونوں کی زبان پر جاری تھا۔

میں نے کہا اے دنیاوی جنت کی حورو۔ اے گلشن عالم کے خوشنما پھولو۔ اپنے سر اٹھاؤ۔ میری آواز سن کر دونوں بے ساختہ اچھل پڑیں گھٹنوں سے سر اٹھا کر دیکھا ان کی آنکھوں سے خوف و شک ظاہر تھا۔

میں نے کہا اگر آپ ہم سے ڈر گئیں ہیں تو ہم چلے جائیں۔
ایک نے کہا آپ کون ہیں ؟
آہ۔ یہ وہی قتالہ عالم تھی جس نے میرے دل کی دنیا میں ڈاکہ ڈالا۔ متاع صبر و سکون کو لوٹ لیا جس کی محبت نے مجھے فقیر بنا دیا۔ خیر قصہ مختصر میں نے کہا۔
ہم رحمت کے فرشتے ہیں خدا نے تمہاری مدد کو بھیجا ہے۔
لیکن اس طوفان میں آپ ہماری کیا مدد کر سکتے ہیں۔
جب تک بارش ہو ہم تمہارے پاس بیٹھ کر تمہارا دل بہلاتے رہیں۔ اگر یہ منظور نہ ہو تو ہمارے کوٹ اور برساتیاں پہن کر چلی جاؤ۔
اگر ہم آپ کے کوٹ اور برساتیاں لے کر چلے جائیں تو آپ کیا کریں گے۔
اخلاق:۔ ہم تمہاری جگہ بیٹھکر جل تو جلال تو پڑھتے رہیں گے۔
دوسری:۔ مذاق کر رہے ہیں آپ!
اخلاق:۔ اگر تم مذاق سمجھتی ہو تو ہم چلے جاتے ہیں۔ آؤ بھائی چلیں۔
دوسری:۔ بہت تیز مزاج ہیں آپ!
میں:۔ یہ کچھ ہی سمجھیں ہمیں اپنا فرض ادا کرنا چاہیئے۔ کہیئے ہم آپ کی کیا مدد کریں۔
پہلی:۔ جو آپ مناسب سمجھیں۔
میں:۔ اگر حکم ہو تو بارش کم ہونے تک یہیں ٹھیریں۔
پہلی:۔ آپ کی مرضی ہو۔
اخلاق نے ایک پتھر پر بیٹھتے ہوئے کہا یہ بجلی سے ڈر کر کون چیخا تھا۔
پہلی:۔ میری سہیلی فاطمہ۔
اخلاق:۔ بہت ڈرپوک ہیں یہ فاطمہ صاحبہ۔
میں:۔ ان کا نام تو معلوم ہو گیا۔ آپ کا اسم مبارک
بندی کو رضیہ کہتے ہیں۔ کیا میں اپنے محسنوں۔ اے تو یہ بھول گئی رحمت کے فرشتوں کے نام معلوم کر سکتی ہوں۔
میں:۔ غلام کو عابد کہتے ہیں اور میرے دوست کا نام اخلاق ہے۔
فاطمہ:۔ لیکن یہ تو بداخلاق معلوم ہوتے ہیں، مزاج میں تیزی بھی ہے۔ دیکھو نا واپس جا رہے تھے آپ۔ میں پوچھتی ہوں بلایا کس نے تھا آپ کو۔
اخلاق:۔ خوب نیکی برباد گناہ لازم۔ آپ کے چیخنے کا مطلب کیا تھا۔
فاطمہ:۔ یہ مطلب تھا کہ میں مدد کے لئے آپ کو بلا رہی ہوں۔
اخلاق:۔ اور نہیں تو کیا۔
رضیہ:۔ صاحب آپ کے دوست تو بڑے لڑاکا ہیں۔
نہیں ان کی طبیعت میں مذاق بہت زیادہ ہے۔ او ہو آپ تو سردی سے کانپ رہی ہیں لیجیے میرا کوٹ پہن لیجیے۔
میں نے اپنا کوٹ رضیہ کو اور اخلاق نے فاطمہ کو پہنا دیا۔
رضیہ:۔ میرے اللہ کیا آج مینہ نہ تھمے گا۔
میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا گھبرائیے نہیں بادل پھٹ گیا ہے اب مینہ رک جائے گا۔ دیکھئے وہ زور شور نہیں رہا۔
اخلاق:۔ ع الٰہی یہ گھٹا دو دن تو برسے۔
فاطمہ:۔ تو یہ ہی بارش تو تھمنے ہی کو نہیں کہتی بیٹھے بیٹھے ٹانگیں بھی جڑ گئیں۔
رضیہ:۔ چلیئے یہاں سے اب جی گھبرانے لگا۔ یہی ہو گا نا کہ بھیگ جائیں گے۔
میں:۔ جو حکم ہو ہمیں تو آپ کا فرمانبردار بنا کر بھیجا گیا ہے۔
بادل منتشر ہو چکے تھے بارش کم ہو گئی تھی ہلکی ہلکی پھوار میں ہم وہاں سے چل پڑے برساتیاں ہم نے سروں پر تان لیں میرے ساتھ رضیہ تھی اور اخلاق کے ساتھ فاطمہ۔ تھوڑا راستہ طے کیا تھا بوندیں بھی کم ہو گئیں جب ہم سڑک پر پہنچے تو سورج نہایت آب و تاب سے تیز اور گرم شعاعیں پھیلا رہا تھا۔ آبادی کے قریب رضیہ اور فاطمہ نے ہمارے کوٹ واپس دیدئے۔
میں:۔ کیا اس طرف جائیں گی آپ
رضیہ:۔ جی ہاں غریب خانہ اسی طرف ہے۔
میں:۔ کیا میں پھر ملاقات کی امید کر سکتا ہوں
رضیہ:۔ کیا آپ کو آسمان سے اترنے کی پھر اجازت مل جائے گی
میں:۔ ہاں چونکہ ہم رحمت کے فرشتے ہیں آ سکتے ہیں۔
رضیہ:۔ تیسرے پہر کو ہم دونوں اکثر اسی سڑک پر ٹہلتے ہیں جب آپ کا جی چاہے تشریف لائیے گا۔ ....
میں:۔ بہت اچھا ہم دونوں بھی ہر روز اسی سڑک پر صبح و شام سیر کیا کریں گے۔
رضیہ:۔ اچھا اجازت دیجے بہت دیر ہو گئی اماں جان بیٹھی ہولیں کھا رہی ہوں گی۔ آپ کی مہربانی کا بہت بہت شکریہ۔

اماں :- بیٹا اسی طرح گھر بستے ہیں اور شریف لوگ ایک دوسرے کو نباہ دیتے ہیں۔

میں :- یوں کسی نے نباہی تو کیا نباہی زندگی تو تلخ ہوگئی۔ آپ شادی کے جھگڑے کو ابھی رہنے دیں۔

یہ کہہ کر میں باہر چلا گیا۔ اماں جان نے خدا جانے والد سے کیا کہا رات کو جب گھر آیا تو انہوں نے ٹانگ لی رات کے بارہ بجے تک یہی قصہ رہا۔ میں کیوں کر اقرار کر لیتا رضیہ کی یاد میرے دل میں تھی میرے ضمیر نے اجازت نہ دی کہ میں عہد و پیماں کے خلاف شادی کر کے رضیہ سے بے وفائی کروں۔ میں رات بھر روتا رہا۔ صبح کچھ نوٹ اور روپے جو میرے بکس میں تھے جیب میں ڈال خدا کے بھروسہ پر گھر سے چل نکلا گرمی کا موسم آچکا تھا چند شہروں میں محبوب دلنواز کو تلاش کیا لیکن کہیں پتہ نہ ملا۔ اب گرمی کا زمانہ شباب پر تھا خیال آیا شملہ چلوں وہاں تو رضیہ سے ضرور ملاقات ہوگی دن پر دن ہفتے پر ہفتے مہینے پر مہینے گذر گئے لیکن میرے دل کی تاریکیوں کو روشن کرنے والی نظر نہ آئی۔ گرمیاں بھی ختم ہوگئیں۔ برسات کا زمانہ بھی گذر گیا لوگ شملہ سے چلے بھی گئے۔ میں مایوسیوں کے عالم میں پہاڑیوں سے سر ٹکراتا رہا۔ کوئی پتہ نشان معلوم نہیں کہاں جاؤں کدھر ڈھونڈوں۔ اخلاق بھی نہ ملا نہ کہیں فاطمہ نظر آئی ان سے ہی کچھ معلوم ہو جاتا گھر کس منہ سے جاؤں آخر حسرت و یاس کا اس قدر ہجوم ہوا کہ گھبرا کر جان دینے کا ارادہ کر لیا رات کو اسی خیال سے اونچی چٹان یا کھڈ کی تلاش میں نکلا کہ گر کر زندگی کا خاتمہ کر دوں کافی اندھیرا ہو چکا تھا میں اس جھونپڑی کے قریب پہونچا غم کی سوزش سے حلق خشک ہو گیا تھا میں نے سوچا اس جھونپڑی میں اگر کوئی ہو تو ذرا پانی سے حلق تر کر لوں آواز دی کوئی ہے اس جھونپڑی میں۔

جواب ملا اندر آجاؤ۔

میں اندر گیا ایک فقیر مرگ چھالا پر بیٹھا اللہ اللہ کر رہا تھا میں نے کہا پیاسا ہوں اگر پانی ہو تو پلاؤ۔

انہوں نے بیٹھنے کا اشارہ کیا چند منٹ بعد تسبیح ختم کر کے پانی دیا پوچھا کون ہو تم؟ اتنی رات گئے پہاڑیوں میں کیوں پھر رہے ہو تمہارے چہرے پر رنج کے آثار ہیں کیا ماجرا ہے۔

مجھ سے ضبط نہ ہو سکا آنسو نکل آئے میں نے کہا

شاہ صاحب۔ بدقسمت انسان ہوں پہاڑوں سے سر ٹکراتا پھرتا ہوں۔

فرمایا مفصل حال کہو

میں نے تمام کیفیت سنائی۔

کہا بیٹا خدا کے فضل سے تم سمجھدار ہو جانتے نہیں خودکشی اور مایوسی دونوں حرام ہیں خدا پر بھروسہ رکھو وہ چاہے گا تو سب کام بن جائیں گے ورنہ جس طرح زندگی گذرے گذارو۔ شاہ صاحب نے کچھ اس طرح سمجھایا کہ خودکشی کا خیال دل سے نکل گیا۔

میں نے کہا حضرت اب میرا کوئی ٹھکانا نہیں کہاں جاؤں۔

فرمایا ہمارے پاس رہو اللہ سے لو لگاؤ عشق مجازی تو کر چکے اب عشق حقیقی کی طرف آؤ۔ اس دن سے یہاں رہنے لگا۔ افسوس چھ مہینے بھی پورے نہ گذرے تھے کہ شاہ صاحب ہمیشہ کے لئے داغ مفارقت دے گئے۔ اب تنہائی کی زندگی بسر کرتا ہوں یہ تیسرا برس ہے سہ پہر کو روزانہ اس متبرک چٹان کی طرف محبوب کی تلاش میں جاتا ہوں اور ناکام واپس آتا ہوں حضرت یہ ہے میرا قصہ۔

بارش بند ہو چکی تھی حامد و ناصر نے ہمدردی ظاہر کرتے ہوئے جانے کی اجازت مانگی۔ دونوں وقتاً فوقتاً آتے رہنے کا اقرار کر کے عابد سے رخصت ہوئے۔

دوسرے دن صبح ناشتے کے وقت حامد نے کہا

ناصر بھائی آج میں تمہارے ساتھ سیر کو نہیں جا سکتا اگر تم چاہو تو تنہا چلے جاؤ۔

ناصر :- کیوں خیر تو ہے۔

حامد :- آج رضیہ کی طبیعت ذرا خراب ہے۔

ناصر :- ہاں یاد آیا تم نے کہا تھا۔ بہن عرصہ سے بیمار ہے۔ اب کیا حال ہے۔

حامد :- پچھلی رات سے گھبراہٹ اور بے چینی زیادہ ہے۔

ناصر :- یہ اسی کے کراہنے کی آواز تھی جو رات کو میرے کانوں میں آتی رہی۔ بھئی خفا نہ ہو تو ایک بات کہوں۔

حامد :- ایک نہیں دس

ناصر :- ممکن ہے آپ کے والد ناراض ہوں اس لئے کہ خیال ہی تو ہے غلط بھی ہوتا ہے۔ صحیح بھی۔ چچا جان اجازت دیں تو عرض کروں۔

رشید :- (حامد کے والد) بیٹا کہو ممکن ہے تمہارا خیال کچھ مفید ہو۔

ناصر:- حامد تم نے ابھی بہن کا کیا نام لیا تھا۔

حامد:- رضیہ۔ کیا تم نہیں جانتے۔

ناصر:- تمہیں یاد ہے شاہ صاحب نے کیا نام بتایا تھا

حامد:- تمہارا خیال یہ تو نہیں کہ وہ رضیہ یہی ہے

ناصر:- خوب سمجھے۔ برا نہ مانئے گا رات کو میں نے جو کراہنے کی آواز سنی اس میں ایسا درد تھا جو مریض محبت کے سوا کسی اور کی آواز میں نہیں ہو سکتا۔ یہ میرا خیال ہے۔

رشید:- میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا کون شاہ صاحب ہیں کیا قصہ ہے۔

ناصر نے شاہ صاحب کا واقعہ بیان کیا۔ سن کر کہا

بیٹا دنیا میں ہزاروں کا نام رضیہ ہے یہ کیسے خیال ہوا کہ وہ رضیہ یہی ہے میں جانتا ہوں اس کی ایک سہیلی کا نام فاطمہ بھی ہے کیا وہ وہی فاطمہ ہو سکتی ہے۔

ناصر:- اگر رضیہ کی کسی سہیلی کا نام فاطمہ بھی ہے تو یقیناً یہ وہی رضیہ ہے جس سے عابد کو محبت ہے آپ رضیہ سے دریافت تو کریں بہتر خیال میں یہ کام ان کی والدہ خوب کر سکتی ہیں اگر میرا خیال درست نکلا تو ہم آج ہی عابد کو پکڑ لائیں گے وہ شریف زادہ ہے رئیس کا بیٹا ہے کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔

رشید:- عابد۔ ساجد علی خاں کا بیٹا تو نہیں۔

ناصر:- ممکن ہے ان کے والد کا یہی نام ہو۔

رشید:- یہ گورکھ دھندا کچھ کھلتا جا رہا ہے۔ ساجد علی خاں کے فرزند کا نام بھی عابد علی خاں ہے اور وہ غالباً تیسرا برس ہے گھر سے غائب ہو گیا تھا اس لئے کہ وہ اپنی شادی کرنے پر رضامند نہ تھا لیکن یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ رضیہ سے محبت ہوتے ہوئے اس نے شادی سے انکار کیوں کیا۔؟

ناصر:- آپ نے ابھی اس کا قصہ سنا اسے معلوم ہی نہ تھا کہ شادی کہاں اور کس کے ساتھ ہو رہی ہے اگر یہ معلوم ہو جاتا کہ اس کی منگیتر رضیہ ہے تو خوشی سے پھولا نہ سماتا۔

رشید:- دیکھو میں ان کی والدہ سے ذکر کرتا ہوں۔

رضیہ کی والدہ چڑچڑے مزاج کی تھیں جب رشید صاحب نے ان سے ذکر کیا تو وہ تڑخ کر بولیں

لے۔ نوج دو پہار میری بیٹی ایسی کیوں ہوتی۔ ہو دیں کہنے والا کہ ہوتی سو تیا پا جھلسا دوں اس کے منہ کو جو میری بچی کا نام لیتے پھٹکار ہو اس موئے پر میری لاڈلی پر تہمت رکھے۔ خدا کا غضب ٹوٹے اس پر۔ اس کی ماں بہنیں نین مٹکاتی پھریں۔

رشید:- ارے بی سنو تو سہی تم تو ذرا سی بات میں آپے سے باہر ہو جاتی ہو۔

عقیلہ:- لو غضب اندھیر۔ یہ ذرا سی بات ہے تمہارے نزدیک۔ یہاں گھڑوں پانی پڑ گیا۔

رشید:- تمہاری تو مت الٹی ہے کوئی کتنی ہی بھلے کی کہے تمہاری سمجھ میں نہیں آتی

عقیلہ:- ہاں جی تمہارے بس میں ہیں جو چاہو کہو جو چاہو اوروں سے کہواؤ۔ میری اکیلی کی ماتا تو ہے نہیں، تمہاری بھی تو بیٹی ہے۔

رشید:- اس جہالت کو چھوڑو اگر تم اس کی زندگی چاہتی ہو تو جو کچھ میں نے کہا ہے اس سے پوچھ لو

رضیہ سے اس کی والدہ نے پیار و محبت سے جان کی قسمیں دے کر پوچھا تو اس نے بڑی مشکل سے عابد کی محبت کا اقرار کیا۔

رشید اسی وقت حامد و ناصر کے ساتھ عابد کے پاس گئے۔

رشید:- السلام علیکم۔

عابد:- وعلیکم السلام۔ آئیے کیسے قدم رنجہ فرمایا۔

رشید:- حضرت۔ ان دونوں سے آپ کے زہد و تقویٰ کی بہت تعریف سنی۔ قدم بوسی کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ اور ایک غرض بھی ہے۔

عابد:- آپ بزرگ ہیں مجھے کیوں کانٹوں میں گھسیٹتے ہیں۔ میں کس قابل ہوں۔

رشید:- یہ آپ کی کسر نفسی ہے۔ مدعا یہ ہے کہ میری بیٹی عرصے سے بیمار ہے ہر قسم کا علاج کیا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اب دوا سے اکتا کر دعا کی طرف خیال ہوا ہے آپ اسے دیکھ لیں کچھ پڑھ کر دم کریں خدا سے دعا کریں ممکن ہے صحت ہو جائے آپ کو تکلیف تو ضرور ہوگی۔

عابد:- حضرت میں اس قابل کہاں ایک گنہگار خدا کا نافرمان بندہ ہوں میری دعا سے کیا ہوگا؟

رشید:- ہماری تسلی ہو جائے گی۔ بس آپ تشریف لے چلیں۔

حامد و ناصر نے بھی کہا عابد ان کے اصرار سے مجبور ہو کر ان کے ساتھ ہو لیا۔

عابد کو رضیہ کے کمرے میں پہنچا کر مسٹر رشید کسی بہانے سے باہر آ گئے۔ رضیہ آنکھیں بند کئے لیٹی تھی بیماری سے صورت بہت کچھ بدل گئی تھی پھر بھی عابد نے پہچان لیا۔ مدت کی جدائی کے بعد خلاف امید جب گمان بھی نہ ہو۔ اچانک ایک فراق نصیب اپنے محبوب دلنواز کو دیکھے تو دل کی کیا کیفیت ہو گی۔ تعجب نہ تھا کہ جوش شادی مرگ ہو جاتا جوش مسرت سے دوران خون تیز ہو جانے کے باعث سر چکرایا اور بے ہوشی طاری ہو گئی لیکن چند منٹ کے بعد رضیہ کے کراہنے اور سرد آہوں نے اسے ہوشیار کر دیا ہوش و حواس درست ہونے کے بعد عابد نے بہت سوچا گفتگو کا کوئی پہلو سمجھ میں نہ آیا یکایک پہلی ملاقات کے واقعات خیال میں آئے اس نے جل تو جلال تو پڑھ پڑھ کر رضیہ پر دم کرنا شروع کیا

آواز گوش آشنا معلوم ہوئی تو رضیہ نے آنکھیں کھول کر غور سے دیکھا لیکن ڈاڑھی اور لمبے بالوں کی وجہ سے نہ پہچان سکی۔ دماغ پر بہت زور دیا۔ یا اللہ یہ آواز تو بالکل عابد کی سی معلوم ہوتی ہے لیکن یہ حضرت ہیں کون۔ جل تو جلال تو پڑھ کر دم کرنے سے ان کا کیا مقصد ہے آخر کچھ سمجھ میں نہ آیا تو کہا

حضرت آپ کون ہیں اور یہاں کیسے تشریف لائے۔

عابد:۔ ہم ہیں رحمت کے فرشتے۔ تمہارا علاج کرنے آئے ہیں۔

(عابد نے اس خیال سے مذاق شروع کر دیا کہ یکایک نام بتانے کا اثر شاید برا ہو گفتگو کے اس پہلو سے خود پہچان لے

"رحمت کے فرشتے" "جل تو جلال تو" ان فقروں سے عابد کی پہلی ملاقات کا منظر اس کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ اس نے دل میں کہا یا اللہ کیا یہ عابد ہے ممکن ہے محبت کی ناکامیوں نے اسے فقیر بنا دیا ہو۔

شاہ صاحب آپ کا اسم گرامی

عابد:۔ تم کو میرے نام سے کیا کام ہے بس میں حکم دیتا ہوں کہ تم اچھی ہو جاؤ۔

رضیہ:۔ خوب یہ بھی میرے بس کی بات ہے۔ گویا میں بہانہ کر رہی ہوں۔

عابد:۔ تمہارے بس میں نہیں تو میرے بس میں تو ہے۔ کیوں کہ ہم ٹھیرے رحمت کے فرشتے۔ جل تو جلال تو صاحب کمال تو آئی بلا کو ٹال تو۔ اللہ شافی چھو چھو چھو۔

عابد کی ان حرکتوں سے رضیہ سمجھ گئی کہ یہ حضرت وہی ہیں لیکن وہ ان کی زبان سے سننے کی مشتاق تھی۔

رضیہ:۔ مہربانی کر کے اس چھو چھا سے مجھے پریشان نہ کیجے اپنا نام بتائیے۔

عابد:۔ تم اچھی ہو جاؤ تو میں نام بتا دوں

رضیہ:۔ آپ نام بتا دیں میں اچھی ہو جاؤں گی

عابد:۔ خوب کیا میرے نام میں تاثیر شفا ہے۔

رضیہ:۔ ممکن تو ہے

عابد:۔ اچھا سنو میرا نام ہے دباغ شاہ۔ کیا اچھی ہو گئی ہو تم چہرے پہ بحالی تو معلوم ہوتی ہے

رضیہ ناسمجھ نہ تھی تعلیم یافتہ تھی فوراً سمجھ گئی حضرت نے عابد کو الٹ کر دباغ نام بتایا ہے یہ مذاق کر رہے ہیں یوں سیدھے نہیں ہوں گے۔ عابد کی طرف سے کروٹ لے لی

غالباً اب آپ کی طبیعت درست ہو گئی ہو گی میں نے نام بھی بتا دیا ...... بتائیے نا اب مزاج کیسا ہے ...... سن رہی ہیں آپ میں کیا کہہ رہا ہوں ...... کیا خفا ہو گئیں۔ رضیہ رضیہ خدا کے لئے بولو۔ ایک دکھے ہوئے دل کو تسکین دو۔ تین برس پہاڑوں سے سر ٹکرانے کے بعد آج تمہاری پیاری صورت نظر آئی ہے بولو بولو ادھر دیکھو لو میں بتائے دیتا ہوں میں وہی تمہاری زلفوں کا اسیر عابد ہوں۔ بولو للہ اپنے بدنصیب عاشق پر رحم کرو

عابد کرسی سے اٹھا اس کے چہرے کی طرف جھکا رضیہ سسکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔

ہیں تم رو رہی ہو رضیہ میری باتیں ناگوار ہوئیں آہ میں بہت بدقسمت ہوں للہ میرا قصور معاف کر دو آہ شومئ بخت کا دنیا میں نہیں کوئی علاج۔ نہ بولو۔ خیر اللہ تم کو ہمیشہ خوش رکھے۔ خدا حافظ۔

عابد روتا ہوا جانے کے لئے دروازے کی طرف مڑتا ہے۔ رضیہ پلنگ پر بیٹھتے ہوئے کہتی ہے ٹھیرو عابد ٹھیرو۔

عابد:۔ ہاں کہو کیا کہتی ہو۔ کیا میرا قصور معاف کر دیا۔

رضیہ:۔ کیسا قصور کس کا قصور۔ عابد جوش مسرت نے مجھے مدہوش

کر دیا ہے میں آپے سے باہر ہوں تم سوال پر سوال کئے جاتے ہو ذرا تو حواس ٹھکانے ہو جائیں۔

عابد:۔ کیا سچ مچ تم خفا نہیں ہو

رضیہ:۔ عابد جس کا صرف نام میرے لئے آرام جاں ہو اس سے خفا ہو سکتی ہوں۔ یہ تمہاری محبت ہے جس نے میرا یہ حال کر دیا زندہ درگور ہوں پلنگ سے اٹھنے کی بھی طاقت نہ رہی۔ ہڈی سے چمڑا الگ گیا۔ سوکھ کر کانٹا ہو گئی۔

عابد:۔ رضیہ یہ خوشی کا موقع ہے اور رو رہی ہو۔

رضیہ:۔ عابد یہ غم کا رونا نہیں یہ خوشی کے آنسو ہیں اس وقت خوشی کے مارے میرا دل بلیوں اچھل رہا ہے۔

عابد:۔ ہاں ٹھیک کہتی ہو جب تمہارے والد مجھے یہاں تنہا چھوڑ کر چلے گئے تو تمہاری صورت دیکھ کر جو کیفیت مجھ پر طاری ہوئی وہ بیان نہیں کر سکتا۔

رضیہ:۔ یہ آپ نے فقیری کیوں اختیار کی ہے۔

عابد:۔ بدل کر فقیروں کا ہم بھیس عابد۔ تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں
اگر فقیر نہ بنتا تو یہاں تک کیسے پہنچتا۔ لائیے کچھ حسن کی خیرات دلوائیے۔

رضیہ:۔ میرے پاس کیا دھرا ہے اپنی جان اپنا دل۔ صبر و سکون ہوش و حواس تاب و تواں سب کچھ آپ کے حوالے کر چکی ہوں ایک یہ جسم خاکی ہے آپ چاہیں تو اسے بھی حاصل کر سکتے ہیں۔

عابد:۔ آہ رضیہ میں گھر سے نکل کر بالکل فقیر ہو گیا ہوں ایسی حالت میں تمہارے والد شاید ہی منظور کریں لیکن میں قسمت آزمائی کروں گا۔

رشید، حامد اور ناصر کھنکارتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے رضیہ نے شرما کر آنکھیں نیچی کر لیں

رشید:۔ بیٹا شاہ صاحب کے دم کرنے سے کچھ گھبراہٹ کم ہوئی ...... شرماؤ نہیں جو حال ہو صاف صاف کہو۔

رضیہ:۔ ابا جان پہلے سے کسی قدر کم ہے

ناصر:۔ شاہ صاحب پورے ولی ہیں فقیر کامل ہیں۔ ان کے علاج سے انشاء اللہ بہت جلد تندرست ہو جاؤ گی۔ بھائی حامد دیکھئے صورت سے ظاہر ہے آج ہی آدھا مرض کم ہو گیا۔

ناصر کی زبان سے یہ چبھتا ہوا فقرہ سن کر رضیہ تاڑ گئی کہ سب کو میری اور عابد کی محبت کا حال معلوم ہے اسے اتنی غیرت آئی کہ دوپٹہ منہ پر لپیٹ کر پڑ گئی۔

رشید:۔ چلئے اب اسے کچھ دیر آرام کرنے دیجئے۔

باہر آ کر ایک کمرہ جو اسی وقت تجویز ہوا تھا عابد کو رہنے کے لئے دیدیا گیا۔ اس کے والد کو تمام واقعات لکھ دئے گئے۔ ایک ہفتہ بعد عابد کے والدین شملہ آ پہونچے والدہ عابد سے لپٹ لپٹ کر خوب روئیں۔ جب دل کی بھڑاس نکل چکی تو کہا۔

بیٹا اب تم یہاں شادی کرنے پر کیسے رضامند ہو گئے پہلے کیا بلی نے چھینک دیا تھا۔

عابد:۔ کیا کہیں میری شادی کر رہی تھیں آپ۔

والدہ:۔ اور کیا تم کسی بھنگی چمار کی بیٹی سمجھے تھے۔

عابد:۔ مجھے کیا خبر تھی۔ کچھ دن کی ٹھوکریں کھانی تھیں قسمت کا لکھا پورا ہوا۔

والدہ:۔ تمہارے نکل جانے پر خدا ہی کو روشن ہے جو ہمارے دل پر بیتی۔

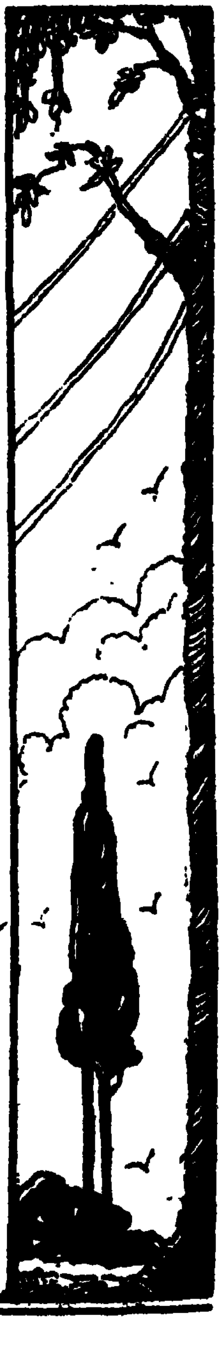
عابد:۔ اماں جان مجھ سے غلطی ہوئی خدا کے لئے معاف کر دیجے

والدہ:۔ خیر بیٹا جو ہوا سو ہوا۔ (عابد کا کان پکڑ کر) دیکھو اب نہ کہیں بھاگ جانا۔ کل تمہارا نکاح ہے ✣ ۔

(منشی محمد صدیق مجنوں دہلوی)

مطالبات

از حضرت کوکب شاہجہاں پوری



نگاہِ محبت فزا چاہتا ہوں
مسافر ہوں اک رہنما چاہتا ہوں

تجلّی نظر آشنا چاہتا ہوں
تجھے جلوہ گر دیکھنا چاہتا ہوں

ستم چاہتا ہوں جفا چاہتا ہوں
کہ مشقِ طریقِ وفا چاہتا ہوں

نہ پوچھے کوئی مجھ سے کیا چاہتا ہوں
کہ اپنے کیے کی سزا چاہتا ہوں

ابھی خام ہے کچھ مذاقِ تمنّا
کرم ہائے صبر آزما چاہتا ہوں

مجھے کوئی کافر مسلمان کر دے
مجازِ حقیقت ادا چاہتا ہوں

دلا دے کوئی یاد، بھولا ہوں کس کو
بتا دے کوئی، ہائے کیا چاہتا ہوں

خریدار ہے کون دنیا میں دل کا
کہاں اور کیا بیچنا چاہتا ہوں

خطا پر ندامت خطا در خطا ہے
خطا کر کے دادِ خطا چاہتا ہوں

کیا ہے محبت نے گستاخ کتنا
کہ تجھ سے تجھے مانگنا چاہتا ہوں

ہوس چاہتی ہے تجلّیِ عریاں
مگر میں نگاہِ رسا چاہتا ہوں

جو قیدِ مجاز و حقیقت اُٹھا دے
وہ کیفیّتِ دل کشا چاہتا ہوں

تمنا مری اور محدود کوکب
مقامِ وراء الورا چاہتا ہوں

مزاحیہ

ڈاکٹر!

ہندوستان میں تعلیم اور تپ دق دونوں کی ترقیاں کچھ اس طرح ساتھ ساتھ جا رہی ہیں کہ یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ میڈیکل کالجوں سے ہر سال ڈاکٹر زیادہ برآمد ہوتے ہیں۔ یا ہر سال دق کے مریض قبرستانوں میں زیادہ داخل ہوتے ہیں۔ بہرحال بظاہر تو ڈاکٹروں ہی کی تعداد زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے کہ دق کے مریض شہرت پسند نہیں ہوتے۔ اور نہ اپنے سائن بورڈ پر اپنا مرض لکھتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹروں کے سائن بورڈ تو اس کثرت سے نظر آتے ہیں۔ کہ قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ آخر اتنے ڈاکٹروں کو مریض کہاں سے ملتے ہوں گے اور اگر اتنے ڈاکٹروں کے تناسب سے اس ملک کے لوگ بیمار بھی ہوتے ہیں تو آخر یہ محکمہ حفظان صحت کس مرض کی دوا ہے۔ دراصل ڈاکٹروں کی کثرت سے صرف دو ہی نتیجے نکلتے ہیں۔ اوّل یہ کہ اس ملک کی سو فیصدی آبادی دائم المریض ہے۔ دوسرے یہ کہ ڈاکٹر ڈاکٹری پاس کرنے کے بعد طبابت کے بجائے کوئی دستکاری سیکھنے پر مجبور ہوتے ہوں گے۔ یا پولیس میں بھرتی ہو جاتے ہوں گے یا کسی فلم کمپنی میں نوکری کر لیتے ہوں گے۔ اس لئے کہ ڈاکٹروں کا تو یہ حال ہے کہ پیسے کے دو کا کھلا ہوا نرخ ہے۔ کسی گلی کوچے میں چلے جائیے۔ وہاں آپ کو ایک آدھ ڈاکٹر ضرور مل جائیگا۔ ایم۔بی۔بی ایس نہ سہی ایل ایم۔پی۔ سہی ورنہ ہومیوپیتھک والے ایچ۔ایم۔پی تو ضرور ہی مل جائیں گے اور یہ سب گویا ان ڈاکٹروں کے علاوہ ہوں گے۔ جو سرکاری اسپتالوں میں مفت علاج کرنے اور مفت علاج کے ساتھ ساتھ مفت دوا بھی دینے کے لئے مقرر ہوتے ہیں۔ اب بتائیے آخر ان سب کو مریض کہاں سے ملتے ہوں گے۔ اور ان کی ڈاکٹری کیونکر چلتی ہوگی۔ سرکاری ملازمت محدود ہے اور ڈاکٹروں کی تعداد لامحدود۔ نتیجہ یہ ہے کہ چند تو سرکاری ڈاکٹر ہو جاتے ہیں۔ باقی سب بیوپاری ڈاکٹر بنکر پرائیوٹ پریکٹس کرتے ہیں اور بالکل تجارت کے اصول پر اپنی ڈاکٹری چلاتے ہیں

ان بیچاروں کی گھریلو زندگی کیا ہوتی ہے۔ اس کو دراصل باہر والے سمجھ ہی نہیں سکتے اور خود ہم کو بھی وہ بجی حالات قیامت تک معلوم نہ ہوتے اگر اسی قسم کے ایک پرائیویٹ ڈاکٹر صاحب ہمارے پڑوسی نہ ہوتے۔

ہمارے یہ پڑوسی ڈاکٹر صاحب اچھے خاصے مکان میں اچھی خاصی آن بان کے ساتھ رہتے تھے۔ مطب میں فرنیچر بھی اچھا خاصا تھا اور سوٹ بھی باقاعدہ پہنتے تھے۔ موٹر گو سکینڈ ہینڈ کے درجے میں گذر کر تھرڈ ہینڈ ہو چکی تھی۔ اور اس کو بیک نظر دیکھ کر وثوق کے ساتھ موٹر کہنا دشوار تھا۔ مگر ہم کو معلوم ہے کہ وہ موٹر تھی ضرور اور اگر اس میں پٹرول ڈال دیا جاتا تھا تو چلتی بھی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ آواز اور رفتار کے اعتبار سے وہ کسی لاری اور چھکڑے کی سول میرج کی زندہ یادگار نظر آتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کے سائن بورڈ پر ڈاکٹری کی ڈگری کا حوالہ بھی تھا۔ اور خود ہم نے مزید تصدیق کرنے کے لئے وہ ڈگری بھی ان کے مطب میں آویزاں دیکھ لی تھی۔ جس کے بعد یہ تو گویا طے ہی ہو گیا تھا کہ وہ سند یافتہ ڈاکٹر ہیں اب رہ گیا اس ڈاکٹری کا چلنا اس کو ہم نے ہمیشہ ان کی موٹر کی طرح چلتے دیکھا۔ اول تو آپ کے مطب میں مریض ہی کم نظر آتے تھے۔ اور جو کوئی نامراد ایک مرتبہ نظر بھی آیا تو دوسری مرتبہ اس کو دیکھنے کے لئے آنکھیں ترس جاتی تھیں اس سلسلہ میں روایات ذرا مختلف ہیں۔ خود ڈاکٹر صاحب کا بیان یہ ہے کہ ایک ہی نسخہ میں چونکہ مریض بالکل تندرست ہو جاتا ہے۔ لہٰذا وہ لوٹ کر نہیں آتا۔ اور ان کی بیوی جو اخراجات کے سلسلہ میں مشکلات کا شکار رہتی تھیں۔ اس بیان کی تردید کرتی تھیں بلکہ ان کا خیال یہ تھا۔ کہ چونکہ مریض تمہارا علاج کرتے ہی مر جاتا ہے۔ لہٰذا اس کو دوسری مرتبہ مطب آنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ ان دو بیانات میں انیسا نہ بعد

تضاد ہے کہ ایک غیر متعلق آدمی نہ ڈاکٹر صاحب کی تائید کرسکتا ہے نہ ان کی بیوی کی رائے سے متفق ہو سکتا ہے۔ بہرحال ڈاکٹر صاحب کی ظاہری شان و شوکت دیکھنے والے خواہ ان کو کچھ ہی سمجھتے ہوں مگر ہم تو روزانہ ان کے گھر کے جھگڑے سنا کرتے تھے۔ لہذا ہم جانتے تھے اس خوبصورت غلاف میں کس قدر بدصورت تصویر ہے اور اس عظیم الشان ڈھول میں کیسا زبردست پول ہے قصہ دراصل یہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب کی اہلیہ محترمہ ذرا کھاتے پیتے گھرانے کی تھیں۔ مگر ڈاکٹر صاحب اپنا سب کچھ اپنی تعلیم پر صرف کرنے کے بعد صرف ڈاکٹر بنے تھے اور ڈاکٹری کی بجائے اپنی بیوی کے زیورات کے رہین منت تھے۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ عورت زیور کو کیا سمجھتی ہے اور کن حالات کے ماتحت کس طرح زیور کو جدا کرسکتی ہے اور اس امتحان میں کس حد تک ثابت قدم رہ سکتی ہے بہرحال واقعات کچھ ایسے تھے کہ بیوی اپنی جان سے بیزار تھیں اور ڈاکٹر صاحب مکاندار سے شرمندہ تھے۔ جس کا کرایہ اس حد تک چڑھ چکا تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے اس سے منہ چھپانا شروع کردیا تھا گھر میں ہیں تو کہلوا دیا کہ مریض کو دیکھنے گئے ہیں، راستہ یا گلی میں ملاقات ہوگئی تو بس ایک گھنٹہ کا وعدہ کرکے ٹال دیا اس کے ڈر کے مارے مطب میں بیٹھنا چھوڑ چکے تھے اور باہر نکلتے بھی تھے تو ذرا چوکنا اور مالک مکان سے نظر بھی بچاتے ہوئے آخر ایک روز جب مکاندار نے کچھ نامناسب طریقہ پر دروازہ پر کچھ غیر طبّی کلمات کہے تو ڈاکٹر صاحب کی بیوی کا پیمانہ صبر لبریز ہوگیا اور اس دن ہم کو یہ معلوم ہوا کہ ایک ڈاکٹر کی گھریلو اور بیرونی زندگی میں کیا فرق ہوتا

فکرِ ناتمام

فروغِ موجِ مے دشعلۂ رنگِ حنائی تو
چھلکی جاتی ہے چھاتی دستِ ساقی میں گلابی کی

ذرا کچھ اور گہرا رنگ دے چشمِ گلابی کو
بہت کچھ میری فطرت میں ہے گنجائش خرابی کی

نظر ملتے ہی تجدید تمنا ہو گئی ساغر
نگاہِ حسن نے بنیاد پھر رکھدی خرابی کی

(ساغر نظامی)

ہے مکاندار کو تو خیر کسی نہ کسی طرح ٹال دیا۔ مگر بیوی نے فیصلہ کن انداز سے ڈاکٹر صاحب سے کہا۔

"میں پوچھتی ہوں آخر کب تک یہ بہانہ بازیاں ہونگی اور ایک اسی پر کیا ہے۔ ہر کام میں دقت ہو رہی ہے بچوں کے اسکول کی فیس۔ بیمہ کمپنی کی قسط آپ کی کتابوں کی قیمت۔ بزاز کے دام ایک بات ہو تو کہی جائے۔ میں تو ہر وقت کے تقاضوں سے تنگ آگئی ہوں۔ مگر روپیہ کی صورت کہیں سے نظر نہیں آتی"

ڈاکٹر صاحب سعادتمندی کے ساتھ سنتے رہے اور اس کے بعد نہایت پریشانی کے ساتھ کہا۔

"آخر تم ہی بتاؤ میں کیا کروں میں ڈاکٹر ہوں ڈاکٹری سند موجود ہے۔ مطب کرتا ہوں۔ نبض دیکھ لیتا ہوں۔ آپریشن کرسکتا ہوں۔ مگر حال یہ ہے کہ مہینوں کوئی مریض ہی نہیں آتا آخر میں مریضوں کو کہاں سے لاؤں۔ اگر کسی بازار میں مریض ملتے ہوتے تو شاید وہیں سے لے آتا"

بیوی نے بلکر کہا۔ "تو پھر اس ڈاکٹری کمبخت کو چھوڑو نا آخر کب تک یونہی ایڑیاں رگڑی جائینگی"

ڈاکٹر صاحب نے معصومیت کے ساتھ کہا "ڈاکٹر ہوکر ڈاکٹری کو کیسے چھوڑ دوں۔ آج تک کسی ڈاکٹر نے یہ بھی نہ کیا ہوگا کہ پاس کرے ڈاکٹری اور شروع کردے ٹکٹ کلکٹری یا سب رجسٹراری"

بیوی نے کہا "پھر آخر بات کیا ہے کہ تم کو ڈاکٹری سے کوئی آمدنی نہیں ہوتی"

ڈاکٹر صاحب نے کہا "ایک مجھ ہی پر کیا منحصر ہے اسی

سڑک پر چار ڈاکٹر اور تین ہومیوپیتھک کے ڈاکٹر رہتے ہیں اور میں تو ان میں سے ہر ایک کے مطب میں سناٹا ہی دیکھتا ہوں۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ بدقسمتی سے اس شہر کی آب و ہوا نہایت اچھی ہے اور یہ بھی ہمارا مقدر کہ کوئی وبائی مرض بھی یہاں شروع نہیں ہوتا۔ اور کچھ دنوں کے لئے ذرا ہیضہ شروع ہو گیا تھا۔ تو تم نے دیکھا ہو گا کہ مکاندار کا کرایہ بالکل ٹھیک وقت پر دیا گیا۔ اور خود تم اس زمانے میں بیحد خوش نظر آتی تھیں۔ مگر یہ قسمت کی گردش ہی تو ہے کہ جب سے وہ ہیضہ گیا ہے۔ آج تک اس شہر میں کسی کو چھینک تک نہیں آئی۔ ورنہ میرے پاس کوئی تو مرا کھپا آتا۔"

بیوی نے کہا "اور جو تم سوداگر صاحب کے لڑکے کا علاج کر رہے تھے۔ ان سے تو کبھی کبھی کچھ مل ہی جاتا تھا۔"

ڈاکٹر صاحب نے گردن جھکا کر کہا "وہ غریب مر گیا!"

بیوی نے کہا "اور وہ سیٹھ جی کی بہو بھی کیا تم نے مار ڈالی؟"

ڈاکٹر صاحب نے سر اونچا کر کے کہا "نہیں صاحب وہ کمبخت تو حیرت انگیز طریقہ پر اچھی ہو گئی میں نے لاکھ لاکھ اس کو جھولانا چاہا۔ اور مرض کو ایک حالت پر قایم کر دینے کی ہر تدبیر کی مگر وہ ایسی بے حیا کہ اس کو ہر وہ دوا فائدہ کرنے لگی۔ جس سے کہ نقصان ہونا چاہئے تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بالکل اچھی ہو کر چلی گئی۔ دراصل یہ تمام باتیں مقدرات سے ہوتی ہیں۔"

بیوی نے کہا "تو کیا آج کل کوئی بھی مریض نہیں ہے؟"

ڈاکٹر صاحب نے کہا "دو مریض ہیں۔ ایک تو بیچارہ اس قدر غریب ہے کہ علاج کے علاوہ اس کی کچھ مالی امداد بھی کرنا چاہئے اور دوسرے صاحب کل ملے ہیں ان سے ذرا امید ہے۔ سنا ہے کہ مالی حالت اچھی ہے اور آنتوں کی دق میں مبتلا ہیں۔ تمام ڈاکٹروں نے آنتوں کی دق تجویز کر کے ان کو مایوس کر دیا تھا۔ مگر میں نے محض ضعف معدہ تجویز کر کے ان کو ذرا اٹکا لیا ہے کل تو وہ خود مطب میں آئے تھے۔ مگر میں نے ان سے کہدیا ہے کہ آپ کے لئے نقل و حرکت مضر ہے لہذا امید ہے کہ اب وہ مجھ ہی کو بلائیں گے۔ اور میں ان کا اس قابلیت سے انشاء اللہ علاج کروں گا کہ ــــ"

بیوی نے بات کاٹ کر کہا کہ وہ جلدی سے اچھے ہو کر چلے جائیں تو یہ سلسلہ بھی جائے۔

ڈاکٹر صاحب نے جھلا کر کہا "اجی لاحول ولاقوۃ پہلے پوری بات تو سن لیا کرو۔ قابلیت سے علاج کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انکو اپنا معتقد بناؤں گا۔ دو نسخوں سے فائدہ ہوا۔ تو تیسرے دن پھر ان کو اس قابل بنا دیا کہ وہ فوراً مجھکو بلائیں پھر ذرا ان کی حالت میں سکون پیدا کر دیا اور پھر اپنی فیس کے حالات پیدا کر دیے۔ اگر یہ سلسلہ کچھ دن چل گیا۔ تو مکان کا کرایہ پورا انشاء اللہ ادا ہو جائے گا۔ اس لئے کہ مریض کی حالت ایسی ہے کہ اس کو کچھ دنوں اسی مد و جزر میں رکھا جائے۔"

بیوی نے کہا "میں تو اس کمبخت ڈاکٹری کو خدا جانے کیا سمجھا کرتی تھی اور ڈاکٹروں کی آمدنی میرے خیال میں ہمیشہ بہت ہی زیادہ ہوتی تھی۔ مگر میں پوچھتی ہوں کہ آخر یہ جو بہت بڑے بڑے ڈاکٹر ہیں ان کو آخر مریض کہاں سے ملجاتے ہیں۔"

ڈاکٹر صاحب نے کہا "اوہو۔ یہ تمہارے سمجھنے کی چیز نہیں۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ روپیہ روپیہ کو کھینچتا ہے۔ وہ اعلےٰ درجہ کی کوٹھی میں رہتے ہیں۔ اور فضول بھی اپنے موٹر کو دوڑاتے رہتے ہیں۔ تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ ڈاکٹری چل رہی ہے حالانکہ محض موٹر چلتی ہے۔ ڈاکٹری اتنی نہیں چلتی مگر رفتہ رفتہ موٹر کی طرح ڈاکٹری بھی چلنے لگتی ہے۔ اب اگر میں اسی طرح موٹر دوڑاؤں۔ تو جس طرح مکاندار نے جینا دوبھر کر دیا ہے اسی طرح پٹرول کا ناطقہ بند کر دیں اور موٹر روزانہ کارخانہ میں مرمت کے لئے کھڑی ہوئی نظر آئے۔ یوں جب میں اس پر نکلتا ہوں تو لوگ دور دور تک کھڑے دیکھتے ہیں کہ یہ کیا چیز ہے۔"

بیوی کچھ کہنا چاہتی تھیں کہ باہر سے ڈاکٹر صاحب کو کسی نے آواز دی اور ڈاکٹر صاحب نے گڑبڑا کر اٹھتے ہوئے کہا۔ "وہی مریض ہے جس کا میں ابھی ذکر کر رہا تھا۔ ذرا اس سے کہلوا دیجئے کہ ڈاکٹر صاحب مریضوں کو دیکھنے گئے ہیں آتے ہی ہوں گے۔ آپ مطب میں بیٹھئے اتنی دیر میں کپڑے پہن کر پشت کے دروازہ سے نکل جاؤں گا۔"

یہ کہہ کر ڈاکٹر صاحب اُدھر کپڑے پہننے لگے اور ادھر بیوی نے

کپڑے پہننے شروع کئے کہ آج ڈاکٹر صاحب کے مطب کی سیر کریں گے۔ اور ان کی یہ گھریلو حالت دیکھنے کے بعد ان کے مطب کی شان دیکھیں گے۔ چنانچہ جس وقت ہم پہنچے ہیں۔ اس وقت تک ڈاکٹر صاحب مطب میں تشریف نہیں لاتے تھے۔ اور ہم کو اسی مریض سے ڈاکٹر صاحب کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ مریضوں کے دیکھنے کے لئے تشریف لے گئے ہیں۔ مگر ہمارے پہنچنے کے بعد ہی ڈاکٹر صاحب اپنا ہینڈ بیگ لئے ہوئے اس طرح تشریف لے آئے کہ گویا واقعی سیکڑوں مریضوں کو دیکھ کر آرہے ہیں۔ مطب میں آتے ہی آپ نے حیرت سے اس مریض کو دیکھ کر کہا۔ آپ غالباً وہ مریض ہیں جن کے متعلق میں نے مشورہ دیا تھا کہ آپ نقل و حرکت نہ کریں گے۔"

مریض نے کہا "جی ہاں میں وہی ہوں۔ مگر میں نے آپ کے حکم کی خلاف ورزی اس لئے کی کہ آج مجھ کو یوں بھی اٹھنا ہی تھا اس لئے کہ ایک مقدمہ کی آج پیشی ہے۔ لہذا میں نے کہا کہ آپ کو بھی دکھا دوں۔"

ڈاکٹر صاحب نے اپنے چہرہ پر خطرہ کی زنجیر لٹکاتے ہوئے کہا مگر جناب زندگی اور تندرستی سب سے مقدم ہے۔ بہر حال یہ میرا مشورہ ہے کہ آپ نقل و حرکت نہ کریں۔ ورنہ جو چیز آج محض ضعف معدہ ہے وہی ترقی کر کے آنتوں کو زخمی کر سکتی ہے اور دو سرے ڈاکٹروں نے جو کچھ کہا ہے وہ صحیح ہو سکتا ہے۔"

مریض نے کہا۔ میں آئندہ احتیاط رکھوں گا۔ مگر آج دیکھ لیجئے۔"

ڈاکٹر صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا "مجھے دیکھنے میں کوئی عذر نہیں۔ مگر دیکھنے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اس لئے کہ نقل و حرکت کے بعد آپ کے تمام نظام میں ایک ہیجانی کیفیت ہوگی اور اس ہیجانی کیفیت میں کچھ سمجھ نہ سکوں گا۔"

ہم نے ڈاکٹر صاحب کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔ چلنے پھرنے سے تو واقعی ضعف معدہ نہایت خطرناک ہو جاتا ہے اکثر آنتیں الٹ جاتی ہیں اور معدہ کا منہ پھر جاتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ جی ہاں میرے پاس ابھی چار دن پہلے ایک مریض تھا اس نے چلنا پھرنا نہیں چھوڑا نتیجہ یہ ہوا کہ ضعف نے پیٹ کی دق کی شکل اختیار کر لی ہے اب وہ مہلک پیچش شروع ہو گئی ہے۔ جس کا علاج لقمان کے پاس بھی نہیں ہے۔ میں ان کے سلسلے میں اسی لئے ڈرتا ہوں۔ حالانکہ پھر میرے لئے وقت ہو جائے گی کہ وقت نکال کر ان کے دیکھنے کو جاؤں اس لئے کہ آج کل تو مریضوں کی کثرت کی وجہ سے وقت ہی نہیں ملتا۔ صبح چھ بجے کا نکلا ہوا۔ اب آیا ہوں اور اب پھر جا کر غالباً رات کے دس بجے چھٹی ملے گی۔

مگر جس طرح بھی ہوگا، ان کو دیکھوں گا۔ مجھ کو تو ان کا علاج کر کے یہ بتانا ہے کہ ذرا سی بات کو یہ ڈاکٹر محض فیس وصول کرنے کے لئے کس قدر خوفناک ثابت کرتے ہیں۔ آپ آپ کو ذرا سخت قسم کا ضعف معدہ ہے۔ اس کو دق تجویز کر دیا ہے!"

مختصر یہ کہ اس مریض کو ڈاکٹر صاحب نے یوں ہی ٹال دیا معلوم نہیں کہ پھر اس نے ڈاکٹر صاحب کو گھر پر بلایا یا نہیں بہر حال اب ڈاکٹر صاحب ہمارے پڑوسی نہیں ہیں۔

خون کا دباؤ کیا ہوتا ہے؟

از ماہرِ امراضِ مردانہ ڈاکٹر میڈیکو

لوگ بہت سی بیماریوں کے نام تو لیتے رہتے ہیں اور اکثر اوقات انہیں اس صورت سے بیان کرتے اور ان پر ایسے سیدھے تبصرے کرتے رہتے ہیں گویا وہ ان کے خواص اور علامات وغیرہ سے پورے طور پر واقفیت رکھتے ہیں حالاں کہ حقیقت یہ ہے استعداد امراض کی ابجد سے بھی عوام واقف نہیں ہوتے اور ان پر رائے زنی کرتے وقت وہ صحیح طور پر ان امراض کے متعلق کوئی درست رائے بھی قائم نہیں کر سکتے۔ اسی قسم کے امراض میں جن کا ذکر تو اکثر لوگوں کی زبان پر رہتا ہے مگر ان سے واقفیت حاصل کرنے کی بہت کم کوشش کیجاتی ہے۔ ایک مرض "خون کے دباؤ" کا بھی ہے۔

"خون کے دباؤ" کو سمجھنے کے لیے بہتر ہے کہ ہم کسی ایسے پمپ یا ربڑ کی ٹیوب کا تصور کریں جس کے ذریعے خون ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچایا جاتا ہو۔ پانی کے پمپوں اور ربڑ کی نلکیوں میں اکثر دیکھا جا سکتا ہے کہ جب بہنے والے رقیق مادے کی مقدار کچھ کم ہوتی ہے اور روانی زیادہ تیز نہیں ہوتی تو پمپ یا نل کے دہانے وغیرہ پر زور اور دباؤ بہت کم پڑتا ہے۔ اس کے برعکس جب بہنے والے یا خارج کیے جانے والے مادے کی مقدار زیادہ ہوتی ہے اور پمپ سے بیک زیادہ رقیق مادہ خارج کرنے یا منتقل کرنے کی کوشش ہوتی ہے تو قدرتی طور پر اس نلکی یا پمپ پر زیادہ دباؤ پڑتا ہے اور اگر وہ پائپ کمزور یا ربڑ کا نلکا ہو تو اس کے ٹوٹ جانے کا ہر لحظہ اندیشہ رہ سکتا ہے۔ اگر ٹیوب کا منہ کم چوڑا ہو تو وہ زیادہ کشادہ ہونے کے مقابلے میں زیادہ دباؤ پڑتا ہے۔ اس مثال سے خون کے دباؤ اور اس کی صورتِ وقوع پر کچھ روشنی پڑ سکتی ہے۔

اصل میں قلب اس اپریٹس کی طرح ہوتا ہے جو شریانوں کے ذریعے خون پمپ کر کے جسم کے مختلف حصوں میں منتقل کرتا ہے۔ ان رگوں پر خون کا دباؤ خون کی مقدار اور خود ان شریانوں کی تنگی و کشادگی کے پیشِ نظر پڑتا ہے اس میں اتنا اضافہ اور کیا جا سکتا ہے کہ خون کا دباؤ خون کی رقت اور غلظت پر بھی ایک حد تک منحصر ہوتا ہے۔

خون کا دباؤ اس وقت شروع ہوتا ہے جب شریانوں کے ذریعے خون زیادہ مقدار میں گردش کرنے میں کوشاں ہو یا شریانوں کے دہانے اور راستے اتنے تنگ ہو جائیں کہ ان سے خون کی یہ مقدار نہ گزر سکے۔ یا کسی فوری جذبہ، غصہ و محبت وغیرہ کی وجہ سے حرکتِ قلب میں اتنا اضافہ ہو جائے کہ خون کی روانی میں زیادتی کا باعث قرار پائے۔

اس کے ساتھ ہی یہ امر بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ جب گردشِ خون میں رکاوٹ اور دقت پیدا ہوتی ہے تو قلب کے اپریٹس پر اور بھی زیادہ کام کا بار پڑ جاتا ہے اور اسے پہلے سے زیادہ مشقت سر لینا پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کسی شخص کو قلب کے متعلق کوئی بیماری لاحق ہوتی اور کوئی شکایت پیدا ہوتی ہے تو ڈاکٹر یا طبیب پہلے یہی معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اسے خون کے دباؤ کا عارضہ تو لاحق نہیں ہو گیا۔ کیوں کہ خون کے دباؤ کا لازمی طور پر پہلے دل کی حرکت پر ہی اثر پڑتا ہے۔ لیکن ہر موقع پر خون کے دباؤ کے ذریعے ہی قلب کے عوارض کا پتہ چلانا ممکن نہیں ہوا کرتا۔ کیوں کہ خون کا دباؤ تو بات بات پر پیدا ہوتا رہتا ہے کوئی شخص ورزش باکثرت کرے تو بھی خون کے دباؤ میں اضافہ ہو جاتا ہے کسی جذبے کا اثر ہو جائے یا خوف و دہشت کا اثر چھا جائے تو بھی خون کا دباؤ بڑھ جاتا ہے۔ اکثر اوقات تو ڈاکٹر کے سامنے آتے ہی یا ڈاکٹر کے اوزار دیکھتے ہی خوف و دہشت طاری ہو جاتی ہے اور اس کی وجہ سے خون کا دباؤ معمولی حالت پر نہیں رہتا۔ ایسے موقعوں پر ڈاکٹر یا طبیب کو یہ چاہیئے کہ وہ مریض کا اول اطمینان کردے کہ کوئی بات نہیں ہے۔ مگر یہ اطمینان بھی اس کا دل وغیرہ دیکھ کر کیا جائے تا کہ اسے یقین ہو جائے کہ ڈاکٹر اسے محض جھوٹی تسلی نہیں دے رہا ہے۔ اگر تدبیر عمل میں لائی گئی تو منٹ بھر میں ہی حیرت انگیز نتیجہ دیکھنے میں آئے گا جس مریض میں خون کے دباؤ کی کیفیت پائی گئی ہو گی اسے اپنی صحت کا یقین ہونے پر خون کے دباؤ کی کیفیت اس طرح متغیر اور بہ زوال ہو جائے گی جس طرح گرم ماحول سے سرد ماحول میں لانے سے یکایک تھرمامیٹر کا پارہ گر جایا کرتا ہے۔

بعض لوگوں کو مستقل طور پر خون کے دباؤ کی بیماری ہو جایا کرتی ہے اور اس کے نتیجے کے طور پر ان کے سر میں درد رہنے لگتا ہے سانس پھول جاتا ہے معمولی سی مشقت سے بھی جلد تھکن طاری ہو جایا کرتی ہے۔ اور بعض اوقات ان بیماریوں اور شکایتوں کی بدولت ہی حرکت قلب بند ہو جانے سے موت واقع ہو جایا کرتی ہے۔ ان حالات میں اور بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ خون کے دباؤ کو معمولی مرض سمجھ کر اس سے غفلت برتنے کی کوشش نہ کی جائے۔ جب کبھی اس کی علامات اور آثار ظاہر ہوں اولین فرصت میں ڈاکٹر یا طبیب سے رجوع کیا جائے اور صحت مندی حاصل کرنے کی کوشش عمل میں لائی جائے۔

خون کے دباؤ کے بارے میں ماضی قریب کے ایک مصنف نے یہ لفظ لکھے تھے: اگر کسی پائپ کی محیطی دیوار زیادہ موٹی ہو جائے اور اندرونی جانب اس میں دبازت زیادہ پیدا ہو جائے تو اس پائپ میں سے جو رقیق مادہ گزرے گا اسے اپنا راستہ پیدا کرنے کے لیے زیادہ جدوجہد عمل میں لانا پڑے گی ممکن ہے دباؤ اتنا ہو کہ پائپ پھٹ جائے۔ اسی طرح اگر پائپ یا نل کا بڑھ تو زیادہ سیال مادے کا دباؤ اس میں شگاف یا شکست و ریخت کا موجب ہو سکتا ہے۔ بالکل یہی صورت شریانوں کے ساتھ جن میں سے خون گردش کرتا ہے پیش آتی ہے۔ جب دورِ شباب ختم ہو جاتا ہے اور بڑھاپا اپنے قدم جمانے لگتا ہے تو شریانیں زیادہ موٹی اور سخت ہونے لگتی ہیں۔ اس طرح ان کی پہلی طاقت اور صلاحیت مفقود ہونے لگتی ہے۔ اسی وجہ سے جوں جوں انسان کی عمر میں اضافہ ہوتا جاتا ہے خون کے دباؤ کی شکایت پیدا ہونے لگتی ہے۔

خون کے دباؤ کا علاج!

ہم عمر کی رفتار اور اس کے اثرات پر کسی طرح بھی پابندی عائد نہیں کر سکتے۔ نہ تو اپنے آپ کو بوڑھا ہونے سے محفوظ رکھ سکتے ہیں اور نہ بڑھاپے کے آثار و علامات سے ہی راہ فرار اختیار کر سکتے ہیں۔ البتہ ہم شریانوں کی نرمی اور سختی کے مقابلے میں کچھ احتیاطی اور انسدادی تدابیر کامیابی کے ساتھ عمل میں لا سکتے ہیں۔ جو دوائیں خون کے دباؤ کو روکنے کے لیے استعمال کی جاتی ہیں وہ عام طور پر کچھ مفید و مؤثر ثابت نہیں ہوتیں۔ لیکن سائنٹفک طریقے پر کلوروفیل کا استعمال زیادہ مفید و بہتر ثابت ہوا ہے اگر ہم اپنی عمر کی کہولت کے ساتھ ہی ساتھ اپنی غذا میں بھی زیادہ سادگی اور اعتدال پیدا کرتے جائیں تو بھی خون کے دباؤ سے بڑی حد تک محفوظ رہ سکتے ہیں بدقسمتی سے بعض لوگوں کا یہ خیال ہوتا ہے کہ جوں جوں عمر میں اضافہ ہوتا جائے انسان کو اپنی صحت و توانائی قائم رکھنے کے لیے زیادہ خوراک کھانے اور زیادہ مقوی اغذیہ استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔ اس خیال میں ذرہ بھر بھی صداقت نہیں اور بعض اوقات اس طریقے پر عمل ہی بہت سی بیماریوں کا پیش خیمہ ثابت ہو جاتا ہے۔ ایسے اصحاب کو یہ تو خیال کرنا چاہیئے کہ ان کے اعضا اور اعصاب میں اس زمانے کی سی صلاحیت اور قوت تو رہی نہیں جیسی کہ پہلے تھی۔ انہیں شراب، چائے، قہوہ اور دوسری ثقیل غذاؤں سے تو بالکل ہی پرہیز اختیار کر لینا چاہیئے۔ تاکہ ان کے ہاضمے اور گردوں اور خون کی مشینری پر زیادہ زور نہ پڑے۔ اگر زیادہ گہرے اور لانبے سانس لینے کی عادت ڈال لی جائے تو بھی خون کے دباؤ میں بہت کمی ہو جاتی ہے کیونکہ اس طرح خون کی رفتار رگوں مدہم نہیں ہونے پاتی

مترجمہ: قابل گلاؤٹھی

رُباعیّات

ظاہر کو جلا کے تودۂ خاک تو کر　　پوشیدہ تجلیوں کا ادراک تو کر
باطن میں ہے آراستہ اک بزمِ جمال　　پیراہنِ زندگی کبھی چاک تو کر

بدبین نگاہ دیکھ لیتا ہوں میں　　قلبِ بدخواہ دیکھ لیتا ہوں میں
پڑتی نہیں اپنے عیب پہ میری نظر　　اوروں کے گناہ دیکھ لیتا ہوں میں

(سیماب اکبرآبادی)

انوکھا مشاعرہ!

موسم بہار کی ایک رات کا ذکر ہے،

ایڈورڈ پارک" میں چند" زندہ دل" شاعروں کا ایک شاندار اجتماع ہوا۔

ہوا کے ٹھنڈے جھونکے چل رہے تھے۔ چاند اپنی رعنائیاں بکھیر رہا تھا۔

اس دل فریب ادبی محفل میں تقریباً آدھی درجن" زندہ دلانِ سخن" موجود تھے، جن میں سے ہر ایک "فخر خاندان"، "فخر ایشیا" "فخر ملت"، اور آفتاب سخن" ہونے کا دعویٰ دار تھا۔

سب سے پہلے ایک" فخر ایشیا" کھڑے ہوئے۔ اور انہوں نے اپنی زبان فیض ترجمان) سے ارشاد فرمایا:۔

حضرات!

یہ دلّی ہے، ہم" ایڈورڈ پارک" سے بول رہے ہیں۔ موسم خوشگوار ہے جذبات کے سمندر میں لہریں اور موجیں اُٹھ رہی ہیں۔

کیا اچھا ہو، آج ہم "زندہ دلان سخن"، اپنی طبع سلیم کے جوہر پیش کریں؟

حاضرین نے اس تجویز کی پرجوش تائید کی اور ہر طرف سے صدائیں بلند ہوئیں ضرور، ضرور، اس تحریک اور تائید کے بعد ایک پہلوان سخن ادبی اکھاڑے میں تشریف لائے۔ اور یوں گہر افشانی فرمائی۔

حضرات! آج کے" ادبی اکھاڑے" کا نام ہے" انوکھا مشاعرہ"

یہ بڑی خوشی کی بات ہے اس" نایاب" اور زود اثر" محفل میں ہر قوم، اور ہر جماعت، کے نمائندے موجود ہیں۔ اور آج کا یہ ادبی اکھاڑہ" اپنی نمایندگی کے لحاظ سے" مایۂ ناز" "بے نظیر" اور سنسنی خیز" ہے،

اِس تمہید کے بعد" مصرعۂ طرح"، تجویز کیا گیا:۔

"ہم نے جو کچھ تھا نثارِ روئے جاناں کر دیا"

"مصرعۂ طرح کو سن کر چاندنی چوک کے ایک حلوائی صاحب کھڑے ہوئے اور یوں گہر افشانی فرمائی:۔

برادران سخن!

یہ خاکسار نیاز مند خاندانی طور پہ "فخر خاندان" حلوائی ہے اور شعر و شاعری سے بھی دلچسپی ہے۔

آپ کے مصرعۂ طرح کو سن کر اس وقت میری شاعری کی چاشنی میں جوش آگیا اور خاکسار نے فی البدیہ ایک لذیز شعر موزوں کیا ہے اگر حکم ہو تو عرض کروں؟:۔

حاضرین محفل:۔ ضرور، ضرور،

اپنے ذوق سخن کی چاشنی تقسیم کیجئے!۔

حلوائی صاحب نے فرمایا:۔ عرض کرتا ہوں:۔

لڈو، پیڑے، بالوشاہی، اور امرتی دے کے سب
ہم نے جو کچھ تھا نثار، دہنِ جاناں کر دیا۔

حاضرین محفل:۔

واہ وا، سبحان اللہ، مرحبا۔ جزاک اللہ۔ کیا لذیذ شعر ہے۔ مکرر فرمائیے:۔

اس گہر افشانی کے بعد ایک جراح صاحب کھڑے ہوئے اور انہوں نے فرمایا: خاکسار نے بھی ایک شعر عرض کیا ہے۔ اگر حکم ہو تو پیش کروں؟

حاضرین:۔ ضرور ضرور، آپ بھی نشتر سخن دلوں میں پیوست کیجئے!۔

جراح صاحب نے کہا:۔ عرض کرتا ہوں:۔

صبر کا مرہم لگا کر دل پہ پٹی باندھ دی
ہجر میں اس بت نے یہ کار نمایاں کر دیا

حاضرین:۔ واہ وا سبحان اللہ۔ کیا روح پرور شعر ہے خدا آپ کو قیامت کے دوسرے دن تک زندہ رکھے

اس فصاحت طرازی کے بعد، ایک مولوی صاحب کھڑے ہوئے اور انہوں نے فرمایا:-

حضرات! میں ایک غریب طالب علم ہوں۔ شعر و شاعری سے مجھے بے حد دلچسپی ہے۔ لیکن وقت کم ملتا ہے

آپ کا مصرعہ طرح سن کر آج میرے دریائے فصاحت میں بھی طوفان آگیا اور میں نے بھی ایک شعر موزوں کیا ہے اگر حکم ہو تو عرض کروں؟

حاضرین:- ضرور ضرور باواز بلند فرمائیے:-

مولوی صاحب نے یوں گہر افشانی کی:-

بت کو سجدہ بھی کیا اور روٹیاں بھی نذر کیں۔
جان و دل صدقے تصدق دین و ایماں کر دیا۔

حاضرین:- ماشاء اللہ سبحان اللہ۔ کیا موٹا تازہ شعر ہے۔

اس فصاحت افشانی کے بعد ایک "ورق ساز" (چاندی اور سونے کے ورق بنانے والے) جن کا تخلص شلجم ہے کھڑے ہوئے اور انہوں نے یہ "زریں" شعر سنایا:-

کوٹ ڈالے سب ورق ہم نے کتاب عشق کے
دیکھنے والوں کو شلجم ہم نے حیراں کر دیا۔

حاضرین:- واہ وا سبحان اللہ کیا کٹائی کی ہے۔ زندہ باد۔

ورق ساز صاحب کے بعد ایک سنار کھڑے ہوئے اور فرمایا:-

صاحبان! اس خاکسار کو بھی شعر و سخن سے دلچسپی ہے۔ لیکن "فکر معاش"، اور "عشق بتاں" کی وجہ سے شعر لکھنے کا موقعہ کم ملتا ہے۔

اس وقت آپ کا مصرعہ طرح سن کر اس خاکسار نے بھی ایک شعر گھڑ لیا ہے اگر حکم ہو تو عرض کروں؟

حاضرین:- ضرور ضرور۔

سنار صاحب نے یوں گہر افشانی کی:-

ایک جھومر چار چوڑی، ڈو انگوٹھی چھ بٹن
بت کی خدمت میں روانہ سارا ساماں کر دیا

حاضرین:- واہ وا، مرحبا۔ کیا سنہری شعر ہے۔

اس گل فشانی کے بعد، استاد شموں خاں کھڑے ہوئے اور انہوں نے فرمایا:-

صاحبان! میں دلی کے "آثار قدیمہ" میں سے ہوں، شعر و سخن سے مجھے خاص دلچسپی ہے۔ لیکن جب سے ایک فیشن پرست بیوی کے ساتھ شادی ہوئی ہے اس کی "نئی نئی فرمائشوں" نے میری شاعری کا دیوالہ نکال دیا ہے۔ پھر بھی آپ کا "مصرعہ طرح" سن کر میرے جذبات کے سمندر میں ایک طوفان آگیا اور میں نے بھی ایک شعر موزوں کیا ہے،

اگر حکم ہو تو عرض کروں۔؟

حاضرین:- ضرور ضرور،

شموخاں:- عرض کرتا ہوں۔

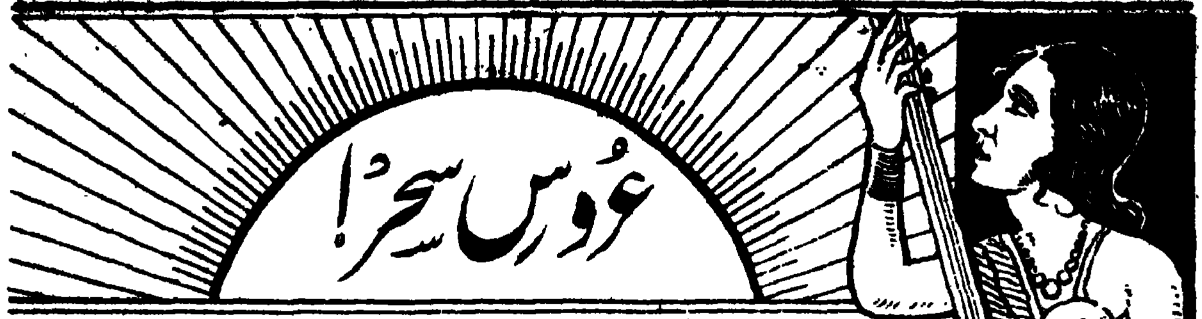
کیا بلا ہے یا الٰہی، یہ "شریک زندگی"
جب ہوئی عریاں نگاہوں کو پریشاں کر دیا۔

حاضرین:- واہ وا سبحان اللہ۔ کیا "مقوی دل" شعر لکھا ہے۔ ماشاء اللہ جزاک اللہ۔ اللہ آپ کو اجر دے

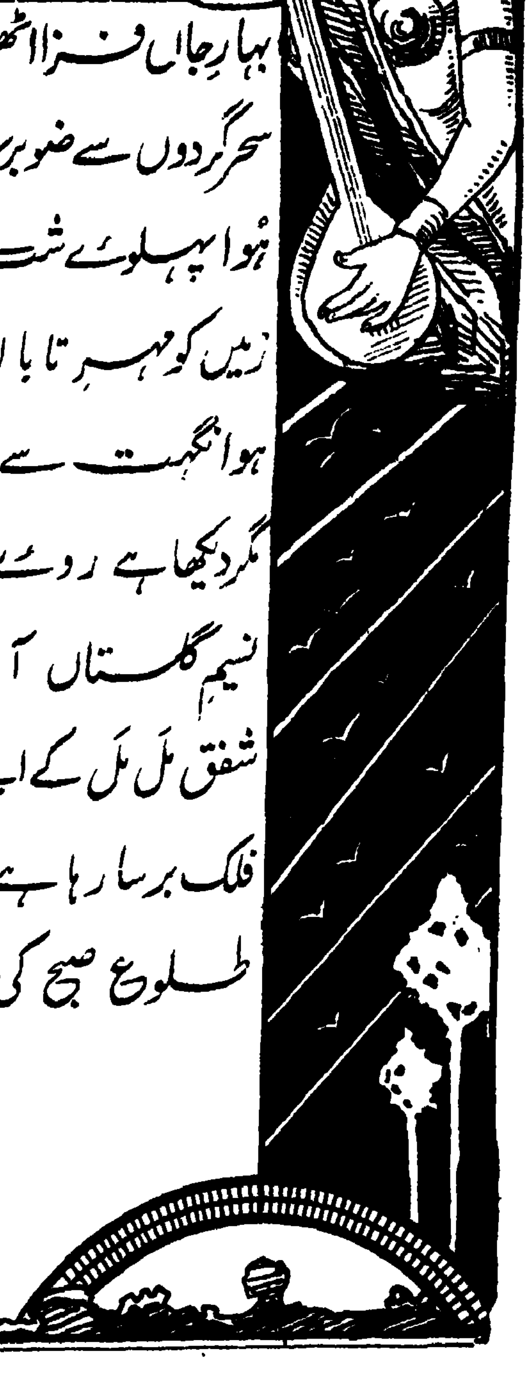
اور آپ کی "شریک زندگی" کو "صبر جمیل" عطا فرمائے۔

غرض یہ کہ ان گل افشانیوں کے بعد روح پرور محفل ختم ہوئی۔

(زاہد القادری۔ دہلی)



عُروسِ سحر!



بہارِ جاں فزا اٹھلا رہی ہے
زمیں پر پھول سے برسا رہی ہے

سحر گردوں سے ضو برسا رہی ہے
جہاں کو نور میں نہلا رہی ہے

ہُوا پہلوئے شب سے نور پیدا
ضیائے مہر ہر سو چھا رہی ہے

زمیں کو مہرِ تاباں کی تجلّی
لباسِ روشنی پہنا رہی ہے

ہوا نکہت سے مالا مال ہو کر
مشامِ انس و جاں مہکا رہی ہے

مگر دیکھا ہے روئے صبح خنداں
کلی کیوں مسکرائے جا رہی ہے

نسیمِ گلستاں آوارہ ہو کر
جہاں میں نکہتیں پھیلا رہی ہے

شفق مَل مَل کے اپنے رُخ پہ غازہ
دلِ اہلِ جہاں تڑپا رہی ہے

فلک برسا رہا ہے بارشِ نور
زمیں مستانہ غزلیں گا رہی ہے

طلوعِ صبح کی دل کش تجلّی
مرے دل میں سمائے جا رہی ہے

تری یہ نظمِ دل افروز ماہرؔ
جہاں پر زندگی برسا رہی ہے

(خان صاحب) حکیم محمود علیخاں ماہرؔ اکبر آبادی)

زبان ادب کی اہمیت و ضرورت

انسان طبعًا اجتماعی ہے اس لئے وہ مجبور ہے اس بات پر کہ بنی نوع انسان کے ساتھ مل جل کر رہے۔ پھر چونکہ اجتماعی زندگی کا انحصار باہمی میل و ملاپ پر ہے اس لئے یہ بات کسی فرد واحد کے لئے ممکن ہی نہیں کہ کارزار حیات میں اپنی جملہ ضروریات زندگی کو بیرونی امداد کے بغیر پورا کر سکے یا اپنے عیوب اور خامیوں کی بغیر کسی کے مشورہ کے اصلاح کر سکے۔ زندگی کی مشکلات گوناگوں اور ان کی تعداد غیر محدود ہے اور انسان کی اہمیت کم۔ اس لئے وہ بے بس اور مجبور ہے خارجی امداد کے بغیر اپنی تمام ضروریات کو پورا کر ہی نہیں سکتا۔ آپ دیکھیں اور غور کریں کہ قدرت کردگار نے نر اور مادہ ہر دو کو نامکمل پیدا کیا ہے۔ دونوں کے ملاپ کے بعد ہی ان کی تکمیل و بقاء زندگی ممکن ہو سکتی ہے۔ لہذا یہ بات بہ آسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ ہمارے مقاصد اسی وقت پورے ہو سکتے ہیں جب ہمارے جوش عمل میں ابنائے جنس کی امداد شامل ہو۔ ورنہ ہم ناکامیوں اور نامرادیوں کا تختہ مشق بن کر رہ جائیں گے۔ اور اگر ہم اجتماعی زندگی کے اصول کو نظر انداز کرنے کی غلطی کر کے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد علیحدہ بنائیں تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں ہمیں ناقابل تلافی نقصان اٹھانے کے علاوہ ہم میں اور حیوان میں بہت کم فرق باقی رہ جائے گا۔ اور ہم بھی حیوانوں کی طرح مقام و قیام سے بے پروا ہو کر سر بفلک پہاڑوں خوفناک جنگلوں۔ اور مہیب بیابانوں میں بے خانماں برباد پھرنے لگیں گے۔

مشاہدہ اور تجربہ سے ظاہر ہے کہ ایک حد تک حیوان بھی اجتماعی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ وہ انفرادی طور پر اپنی جملہ ضروریات زندگی پورا نہ کر سکنے کے علاوہ بقاء حیات اور اپنے سے زیادہ طاقتور دشمن کے حملوں سے بچنے کے لئے بھی انہیں چھوٹی چھوٹی ٹولیوں اور جماعتوں میں رہنا پڑتا ہے لیکن اس نوع کی زندگی کو صحیح معنوں میں اجتماعی زندگی نہیں کہا جا سکتا۔ علاوہ ازیں حیوان اجتماعی زندگی کے اصول غرض و غایت اور فوائد سے بھی واقف نہیں۔ اسی وجہ سے وہ اپنی عمر ضائع کرتے ہیں اور ان کی زندگی میں خود غرضی کی بھیانک جھلک کے بغیر کچھ نہیں ہوتا۔ اندریں حالات تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اجتماعی زندگی ایک سایۂ رحمت ہے کیونکہ اس کے بغیر ہماری لامحدود ذاتی خواہشیں پوری نہیں ہو سکتی ہیں۔ اور نہ ہم اپنے متعدد شہری مقاصد کے لئے جامۂ عمل مہیا کر سکتے ہیں۔ اب جس طرح شہری زندگی کے لئے انسان اجتماعیت چاہتا ہے بالکل اسی طرح وہ اس زندگی کے لئے اس چیز کو بھی حاصل کرنا چاہتا ہے جو اس کے اور ابنائے جنس کے درمیان اظہار دوستی کا ذریعہ بن سکے۔ اس "ذریعہ" کو زبان کہا جاتا ہے جس کی وساطت کے بغیر ایک انسان کا کبھی دوسرے انسان سے طالب امداد ہونا تو در کنار وہ اپنی ضروریات حاجات اور دلی خیال کا اظہار بھی نہیں کر سکتا ہے مثل کے طور پر آپ شیر خوار بچوں کی حالت پر نظر ڈال لیجئے۔ کہ وہ زبان کے بغیر کس قدر بے بس و مجبور ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ زبان ہی ایک ایسی چیز ہے جس کی وساطت سے ہم ایک دوسرے کے خیالات سے واقفیت حاصل کرتے ہیں اور ان سے اپنی اپنی ضرورت کے مطابق فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ملکوں اور تمدنوں میں رابطہ پیدا کر سکتے ہیں یا یوں کہیئے کہ اگر بنی نوع آدم کو اظہار خیال میں "زبان" کی مدد حاصل نہ ہوتی تو پھر اسے اشرف المخلوقات کہنا صحیح نہ ہوتا۔ اور اس میں اور حیوان میں امتیاز کرنا ناممکن ہو جاتا۔

انسان سب سے پہلے اپنی ضرورتوں کو ادراک سے پیدا کرتا ہے اس کے بعد ان کو مکمل کرتا ہے اور اس کی ذہنی قوت کی تکمیل عمر کا تہائی حصہ گذر جانے کے بعد ہو جاتی ہے۔ لیکن اس منزل تک پہونچنے کے لئے جس ذریعہ سے وہ امداد حاصل کرنے کی سعی کرتا ہے اس کا نام "زبان" ہے اور زبان کی شائستہ، پر اثر اور ترقی یافتہ صورت کو "ادب" کہا جاتا ہے ایک قوم کا ادب آئینہ دار ہے اس کی تمدنی معاشرتی اقتصادی۔ اخلاقی اور مذہبی ترقی کا۔ کسی قوم کے ادب کے

مطالعہ سے اس کی پوری تاریخ لکھی جا سکتی ہے۔ ہم اس کے مطالعہ سے گذشتہ قوموں کے کارنامے۔ زمانہ ماضی کے واقعات۔ قوموں کے عروج و زوال کے اسباب، ان کے نشو نما اور ارتقار کے طریقے معلوم کر سکتے ہیں۔ ماضی کے تاریک اور ہولناک پہلوؤں سے عبرت حاصل کر سکتے ہیں اور روشن صورتوں سے ترقی کے اصول سیکھ سکتے ہیں۔

ادب کی ضرورت اور اہمیت کا ہر صاحب فکر کو احساس ہے کیونکہ ادب ہی کے وسیلہ سے گذشتہ زمانہ کی قوموں اور ان کی تہذیب تمدن کے عروج و زوال۔ ان کے اخلاقی معاشرتی اور اقتصادی اصولوں کی کیفیت عہد بہ عہد اور نسل بہ نسل معلوم ہو سکتی ہے۔ مثلاً یونانی تہذیب و تمدن کا روم میں داخل ہونا اور وہاں سے ایشیائے کوچک تک پھیلنا اور پھر وہاں سے شام۔ ایران اور عرب پر چھا جانے کا حال صرف یونانی ادبیات کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتا ہے اور ساتھ اس بات کا بھی پتہ لگتا ہے کہ اہل یونان کی زبان صرف اپنے ہمہ گیر ادب کی وجہ سے بقدر وسعت شہرت اور قبولیت حاصل کر سکتی تھی کیونکہ اہل یونان اپنی ادبیات کی مدد سے غیر قوموں کو آسانی کے ساتھ اپنے تمدن اور اپنی تہذیب کی خوبیاں ذہن نشین کرا دیتے تھے۔

اہل عرب کے عروج کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے تمدن اور روحانی عرفان کو نہ صرف براعظم ایشیا بلکہ کرۂ ارض کے تین چوتھائی حصہ میں جو مقبولیت حاصل ہوئی اس کی اہم وجہ یہی تھی کہ ان کی وجہ یہی تھی کہ ان کی زبان فصیح و بلیغ تھی۔ اور زبان ادب کا بہترین نمونہ قرآن بھی ان کے پاس تھا۔ ادبیات عرب نے سب سے پہلے شام، ایران اور نواحی ملکوں کو مسخر کیا۔ اور چونکہ فلسفہ و الہامات اسلام کی تبلیغ اور نشر و اشاعت ادبیات عرب کے رنگین اور خوشنما لباس میں کی گئی تھی اس لئے ذہین اور صاحب فکر لوگ بہ آسانی اس کے حلقہ بگوش ہو گئے اور اگر اہل عرب کی زبان ادبی طاقت سے محروم ہوتی تو اسلام کو اس قدر عروج اس آسانی اور اس سرعت کے ساتھ حاصل نہ ہوتا۔ اسی طرح اہل یونان کا فلسفہ اور اس کا طریقہ علاج صرف یونانی زبان کی ادبیات کی ہمہ گیری اور لطافت کی وجہ سے آج نہ صرف زندہ ہے بلکہ بدستور سابق مقبول ہی ہے۔ یونانی طب اور فلسفہ نے پہلے ایران میں روایتوں اور حکایتوں کی صورت اختیار کی پھر خلافت عباسیہ کے عروج کے زمانہ میں جبکہ شہر بغداد دنیا کے جملہ علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کا گہوارہ بنا ہوا تھا طب یونانی اور فلسفہ کو نہ صرف ملک عرب میں داخل ہونے کا موقعہ ملا بلکہ شہر بغداد کو اس کی جنم بھومی ثانی بننے کا فخر حاصل ہوا اور یہاں اس نے اس قدر مضبوطی سے اپنی جڑیں جمالیں اور اس قدر ترقی کی کہ آج بھی ہمیں علمائے اسلام کے مباحثوں اور عربی مقالات میں فلسفہ یونان کی جھلک نظر آتی ہے۔

جس طرح ایک تناور درخت کی بہت سی شاخیں اور ٹہنیاں ہوتی ہیں اسی طرح ادبیات کی بھی مختلف صورتیں ہیں۔ مثلاً تاریخ۔ شاعری۔ افسانہ، ناول صحافت وغیرہ وغیرہ اور ان سب کے مطالعہ سے ایک قوم کے خاص عقائد زمانہ کے بنیادی امتیازات اور ہر دور کے اجتماعی و انفرادی اصولوں کی کیفیت بہ آسانی معلوم کی جا سکتی ہے۔ مثلاً ملک عرب کے زندہ جاوید شاعر امرار القیس کے پرجوش قصائد کے مطالعہ سے آج بھی ہم شجاع اور رجانہ بدوؤں کی جنگجو زندگی کے تمام پہلو معلوم کر سکتے ہیں۔ عہد عباسیہ کے مشہور عالم شاعر متنبی کے حکیمانہ قصائد کا مطالعہ کرتے وقت خلفائے عباسیہ کی عظمت و جلالت اور اس زمانہ کی تہذیب و تمدن کا نقشہ نظروں کے سامنے کھنچ جاتا ہے۔ ہندوستانی راجاؤں کے درباری گویوں کے گیتوں کے مطالعہ سے اس عہد کی رسوم و رواج اور طریقہ جنگ و جدل اور طرز معاشرت کا حال معلوم ہوتا ہے ہندوؤں کی مقدس کتابیں رامائن۔ مہابھارت اور وید اپنے اپنے زمانہ کے تمدن اور اصول زندگی کی آئینہ دار ہیں۔ فرانس زندہ جاوید شاعر و ادیب والٹیئر کے کلام سے اہل فرانس کی مظلومانہ افسردگی کی کیفیت معلوم ہوتی ہے، یونان کے قدیم شعرار کے اشعار اہل یونان کی مسرت سے لبریز زندگی کا روح پرور عکس ہماری زندگیوں پر ڈالتے ہیں۔ الغرض شاعری ہی ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہر زمانہ اور ہر ملک کی سیاسی و اجتماعی زندگی اور طرز معاشرت و عقائد کی جھلک دیکھی جاتی ہے۔ کیونکہ ابتدائے آفرینش سے ہی شاعری ہر دور اور ہر ملک میں اپنے قومی مقاصد کی مبلغ رہی ہے اور اجتماعی ضروریات کے مطابق آپ کو حیات تازہ سے آشنا کرتی رہتی ہے۔

دنیا کا اصول ہے کہ اگر کوئی قوم دوسری قوم کے ذہن پر اپنی قابلیت کا سکہ بٹھانا چاہے تو اس کے لئے لازمی ہے کہ دعویٰ کے ثبوت میں سب سے پہلے اپنا ادب پیش کرے کیونکہ بغیر وہ اپنی تہذیب و تمدن، اخلاق اور دیانت کی برتری کا مخالف کے ذہن نشین نہیں کرا سکتی ہے۔ علمبرداران اسلام اپنی

اقوام عالم کی دیگر قوموں کی تہذیبوں پر محض اس لئے آسانی کے ساتھ ڈال سکے کہ اہل عرب کی زبان اور ادبیات میں اقوام عالم کو مسخر کرنے کا جوہر موجود تھا۔ اسی طرح سرکار دو جہاںؐ کی پیدائش سے قبل عیسائیت کو ملک عرب اور دوسرے ملکوں میں جو عروج حاصل ہوا وہ عبرانی زبان اور اس کے ادب کی وجہ سے تھا جس کی دل فریب فصاحت اپنے سامعین و ناظرین کی روح کو اپنا متوالا بنا چکی تھی کیونکہ عربی اور عبرانی زبانوں کو دلکش اور جامع الفاظ کا جو سرمایہ حاصل ہے وہ دوسری زبانوں کو انتہائی وسعت کے باوجود نصیب نہیں ہو سکا۔

زبان کی دلکشی مذہب اور تمدن کو مقبول و محبوب بنانے میں جس قدر کامیاب ہو سکتی ہے اس کا اندازہ خارجی شہادتوں سے لگایا جا سکتا ہے مثلاً اگر مرکز اسلام اور دنیا کے مسلمانوں کے درمیان لسانی اتحاد کا واسطہ نہ ہوتا تو اسلام کی تعلیم اخوت دلائل کی حد سے بڑھ کر عملی جامہ نہ پہن سکتی۔ لیکن عربی کی ہمہ گیر مقبولیت نے شریعت اسلام کے احکام پر افہام و تفہیم کے لئے جو وحدت پیدا کر دی ہے اس کی بدولت مسلمان مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک ایک تسبیح کے دانے بن چکے ہیں۔ علاوہ ازیں عربی کے الفاظ کی السنہ کی دنیا سے اسلام کی دیگر زبانوں میں اس حد تک ملاوٹ ہو چکی ہے کہ ہر ادیب کو اپنے مقصد یا کامیابی حاصل کرنے کے لئے مجبوراً عربی زبان کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔

یہ عربی کی ہی لطافت کا ایک اثر ہے کہ ظہور اسلام سے تقریباً تین صدی بعد جب علمبرداران اسلام نے براعظم ایشیا و یورپ کے ایک بڑے حصہ کو فتح کر لیا تو ہر ملک کے علماء کو اپنی مکمل زبان کی موجودگی میں بھی عربی اپنے قلم کی جولانیاں دکھانی پڑیں۔ مثلاً امام غزالی اور ابو نصر فارابی وغیرہ علماء ایرانی النسل ہیں لیکن ان کا شمار عربی مصنفین میں ہوتا ہے۔ اسی طرح انگلینڈ کے متعدد مشہور و معروف حکماء نے اپنے فلسفہ کے حقائق لاطینی زبان میں پیش کئے۔ اسی وجہ سے آج دنیا کو ان کی وطنیت پر بھی شک ہے۔ ایرانی علماء نے چونکہ اپنی تصانیف میں عربی کو ذریعہ تحریر بنا لیا تھا اس لئے ایرانی ادبیات کا متوقع عروج بھی عربی کے کمال کا ایک حصہ بن کر رہ گیا

علماء السنہ کا قول ہے کہ جس قوم کا ادب غیر مکمل ہے اس کی امتیازی تہذیب و تمدن اور مذہبی روایات بھی دیرپا نہیں ہو سکتی ہیں تو موں کے سیاسی و مذہبی عروج و زوال کی داستان پر تاریخ کی روشنی میں غور کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ فاتح قوم مفتوحہ ملک کے باشندوں کی ذہنیت کو غلام بنانے کیلئے وہاں اپنی زبان اور ادب کو عروج دینا شروع کر دیتی ہے کیونکہ جس وقت محکوموں کے ذہن پر حاکموں کی زبان اور ادب کا احترام قابض ہو جاتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ اہل زبان کے متعلق بھی ان کے دل میں محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ جو کام چشم زدن میں سینکڑوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دینے والی توپوں سے نہیں ہو سکتا ہے وہ زبان اور ادب کی وساطت سے آسانی کیا جا سکتا ہے۔ ہم جس کسی محکوم قوم کی غلامی کے اسباب پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دل میں حاکموں کی زبان اور ان کی ادبیات غلامی کا شوق بن کر رہ گئی ہے۔ حاکموں کی زبان اور اس کی ادبیات کا ان پر اس قدر اثر پڑا کہ ہر خطرہ اس کی گرفت سے رہائی مشکل معلوم ہوتی ہے کاش وطنیت کا ہنگامہ بلند کرنے والے انسان غلامی کی حقیقی و معنوی وطنی زبان کے انحطاط کے اسباب پر غور کریں۔ اس دعوی کی تصدیق کے لئے یورپین مستعمرات مثلاً کینیڈا۔ اسٹریلیا۔ اور نیوزی لینڈ وغیرہ کی لسانی اور ادبی حیثیت پر غور کیجئے۔ تو آپ پر ظاہر ہو گا کہ یہ ملک فرانسیسی اور انگریزی زبانوں کے زیر اثر ہونے کی وجہ سے انگلستان اور فرانس کی مدنیت تعلیم اور اخلاق پر وطنی روایات قربان کر چکے ہیں۔ ان میں غیروں کی زبان مقبول ہونے کی وجہ سے اپنی زبانوں کی حفاظت کے لئے کوئی ذہنی و علمی طاقت موجود نہیں۔ اگر یہ ملک اسی طرح انگریزی اور فرانسیسی کے غلام بنے رہے تو ان کی اپنی زبانیں آہستہ آہستہ بالکل فنا ہو جائیں گی۔ غلام ہندوستان اور بالخصوص ہندوستان کے اعلے تعلیم یافتہ طبقہ کی غلامانہ ذہنیت بھی بطور مثال پیش کی جا سکتی ہے ان لوگوں نے نہ صرف انگریزی لباس اور انگریزی طرز بود و باش کی تقلید کرنا اپنا شعار بنا لیا ہے بلکہ وہ اپنی مادری زبان میں گفتگو کرتے ہوئے شرم و ذلت محسوس کرتے ہیں انہیں اپنی وطنی زبان اور اس کے ادب سے نہ صرف کوئی دلچسپی نہیں ہے بلکہ وہ ایک حد تک اس کی ترقی کی راہ میں رخنہ انداز ہو رہے ہیں ان کو اپنی انگریزی دانی پر فخر ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ وطنی زبان کو مٹا کر ملک میں انگریزی رائج کر دیں۔ اس تاریکی میں صرف ریاست حیدرآباد میں روشنی کی ایک شعاع نظر آتی ہے جس کے دور اندیش اور حساس دل کے مالک تاجدار سلطان العلوم اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں صاحب نے اپنی مادری زبان اور اس کے ادب کی ضرورت اور اہمیت کو پوری طرح محسوس کر کے اردو کو ذریعہ تعلیم

قرار دیدیا ہے۔ اور اس طرح اپنی اس قومی اور وطنی زبان کو فنا ہوجانے سے بچالیا ہے۔

حقیقت السنہ پر نگاہ ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ زبان اور حکومت کا آپس میں لازم و ملزوم کا تعلق ہے۔ جب ہندوستان پر آریاؤں کی حکومت تھی تو سنسکرت کو فروغ حاصل تھا۔ مسلمانوں کے عہد حکومت میں ہر شہر اور ہر قصبہ عربی و ایرانی علوم و معارف کا مرکز بن گیا۔ اور جب ہندوستان پر برطانوی راج قائم ہوگیا تو ہر طرف انگریزی کا چرچا ہوا۔ اور آج خیر سنسکرت تو ایک مردہ زبان ہوکر رہ گئی ہے، عربی و فارسی کا ذکر بھی سوائے چند مذہبی درسگاہوں کے اور کہیں بہت کم سننے میں آتا ہے

جو قوم اپنی طویل غلامی کی سیاہی کو مستقبل میں آزادی کی روشنی سے منور کرنا چاہتی ہے اس کا فرض اولین یہی ہے کہ سیاسی حقوق کا ہنگامہ برپا کرنے سے پہلے حاکم قوم کی زبان سے کنارہ کشی اختیار کرکے اپنی مادری زبان کو ترقی دے۔ اگر اس زبان میں فاتحانہ قوت موجود ہے تو وہ آزادی کی دیوی سے بھی ہمکنار ہوسکتا ہے ورنہ انسانیت بھی خطرہ میں ہے اسی وجہ سے ہندوستان کے مسلمان اپنی مادری زبان اور اس کے ادب کے تحفظ کا مطالبہ کرنے میں حق بہ جانب ہیں اور ہندی کی روزافزوں ترقی سے خائف ہیں۔ کیونکہ ان کے دور اندیش اور صائب الرائے حضرات نے محسوس کرلیا ہے کہ اگر برادران وطن اردو کو مٹا کر ہندی کو قومی زبان بنانے میں کامیاب ہوگئے تو اس کا صاف اور واضح الفاظ میں یہی مطلب ہوگا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو انگریزوں کی بجائے ہندوؤں کی ذہنی غلامی کرنی پڑے گی کاش اردو داں حضرات اپنی زبان اور اس کے ادب کی حفاظت کو محسوس کرکے اسے ترقی دینے اور خادمان زبان کی ہمت افزائی کرنے کی طرف متوجہ ہوں، کیونکہ اس صورت میں ہندوستان کے مسلمان اپنی انفرادی ہستی کے قیام و بقاء کا انتظام کرسکیں گے۔

زبان کی ضرورت اور اہمیت پر سطور بالا میں کافی بحث ہوچکی ہے۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ قوم کی تہذیب و تمدن اور معاشرت کی ساری بنیاد زبان پر قائم ہوتی ہے۔ ہمارے خیالات و افکار اور اعمال و افعال کا راستہ زبان ہی متعین کرتی ہے۔ اگر آج جزائر برطانیہ کی سرکاری اور دفتری زبان انگریزی کی بجائے عربی کردی جائے تو چند سال کے اندر اندر اس ملک کی تہذیب اور معاشرت میں نمایاں تغیر نظر آنے لگے۔ ہندوستان میں انگریزی زبان کے رواج پذیر ہونے کی وجہ سے اس کا ہماری معاشرت اور تہذیب پر جو خاموش مگر بیحد خائز اثر پڑا ہے وہ آج ہمارے سامنے ہے اس لئے اگر ہندوستان کے متحدہ جمہوری نظام حکومت میں ہندو اپنی اکثریت کی وجہ سے اس ہندی کو جو آج کل بنائی جارہی ہے سرکاری اور دفتری زبان کی حیثیت دیدیں تو اس کے لازمی اور بدیہی معنی یہ ہوں گے کہ ہندو تہذیب و تمدن کو ہندوستان میں رائج کیا جارہا ہے کسی کو نہیں معلوم کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے ملاپ سے ہندوستان میں ایک مشترک زبان بنی تھی اور یہی مشترک زبان ہندو اور مسلمان کی مشترکہ قومیت کا سنگ بنیاد تھی۔ لیکن آج اس مشترک زبان کو اردو کا نام دے کر صرف مسلمانوں کی مخصوص زبان کہا جارہا ہے اور اس کی جگہ ملک کی عام زبان خالص سنسکرتی ہندی کو قرار دیا جارہا ہے۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اشتراک و اتحاد کا جھوٹا نام لے کر مسلمانوں کو خالص ہندو معاشرت قبول کرنے پر مجبور کیا جارہا ہے۔

اردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دے کر اس کی تعلیم کا جداگانہ انتظام کردینا یا کتب خانوں میں اردو کی کتابیں فراہم کردینا یا اس قسم کی چند رعایتیں جن کا بہت زور شور کے ساتھ پرچار کیا جاتا ہے مسلمانوں کیلئے بے کار ہیں۔ اگر ہندوستان میں ایک جمہوری حکومت قائم ہوجائے اور اس جمہوری حکومت میں ہندو اکثریت ہندی رائج کردے تو پھر اردو کی حیثیت ہی کیا رہ جائے گی۔ اس صورت میں نہ تو اردو میں تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت باقی رہے گی اور نہ اس کے تحفظ کا کوئی مطالبہ کرے گا۔ مسلمانوں کو اردو کے تحفظ پر اصرار اس لئے نہیں ہے کہ یہ ان کی مذہبی زبان ہے بلکہ اس لئے اور صرف اس لئے کہ اردو ہندوؤں اور مسلمانوں کی تہذیب و معاشرت کے ملاپ کی نشانی ہے۔ یہ ایک ایسا نشان راہ ہے جس سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ باہمی اشتراک و اتحاد کی راہ میں ہم نے کتنی منزلیں طے کی ہیں اس لئے اگر آج اردو کی اس حیثیت کو تسلیم کرنے سے کسی کو انکار ہے تو اس کے صاف اور کھلے ہوئے معنی یہی ہیں کہ مسلمانوں سے یہ کہا جاتا ہے کہ آنے والے ہندوستان کی مشترک قومی تہذیب کے مرقع میں ہم تمہیں تمہارا جائز حق دینے کے لئے تیار نہیں، ہم تم سے متاثر ہونا نہیں چاہتے صرف تم کو متاثر کرنا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ مسلمان اس حیثیت کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوسکتے ہیں۔ کیونکہ جس زبان کو ہندو اکثریت ملک میں رائج کرنا چاہتی ہے اس میں عربی فارسی کے زود فہم اور کثیر الاستعمال الفاظ کو بھی خارج کرکے اوق اور قطعاً ناقابل فہم

(بقیہ صفحہ ۳۲ پر)

جراثیم ملیریا کی تاریخ

سر رونالڈ روس کی وفات پر بعض اخبارات نے یہ بیان شائع کیا کہ ملیریا کے جراثیم سب سے پہلے ڈاکٹر رونالڈ روس نے دریافت کئے ہیں حالانکہ ان کا یہ بیان حقیقت کے خلاف تھا کیونکہ اس کی دریافت تو ایک فرانسیسی ڈاکٹر لافران کی جد و جہد کا نتیجہ ہے جو سنہ ۱۸۸۰ء میں مکمل ہو چکی تھی۔ یہ ڈاکٹر فرانسیسی فوج متعینہ ٹیونس الجزائر و مراکش کا طبیب تھا۔ فوج میں یہ مرض اکثر پھیلتا رہتا تھا اس لئے اس نے اس پر توجہ کی اور اس کے اسباب دریافت کر کے چھوڑے۔

بہر حال اس جرثومہ کا انکشاف اخبارات کے اس بیان سے معرض اختلاف میں آگیا ورنہ یہ دونوں باتیں پہلے ہی سے معلوم تھیں۔ اور سر رونالڈ روس کی انکشاف کے متعلق مزید تحقیق یہ بھی تھی کہ انہوں نے جرثومہ ملیریا دریافت ضرور کیا تھا۔ مگر وہ جرثومہ جو پرندوں میں ملیریا کا باعث ہوتا ہے نہ کہ انسانوں میں پرندوں کا ملیریائی جرثومہ ----- انسانی ملیریائی جرثومہ سے مختلف ہوتا ہے مگر اختلاف و اشتباہ کی بدولت ضرورت محسوس ہوئی کہ مسئلہ پر مزید تحقیق کی جائے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ بکٹریا لوجی (علم جراثیم) کے ماہر خصوصی ڈاکٹر زکی خالد سے اس بات میں معلومات اخذ کی جائیں۔

چنانچہ آئندہ معلومات ڈاکٹر صاحب موصوف ہی کے رہین تحقیق ہیں۔

ڈاکٹر صاحب موصوف نے فرمایا کہ اس کی دریافت بھی عجیب و غریب دلچسپ کہانی سے کم نہیں ہے جس طرح پولیس اور سراغرسانی کے اخبار دلچسپی سے پڑھے اور سنے جاتے ہیں اس کی دریافت کی کیفیت بھی ایسی ہی دلچسپ ہے۔

تقریباً بیس سال سے متواتر مختلف اقوام کے ڈاکٹر اس کے تلاش میں سرگرداں تھے۔ اور ہر ایک نے اس کی کافی جانچ کی اور سب مختلف وقتوں اور مختلف مقامات پر تقریباً صحیح نتیجے پر پہنچے جو جو تکالیف اور مصائب انہوں نے ان دریافتوں میں اٹھائے ان کو ہم بخوف طوالت نظر انداز کرتے ہیں۔ ان لوگوں نے یورپ ایشیاء، افریقہ ہر سہ براعظموں میں گشت لگائی ملیریا کے اسباب کو دریافت کیا۔ اکثر مواقع پر موت کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ گروہ اپنے اہل و عیال وطن دوست و احباب سے دور علم کے شوق اور اس کی تحقیقات میں مصروف جنگلوں اور ایسے میدانوں میں جہاں ملیریا کثرت سے ہوتا ہے سفر کر رہا تھا۔ ان علماء میں مختلف اقوام کے لوگ شامل تھے جن میں انگریز فرانسیسی اور اطالوی سب تھے

یہ ایک عجیب بات ہے کہ یہ مختلف اقوام اور مختلف الخیال علماء تھے لیکن طرز تحقیق سب کا ایک ہی تھا۔ میری رائے میں یہ حقیقی ہیرو تھے .... اور علم پر اور انسان پر ان کے کارنامے ان کی تحقیقات کا بہت بڑا احسان ہے۔ ان کی زندگی اور ان کے کارنامے ہمیشہ ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ آئندہ آنے والی بہادر قومیں ان کے نقش قدم کی پیروی کریں گی۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے دنیا اور اس کی جملہ دلچسپیوں کو چھوڑ کر تنہا جنگلوں کو اختیار کیا اور معلومات حاصل کی۔ ان کی معلومات جب تک دنیا کو فائدہ پہنچاتی رہے گی ان کی کوششیں مشکور ہوتی رہیں گی۔ سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔

سنہ ۱۸۸۰ء میں نوجوان ڈاکٹر لافیران (فرانس) نے خوردبین کے ذریعہ سے ملیریا کے مریضوں کے خون کا معائنہ کیا یہ مریض الجزائر میں تھے اور یہ ڈاکٹر وہاں متعین تھا۔ ڈاکٹر نے خون کے سرخ ذرات میں نہایت چھوٹے جراثیم محسوس کئے۔

پانچ سال بعد ڈاکٹر گوگی نے یہ معلومات حاصل کی کہ یہ جراثیم مختلف قسم کے ہوتے ہیں اور خون کے ذرات سے نکل کر جسم پر اثر انداز ہوتے ہیں اور ان کے نتائج اور اثرات بھی مختلف ہوتے ہیں۔ رونگٹے کھڑے ہونے اور لرزہ آنے کا سبب بھی اس نے بیان کیا اور یہ بتایا کہ عموماً مغرب کے وقت ہی ایسا کیوں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر کوخ گوگی اور سیلی کی متفقہ یہ رائے ہوئی کہ ملیریا کی متعدد قسمیں ہیں اور ہر قسم کے ملیریا کا تعلق اسی قسم کے جراثیم سے ہے یعنی جس طرح جراثیم مختلف النوع ہیں اسی طرح ملیریا بھی مختلف النوع ہے۔ اس جگہ سے جراثیم ملیریا کی بحث شروع ہوگئی۔ اور تحقیقات سے معلوم ہوا کہ یہ قسمیں سب ہمارے ہی خون میں پرورش پاتی ہیں۔ پھر ہم کو ہی فنا کرتے ہیں یہ بھی معلوم ہوا کہ ہمارے سرخ ذرات خون سے اپنی غذا حاصل کرتے ہیں۔ اور توالد و تناسل کے سلسلہ سے بڑھتے ہیں۔ جب کثرت ہوجاتی ہے تو نظام صحت کو درہم برہم کر دیتے ہیں۔ جب ہم ملیریا میں مبتلا ہوتے ہیں تو ہمارے خون کے لاکھوں ذرات فنا ہوجاتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے ملیریا کے مریض نقر الدم یعنی قلت خون کا شکار ہوتے ہیں۔ اب ایک سوال یہ ہے کہ یہ جراثیم کہاں سے آتے اور کہاں پیدا ہوتے اور کس طرح ایک سے دوسرے میں منتقل ہوتے رہتے ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ جب۔ ملیریا کا سبب دریافت ہوگیا تو پھر مفکرین نے اس مسئلہ پر غور کیا کہ مریض سے تندرست جسم میں یہ مرض کس طرح منتقل ہوتا ہے چنانچہ ڈاکٹر لاقران (فرانس) اور ڈاکٹر کینگ (انگلستان)

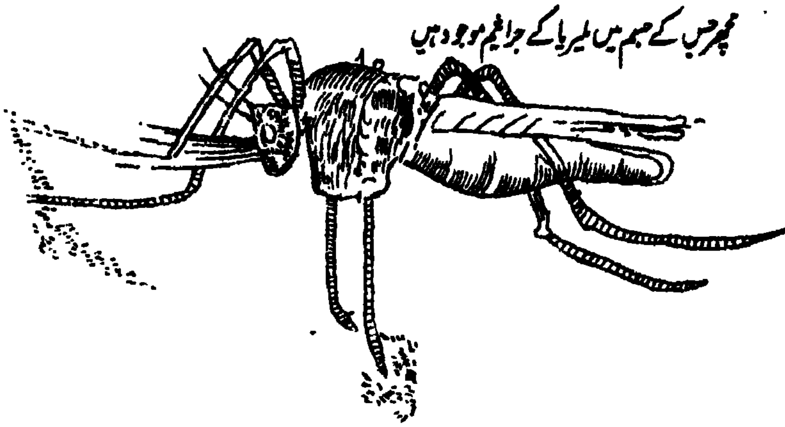
نے خیال کیا کہ مچھر کے ذریعہ سے یہ جراثیم مریض سے تندرست جسم میں منتقل ہوتے ہیں اور تندرست کو مریض بنا دیتے ہیں۔ لیکن ابھی یہ خیال تحقیق کا مرتبہ نہ حاصل کرسکا تھا۔

سر بے ٹریک نے رائے قائم کی کہ یہ جراثیم مچھر کے معدے میں اتر جاتے ہیں اور پھر جسم انسان میں اس کے معدہ سے منتقل ہوتے ہیں۔ اپنا دور حیات مچھر کے جسم میں پورا کرتے بڑھتے رہتے ہیں اور پھر جسم انسانی میں مچھر کے ذریعہ سے جب وہ انسان کو کاٹتا ہے۔ منتقل ہوجاتے ہیں۔ اس نظریہ کے مطابق جراثیم ملیریا کی زندگی کے دو دور تسلیم کئے جاتے ہیں پہلا دور جب کہ وہ مچھر کے معدے میں ہوتے ہیں دوسرا دور جب کہ وہ انسان کے جسم میں ہوں جب انسان کے جسم میں ہوتے ہیں تو خون کے سرخ ذرات میں بڑھتے رہتے ہیں۔ مچھر کے جسم میں جب ہوتے ہیں تو اس کے معدے میں نشو و نما پاتے ہیں اس نظریہ پر بہت سے دلائل دئے گئے ہیں اور ان دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظریہ بالکل درست اور قابل تسلیم ہے۔

ڈاکٹر روس نے ان نظریوں اور تحقیقاتوں کے بعد ثابت کیا

رہتے ہیں اس کی شکل دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ایک سونڈ مثل ہاتھی کی سونڈ کے ہوتی ہے۔ جس میں وہ جراثیم ہوتے ہیں جو تعدیہ سے پہلے پرندوں کے خون میں پائے جانے والے جراثیم کے مشابہ ہوتے ہیں۔ یہ ہے وہ تحقیقات جو ڈاکٹر رونالڈ روس نے کی تھی۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم غلط بحث کرکے انسانی جراثیم ملیریا کا مکتشف ڈاکٹر رونالڈ روس کو نہ مان لیں۔ اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر موصوف نے اپنی تحقیقات سے یہ ثابت کر دیا تھا کہ مریض سے تندرست تک ملیریا کا تعدیہ مچھر کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ اس لئے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آئندہ تحقیقات کے لئے ایک بڑا راستہ پیدا کر دیا اور ملیریا کے اسباب و تعدیہ پر بحث کرنے کی بہت سی سہولتیں پیدا کر دیں۔ جس حد تک پرندوں کا تعلق ہے ۱۸۹۸ء میں ملیریائی جراثیم کا انکشاف مکمل ہو چکا تھا۔ مگر انسانوں میں ملیریا کی پیدائش اور تعدیہ کے اسباب معلوم کرنے کا سہرا دو اٹالین علماء گراسی اور نیامی کے سر تھا۔ انہوں نے ثابت کیا کہ تعدیہ انافلس مچھر کے ذریعے سے ہوتا ہے اس حقیقت کی توضیح کی کہ ملیریا کے جراثیم اپنی زندگی کے دونوں دور مچھر کے معدے اور انسان کے خون میں کس طرح پورے کرتے ہیں۔ یہ بیان کرنا بھی ضروری ہے۔ یورپ میں اٹلی ہی وہ جگہ ہے جہاں ملیریا پھیلانے والے مچھر کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

مچھر جس کے جسم میں ملیریا کے جراثیم موجود ہیں





جراثیم ملیریا مچھر کے معدے میں اڑ رہے ہیں

کہ جراثیم ملیریا جو پرندوں پر اثر انداز ہوتے ہیں وہ بھی مچھر کے معدے میں پرورش پاتے اور ترقی کرتے ہیں ان کی زندگی کے بھی دو دور ہیں پہلا دور جب کہ مچھر کے معدے میں ہوں دوسرا دور جب کہ پرندے کے خون کے اجزا سے اپنی غذا حاصل کریں۔

جس مچھر کے معدے میں یہ جراثیم پرورش پاتے اور زندہ

تجربہ ہی سب سے بڑی دلیل ہے۔ تجربے اور مشاہدات ہی سے ہم کسی نظریہ کی کامل تصدیق کر سکتے ہیں۔ یا انکار کرتے ہیں وہ انگریز علمانے اس طرف توجہ کی وہ اٹلی سے لندن ایسے مچھر لائے جن کے معدوں میں ملیریا کے جراثیم پرورش پا رہے تھے لندن میں جہاں ملیریا کا نام بھی دھا چند تندرست اشخاص کو ان مچھروں سے کٹوایا۔ جب مدت معینہ گذر گئی ان اشخاص پر ملیریا کا اثر ہوا اور بیمار ہو گئے۔ جب ان کے خون کا معائنہ کیا گیا تو ملیریا کے جراثیم پائے گئے اس تحقیقات کے بعد ان میں کوئی شک نہیں رہا کہ ملیریا جراثیم کے ذریعہ پیدا ہوتا ہے اور یہ جراثیم مچھروں کے ذریعہ سے ایک جسم سے دوسرے جسم میں منتقل ہوتے ہیں۔ انسان نے کامل ایک چوتھائی صدی اس کی تحقیقات میں گذار دی آخر وہ گوہر مقصود حاصل کر سکا۔ باوجود اس مشاہداتی تصدیق کے غافل انسان اس پر یقین نہیں رکھتا اور بہت لوگ تو اس کو جانتے بھی نہیں کہ یہ کیا ہے اور کیوں ہوتا ہے ڈاکٹر زکی خالد کی رائے حاصل کرنے کے بعد دوسرے مشہور ماہر فن و ڈاکٹروں سے ملیریا سے بچنے کے طریقے معلوم کئے گئے چنانچہ ڈاکٹر حسنین کی رائے حسب ذیل ہے۔

مچھر سے امراض ذیل کا تعدیہ ہوتا ہے۔

۱۔ ملیریا۔

۲۔ ڈینگو فیور

۳۔ فیل پا (انسان کی پنڈلی اس قدر موٹی ہوتی ہے۔ جیسے ہاتھی کی) ۴۔ زرد بخار۔

اس کے تعدیہ سے محفوظ رہنے کے حسب ذیل طریقے ہیں۔

۱ جہاں تک ہو سکے اس مچھر کو اپنے گھر میں آنے نہ دو ایسے مقامات کو صاف رکھو جہاں عموماً اس کی سکونت رہے اور اسکو پنا مل سکے

۲ جہاں تک ہو سکے مچھر دانی میں سویا کرو اور اس کے کنارے بستر کے نیچے دبے ہوں تاکہ مچھر کسی طرح بھی ان میں داخل نہ ہو سکے۔

۳۔ مچھروں کو جو تمہارے گھر میں ہیں بالکل فنا کر ڈالو۔

۴۔ جہاں تک ہو سکے گھر میں گندہ پانی جمع نہ ہونے دو موری اور نالیاں ہفتہ میں کم سے کم ایک مرتبہ صاف کی جایا کریں پانی اور پانی کے برتن ہمیشہ صاف رہیں اور جہاں مچھر پیدا ہوتے ہوں وہ جگہ عموماً نم دار ہوتی ہے۔ وہاں صفائی کی طرف خاص توجہ رکھی جائے اور ایسی ادویہ چھڑکی جائیں جو مچھر کو فنا کر دیتی ہیں۔

۵۔ اگر مچھر سے کسی طرح بھی حفاظت ممکن نہ ہو تو پھر کونین کو استعمال کرنا چاہیئے۔ ایک یا دو خوراک ڈاکٹر کے مشورے سے ضرور استعمال کرتے رہنا چاہیئے۔

* اگر کوئی شخص ملیریا میں مبتلا ہو جائے تو حسب ذیل ہدایات پر عمل کرنا چاہیئے۔

۱ فوراً ڈاکٹر یا طبیب سے رجوع کریں۔

۲۔ شفا کامل کے بعد بھی تین ماہ تک کونین کا استعمال جاری رکھنا چاہیئے۔

۳۔ ایسے اشخاص کو جن پر مرض کا ایک دفعہ حملہ ہو چکا ہے دوسرے مریض اشخاص سے دور ہی رکھا جائے تاکہ وہ دوبارہ پھر اس کی زد میں نہ آئیں۔

امید ہے کہ ہمارا مضمون لوگوں کو ملیریا سے محفوظ رکھنے کے لئے اگر وہ ان ہدایات پر عمل پیرا ہوئے تو ضرور مفید ہوگا۔

ابوحمزہ حسنی

(بقیہ مضمون صفحہ ۲۸ پر ہے)

سنسکرت کے الفاظ کو ٹھونسا جا رہا ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اگر اس نوع کی زبان ملک میں رائج ہو گئی اور مسلمانوں کو اس کے اختیار کرنے پر مجبور کیا گیا یا مجبور ہونا پڑا تو وہ عربی و فارسی سے قطعاً بے گانہ ہو جائینگے اور اس کے نتیجہ کے طور پر ان کو اسلامی دنیا سے دور کا بھی واسطہ نہ رہیگا۔ وہ مرکز سے الگ ہٹ کر اپنی انفرادی ہستی کو قائم رکھنے میں کبھی کامیاب نہ ہو سکینگے۔ اندریں حالات ہندوستانی مسلمانوں کے دور اندیش، ورصاحب الرائے حضرات کا فرض ہے کہ وہ ابھی سے اس خطرہ کو محسوس کر کے مسلمانوں کو اس سے بچانے کیلئے کوشش شروع کر دیں ورنہ پانی سر سے اونچا ہو جائیگا صورت میں کوئی تدبیر کارگر نہ ہوگی

(سید محمود مورخ)

حقیقتِ عُریاں

"ہیلو! ہیلو!! ... ... آپ کہاں سے بول رہے ہیں؟
... ... اچھا! تمام دوسری کارروائی کو بالائے طاق رکھدو اور .....
ہاں سنو ..... گھر سے واپسی پر ایک اندھے فقیر کو جس کے چہرے پر مفلسی، غمگینی، اداسی، ایسی بلاؤں نے گھر بنا رکھا ہو اپنے ساتھ لیتے آئیو اور ...... ہاں! ... ... دیکھنا فقیر عمر رسیدہ بھی ہو اگر اس کے ڈیڑھ یا بالشت لانبی سیاہ ریش ہو تو بہت ہی بہتر ہے —
گیا ؟
جہاں سے بھی مل سکے ...... تمہیں ایسا ہی فقیر لانا ہوگا ...... ورنہ اس کی اداکاری تمہیں کرنی ہوگی ..... سمجھے؟
..... ہاں تو تمام بیرونی مناظر آج ختم ہو جانے چاہئیں —" یہ کہتے ہوئے ڈائرکٹر نے سلسلۂ پیغام رسانی منقطع کر دیا۔

یہ تھے وہ احکام جو ڈائرکٹر نے فون پر سنائے۔

لوٹتے وقت سڑک کے کنارے کھڑے ہونے والے فقیروں کو غور سے دیکھتا چلا آیا۔ ریلوے اسٹیشن کے قریب ہی مجھے فقیروں کا ایک گروہ نظر پڑا۔ ان میں بوڑھے بھی تھے اور جوان بھی۔ لنگڑے بھی تھے اور بدشکل بھی۔ لیکن اداسی ان کے چہروں پر نام کو نہ تھی اور نہ ہی وہ اندھے تھے۔

تھوڑا عرصہ توقف کرنے کے بعد میں نے ایک لنگڑے فقیر کو بلا کر پوچھا "کیا کوئی اندھا فقیر مل سکتا ہے۔

"ہاں! وہاں! ! ...... گھنے درخت کے نیچے گلفروشں کی دکان کے پاس" — لنگڑے فقیر نے سامنے والی گلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

فقیر نے مجھے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے بتا دیا۔ اگرچہ وہ میرے اس سوال پر متعجب ضرور ہوا ہوگا اور نہ ہی میرے اس غیر معمولی سوال نے اسے پریشان کیا۔

یہ کیوں — ؟ یہ میں خود بتانے سے قاصر ہوں۔

میں اس جگہ پر گیا۔ اندھا فقیر وہاں موجود تھا۔ اداسیاں اس کے چہرے پر نچھاور ہو رہی تھیں۔

میرے خیال میں ڈائرکٹر ایسے ہی شخص کا آرزومند تھا۔

میرے شوفر نے کار کو روکا اور فقیر کو اپنے پاس بلا لیا۔

"کیا تم ہمارے ساتھ چلو گے —" میں نے اس سے دریافت کیا۔

وہ کچھ ڈر سا گیا۔

"کہاں — ؟ کیا تم پولیس کے آدمی ہو — ؟" غریب مارے ڈر کے کانپ رہا تھا۔

اس نے مجھے پولیس کا ایک افسر سمجھ لیا ہوتا اگر میں اسے یہ نہ بتا دیتا کہ میں اسے فلمانا چاہتا ہوں جس کے لئے معقول اجرت دیجائے گی

"فلمانا — ؟ یہ میں نہیں سمجھا" اس نے تھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

اس دوران میں کار کے گرد لوگوں کا جمگھٹا ہو گیا۔

گروہ میں سے ایک نوجوان نے ہمیں بتایا کہ کچھ دن ہوئے پولیس اس فقیر کے اکلوتے بیٹے کو پکڑ لے گئی تھی اور جبھی سے یہ غریب غم کی وجہ سے بے چین ہے۔

لیکن میں کوئی پولیس افسر نہیں ہوں۔ تم میرے ساتھ چلو ... تمہیں معقول معاوضہ دیا جائے گا۔ اور میرا شوفر تمہیں کار میں عین اسی جگہ تمہارا کام ختم ہونے کے بعد چھوڑ جائے گا .... میں نے اسے نرم لہجہ میں سمجھایا۔ پہلے تو اندھا فقیر کچھ ہچکچایا لیکن پھر وہ ایک قدم آگے بڑھا۔

میرے اشارہ کرنے پر شوفر نے اسے اپنے پاس اگلی سیٹ پر بیٹھنے میں مدد دی۔ کار بڑی تیزی کے ساتھ لوگوں کے گروہ کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔

فقیر کار میں بیٹھا تصور کر رہا ہوگا کہ میں ہارون الرشید خلیفہ بغداد کے طلسمی قالین پر بیٹھا اڑا چلا جا رہا ہوں۔

راستے میں میں نے اس سے پوچھا کہ اُسے دن میں کتنے پیسے مل جاتے ہیں اور وہ اس جگہ کب سے ٹھیرا ہوا ہے۔

"بابو جی ــــ!! اب تو میں رات کو بھیک مانگنے سے بھی تنگ آگیا ہوں۔ پولیس تو مجھے دن کے وقت بھی شہر کے کوچہ و بازار میں پھرنے کی اجازت نہیں دیتی۔

کوئی ایسا خوش قسمت دن آتا ہوگا۔ جس دن مجھے کچھ پیسے مل جاتے ہوں جو دو ایک دن کے لئے کافی ہوتے ہیں۔ بسا اوقات تو میں بھوکا پیاسا ہی اس درخت کے سائے میں پڑا رہتا ہوں"

وہ بہت نحیف و نزار نظر آتا تھا۔ اس کا جسم کانپ رہا تھا جیسے کہ اسے لرزہ آگیا ہو۔

"کیا تم جانتے ہو۔ فلم کیا ہے ــــ؟ تم کتنے عرصہ سے اندھے ہو! ...... تمہاری بینائی کب سے جاتی رہی؟"

"میں کیا جانوں بابا! ...... میں نے کچھ نہیں دیکھا!!.... میں مادر زاد اندھا ہوں!!!"

اس کا لہجہ افسردہ اور الفاظ پر درد تھے۔

جب ہم نگار خانہ پہنچے تو ڈائرکٹر ان بیرونی مناظر کی تمام تیاریاں مکمل کر چکا تھا۔ جہاں کہ فقیر نے فضائے صحیح کی تخلیق کرنا تھی۔

ڈائرکٹر نے فقیر کو ناقدانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "بہت خوب! ــــــــ"

ڈائرکٹر اپنے معاون کو فقیر کی مشق کرداری سے متعلق چند ضروری ہدایات دینے کے بعد دیگر اہم امور کی دیکھ بھال کے لئے چلا گیا۔

معاون اندھے فقیر کے پاس گیا۔ اور یوں گویا ہوا۔

"ذرا غور سے سنو! اور پھر میری طرح فقیروں کی سی آواز نکالو"

پھر معاون نے فقیرانہ صدا لگائی:-

"دے اللہ کا نام ...... کوئی لگے نہ دام۔"

ذرا تصور کیجئے معاون فقیر کو اس کا اپنا کام سکھا رہا ہے۔ لیکن یہ "فلمی زندگی" ہے۔ نابینا فقیر خاموش تھا۔

"تم گاتے کیوں نہیں۔ جیسا کہ میں کہہ رہا ہوں ــــ؟" معاون نے تند لہجہ میں کہا۔ فقیر کے چہرے سے ایک کیفیت عجیب مترشح تھی وہ سہما ہوا سا اور پریشان معلوم ہو رہا تھا۔

"کہو نا ــــــ" معاون نے چلا کر کہا۔

"نہیں بابا...... یہ میں کبھی نہیں کہہ سکتا!" فقیر نے خشمگیں لہجہ میں کہا۔

"میں ہمیشہ خدا کے نام پر دریوزہ گری کرتا رہا ہوں۔ یہ میں کیسے کہہ دوں کہ اس میں کوئی بھی دام نہیں لگتا"

ڈائرکٹر ان کی یہ باہمی تکرار سن کر وہاں آموجود ہوا۔

وہ فقیر کے تخیلات کو بھانپ گیا۔

ڈائرکٹر نے اسے نرمی سے سمجھایا اور اسے چائے کا پیالہ پیش کیا۔ وہ اس سے ہمدردانہ گفتگو کرتا رہا۔ حتیٰ کہ فقیر کو مجبور ہو کر کہنا پڑا۔

"آپ پولیس کے آدمی تھوڑا ہی ہیں ــ"

تھوڑی ہی دیر بعد فقیر کو مصروف کار دیکھا گیا۔

چند ہی مشقوں کے بعد فقیر کی اس درد بھری آواز کی صدا بندی کر لی گئی اور عکاس نے اس کی لرزیدہ خرامی اور اس کے ناقابل بیان مغموم چہرے کو فلما لیا۔ اعادہ کے بعد فقیر کا کام ختم ہو گیا۔

فقیر کو اجرت کے لئے ڈیڑھ روپیہ دیا گیا۔ جسے اس نے نہایت احتیاط کے ساتھ اس نے ایک چونی تبدیل کرنے کے لئے لوٹا دی۔

کار اسے اس کی فرودگاہ کے پاس لے آئی ..... اس گھنے درخت کے نیچے جہاں "پھول والے" کی دوکان تھی۔

فلم تیار ہو چکی تھی۔ اس کی نمائش پردۂ سیمیں پر کی جاتی ہے جب رات کی خاموش تاریکیوں کا سماں فقیر کی دردناک آواز کو اپنے جلو میں لئے ہوتا ہے تو ایک ماہر فن نقاد اس منظر کی صحیح فضا پر صدائے تحسین بلند کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

"کیا خوب اداکاری ہے! ...... ایک بازاری فقیر بھی اس کردار کو اس احسن طریقے سے نہیں نبھا سکتا ...... یہ قابل اداکار ضرور ایک نہ ایک دن فن کے لئے سرمایۂ ناز ہوگا!"

لیکن ناظرین میں سے کوئی ایک بھی اس "پروردۂ افلاس" کو نہ جان سکے گا۔ جس نے پردۂ سیمیں پر ان کو حیرت زدہ کر دیا تھا۔

عزیز ضیا لدھیانوی

قطعات

ماضی

ماضی کو خیالات سے کب ٹالتے ہیں
غفلت میں بسر کر کے احساس سے کچھ پالتے ہیں
کچھ شرح بتاتے ہیں اسی کا مقصود ادیب
اس دور تو تو ہی کی یہ بکھری جانتے ہیں

تنقید لطیف

سمجھو کہ یہ حکومت نے جو دھار رکھا ہے
زر نے دولت نے ادھار رکھا ہے
عالم کہ دو عالم سے اڑی ہے لب پر
یوں خاک کے پتلوں سے وقار رکھا ہے

دولت

یہ وہ دنیا ہے کہ بس دل ہے جہاں
پھول اخلاص کے نہیں کھلتے
ہم نے دیکھا ہے قصرِ دولت میں
ہاتھ ملتے ہیں دل نہیں ملتے

تہذیب

جب آ گیا گرتے گرتے ہیں قدم تہذیب کا
اڑنے لگے آسمانوں میں علم تہذیب کا
بیگانے ہو گئے ہیں بیان کا سبق
سن کر زبان کی ہیں ہم تہذیب کا

دل

میرے غنچے نے یہ ہی آگ کا بنا سا چراغ
صفحۂ عشق پہ نہیں جلتے ہوئے منظور کا
کر ان کو دیکھا تو دل کے نسبتِ نازک کا
جسم ہیں جو ہر سے ہی انداز شمعِ طور کا

احساسِ نظر

یارب دلِ بسمل کا اثر چھین لے مجھ سے
کیفیتِ فریاد بھی اب چھین لے مجھ سے
ممکن نہیں جاں اور مرے بند دل کی تباہی
اچھا ہے کہ احساسِ نظر چھین لے مجھ سے

ادیب مالیگانوی

مجربات

ازجناب حکیم حاجی شمش الحق خان صاحب

سفوف جریان تالمکھانہ، بھونچلی، بیج بند، ستاور، ریش برگد ہر ایک ۲ تولے، سب چیزوں کو کوٹ چھان کر سات تولے شکر سفید ملاکر تیار کریں اور نو نو ماشہ یہ سفوف صبح و شام گائے کے دودھ کے ساتھ استعمال کریں، یہ سفوف جریان کے لئے بیحد مفید ہے، اور زکاوت حس کو رفع کرتا ہے۔

سفوف احتلام ثعلب مصری، ستاور، موصلی سفید، ہر ایک ایک تولہ مغز تخم تمرہندی ۲ تولہ، تخم ریحان ایک تولہ، اسبغول ۲ تولے، کشتہ قلعی ایک تولہ، شکر خام ۵ تولے، سب چیزوں کو کوٹ چھان کر سفوف بنائیں اور نو نو ماشہ صبح اور شام دودھ یا پانی کے ساتھ استعمال کریں، یہ سفوف احتلام کی پرانی سے پرانی شکایت کو دور کر دیتا ہے۔ مغلظ ہے۔

سفوف احتلام دیگر کشتہ مرجان، کشتہ یشب، کشتہ عقیق کشتہ زمرد، کشتہ قلعی، ورق نقرہ ہر ایک ایک تولہ، اقاقیا ۲ تولے، ثعلب مصری، موصلی سفید، شقاقل مصری۔ تالمکھانہ، موصلی سنبھل ہر ایک ایک تولہ، مصری کوزہ پانچ تولے، سب چیزوں کو کوٹ چھان کر سفوف بنالیں اور تین تین ماشہ صبح و شام گائے کے دودھ کے ساتھ استعمال کریں۔

یہ سفوف کثرت احتلام کو دور کرتا ہے اور احتلام کی زیادتی سے جو جو نقصان جسم کو پہنچ جاتے ہیں، ان کا تدارک کرتا ہے، اس کے استعمال میں موسم کی کوئی قید نہیں۔ دل و دماغ وغیرہ کو طاقت پہنچاتا ہے۔

ازجناب حکیم قاضی غلام عمر صاحب حاذق

اکسیر قولنج یہ گولیاں قولنج کے درد کو دور کرتی ہیں پہلی ہی خوراک سے فائدہ معلوم ہوتا ہے۔

نسخہ:۔ نوشادر ایک رتی، افیون ½ رتی، عصارہ ریوند ۲ رتی کلونجی ۳ رتی، سب دواؤں کو خوب باریک پیس کر لعاب گھیکوار کے ساتھ گولیاں بنائیں اور استعمال کرائیں، اگر ضرورت ہو تو دن میں دو مرتبہ ۲ گولی دے سکتے ہیں۔ لاجواب ہیں ضرور تیار کر کے مطب میں رکھیں۔

اکسیر بواسیر مغز تخم نیم، مغز تخم بکائن، رسوت مصفیٰ، چاکسو، مغز کرنجوہ، پوست بندق ہندی، پوست ہلیلہ زرد پوست ہلیلہ خورد، ایلوا، مغز پستہ کتھ عمدہ ہر ایک چار چار ماشہ سب کو کوٹ چھان کر مولی کے پانی سے چنے کے برابر گولیاں بنائیں یہ گولیاں خونی و بادی کو دور کرتی ہیں، خون کو پہلے روز بند کرتی ہیں۔ خارش کو مٹاتی ہیں، مسوں کو خشک کرتی ہیں، ایک ایک گولی صبح و شام ہمراہ آب تازہ استعمال کریں۔

اکسیر صدر ذات الجنب، ضیق النفس، نمونیا، ذات الصدر۔ ذات الریہ میں نہایت مفید ہے۔ کالی کھانسی کو دور کرتا ہے۔ نسخہ:۔ سم الفار سفید ۲ تولہ، شاخ گوزن (براده) ۲ تولہ، شیر مدار ۲۰ تولہ میں کھرل کرتے قرص بنائیں اور آک کے پچاس پتوں میں لپیٹ کر کپڑ مٹی کریں اور دس سیر اپلوں کی آگ دیں، پھر نکال کر رکھیں اور ایک رتی مناسب بدرقہ کے ساتھ استعمال کریں

ضماد صدر یہ ضماد نہایت مفید ثابت ہوا ہے۔ درد سینہ کو فوراً رفع کرتا ہے۔

نسخہ:۔ آرد کرسنہ (ماش) ۱۸ ماشہ، آرد جلہ (میتھی) ۱۹ ماشہ اصل السوس مقشر ۷ ماشہ، شونیز (کلونجی) ۷ ماشہ، عاقرقرحا ۵ ماشہ موم خالص ۵ تولہ، روغن گل ۲ تولہ، موم کو روغن گل میں پگھلائیں۔ اور دوسری دواؤں کو خوب اچھی طرح باریک کر کے ملائیں اور نیم گرم کر کے درد کی جگہ مالش کریں۔ درد فوراً کم ہو جائے گا اور دوبارہ شدت نہ کرے گا۔

برقی حادثات کا عجائب خانہ

وہ چوہا جس نے جنگِ عظیم کا نقشہ بدل دیا تھا!

اس وقت ملک آسٹریا کا دار الحکومت وائنا جرمنی کے ہاتھوں میں ہے اور نازی یورش کا شکار ہو چکا ہے۔ لیکن اس کے پاس اب بھی ایک ایسی چیز جس کی کوئی مثال دنیا میں نہیں ہے یعنی ساری دنیا میں وہیں ایک ایسا واحد عجائب خانہ ہے جس میں برقی حادثات کی بہت سی حیرت انگیز مثالیں جمع کر دی گئی ہیں۔ اس عجائب خانہ کو سائنس کی اصطلاح میں "بجلی میوزیم" کا نام دیدیا گیا ہے۔ اور اس میں تمام چیزوں کو جمع کرنے کا سہرا پروفیسر اسٹیفن جیلینک کے سر ہے جو بجلی کے موضوع پر بڑے ماہر مشہور ہیں۔

اس "بجلی میوزیم" برقی عمل سے پیدا ہونے والے خطرات کی ہزاروں مثالیں موجود ہیں۔ جن کا مطالعہ ماہرین سائنس اور اطبا اور ماہرین جرائم کے لئے بہت مفید ثابت ہو رہا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ حیرت انگیز ایک چھوٹے سے چوہے کی ہے جس نے اب تاریخی شہرت حاصل کر لی ہے۔ یہی چوہا تھا جس نے گذشتہ جنگ عظیم کا نقشہ بدل دیا تھا اور مشرقی محاذ پر جرمنوں کی بڑھتی ہوئی رَو کو دفعتاً روک لیا تھا۔

واقعہ یوں ہے کہ ۱۹۱۷ء میں جب جرمنی جنرل میکنسن رومانیہ پر حملہ آور ہوا تھا اور اس کی فوجیں تیزی سے دھاوا کرتی ہوئی ایک فاتحانہ انداز میں رومانیہ میں داخل ہونا چاہتی تھیں، دفعتاً ایک پراسرار طریقہ پر مرکزی فوجی کمانڈ سے یہ فوجی دستے منقطع ہوگئے اور چوبیس گھنٹے تک ان کے اور مرکز کے درمیان رسل و رسائل کا یا ہدایتیں دینے اور لینے کا سلسلہ ٹوٹا رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جرمن موجوں میں دہشت اور ابتری پھیل گئی۔ اور رومانیہ کی فوجوں نے موقع پاکر ایسی زبردست مورچہ بندی کری۔ کہ جرمن فوجیں آگے نہ بڑھ سکیں۔ اور رومانیہ کی گولہ باریوں کی باعث انہیں پسپا ہونا پڑا اس ایک معمولی سے واقعہ نے مشرقی محاذ پر لڑائی کا پانسہ پلٹ دیا۔

آخر کار جب مرکزی فوجی کمانڈر سے جرمن فوجوں کے منقطع ہوجانے کا سبب دریافت کیا گیا تو معلوم ہوا کہ فوجی ہیڈ کوارٹر کے اہم ترین وائرس اسٹیشن کے آلہ نشر کو ایک چوہے کے عمل نے بیکار و معطل کر دیا تھا۔ یہ چوہا وائرس آلہ کے ایک سوراخ میں گھس گیا تھا اور ایک برقی تار کو کاٹ کر خود موت کا شکار بن گیا تھا۔ اس تار کے کٹ جانے کے باعث آلہ نشر اس طرح بیکار ہوگیا کہ آگے بڑھنے والے فوجی دستے کو کوئی ہدایت بذریعہ وائرس بھیجی نہ جاسکے۔

اب یہ آلہ نشر اور یہ چوہا جس نے جنگ عظیم میں اتحادیوں کی عظیم الشان خدمات انجام دی تھیں وائنا کے عجایب خانہ میں موجود ہیں۔ چوہا الکحل میں محفوظ رکھا گیا ہے تاکہ آئندہ نسلیں بھی اسے دیکھیں اور غور کریں کہ چھوٹے چھوٹے واقعات سے کتنے بڑے بڑے نتیجے پیدا ہوتے ہیں۔

برقی حادثات کے اس عجایب خانے میں صرف یہی تاریخی چوہا نہیں ہے، بلکہ بہت سے جانوروں مثلاً بلیوں، چوہوں، سانپوں، چھپکلیوں، کوّوں اور دوسرے پرندوں کی لاشیں بھی موجود ہیں۔ یہ سب کے سب کسی نہ کسی برقی حادثہ کا شکار ہوئے تھے۔ اور انہوں نے بجلی کی چلتی ہی رو میں مداخلت کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان تمام مثالوں سے حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ بجلی اس زمانے میں ایک بہت کار آمد چیز ہونے کے باوجود خطرناک ہے اور اسکی لائنوں کو اس مکمل طور پر محفوظ رکھنا چاہئے کہ حادثات کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔

پروفیسر سوہن سنگھ امرتسر

ضروری نوٹ خریداران رسالہ "مشہور" کی خدمت میں التماس ہے کہ خط و کتابت کے وقت اپنا خریداری نمبر ضروری تحریر کریں۔

نیازمند منیجر

عورتوں کے لیے

افزائشِ حسن کے تاریخی حقائق!

عام طور پر لوگوں کا خیال ہے کہ اس نئے زمانے میں حسن کی نمائش کا طریقہ مغربی ممالک سے رواج پایا ہے۔ مختلف ممالک کی تواریخ سے پتہ چلتا ہے کہ ہر زمانے میں رسم و رواج اور ماحول کے مطابق نمائش حسن کا طریقہ کسی نہ کسی شکل میں رائج رہا اور صدیوں سے ایسی چیزوں کی تحقیق و تدقیق ہوتی رہی ہے جو حسن کو لازوال بنانے میں مفید ثابت ہو سکیں۔ زمانہ قدیم میں آرین قوم آرائش حسن کے سلسلہ میں بہت سے طریقوں پہ عمل کرتی تھی۔ انجن یعنی سرمہ کا ذکر ویدوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ اس زمانے میں سرمہ صرف آنکھوں کی حفاظت کے لئے استعمال نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ اس کا شمار سامان آرائش میں بھی کیا جاتا تھا۔ بالوں کی حفاظت اور انہیں طویل بنانے کا ذکر بھی وید میں موجود ہے۔

بہت پرانے زمانے میں جسم پر زعفران۔ کافور اور دیگر خوشبودار اشیا کی بھی مالش کی جاتی تھیں۔ اس طرح کا ایک منظر بالمیکی راماتن میں اس مقام پر موجود ہے جب رام بن باس کے وقت ستیا، ستی انوسویا سے ملی تو انوسویا نے شوہر پرستی کی تعلیم دینے کے بعد ستیا کو کچھ ایسی چیزیں دیں جو افزائش حسن کیلئے مفید ہیں۔ والمیک جی لکھتے ہیں۔

یہ خوبصورت مالا۔ خوبصورت زیورات اور چندن لیپ میں تمہیں دے رہی ہوں ستیا! یہ تمہارے جسم کے حسن میں اضافہ کریں گے اور تم اپنے شوہر کے ساتھ ایسی معلوم ہوگی جیسے وشنو کے ساتھ لکشمی!!

راماتن کے اسی شلوک میں "آنگرانک" کا لفظ استعمال کر کے کافور اور مشک کی تعریف کی گئی ہے۔

جسم پر خوشبودار سفوف کی مالش کا ذکر بھی قدیم آرین تاریخ میں موجود ہے۔ زیور اور سامان آرائش کا ذکر بھی پایا جاتا ہے دانتوں کی حفاظت۔ دریا میں غسل کرنا جسم پر مٹی کی مالش وغیرہ ایسے آسانی طریقے ہیں جنہیں اب مغربی ممالک میں تجربہ کی کسوٹی پر رکھا جا رہا ہے۔ مشہور شاعر پنڈت بہاری کہتے ہیں۔

"عورتوں کو افزائش حسن کے لئے مہندی۔ پان، سرمہ مسی وغیرہ استعمال کرنا چاہئے۔ اور گندھے ہوئے بال خوبصورتی کو دوبالا کرنے کے لئے بہترین چیز ہیں۔

ویدک زمانے کے بعد مسلمانوں کے عہد حکومت میں بھی وہی اشیائے آرائش استعمال میں آتی رہیں۔ مسلم عہد کے شاعروں نے ان چیزوں کا ذکر جا بجا کیا ہے۔ حضرت امیر خسرو خانخانان اور کبیر داس وغیرہ نے بھی اپنے دوہوں میں خاص طور پر افزائش حسن کے طریقوں واضح کیا ہے۔ مسلمان بادشاہوں نے ایران۔ ترکی اور عرب کے طریقہ آرائش کو ہندوستانی سنگار میں شامل کر دیا۔ مثال کے طور پر ترکی حمام کو لے لیجئے۔ عہد مغلیہ میں ملکہ نورجہاں نے ایک حمام سے عطر کی ایجاد کی اسی زمانہ میں ہاتھ اور پاؤں میں مہندی لگانے کی رسم بھی جاری ہوئی۔ عرب کی عورتوں میں عموماً گدوانے کا شوق ہوتا تھا۔ وہ بازو اور ساق تک گدوائتی تھیں۔ یہ رسم اب تک دنیا کے ہر ملک میں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ خصوصاً راجپوتانہ سندھ۔ بلوچستان۔ ایران۔ اور عرب کی عورتیں جسم کو گدوانا خوبصورتی کا باعث خیال کرتی ہیں۔ عرب کے بعض قبائل میں آج بھی ٹخنوں سے اوپر گدوایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ عرب میں افزائش حسن کے دیگر طریقوں پر بھی عمل کیا جاتا ہے۔ عرب کے مشہور شاعر جمیل کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے ایک مرتبہ اپنی محبوبہ کی لونڈی سے کہا کہ مجھے شبینہ کا جلوہ دکھا دو۔ لونڈی ام منظور نے اس پیش کش کو منظور کر لیا مگر اس نے جمیل کو شبینہ کا جلوہ جسطرح دکھایا اس کے متعلق وہ خود مصعب بن زبیر کے دربار میں اس طرح بیان کرتی ہے۔

"میں نے ایک ہار شبینہ کے گلے میں ڈال دیا تھا۔ ایک

بھر میں پیسٹ دی تھی۔ کالکوں کی چوٹیاں گوندی تھی اور مانگ میں غلوفی (خوشبو جو صندل کی طرح استعمال کی جاتی ہے) لگوایا تھا۔ بس اتنا ہی سنگار کرکے میں نے شیشہ کو ایک جگہ بیٹھا دیا اور جیل کو صرف اتنی اجازت دی کہ وہ سامنے سے گذر جائے"

ہندوستان سے باہر جہاں مہندی کا رواج نہیں ہے وہاں سرخ رنگ سے ناخن اور انگلیوں کا رنگ لیا جاتا ہے۔ پیشانی پر بندی لگانی قدیم آرین ایجاد ہے۔ اور گال پر سیاہ نقطہ لگانا قدیم ایرانی تہذیب میں شامل ہے۔ تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ سیندور ہندوؤں کی مذہبی چیز ہے۔ لیکن بودھ مذہب کے ساتھ یہ چیز مشرق بعید یعنی چین اور جاپان میں بھی پہونچ گئی۔ بہار اور بنگال کی مسلم خواتین بھی سیندور استعمال کرتی ہیں۔

عہد مغلیہ میں سنترے کا چھلکا۔ آٹا۔ بیس۔ صندل اور دودھ کی بالائی کو محلول کرکے عورتیں چہرے پر مالش کرتی تھیں۔ دولتمند خواتین پستہ۔ بادام۔ زعفران۔ موم کسوم کے پھول وغیرہ کو دودھ میں مس کر چہرہ پر لگاتیں اور بعد میں آٹے سے خشک کرکے اس کو اتار ڈالتی تھیں۔ بھویں بنانے کا رواج ملک چین سے ہندوستان پہونچا اور مغل خواتین نے خاص طور پر اس طریقہ کو دیگر لوازم میں شامل کرلیا۔

رفتہ رفتہ ہندوستان کی مالی حالت خراب ہوتی گئی اور طریقہ آرائش کو سولہ سنگار تک محدود کردیا گیا۔ مگر آج بھی یہ تخفیف شدہ سنگار بڑی بڑی مغربی تہذیبوں سے مقابلہ کررہا ہے۔

دوسرے ممالک کی تاریخ میں بھی اسی طرح کے اذکار ملتے ہیں مصر کی عورتیں دودھ سے غسل کرتی تھیں۔ مصر کی مشہور حسینہ ملکہ قلوپطرہ کا دودھ سے غسل کرنا مشہور ہے۔ اس کی کنیزیں ایک قسم کی مٹی سے اس کے جسم کی مالش کرتی تھیں جس سے اس کا جسم ہمیشہ بارونق رہا کرتا تھا۔ یہ رواج پنجاب کی بعض عورتوں میں اب بھی موجود ہے۔ مصری خواتین غسل کرنے سے پہلے پام اور زیتون کے تیل برابر حصوں میں شامل کرکے جسم پر مالش کرتی تھیں۔ یونان کی عورتوں کے بالوں کی طوالت مشہور تھی۔ روم کی عورتیں دھوئیں کی راکھ اور بھیڑ کی سینک کو پیس کر اور آٹے میں گوندکر منہ پر لگاتی تھیں۔ روم اور یونان میں عورتوں کے لئے حمام بھی بنائے گئے تھے جن کے آثار اب تک پائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہاں افزائش حسن کی تعلیم کا بھی خاص طور پر انتظام تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس مقصد کے لئے بڑے بڑے درس گاہ جاری تھے۔ مغربی ممالک میں آج بھی اسی اصول کے ماتحت آرائش خانے بنائے گئے ہیں۔ مشہور رومن حسینہ تمسو کیشیا آرائش حسن کے طریقوں سے واقف ہونا مشہور ہے۔ ہر روز وہ اپنے چہرے پر ایک طرح کا خوشبودار لوشن لگاتی تھی۔ ڈین ڈی پوئی ٹرس جس نے ۴۲ سال کی عمر میں ہنری دوئم کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔ روزمرہ ٹھنڈے پانی سے آٹے کا ابٹنا بناکر استعمال کرتی تھی۔ ملکہ میری آف اسکاٹ لینڈ کو افزائش حسن کے طریقوں میں دودھ پر سب سے زیادہ اعتقاد تھا۔ بادشاہ روم نیرو کی محبوبہ بھی دودھ سے غسل کیا کرتی تھی۔ اور اپنے ہاتھوں کو روغن بنفشہ کی مالش کے ذریعہ ملائم رکھتی تھی۔ میری آف اسکاٹ لینڈ کی پوتی یعنی ڈچز آف آرٹینس بادام کے تیل میں ایسی (ایک خوشبودار سے) ملاکر چہرے پر لگاتی تھی۔ مشہور رقاصہ سارا برناڈ کے چہرے پر لگانے کا لوشن پھٹکری، روغن بادام اور عرق گلاب سے تیار کیا جاتا تھا۔

سینما کی ایجاد ہونے پر آرائش حسن کی چیزوں میں بہت اضافہ ہوگیا۔ سینما ایکٹریسوں کی مصنوعی خوبصورتی انسانی اختراع کا شاہکار ہے۔ مسٹر میکس فیکٹر اس سلسلہ میں بہت بڑے ماہر اور تجربہ کار بتائے جاتے ہیں۔

آج کل یورپ میں "لپ اسٹک" بہت کثرت سے استعمال ہوتا ہے لیکن ہندوستان میں بہت عرصہ پہلے لپ اسٹک کا کام پان یا آخروٹ کے چھلکے سے لیا جاتا تھا۔ آخروٹ کے چھلکوں سے ہونٹوں کو سرخ کرنے کا رواج اب بھی پنجاب۔ صوبہ سرحد اور کشمیر میں موجود ہے۔

موجودہ دور ترقی کے پیش نظر کہا جاسکتا ہے کہ دنیا افزائش حسن کے طریقوں کو انتہائی عروج پر پہونچا چکی ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ مستقبل میں کون سی صورت اختیار کی جاتی ہے۔ مشہور رقاصہ مسز لیلی شوکھے اور سیلون کی مس اوسگاڈی جو تیسا کو مصنوعی طریقہ آرائش پر اعتماد نہیں ہے۔ ان دونوں کا بیان ہے کہ مصنوعی چیزوں کے استعمال کے بغیر بھی حسن کو قائم رکھا جاسکتا ہے۔

(حور بانو نئی دہلی)

مزاحیہ

شہ سوار

نہ وہ مولانا تھے۔ نہ ان کی صورت ہی مولانا جیسی تھی۔ مگر یاروں نے انہیں مولانا کا خطاب دے رکھا تھا۔ اور وہ اس نام سے اس قدر مشہور ہوگئے تھے۔ جیسے آج کل خود ساختہ لیڈر کمپنی باغ میں جوتیاں چٹخانے کے باوجود بھی الا بلا کے نام سے مشتہر ہوجاتے ہیں۔

مولانا کمرے میں داخل ہوتے ہی بولے:

"میں بہت تھکا ہوا ہوں۔ چائے پلائیے۔ کیا آپ لوگ چائے پی چکے۔"

ہمارے ایک دوست نے جواب دیا۔

"چائے ختم ہوچکی۔ پھر کبھی دیکھا جائے گا"

"کچھ تو ہوگی؟"

"تھوڑی سی تو ہے۔ مگر دودھ بالکل نہیں ہے۔"

"کیا مضائقہ ہے۔ کام چل جائے گا۔"

یہ کہہ کر مولانا نے چائے دانی اٹھائی اور ایک چھوٹی پیالی میں نچی کی کثیف چائے ڈالی کر اس میں بھی سات پیچے شکر ڈالی ہم سے یہ بدتمیزی نہیں دیکھی گئی۔ ہم نے چار کی پیالی کے پاس ان کے ہاتھ اور شکر دانی سامنے رکھتے ہوئے کہا:۔

"کیوں چائے کو تباہ کر رہے ہیں۔ چینی حاضر ہے جس قدر جی چاہے نکھا لیجئے۔"

"آپ اس کی فکر نہ کیجئے۔ میں ایسی ہی چائے پینے کا عادی ہوں"

ابھی چائے کا مسئلہ پوری طرح حل بھی نہ ہوا تھا کہ ایک صاحب نے گھوڑے کا ذکر چھیڑ دیا۔ انھیں اپنے گھوڑے سے یہ شکایت تھی کہ وہ راستے میں کہیں نہ کہیں سواری کو گرا دیتا ہے۔ بڑا ہی تیز چالاک اور بدمعاش جانور ہے

چائے کی پیالی چھوڑ کر مولانا اس طرف مخاطب ہوگئے۔

"جناب عالی! امید ہے میں اس گھوڑے کو دبا لوں گا۔ تم نے نواب جنگ بہادر کی گھوڑی کا ذکر سنا ہوگا۔ اسے میں نے ہی درست کیا تھا۔ یہ اس سے بھی زیادہ بدمعاش ہوگا؟"

اب کیا تھا چائے کے موضوع کی جگہ گھوڑے نے لے لی۔ کافی بحث و تمحیص کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ ابھی مولانا کا امتحان لینا چاہیئے۔ چنانچہ مولانا کو رضامند کر کے فوراً گھوڑا منگوایا گیا زین کستے دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ مولانا نے نہایت غرور و شان کے ساتھ رکاب پر پیر رکھ دیا۔ گھوڑے نے انہیں بیٹھنے کا موقع تو ضرور دیا۔ لیکن وہ اچھی طرح سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ تیر بہدف بن گیا والا! کچھ ایسے گھبرائے کہ انہوں نے گھوڑے کا رخ بازار کی جانب کر دیا گھوڑا بھاگتا ہوا بازار سے گزر رہا تھا کہ سامنے سے ایک بیل گاڑی آگئی۔ گھوڑا تو کترا کر نکل گیا مگر مولانا دھم سے زمین پر آرہے۔ کچھ لوگ قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے۔ اور کچھ "دیکھنا۔ پکڑنا۔ اٹھانا" کہتے ہوئے دوڑے اور مولانا کو اٹھا کر ایک چبوترے پر ڈال دیا۔ مجمع میں ہر قسم کے آدمی تھے۔ ان میں بعض حضرات ایسے بھی تھے جو حکمت میں اپنے آپ کو جالینوس اور سقراط سے دو چار قدم آگے سمجھتے تھے۔ ان لوگوں میں یہ بحث چھڑ گئی کہ بے ہوشی میں مولانا کے پیر اونچے کیے جائیں یا سر؟ ایک صاحب کہنے لگے:۔

"خون کی روانی کا تعلق دماغ سے بہت زیادہ ہے۔ اس لیے پیر اونچے کر دیے جائیں۔"

دوسرے صاحب نے جواب دیا:۔ نہیں پیر اونچا کرنے سے سر پر خون کا دباؤ پڑے گا۔ اس لیے سر ہی کو اونچا رکھنا چاہیئے۔"

مولانا کو کچھ بہت زیادہ چوٹ نہیں آئی تھی لیکن وہ شرمندگی کے باعث سر نہیں اٹھا سکتے تھے۔ چنانچہ لوگوں یہ غلط فہمی ہوگی کہ مولانا بے ہوش ہوگئے ہیں اور اس سلسلے ان کے لیے دلوں میں ہمدردی پیدا ہونی بھی واجب تھی۔ مگر جب مولانا نے یہ سنا کہ انہیں ہوش میں لانے کے لیے طرح طرح کی تجاویز زیر غور ہیں اور ممکن ہے کہ کسی ایک تجویز کے ماتحت ان کی مزید گت بن جائے تو انہوں نے آنکھیں کھول کر دھیمی آواز میں کہا:۔

"ارے بھائی میں بے ہوش نہیں ہوں"

گھوڑا مولانا کو بازار میں اتار کر جب تنہا گھر واپس آیا تو ہم سب دوڑے کہ ذرا دیکھیں کہ مولانا کہاں رہے۔ بازار میں آکر دیکھا کہ ایک جگہ زبردست

[illegible] لگا ہوا ہے۔ ہم فوراً سمجھ گئے کہ شاید مولانا کا جلوس نکالنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ نزدیک آئے تو معلوم ہوا کہ خدا کے فضل کرم سے مولانا سو فیصدی زندہ و سلامت ہیں۔ مولانا سے خیر و عافیت دریافت کی تو وہ بولے:۔

"کیا کہوں! میں گرنے والا تو تھا نہیں۔ مگر بری گھڑی آتے دیر نہیں لگتی۔ میں گھوڑے کو دبائے ہوئے چلا جا رہا تھا کہ سامنے ایک بیل گاڑی آ گئی اور گھوڑا بھڑک گیا۔ مگر خدا کی قسم گھوڑا بھی یاد کرتا ہوگا کہ کسی سے پالا پڑا تھا۔ ہڈی پسلی ایک کر دی ہے۔ میں نے اس کی مارے ایڑوں کے"

"کیوں نہیں! وہ تو اب بھی تھان پر کھڑا ہوا ہنہنا رہا ہے" ایک صاحب بولے۔

مولانا صاحب تھے بڑی ہمت والے۔ ایک مرتبہ ہم لوگ شکار میں جا رہے تھے۔ دیہات میں گھوڑوں کے سوا اور کوئی سواری نہیں ہوتی سبھوں نے اپنے اپنے گھوڑے ٹھیک ٹھاک کر لئے تھے۔ عین وقت پر مولانا ضد کرنے لگے کہ "میں بھی چلوں گا" ایک صاحب بولے۔

"وہی گھوڑا ہے جس نے آپ کو چاروں شانے چت گرایا تھا کہئے تو منگاؤں"

مولانا نے پیشانی پر بل ڈال کر کہا۔

"کیا گرائے گا وہ مجھکو۔ وقت کی بات تھی۔ لاؤ آج ٹھیک ہی کر دوں اسے"

ان کی رضا مندی کی دیر تھی۔ فوراً گھوڑا آ گیا۔ اور وہ اس پر سوار بھی ہو گئے۔ تھوڑی سی دور چلے ہوں گے کہ راستہ میں ایک نالا مل گیا۔ برسات کا موسم ہونے کے باعث یہ نالا اچھا خاصہ دریا بن گیا تھا۔ اِدھر اُدھر کناروں پر کیچڑ بھی بہت تھی۔ سب اپنے اپنے گھوڑے کو روک کر کہنے لگے:۔ ہماری ہمت تو نالے میں اترنے کی نہیں ہوتی۔ نہ جانے پانی کتنا ہے۔ اور گھوڑا کہیں پانی میں پھنس گیا تو مشکل ہی ہو جائے گی

جب مولانا نے سبھوں کو ہمت ہارتے ہوئے دیکھا تو یہ کہتے ہوئے آگے بڑھے کہ "واہ ہوا تم لوگ کل کے بچے ہونا؟" اور زور سے گھوڑے کو ایک تازیانہ جڑ دیا۔ گھوڑا بجلی کی طرح تڑاپ کر پلک مارتے ہی اس کنارے پر جا پہونچا۔ لیکن مولانا نالے میں پڑے غوطے کھا رہے تھے۔ بڑی مشکل سے انہیں باہر نکالا گیا۔ مولانا بولے:۔

اس میں شک نہیں کہ گھوڑا ہے بہت بدمعاش۔ اس وقت بھی چال چل گیا۔ ہنٹر کھا کر اڑا مگر کمر دوہری کر کے مجھے بیچ نالے میں گرا گیا۔ خیر میں بھی دیکھ لوں گا اس سالے کو"

واقعی مولانا بہت باحوصلہ آدمی تھے۔ نزدیک کے ایک چوبی پل سے ہو کر ہم لوگ اس پار پہونچے۔ مولانا پھر گھوڑے پر سوار ہو گئے اور دو تین میل تک انہوں نے گھوڑے کو نہایت بے رحمی کے ساتھ دوڑایا۔ گھوڑا پسینہ پسینہ ہو گیا۔ ہم نے کہا۔

"بس مولانا گھوڑا ٹھیک ہو گیا۔ اب آہستہ آہستہ چلئے"

"آپ ٹھیک ہونے کو کہتے ہیں۔ میں نے اس کے انجر پنجر ڈھیلے کر دیئے ہیں"

گھوڑا جیسے خار کھائے بیٹھا تھا۔ مولانا کچھ اور کہنا ہی چاہتے تھے کہ اس نے ایک سرپٹ ماری۔ دیکھا تو مولانا ڈسٹرکٹ بورڈ کی سڑک پر پڑے ہوئے کروٹ بدل رہے ہیں۔ اس مرتبہ مولانا کو کافی چوٹ آئی تھی۔ انہیں فوراً قریبی موضع کے ہسپتال میں پہونچایا گیا۔ جب ان کی حالت رو بہ اصلاح ہونے لگی تو ایک دن بستر پر لیٹے ہوئے فرمایا۔

اب کے میں اس مردود کی ہڈی پسلی توڑ کر رکھ دوں گا۔ خدا کی قسم بہت شریر جانور ہے۔

مگر مولانا کو پھر اس گھوڑے پر سواری کسنے کا موقع نہیں ملا کیونکہ ہمارے دوست اس گھوڑے سے عاجز آ گئے تھے اور اسی باعث انہوں نے اونے پونے فروخت کر دیا۔

اب بھی مولانا جب تشریف لاتے ہیں تو کسی نہ کسی طرح گھوڑا ضرور موضوع گفتگو بن جاتا ہے۔

وحشی آروی

ضروری اعلان

جن ادب نواز حضرات نے "مشہور" کا مسلسل مطالعہ کیا ہے وہ یہ حقیقت بخوبی سمجھ چکے ہیں کہ یہ رسالہ ماہ نو کی طرح ہر ماہ ترقی کی منزل نہایت سرعت کے ساتھ طے کر رہا ہے اور وہ ساعت بہت قریب آگئی ہے کہ یہ رسالہ آسمان ادب پر بدر کامل بن کر چمکیگا۔ ملک کے نامور ادیب اور شعرا اس کے سرپرست اور معاون بنتے جارہے ہیں۔ حجم بھی بڑھ رہا ہے اور اس کے ساتھ ادبی دلکشیاں بھی بڑھتی جارہی ہیں۔ بایں ہمہ ابھی تک قیمت میں کوئی اضافہ نہیں کیا تھا۔ لیکن کاغذ کی گرانی بڑھتے بڑھتے آج اپنے پورے شباب پر آگئی ہے اور ہم بلا مبالغہ کہہ سکتے ہیں کہ ؎ ہوگیا جانِ گرامی سے بھی مہنگا کاغذ

پس انتہائی مجبوری کی بنا پر اعلان کیا جاتا ہے کہ اگست ۱۹۴۰ء سے سالانہ چندہ بجائے ایک روپیہ کے ڈیڑھ روپیہ (۱۸/) مقرر کر دیا گیا ہے۔

وہ علم دوست حضرات جو اب تک خریدار نہیں ہوئے ہیں،

ان کے لئے اب بھی موقع ہے کہ وہ ۳۱ جولائی ۱۹۴۰ء تک اپنا چندہ ایک روپیہ بذریعہ منی آڈر بھجوادیں امید ہے کہ اس آخری اعلان سے طلبا اور دیگر حضرات ضرور فائدہ اٹھانے کی کوشش کرینگے۔

المشتہر

مینیجر رسالہ "مشہور" ممتاز منزل فراشخانہ دہلی

ممتاز بکڈپو دہلی

ہندوستان کے نامور مصنفین کی سوانح حیات اور ان کی علمی، ادبی، طبی اور مذہبی تصانیف اس کتب خانے میں نہایت قلیل نفع پہ فروخت کی جاتی ہیں۔ مزید برآں ہر علم و فن کی کتابوں کا ذخیرہ ہمارے ہاں جمع ہے۔ لہذا آپ کو جس کتاب کی ضرورت ہو ایک کارڈ لکھ کر ہم سے طلب فرمائیے۔ ذیل کی تین نایاب کتابیں ڈاکٹر مجیب الدین احمد صاحب فانی ایل۔ ایم۔ پی۔ کی تصنیف ہیں۔ اور دو کتابیں خواجہ محمد شفیع صاحب کی تصانیف درج کرتے ہیں۔

گلشن فانی

ڈاکٹر صاحب موصوف کے تازہ کلام کا مجموعہ ہے۔ ہر شعر تیر و نشتر ہے۔ قلعہ معلیٰ ٹکسالی زبان میں وہ گل کھلائے ہیں کہ دیوان کا ہر صفحہ گلستان بن گیا ہے سوز و گداز شعر کی جان ہے اور وہ فانی کے ہر شعر سے ہویدا ہے۔ نعتِ رسول کا بیشتر حصہ اس دیوان میں موجود ہے۔ جسے عاشقان رسول کریم آنکھوں سے لگائیں گے اور تسکین دل کا سامان پائیں گے۔

ضخامت ۱۲۸ صفحے، سائز $\frac{20 \times 30}{16}$، قیمت صرف آٹھ آنے

ہماری غذائیں

فاضل مصنف نے اس کتاب میں بتایا ہے کہ کون کون سی غذائیں صحت اور تن درستی کے لئے مفید ہیں اور کون سی مضر ہیں اور کن غذاؤں میں وٹامن کی زیادتی ہے اور کس میں کمی ہے۔ اگر الف سے ی تک اس کتاب کو دیکھ جائیں اور اس کی ہدایات پر کاربند ہو جائیں تو نہ صرف یہ کہ آپ ہمیشہ تن درست رہیں بلکہ طاقت ور نوجوان کی حیثیت سے زندگی بسر کریں۔ قیمت آٹھ آنے

بچوں کی دیکھ بھال

نہایت مفید کتاب ہے۔ تربیت اطفال کے متعلق تمام ضروری ہدایات درج ہیں۔ پیدائش سے کر ۷ سال کی عمر تک بچوں کی غذا کی ترتیب قائم کر دی ہے اور معدے کے اکثر امراض جیسے دست وقے پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اور جو مائیں کسی وجہ سے اپنا دودھ بچے کو نہیں پلا سکتیں۔ ان کے برعکس مصنوعی طور پر بچے کی پرورش کے طریقے لکھے ہیں تن درست اور بیمار بچوں کی غذاؤں کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ غرض یہ کتاب اہل و عیال والے کیلئے شمع ہدایت کا کام دے گی۔ قیمت فی جلد آٹھ آنے۔

مغلوں کا مد و جزر

(مصنفہ، خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی) یہ ۶۸ صفحہ کی کتاب ہے جس میں مغلوں کے عروج و زوال کی ایک تصویر کھینچ دی ہے انداز بیان ایسا دلکش ہے کہ بار بار پڑھیئے مگر سیری نہیں ہوتی قیمت ۸/ آنے فی جلد۔

دِلّی کی آوازیں

اگر آپ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ دلی کی راجدھانی میں سودے والے کیونکر آواز لگا کر سودا بیچتے ہیں اور ان کی آوازوں میں کیا جادو بھرا ہوتا ہے کہ راہ گیر چلتے چلتے سودا خریدنے پر متوجہ ہو جاتے ہیں۔ تو آپ اس کتاب کو اوّل سے آخر تک معائنہ کیجئے۔ اس میں آپ کو مختلف سودا بیچنے والوں کی آوازیں سنائی دیں گی اسی کتاب میں دلی کی شادی اور اس کی رسمیں۔ پھول والوں کی سیر۔ دلی کی بقرعید اور کرخنداری بول چال کے نمونے بھی نظر آئینگے۔ غرض کتاب از سرتاپا دلچسپ ہے اور ختم کیئے بغیر اسے چھوڑ نہیں سکتے۔ (مصنفہ خواجہ محمد شفیع دہلوی) قیمت فی جلد آٹھ آنے (۸/)

مذکورہ بالا کتابوں کے علاوہ ہر قسم کی علمی، ادبی، اخلاقی۔ اصلاحی، تاریخی اور طبی کتابیں

پتہ ذیل سے منگایئے

المشتہر

ممتاز بک ڈپو فراشخانہ دہلی۔

روشنی



ایک نور کا دریا ہے جو سُرمہ کی شکل میں آپ کے سامنے ہے۔ ہزارہا ضعفِ بصارت کے مریض اِس سُرمہ کے استعمال سے اچھے ہو گئے اور ان کی روشنی بہت بڑھ گئی۔ آخر یہ نسخہ کسی معمولی حکیم کا نہیں ہے بلکہ طبیبِ شاہی حکیم حاجی محمد بدرالدین خاں مرحوم کی بیاض خاص سے حاصل کیا گیا ہے۔ نہایت بیش قیمت اجزا سے مُرکب ہے۔ ضعفِ بصارت کے علاوہ موتیا بند کو بھی فائدہ پہنچاتا ہے۔ اور اکثر امراض چشم میں مفید ثابت ہوا ہے۔ تجربہ کیجیے +

قیمت فی شیشی ایک روپیہ دو آنے (عہ)

ترکیب استعمال کا پرچہ ہمراہ ہوگا

مصفی اعلیٰ
رجسٹرڈ



فسادِ خون سے پیدا ہونے والی تمام بیماریوں کی اکسیری دوا ہے۔ اس سے بہتر اور زود اثر مصفی خون کوئی دوا نہیں ہو سکتی۔ خون کی خرابی اور غلظت سے خارش یعنی کھجلی۔ داد۔ چمبل۔ چھاجن۔ کیل۔ چھائیں۔ مہاسے۔ پتی۔ گرمی دانے وہر قسم کے پھوڑے پھنسی وغیرہ امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور خون ہی کی خرابی سے آنکھیں آشوب کر آتی ہیں۔ سوزاک و آتشک بھی خون ہی کے فساد کا نتیجہ ہیں۔ اِس لیے ان امراض میں فوراً اس دوا کا استعمال شروع کر دیں۔ اور اگر مریض نہ ہوں تو حفظ ماتقدم کے طور پر دو تین شیشیاں

مصفی اعلیٰ

کی ہر شخص کو سال میں ایک مرتبہ ضرور پی لینی چاہئیں +

ترکیب استعمال کا پرچہ دوا کے ہمراہ ہوگا + قیمت فی شیشی آٹھ آنے (۸/)

روغن زلف دراز



یہ کس ترکیب کا تیل ہے کہ جس نے بیگم کے بالوں کو اتنا بڑھا دیا ہے کہ کمر سے نیچے لٹک رہے ہیں ؟

یہ روغن زلف دراز ہے۔ اس کی تعریف یہی ہے کہ بالوں کو بڑھاتا ہے اور اُن کی جڑوں کو مضبوط کرتا ہے۔

اور جناب ؟ خوشبو دیکھیے۔ کیسی بھینی بھینی ہے گویا آپ کسی چمنستان کی سیر کر رہے ہیں۔

تو بس آج ہی ایک شیشی بیگم کے لیے منگا لیجیے۔ قیمت صرف ایک روپیہ ہے +

ترکیب استعمال: بقدر ضرورت سر میں ڈال کر اتنا ملیں کہ جذب ہو جائے۔

اِکسیر خاتون



یہ عجیب و غریب دوا عورتوں کے پوشیدہ امراض کے لیے نہایت کامیاب ثابت ہوئی ہے سیلان الرحم کے لیے بالخصوص تیر بہدف ہے۔ عورتوں کی عام جسمانی صحت بحال کرتی ہے۔ ورم رحم ضعفِ رحم۔ اسقاط حمل اختناق الرحم اور ایام ماہواری کی بیقاعدگی کو دُور کرتی ہے۔ رحم کی خرابیاں رفع کرنیکے لیے اکسیر صفت ہے۔ تندرست عورتیں بھی استعمال کریں تو شباب کی رعنائی عرصے تک قایم رہتی ہے۔ اور وہ مستعدی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتی ہیں۔



ترکیب استعمال کا پرچہ ہمراہ ہوگا +

قیمت فی شیشی ۱۲/

مشہور دواخانہ۔ دہلی

شربت فولاد جدید



معدہ کو قوت دیتا ہے۔ جگر کو
تقویت بخشتا ہی۔ خون صالح پیدا کرتا ہی۔
بھوگ لگاتا ہی۔ عام جسمانی حالت کو
قوی کرتا ہی۔ چہرہ کو خوشرنگ بناتا ہی۔
بیماری کے بعد کی کمزوری کو دُور کرتا ہی۔
ضعفِ معدہ کے باعث جو دست آتے ہیں انکو
روکتا ہی جگر و طحال بڑھ جانیکو مفید ہی + پرچہ
ترکیب استعمال ہمراہ ہوگا۔ قیمت فی شیشی ۱عہ

معجون نشاط



نہایت ہی پُر کیف
سُرور آگیں اور غایت مقوی

دممسک معجون ہے۔ اس کی ضرورت عام طور پر شادی شُدہ
۔دکو رہتی ہے۔ اور ہم نے شوقین حضرات کے لیے خاص طور پر
اِسے ترتیب دے کر بنایا ہی۔ اس کے استعمال سے سلسلہ مُباشرت
دیر تک قایم رکھا جا سکتا ہے اور تھکن بالکل محسُوس نہیں ہوتی۔
خلوت کی باتیں جلوت میں نہیں لانی چاہئیں۔ ورنہ ہم بتا دیتے کہ
معجون نشاط کیا چیز ہے۔ بس یونہی سمجھ لیجئے کہ دولہا دلہن کی محبت
استوار کرنیکا یہ بہترین ذریعہ ہی۔ قیمت فی شیشی تین روپیہ۔ پرچہ ترکیب ہمراہ ہوگا۔

سنون ممتاز



دانتوں کی جملہ بیماریاں اس کے استعمال سے رفع ہوتی ہیں۔
ہلتے ہوئے دانت جم جاتے ہیں۔ مسوڑھوں سے خون اور پیپ بہتا ہو۔
تو اسکے لگانے سے زخم بھر جاتے ہیں۔ دانتونکو صاف کرنے میں بیمثل ہی
گندی رطوبت نکال دیتا ہی اور منہ کو صاف رکھتا ہی۔ جو شخص اپنی
صحت کی حفاظت چاہتا ہی اُسے لازم ہے کہ روزانہ اس سنون
کو ملے + ترکیب استعمال کا پرچہ ہمراہ ہوگا +

قیمت فی شیشی ۶ر
چھ آنے

اکسیر مفاصل



وجع المفاصل۔ عرق النساء۔
نقرس اور تمام عصبی دردوں کے
لیے مشہور دواخانہ کی یہ ایک خاص
دوا ہی جو بے شمار تجربات کے بعد بنائی
گئی ہے۔ پیشاب میں ایک خاص مادّے کی زیادتی کو جسکو انگریزی
میں یورک ایسڈ کہتے ہیں کم کرتی ہی۔ سینکڑوں گٹھیا کے مریض اس
دوا کی بدولت صحتیاب ہو چکے ہیں لہٰذا جن لوگوں کے چھوٹے یا بڑے جوڑوں
میں درد رہا کرتا ہی وہ اس دوا کے استعمال سے فائدہ اٹھائیں۔ قیمت فی شیشی
۳۰ قرص عہ ترکیب استعمال
کا پرچہ ہمراہ ہوگا +

مشہور دواخانہ۔ دھلی

سفوف یابس



یہ سفوف جریان کے لیے ایک خاص چیز ہے اور جسے عالی جناب حکیم سراج الدین خاں صاحب مدظلہ العالی نے دواخانہ ھذا کو مرحمت فرما دیا ہے۔ تقریباً دس ہزار مریض صحت یاب ہو چکے ہیں۔ اس کے استعمال سے فوراً ہی منی گاڑھی ہو جاتی ہے۔ درد کمر زائل ہو جاتا ہے۔ سستی کافور ہو جاتی ہے۔ چہرہ پر رونق آجاتی ہے۔

قیمت سات خوراک ۱۰۔ر

ترکیب استعمال کا پرچہ ہمراہ ہوگا۔

عجیب رجسٹرڈ



فساد ہضم، تخمہ اور ہیضہ جیسے امراض کے لیے نہایت بھروسہ اور اطمینان کی دوا ہے۔ علاوہ ازیں درد شکم، نفخ شکم، ابکائی، متلی، قے، بھوک، پیٹ کی گرانی وغیرہ امراض کی بے نظیر دوا ہے۔ بیرونی طور پر استعمال کرنے سے درد سر، آدھا سیسی کا درد، درد دنداں وغیرہ جاتا رہتا ہے۔ بھڑ، بچھو اور دیگر زہریلے جانوروں کے کاٹے پر لگانے سے تریاق کا کام دیتا ہے۔ اس کی ایک شیشی سفر اور حضر میں اپنے ہمراہ رکھنی چاہیئے۔

قیمت فی شیشی ایک روپیہ (عہ ر) ترکیب استعمال کا پرچہ ہمراہ ہوگا

شربت روح حیات رجسٹرڈ

موسم گرما میں اگر کوئی چیز دماغ و دل کو مسرور کر سکتی ہے اور روح میں تازگی لا سکتی ہے تو بلا مبالغہ وہ شربت روح حیات ہے۔ ایک گلاس صبح ایک شام پی کر ہر شخص گرمی کے اثر سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکتا ہے۔ لو سے بچا رہتا ہے۔ پیاس کا غلبہ نہیں رہتا۔ کام سے دماغ نہیں تھکتا۔ خلجان قلب نہیں ہوتا۔ سر میں درد نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ یہ تازہ پھلوں کا رس ہے۔ بہترین مفرحات کا عرق ہے۔ پیتے ہی روح خوش ہو جاتی ہے۔





پرچہ ترکیب استعمال ہمراہ ہوگا۔

قیمت فی بوتل صرف ایک روپیہ (عہ ر)

نشاط افزا رجسٹرڈ



یہ اعلیٰ درجہ کی مقوی باہ اور ممسک گولیاں ہیں۔ جو لوگ جوانی کی غلط کاریوں سے مردانہ قوت برباد کر چکے ہیں اور مایوس کن حالت کو موت سے بدتر سمجھ رہے ہوں۔ یہ گولیاں ان کے لیے مسیحا ثابت ہوں گی۔ قیمتی اور نادر اجزا سے بنائی گئی ہیں۔ پہلی ہی خوراک میں حیرت انگیز اثر ظاہر ہونے لگتا ہے۔

تجربہ کیجیے اور فائدہ اٹھائیے۔

قیمت فی شیشی تین روپے۔

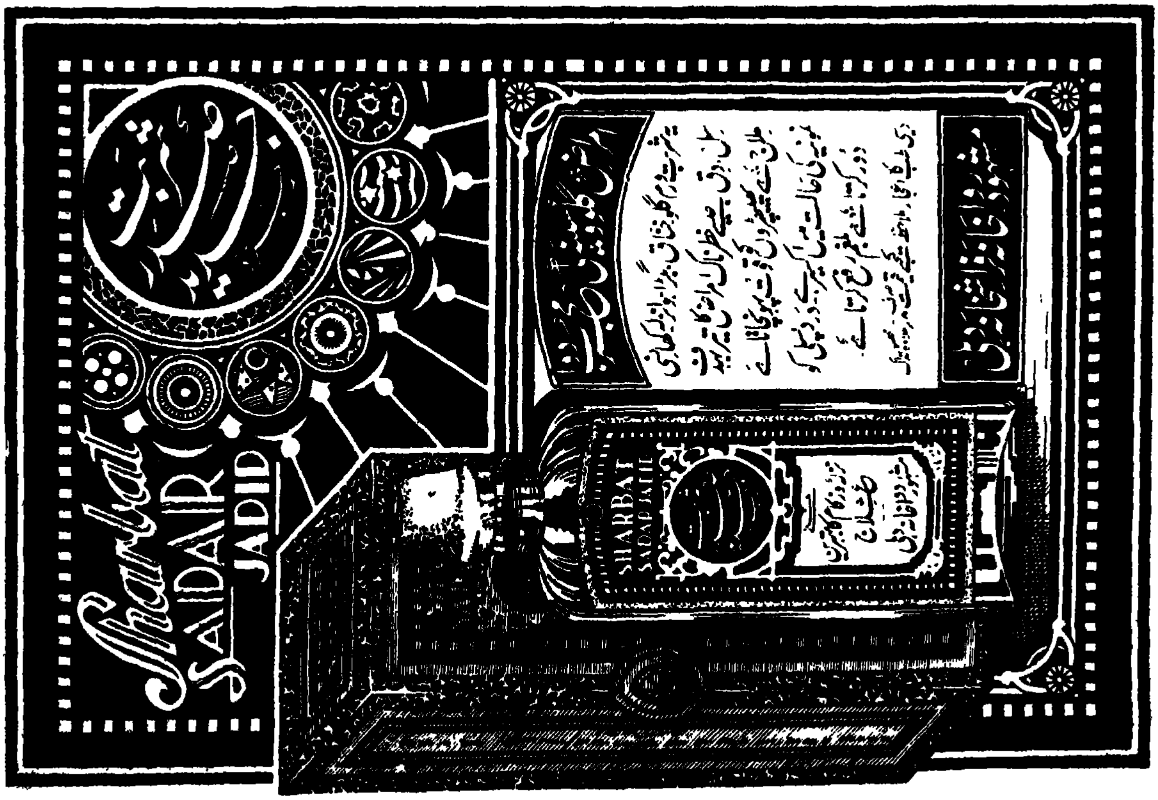
مشہور دواخانہ، دہلی


IKSIR-I-KHATOON
REGISTERED.
اکسیر خاتون
عورتوں کے پوشیدہ امراض کی پیٹنٹ اور مخصوص دوا ہے
ضعف رحم. ورم رحم. سیلان رحم ہسٹریا کے دورے اور
ایام حیض کی بیقاعدگی چند روز کے استعمال سے رفع
ہو جاتی ہیں. استقرار حمل اور قیام شباب کیلئے پیام شفا ہے.
مشہور دواخانہ فراش خانہ دہلی


Roshni
روشنی رجسٹرڈ
عطیہ جناب مسیح الزماں حکیم حاجی محمد بدر الدین خاں صاحب مرحوم
روشنی کا منبع دماغ ہے آنکھ تو محض ایک شیشہ ہے جو نورانی شعاعوں کو
دماغ تک پہونچانیکا ذریعہ ہے پس اس شیشے کو صاف رکھنے
کیلئے روشنی استعمال کیجیئے!
روشنی کیا ہے؟ ایک لاجواب اور قیمتی جواہرات سے مرکب سرمہ ہے جو دھند
خارش. جالا. ناخونہ. سرخی چشم. رونے. نزول الماء. موتیابند میں
اکسیر ہے. روشنی کا روزانہ استعمال آنکھوں کو تمام بیماریوں سے محفوظ رکھتا ہے
قیمت فی شیشی ایک روپیہ دو آنے علاوہ محصول ڈاک
مشہور دواخانہ فراش خانہ دہلی

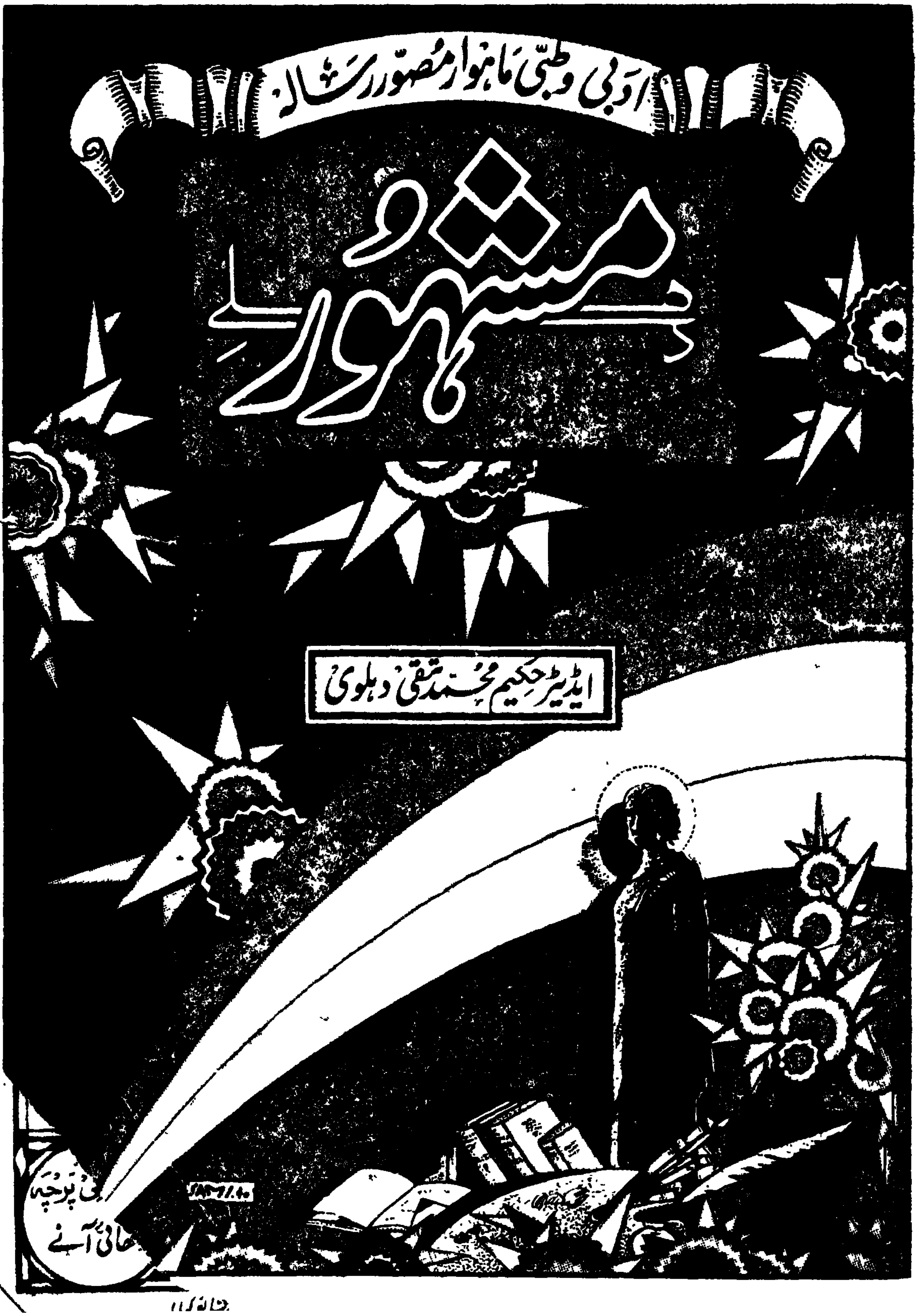
Regd. L. No. 4613





The Label Art Press. FRASHKHANA Delhi

رجسٹرڈ ایل نمبر 4613 ستمبر سنہ ۱۹۴۰ء



علمی - ادبی

لیٹنی

ماہوار

مصوّر رسالہ

ماہنامہ مشہور دہلی

ایڈیٹر

حکیم محمد تقی دہلوی

جلد ۱

نمبر ۶

بابت ماہ ستمبر سنہ ۱۹۴۰ء

قیمت سالانہ ایک روپیہ آٹھ آنے

اعزازی چندہ پانچ روپیہ سالانہ

دار الاشاعت ممتاز منزل فراشخانہ دہلی

ممالکِ غیر سے چار شلنگ

قیمت فی پرچہ ڈھائی آنے

(حکیم محمد تقی پرنٹر و پبلشر نے جید برقی پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر رسالہ مشہور ممتاز منزل فراشخانہ دہلی سے شائع کیا)

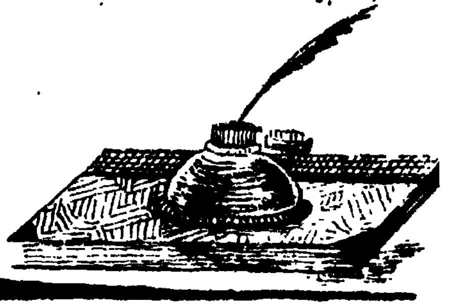
معلوماتِ دہلی

ہندی مسلمانوں کو دہلی سے وہی محبت ہے جو ترکوں کو استنبول سے یا ایرانیوں کو مشہد مقدس سے ہے۔ اسی زمین پر ہمارے اسلاف نے علم و ہنر کی نہریں بہائیں۔ اسی زمین پر مذہبی علوم کے چشمے جاری ہوگئے۔ اور اسی زمین پر ہماری رُوحانیت کا جھنڈا بلند ہوا۔ گویا دہلی ہماری عظمتِ رفتہ کی ایک یادگار ہے۔ پس ہر ہندی مسلمان دہلی سے محبت کرتا ہے اور یہاں کی خاک کو سُرمہ سمجھتا ہے ضرورت تھی کہ دہلی کے متعلق ایک ایسی جامع معلومات بہم پہونچائی جائے جو قدیم و جدید دہلی کے ہر گوشے کی مکمل تفسیر ہو۔ چنانچہ مولانا شیخ محمد رحیم صاحب گورنمنٹ پنشنر دہلی نے اس ضرورت کو محسوس کرکے معلوماتِ دہلی کے نام سے گائڈ بک چھپوادی ہے، اور اس کی فروخت کے لئے "ممتاز بک ڈپو" نے تمام کاپیاں خرید لی ہیں۔ پس اعلان کیا جاتا ہے کہ جن حضرات کو دہلی کی مکمل تاریخ کی ضرورت ہو "معلوماتِ دہلی" طلب فرمائیں

دو آنے کے ٹکٹ آنے پر کتاب ارسال کردی جائیگی

المشتہر

ممتاز بک ڈپو فراشخانہ دہلی



جامِ جمشید

اُردو کی حمایت اور اشاعت کے لئے خسروِ دکن اعلیٰ حضرت **میر عثمان علی خاں بہادر خلد اللہ ملکہٗ** نے اپنے زیرِ حکومت ہمیشہ امداد دی ہے خود حیدرآباد میں "جامعہ عثمانیہ" اور دار الترجمہ قائم کئے جنہوں نے ان معترضین کی زبانیں بند کر دی ہیں، جو کہتے تھے کہ اردو میں علمی زبان بننے کی صلاحیت نہیں ہے اور علمی اصطلاحات وغیرہ کے بنانے سے اردو کا دامن کوتاہ ہے۔

چند ہی سال میں دار الترجمہ نے جو اردو کی کتابیں شائع کی ہیں، اُن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ترقی یافتہ زبانوں کے علم و فن کا ذخیرہ کس قدر جلد اردو میں منتقل کر لیا گیا، اور ہر حیثیت سے اس زبان کو ذی علم بنا دیا گیا۔

آج کل اردو کے خلاف جو طوفان بے تمیزی برپا ہے، اسکی تہ میں مہاسبھائی ذہنیت کارفرما ہے، ورنہ سمجھ رکھنے والے ہندو خوب جانتے ہیں کہ آپس کے لین دین، خرید و فروخت میں اردو کا واسطہ اختیار کئے بغیر چارہ نہیں۔ جس ہندی "ہندی" کا شور برپا ہے اردو تو خود اُس کی معاون ہے۔ اور بے شمار ہندی کے الفاظ اپنے میں جذب کئے ہوئے ہے۔ اور ایک ہندی ہی پر کیا موقوف ہے دنیا کی ہر زبان سے اردو نے رسم و راہ پیدا کی ہے۔ اس کے نزدیک اپنے پرائے سب ایک ہیں۔ انگریزی زبان کا بھی اُردو نے اُسی طرح خیر مقدم کیا ہے جس طرح وہ دیگر زبانوں سے میل جول کر چکی تھی، آج "ریل"۔ "لال ٹین" "ٹکٹ" "کیکٹ" "گلاس" "بکس" وغیرہ ایسے انگریزی الفاظ ہیں جنھیں اردو نے انگریزی سے چھین لیا ہے۔ اور کوئی کہہ نہیں سکتا کہ یہ اجنبی معلوم ہوتے ہیں۔

ہندوستان کے اِس سرے سے اُس سرے تک اگر کوئی زبان ادائے مطلب کے لئے کار آمد ہے۔ تو ہم بلاخوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ وہ اردو ہے۔ پس ملک کی عام زبان بننے کا فخر اردو کے سوا اور کسی زبان کے حصہ میں نہیں آسکتا۔

جب یہ حقیقت ہے تو ہم انجمن ترقی اردو ہند کے ارباب حل و عقد سے گذارش کریں گے کہ وہ ملک کی اسی عامہ کو ایک مرکز پر لانے کی کوشش کریں۔ اور گورنمنٹ سے مطالبہ کریں کہ اردو کو ہندوستان کی سرکاری زبان بنا دی جائے۔

آج کل فلمی زبان باستثنائے چند ایک ایسی مخلوط زبان ہے جسے نہ ہندو ہی اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں نہ مسلمان۔ اگر ہم اسے چوں چوں کا مربّہ کہیں تو بجا ہے۔ اس کے لکھنے والے بر خود غلط ڈرامہ نویس ہیں۔ اُردو سے اُنھیں مس نہیں، اور ہندی و سنسکرت کی پوری قابلیت نہیں۔ وہ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ایسے الفاظ مہیا کرتے ہیں جسے مہاشے جی بھی سنکر گھبرا جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر فلم کمپنیاں بُری طرح ناکام ہوتی ہیں۔ ان حضرات کو جب ڈرامہ کا نام تک رکھنا نہیں آتا تو سمجھ لیجئے کہ ڈرامہ کیسا ہوگا۔ اور اُس کے مکالمے کس پائے کے ہوں گے۔ علاوہ ازیں یہاں کی فلم ساز کمپنیوں کے زیر نظر صرف یہی چیز ہے کہ روپیہ کمایا جائے اُنھیں بحث نہیں کہ ملک کے نوجوانوں کا مذاق سُدھرتا ہے یا بگڑتا ہے۔ اُن کے فلمی اثر سے قوم و ملک کی اصلاح ہوتی ہے یا بربادی۔ مردہ جنت میں جائے یا دوزخ میں اُنھیں اپنے حلوے مانڈے سے کام ہے۔

ہم صنعت فلمسازی کے مخالف نہیں ہیں بلکہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان بھی اس دوڑ میں کسی دوسرے ملک سے پیچھے نہ رہے۔ البتہ جو بیہودہ اور مخرب اخلاق ڈرامے پردۂ فلم پر دکھائے جا رہے ہیں اُن کا مکمل بائیکاٹ کیا جائے۔ اور ملک کے نامور ادیبوں سے ڈرامہ نویسی کی خدمت لی جائے۔

کسی آئندہ صحبت میں ہم بعض ڈراموں کی زبان اور اُن کے بیہودہ خیالات پر تبصرہ کریں گے۔

(حکیم) **محمد تقی دہلوی**

آئینۂ جذبات



خم و مینا، سبو و ساغر و پیمانہ آپہنچا
مرے ساقی کے آتے بزم میں میخانہ آپہنچا

کچھ اس انداز سے محفل میں بیتابانہ آپہنچا
کہ وہ بھی کہہ اٹھے دیکھو مرا دیوانہ آپہنچا

بتا دوں گا کہ تخلیقِ دو عالم سے ہی کیا حاصل
سرِ محفل جو مجھ تک دور میں پیمانہ آپہنچا

نہ پوچھو حالِ دل، سنکر لپٹ جاؤ گے تم مجھ سے
کہ افسوں بن گیا لب تک اگر افسانہ آپہنچا

پتہ مل ہی گیا آخر ترے نورِ تجلی کا
چراغِ کعبہ لیکر میں سوئے بتخانہ آپہنچا

سراہوں جذبِ دل کو یا دعا دوں اپنی آہوں کو
کہ خود گھر پر مرے وہ رونقِ کاشانہ آپہنچا

ترے چرخِ کہن کچھ انقلاب ایسے بھی دیکھے ہیں
زمیں پر سر سے گر کر افسرِ شاہانہ آپہنچا

ادب کا پاس بھی ہے بزمِ حسن و عشق کی زینت
بہت گستاخ ہے گر شمع تک پروانہ آپہنچا

نشیلی انکھڑیوں نے پل میں بیخود کر دیا سبکو
تم آئے کیا کہ محفل میں کوئی میخانہ آپہنچا

رہا یہ اپنی محرومی کا عالم بزمِ ساقی میں
چھلک کر گر گیا لب تک اگر پیمانہ آپہنچا

تعلق کچھ نہیں دنیا میں۔ وہ کر اہلِ دنیا سے
چمن میں فکر مثلِ سبزۂ بیگانہ آپہنچا

ابن الحسن فکر ایم اے

واہ رے شاعر

میاں حمید میرے حقیقی ماموں زاد بھائی تھے۔ اور بہت بانکے شاعر تھے۔ انکے اشعار پر میں نے سامعین کو حسد کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ کہتے بھی خوب تھے، اور پڑھتے بھی خوب تھے۔ اللہ نے بڑا نام اور بڑی عزت دی تھی۔ گھر سے بھی کھاتے پیتے تھے۔ ان میں جملہ خوبیاں تھیں، مگر ایک عیب تھا، اور وہ یہ کہ وہ بیوی سے اس طرح کانپتے تھے جیسے قصائی سے گائے۔

حقیقت یہ تھی کہ وہ حساس آدمی تھے، ہمیشہ یہ چاہتے تھے کہ بیوی کے کسی فعل سے ان کا دل نہ دکھے، اس لئے وہ بیوی کی ہر جا اور بیجا بات مان لیا کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے بیوی کا دماغ خراب ہوتا گیا۔ اور یہاں تک کہ وہ اپنے گھر کی اللہ میاں بن گئیں۔ میری بھاوج کو سب سے زیادہ جلن مہمان سے تھی، مہمان آیا اور اُن کے کلیجے چڑھے۔ ماموں کا گھر سدا سے مہمان نواز تھا۔ ماموں کے مرنے کے بعد میاں حمید کے پاس بھی مہمانوں کی وہی آمد رہی۔ لیکن چند مہینوں کے بعد تمام مہمانوں کو معلوم ہو گیا کہ اب اس گھر کا دروازہ ان سب کے لئے بند ہے، ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ غریب حمید کا اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔ اعزا بھی سب اپنے اپنے گھر بیٹھ رہے۔ حمید کو اس کا بڑا ملال ہوا لیکن وہ غریب اپنی فطرت سے مجبور تھا۔ اس نے ہار کر اپنا ایک کمرہ الگ کر لیا۔ اسمیں دن بھر افسانہ نویسی اور شعر گوئی میں وقت گزارنے لگا۔ شام کو البتہ وہ بازار جاتا اور رات کے نو بجے بیوی کی خدمت میں۔ یہ تھا اس کا معمول۔ مجھ سے حمید کو خاص لگاؤ تھا۔ ہم دونوں ہمسن تھے۔ اس کی شادی کے بعد میں بورڈنگ میں چلا آیا تھا۔ لہٰذا میرا اور بھاوج کا صرف ایک بار سامنا ہوا تھا۔ بورڈنگ ہی میں گھر کے خطوط سے مجھے اُن کی دماغی ساخت معلوم ہو گئی تھی۔ اس لئے میں نے چھٹیوں میں کبھی حمید کے گھر کا رُخ نہیں کیا۔ پانچ سال کالج کی زندگی کے بعد جب میں کامیاب ہو کر نکلا تو اتفاق وقت۔ ایک آسامی کے انٹرویو کے لئے مجھے اسی شہر میں جانا پڑا جہاں حمید کا گھر تھا۔ میں نے پہونچتے ہی ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ اور محض ملنے کے لئے حمید کے ہاں پہونچا۔ حمید میری آواز سنتے ہی اُچھل پڑا۔ بند کمرے کے دروازے کھولے۔ گلے لپٹا اور مجھے کمرے میں گھسیٹ کرلے گیا۔ دروازے کی چٹخنی چڑھا لی۔ اور مجھ سے بولا۔

تم ہو کہاں ہو!

میں نے کہا، "ہوٹل میں"

وہ بولا۔ اچھا کیا۔ میرا گھر تو میرا گھر نہیں ہے۔ مجھے اس کا افسوس بھی ہے۔

"ہاں" میں نے کہا "میں تمہاری مجبوریوں سے واقف ہوں"۔

اتنے میں دروازہ پر زور کی دستک ہوئی، اور حمید نے مجھ سے کہا۔

تمہارے آنے کی غالباً اطلاع ماما نے پہونچا دی ہے، اور وہ یہ سمجھی ہیں کہ تم مہمان ہو کر آئے۔ اسی لئے میرے پاس تشریف آ رہی ہے۔

دروازے پر پھر پوری قوت سے دستک ہوئی۔ حمید نے کہا کون ہے؟

میری بھاوج کی آواز آئی "میں ہوں کھولو"

حمید نے دروازہ کھولا۔ بھاوج بڑے تاؤ کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئیں۔ اُن کا چہرہ غصہ سے سُرخ ہو رہا تھا۔ وہ بولیں،

"کیا تم جعلی سکہ تیار کرنے لگے ہو؟ کیا ایسا کام نگوڑا کرتے ہو کہ جب دیکھو کمرہ بند، مجھے تو وحشت ہونے لگی ہے تمہارے گھر میں"

حمید نے بات کاٹتے ہوئے کہا "تم جانتی ہو میں شعر کہتا ہوں اور کمرے میں آمد و رفت سے میرے تخیلات کو نقصان پہونچتا ہے"

بھاوج نے ہنس کر کہا "اوئی! اس نگوڑی شاعری سے فائدہ۔ بس خالی مولی کی واہ واہ ہو جاتی ہے اور کیا ہے"

حمید نے کہا، تم سے شاعری کے محاسن تو نہیں پوچھ رہا ہوں۔ تم اپنا مقصد بتاؤ۔

بھاوج نے کہا "سلیم آئے ہیں"

حمید نے کہا "یہ کیا بیٹھے ہیں"

اب تک گویا بھاوج نے مجھے دیکھا ہی نہیں تھا۔ میری طرف تیکھی نظروں سے دیکھکر بولیں۔

"یہ پردے کے پیچھے تو بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں دیکھتی کہاں سے۔ ان کا اسباب کہاں ہے"

حمید نے کہا "ان کا اسباب ہوٹل میں ہے، اور یہ کل چلے جائیں گے

او کچھ"؟

بھاوج نے اپنے کو تنکا ستے کھاتے ہوئے دیکھا کہا "ہاں۔ آج کون تاریخ ہے"؟

حمید نے سامنے کے کلنڈر پر نگاہ دوڑائی اور کہا "پہلی"

بھاوج نے کہا "کچھ گھر کی خبر ہے"؟

حمید نے کہا "کیسی"

بھاوج نے کہا "مہینے کا خرچ"

حمید نے لاپروائی سے جواب دیا "دو ایک دن چلاؤ"

وہ ایک دم جھنجلا گئیں۔

میرے چلائے ایک منٹ نہیں چلے گا۔ میں کہاں سے دام لاؤں؟

حمید نے اُن کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے مجبہ سے معافی مانگی اور کہا میں ذرا ان کو نبٹا لوں پھر تم سے بات کروں سلیم۔ ہاں صاحب! مہینہ کا کیا حساب تم کو ملتا ہے۔

بھاوج نے کہا "اوئی کیا انجان بنتے ہو، ڈیڑھ سو"

ڈیڑھ سو۔ حمید بولے۔ سو گھر کے اور پچاس روپے تمہارے جیب خرچ ہی میں نا۔

بھاوج نے منہ بناتے ہوئے کہا "جی ہاں سرکار"

حمید نے دکھی ان دکھی کرتے ہوئے کہا

"لو یہ سو روپیہ کا نوٹ حاضر ہے"

بھاوج نے گھبرا کر کہا "اور میرے پچاس"

حمید نے ایک پاکٹ بک جیب سے نکالتے ہوئے جواب دیا "جرمانہ میں کٹ گئے"

بھاوج کی آنکھیں غصہ سے لال پیلی ہوگئیں۔ انھوں نے چیخ کر کہا، "کیسا جرمانہ"؟

حمید نے کہا، بیگم صاحبہ ذرا ضبط سے کام لیجئے۔ میں پانچ برس سے ضبط کر رہا ہوں۔ آپ سے ایک لمحہ ضبط نہیں ہوتا۔ سنئے۔ میری اور آپ کی شادی کو آج پانچ برس ہوگئے ہیں۔ جس دن سے آپ تشریف لائیں۔ میں نے کوشش کی کہ میرے اور آپ کے درمیان نزاعِ لفظی نہ ہو، اس لئے کہ میں کمزور دل کا آدمی ہوں۔ یہ نہیں چاہتا کہ میرے قلب کو مزید صدمہ ہو"

بھاوج نے گرماتے ہوئے کہا "میں نے تمہارا کیا قصور کیا؟ بتاؤ، خدا غارت کرے اس گھڑی ......"

حمید نے جملہ پورا کرتے ہوئے کہا۔ جب کہ تمہارے ماں باپ نے مجھ جیسے ناکارہ انسان کے ساتھ باندھ دیا تم کو۔ درست۔ بہر نوع میری گفتگو ختم ہو جانے دو۔

ہاں تو تم نے ابتدا سے میرے گھر کی عزت اور شہرت خاک میں ملائی۔ مہمانوں کے ساتھ سختیاں شروع کیں۔ اُن کو ذلتیں پہونچائیں، اور .... "

اور کیا، بھاوج نے کہا، میں ان الغتیوں کو گھر میں پڑتا نہیں دیکھ سکتی تھی۔

حمید نے کہا، پھر وہی بات۔ بات مت کاٹو۔ سنو۔ تو ہاں تم نے گھر کا نظام خراب کیا۔ میری شاعرانہ زندگی سے نفرت اور بیزاری کا اظہار کیا۔ میں نے ہر چیز برداشت کی۔ خاموشی کے ساتھ سکون کے ساتھ۔ اب تمہاری تیزیاں اور بلند ہوگئیں۔ اعزا اور قدیمی متوسلین کے ساتھ تم نے بُرا برتاؤ شروع کر دیا۔

بھاوج نے کہا ختم کرو اپنی داستان مطلب پر آؤ۔

مطلب" حمید نے کہا" یہ ہے کہ میں نے بالآخر یہ طے کیا کہ تمہاری ہر حرکت کو صبر کے ساتھ برداشت کروں درگذر نہ کروں اور تم پر جرمانہ کروں، چنانچہ یہ کتاب موجود ہے جس کی رو سے پچاس روپیہ اس مہینے کے جرمانہ میں کٹ گئے۔ کیوں بیگم تمہارے یہ جرم ہیں، سنے سر جھکا یا کہ نہیں۔

بھاوج نے کہا، کیسا جرمانہ میں بھی تو سنوں؟"

حمید نے مسکراتے ہوئے کہا سنو، ۲ اگست کو ساڑھے بارہ بجے دن میری خالہ تشریف لائی تھیں اُن کے سامنے جو کھانا لگا اُس میں نمک بیحد تیز تھا فیرنی میں شکر مطلق نہ تھی۔ ان کو چائے ٹھنڈی دی گئی۔ جرمانہ بیس روپے۔ اور، اور۔ ہاں یہ رہا دوسرے صفحہ پر۔ اپنی والدہ کی خاطرداری میں تین روپے کے آم منگائے۔ میلوں کو بندوں کی جوڑی دی۔ قیمتی سوا پانچ روپیہ، کیونکہ اپنے عزیزوں کے ساتھ برتاؤ صحیح اور میرے اعزا کے ساتھ بُرا۔ لہٰذا جرمانہ دس روپیہ۔ ابھی اور سنتے جاؤ۔ پڑوس کی مرغیوں کو تمہاری پیاری بلی نے ایک ایک کر روز ہڑپ کرنا شروع کیا، پڑوسی نے جو بے نقط گالیاں دیں اور میں نے خاموشی سے سنیں جرمانہ رعایت کے ساتھ مبلغ دس روپیہ۔ ہاں یہ تو میں لکھنا ہی بھول گیا تھا کل رات کو ساڑھے نو بجے میں ایک رسالہ کے لئے نظم کہہ رہا تھا جس کا معاوضہ مجھے پچیس روپے ملتا تھا اس وقت آپ نے" دیوانہ بنانا ہے تو دیوانہ بنا دے" کا ریکارڈ لگا کر میرے تخیلات کو دوسری جانب پھینک دیا اور نظم مجھ سے نہ ہوسکی۔ لہٰذا معاوضہ ختم ہوگیا۔ مجھے چونکہ بیگم تم بہت عزیز ہو چاہیئے تو تھا کہ میں تم سے پچیس روپیہ جرمانہ لیتا لیکن نہیں تمہارے ساتھ رعایت ضروری ہے جرمانہ محض دس روپیہ۔ چلو تمہارے پچاس ختم ہوگئے۔

بھاوج کا پارہ سوا نگری چڑھ گیا۔ انھوں نے کہا۔

خدا غارت کرے اس گھر کو۔ اور تم کو تو کیا کہوں۔ یا اللہ میں کس مصیبت میں پھنس گئی۔ میں اسی وقت اپنے گھر جاتی ہوں۔

حمید نے کہا۔ بھابی جی۔ بے شک اختیار ہے۔ میری رائے میں انسان کو ہمیشہ اپنے گھر میں رہنا ہی گوارا ملتا ہے۔

بھاوج گرج کر بولیں "تو میں جاتی ہوں"

حمید نے کہا "میں منع کب کرتا ہوں"

بھاوج غصہ سے کمرے سے باہر نکل گئیں۔ حمید نے میری طرف سگرٹ کا ٹین بڑھایا۔ اتنے میں وہ پھر واپس آئیں اور بولیں۔

"اچھا خدا حافظ"

حمید نے بلا ان کی طرف آنکھ اٹھائے کہا "خدا حافظ"

بھاوج نے آنسو بہاتے ہوئے فرمایا "مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی کہ تم پانچ برس کی محبت کو یوں دل سے نکال دو گے۔"

حمید نے کہا۔ اس سے بڑھ کر اور کیا محبت کا ثبوت ہو سکتا ہے کہ میں راضی برضا ہوں۔ تم کچھ کرو میں کچھ نہیں بولتا۔ مہمان آئے۔ نکالو۔ گالیاں سناؤ۔ میں خاموش۔ تم کچھ کرو۔ میری زبان بند۔ تم گھر جانا چاہو میں راضی۔ اب اور کیا آخر محبت کا ثبوت ہو سکتا ہے؟

بھاوج نے کہا۔ خدا کے لئے اب کی روپیہ مجھ کو دیدو۔ آئندہ تم جرمانہ مجھ سے لیا کرنا۔

حمید نے کہا۔ کیوں، کیا قرضہ لے لیا ہے؟"

بھاوج نے دھیمی آواز سے کہا —— "ہاں"

حمید نے کہا "کیا سامان لیا ہے؟"

بولیں —— "ہوں"

حمید نے کہا "دکاندار نے بغیر میرے دستخط کے سامان دیئے کیسے"

بھاوج نے کہا۔ میں نے تمہارے دستخط بنا دیئے تھے۔

"یہ سے بڑا جعل بنانے کی کافی سزا سرکار سے ملتی ہے۔"

بھاوج نے روتے ہوئے کہا خدا کے لئے مجھے معاف کر دو اس مرتبہ اگلے مہینے سے تم جرمانہ لیا کرنا۔

حمید نے دس دس کے پانچ نوٹ نکال کر ان کے سامنے رکھ دیئے اور کہا یہ آخری معافی ہے۔ اس کے بعد اگر دوبارہ جعلی دستخط کئے گئے تو میں ذمہ دار نہیں ہوں۔

بھاوج نے نوٹ اٹھاتے ہوئے کہا تم بڑے اچھے شوہر ہو۔ بندوں کی جوڑی بڑی خوبصورت تھی اور گروا بچا تھا اس سے اس پر راضی نہ ہوا۔ میں تمہاری بہت ممنون ہوں۔ اور اب میں گھر نہیں جاؤں گی۔"

حمید نے کہا۔ مجھے تعجب ہے۔ آج جب میں نے تم پر سختی کی تو تم میری تعریف کر رہی ہو۔ ورنہ اب تک تو میں بہت برا شوہر تھا۔

بھاوج نے کہا۔ نہیں میں غلطی پر تھی۔ تم بہت عمدہ شوہر ہو۔

میں حمید کی اس ترکیب پر لوٹ گیا اور میں نے بیساختہ کہا۔

"واہ رے شاعر"

بہزاد لکھنوی

اہلِ علم کی وسعتِ علمیت

ولیم ہیزلٹ کے نقطۂ خیال سے

"جو شخص محض اپنی مادری زبان میں اپنا مافی الضمیر ادا کرنے پر قادر ہے وہ اُس عالم سے زیادہ قابل سمجھا جائے گا جو مختلف زبانوں سے واقف ہونے کے باوجود کسی زبان میں اپنے خیالات پوری طرح بیان نہیں کرسکتا۔" (ابشلے)

علم و عالم، تصنیف و مصنف چند ایسے الفاظ ہیں جو ہماری معاشرت کی تفہیم میں زبردست حصہ رکھتے ہیں اور ہماری ذہنیت میں ایسے خطوط مرتسم کرچکے ہیں جن کو قدامت پرستی کی سخت ترین مخالفت کے باوجود موجودہ ذہن انسانی ابھی تک نہیں مٹا سکا۔ عالم و جاہل کے سامنے ہی ہمارا ذہن "اعلیٰ و ادنیٰ" کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ ہم سمجھتے چلے آئے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ عالم وہ ہے جو اپنی عقل و فہم کو علوم کے مختلف چشموں سے نشو و نما دے کر اور ماضی و مستقبل کے حجابات کو اُٹھا کر کچھ ایسی چیز "بن چکا ہے جس کے حضور میں معلومات کی دیوی" ہمیشہ ستائش گزار رہے گی۔ کاش عالم سے ہماری یہ توقعات صحیح ثابت ہوتیں۔ دیکھا تو یہ جاتا ہے کہ دنیا میں سب سے کم ذاتی خیالات رکھنے والے وہی ہوتے ہیں جو مصنف محض ہیں یا قاری محض!

حقیقت یہ ہے کہ نوشت و خواند سے محروم رہنا اس سے کہیں بہتر ہے کہ انسان نوشت و خواند کے علاوہ ہر کام کی اہلیت کھو بیٹھے۔ وہ متساہل و ناکارہ انسان جو ہمیشہ کتاب لئے نظر آتا ہے اتنی اہلیت رکھتا ہے نہ رغبت کہ اپنے ارد گرد کے واقعات یا خود اپنی ذہنی دنیا کی طرف متوجہ ہو سکے۔ ایسے انسان کے لئے یہ کہہ دینا بالکل حقیقت بیانی ہے کہ وہ اپنے قوائے عقلی و ذہنی یا تو اپنی جیب میں لئے پھرتا ہے یا اپنی لائبریری کی الماریوں میں چھوڑ آتا ہے۔ کسی جدید سلسلۂ استدلال پر طبع آزمائی کرنا یا کوئی ایسی رائے پیش کرنا جو اُس کے دماغ میں کتابوں کے ذریعے منتقل نہیں ہوئی اس کے لئے وحشتناک امر ہے، جد وجہد دماغی سے جو فقدانِ مشق کی وجہ سے اُس کے لئے ناقابلِ برداشت شے ہو جاتی ہے وہ گریزاں نظر آتا ہے۔ اور اُس کی تشنگیٔ علم کے لئے یہی سرمایۂ تسکین ثابت ہوتا ہے کہ اس کا دماغی خلا حقیقی اشیاء کے اُن نامکمل اور دھندلے نقوش سے معمور رہے۔ جو الفاظ کا لامتناہی تسلسل پیدا کرتا اور مٹاتا رہتا ہے۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ علم کو "عقل عامہ" کا مترادف سمجھ کر حقیقی علم کے ذریعہ تحصیل کو تباہ کر دیا جاتا ہے۔ قدرت کے گوناگوں مظاہرات کو دیکھنے کے لئے کتابوں کو بطور عینک بہت کم استعمال کیا جاتا ہے۔ زیادہ تر کتابیں اس کام میں لائی جاتی ہیں کہ جمالِ فطرت کے تابناک جلوے ہماری کمزور آنکھوں اور متساہل طبائع سے پوشیدہ رہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارا "عالم" ایک "کرمِ کتب" سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ وہ لفظی مسائل کی اُلجھنوں میں پھنس کر اشیاء کے صرف وہ نیم تاریک نقوش دیکھتا ہے جو بذاتِ خود دوسرے لوگوں کے دماغ کا پرتو ہوتے ہیں۔ قدرت جب کبھی بے نقاب ہو کر اُس کے سامنے آتی ہے تو اس کی فہم و عقل مختل اور ہوش و حواس سراسیمہ ہو جاتے ہیں۔ اشیاء کا اصلی رنگ و روپ جو الفاظ کے لبادوں سے معرا اور گراں طویل بیانات سے بے نیاز ہوتا ہے اُس کے لئے ایک ایسی ضرب ہے جو اُس کی فطرت کے استقلال کو متزلزل کر دیتی ہے موجوداتِ عالم کا تنوع اور تغیراتِ کائنات کی سرعت اُس کی قوتِ ادراک کو تھکا دیتی ہے، ختم کر دیتی ہے۔ اور وہ اپنے ارد گرد کی دنیا کی چمک دمک، شور و غوغا اور ابدی تغیر و انقلاب سے گھبرا کر مردہ زبانوں کی خاموش یکسانیت و جمود اور "ابجد" کے کم متغیر کن و معقول حروف کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ اس کا دماغ چونکہ خود اپنی حرکت ضائع کرچکا ہے۔ اس لئے وہ چاہتا بھی یہی ہے کہ اُسے کوئی ایسی دنیا مل جائے جو تبدل و تغیر کے اصول سے مبرا ہو تاکہ تغیرات و حالاتِ جدیدہ کی تفہیم کے لئے جب اُس کا دماغ کوشش کرے تو اعترافِ عجز نہ کرنا پڑے ——— اور یہ دنیا اُسے کتابوں میں مل جاتی ہے۔ جہاں اُس کے قوائے دماغی کو کسی عملی مشقت کی ضرورت نہیں پڑتی۔ وہ ایسا چاہتا ہے تو اس کی یہ تمنا دراصل ہے بھی مطابقِ فطرت! بزدل اور مردہ انسانوں کا ہمیشہ سے یہ اصول رہا ہے کہ "مجھے آرام کرنے دو" آپ کسی مفلوج شخص سے تو یہ توقع رکھ سکتے ہیں کہ وہ کرسی سے کود پڑے اور اپنا عصا پھینک دے لیکن ایک "عالم" سے کبھی یہ اُمید نہیں کی جاسکتی کہ وہ اپنی کتاب پھینک دے اور بذاتِ خود کچھ غور و فکر کرسکے۔ کتاب سے وہ محبت کرتا ہے محض اس لئے کہ یہ اُس کے ذہن کے لئے "سہارا" ہے "عصا" ہے یہ کتاب سے جدا ہونا اُس کے لئے اتنا ہی دہشت انگیز ہے جتنا کسی "کرۂ بے ہوا" میں چھوڑ دیا جانا۔ عام لوگ خدائی کی خدائی میں ہر جگہ

اور ہر فضا میں زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ لیکن وہ شخص "کتابی فضا" میں جی سکتا ہے۔ وہ دوسرے لوگوں سے عقل کا سائل ہے۔ وہ کوئی بھی اپنا ذاتی خیال نہیں رکھتا اور اس لئے دیگر انسانوں کے خیالات کے سہارے جینے پر مجبور ہے۔ جس طرح شراب کی گرسنگی آفرینی خود معدے کی قوت تحلیل غذا کو برباد کر دیتی ہے۔ اسی طرح اپنے دماغ کے علاوہ دیگر ذرائع سے خیالات فراہم کر لینے کی عادت فہم و ادراک اور تخیل کی قوتوں کو ضعیف کر دیتی ہے۔ جب قوائے دماغی کو استعمال نہیں کیا جاتا تو وہ مضمحل، کمزور اور خیال و عمل کے لئے ناکارہ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ان امور کے مد نظر اگر عامۃ تساہل و جہالت کی زندگی بسر کرنے سے کسی پژمردگی اور اضمحلال مستولی ہو جائے تو کوئی تعجب کی بات نہیں، اسکی زندگی عبارت ہوگی صرف اس بے کیف شغل سے، مشتعل ہو کر وہ سطور و الفاظ پر جو حقیقتاً ایک "نامعلوم زبان" کے الفاظ سے زیادہ مفہوم و دلچسپی نہیں رکھتے، نگاہ جمائے رہے تا آنکہ اسکی آنکھوں کے دروازے اسکے دماغ کے خلا پر بند ہو جائیں اور کمزور ہاتھوں سے کتاب نیچے گر پڑے۔ زندگی کو اس طرح نیم خواب و نیم بیداری میں گزار دینے سے یہ کہیں بہتر ہے کہ انسان حقیر ترین کسان و مزدور بن جائے تا کہ دن بھر سخت و گرم دھوپ میں عرق ریزی کرنے کے بعد تمام رات "جنت" میں سوئے۔ "عام مصنف" اور "عام قاری" بالکل ایک ہی سی چیزیں ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جس طرح قاری مصنف کی تصنیف سے اکتساب خیال کرتا ہے اسی طرح مصنف کسی اور مقام سے نقل کر لیتا ہے۔ عام مصنفین ادبی مزدور ہوتے ہیں۔ اگر ان سے کوئی "اوریجنل" تصنیف طلب کی جاتی ہے تو ان کا دماغ چکرا جاتا ہے اور انھیں یہ بھی پتہ نہیں رہتا کہ وہ کیا لکھ رہے ہیں۔ مستقل قارئین کتب تصاویر کے ان ابدی نقل کرنے والوں کے مشابہ ہیں جو جب کبھی کوئی تصویر بذات خود بنانا چاہتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ قدرت کی اشیاء کے نقوش بنانے کے لئے انکی نگاہ تیز، ہاتھ مستقل اور رنگ چکدار نہیں۔

جو شخص ادارہ تعلیم کے مختلف مدارج سے گزر چکا ہے اور ہنوز بیوقوف نہیں بنا اسے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کی صحت ہوش خطرے سے بال بال بچ گئی ہے۔ یہ ایک قدیم مقولہ ہے کہ "جو بچے مدارس میں درخشاں رہتے ہیں وہ بڑے ہو کر دنیا میں داخل ہونے کے بعد زبردست شخصیت کے مالک ثابت نہیں ہوئے۔" حقیقت یہ ہے کہ جو چیزیں بچے کو اسکول میں سکھائی جاتی ہیں اور جن پر اس کی کامیابی کا انحصار ہوتا ہے، وہ ایسی چیزیں ہیں جو دماغ کی اعلیٰ ترین یا مفید ترین قوا کا استعمال نہیں چاہتیں۔ سب سے خاص چیز جو مختلف زبانوں اور جغرافیہ۔ ریاضی وغیرہ کے اسباق کو رٹنے اور زبانی دوہرانے میں متحرک و مستعمل ہوتی ہے وہ قوت حافظہ ہے (اور وہ بھی حقیر ترین قسم کی) اس لئے جو بچہ اس قسم کا حافظہ رکھتا ہے کہ اسباق کے علاوہ ان دیگر چیزوں کی طرف ذرا بھی مائل نہیں ہے۔ جو اسکی طفلانہ توجہات و خیالات پر مضبوط اثر اور زیادہ فطری حقوق رکھتی ہیں وہ یقیناً مدرسے میں سب سے اعلیٰ طالب علم ثابت ہو سکتا ہے۔ قواعد کی پریشان کن الجھنیں، حساب کے بے کیف اصول وغیرہ ایک دس سالہ تندرست بچے کے لئے صحیح معنی میں کبھی کوئی کشش نہیں رکھ سکتے۔ یہ دوسری بات ہے کہ دوسروں کی طرف سے جبراً یہ بطور کام کے اس پر عائد کر دیا جائے۔ یا دیگر چیزوں میں لطف و تفریح کا فقدان کبھی اسکو ادھر متوجہ کر دے۔ ایک بیمار جسم اور مضمحل دماغ طالب علم جس کو محض جو کچھ بتایا جاتا ہے وہ یاد رہتا ہے اور جس کو ہوشیار میں تمیز کرنے کی اہلیت دماغی ہے نہ بذات خود خداداد ذہن کا جوش، اپنی جماعت میں عام طور پر سب سے اعلیٰ پایا جائے گا۔

اس کے برعکس مدرسہ میں ناکارہ و بد شوق بچہ وہ کہلاتا ہے جو تندرست ہے اور ایک پر جوش فطرت رکھتا ہے جو اپنے اعضاء کا استعمال آزادی اور ہوشیاری کے ساتھ کر سکتا ہے۔ جو اپنے خون کے دوران اور دل کی ضربات کو محسوس کرتا ہے جو ایک ہی سانس میں ہنسنے اور رونے کے لئے مستعد نظر آتا ہے۔ جو گیند یا تیتری کے تعاقب کا شائق ہے۔ کھلی میدان کی ہوا اپنے چہرے پر محسوس کرتا ہے میدانوں کی طرف دیکھتا ہے یا پھر آسمان کی طرف۔ پیدا راستے پر چلتا ہے یا جو بجے اور سعی کی کتابوں پر اونگھنے، گھنٹوں لکھنے کی میز کے قریب بندھے بیٹھے رہنے اور خاص خاص موقعے پر اپنے وقت و طاقت کو ضائع کر دینے کے صلے میں چھوٹے چھوٹے انعامی تمغہ جات وصول کر لینے سے بہتر یہ سمجھتا ہے کہ اپنے دوستوں اور عزیزوں کے چھوٹے سے جھگڑے میں شوق و ذوق کی پوری قوت کے ساتھ شریک ہو۔ یہ درست ہے کہ بچوں کو جو چیز معمول کے اسباق کو یاد کرنے اور تعلیمی انعامات حاصل کرنے سے مانع آتی ہے اس میں ان کے "دماغی قصور" کا بھی دخل ہے لیکن اکثر جسے دماغی قصور سمجھا جاتا ہے وہ دلچسپی کا فقدان ہوتا ہے یا کسی ایسے معقول طریقہ کی کمی جو خیال و توجہ کو بلا احساس جبر مدرسے کی تعلیم کے خشک شغل میں منہمک کر سکے۔ جس طرح انتہائی کند ذہن بچے مدرسے کی اس "مزدوری و مشقت" سے بھی کچھ نہیں سیکھ سکتے۔ اس طرح اعلیٰ ترین دماغی ذہانت کے بچے اس کے بغیر ہی سب کچھ حاصل کر لیتے ہیں۔ دنیا کے اعلیٰ ترین اہل عقل و فہم کبھی اسکول یا یونیورسٹی میں ممتاز نہیں رہے۔ سرگرم و تندرست تخیل نے کبھی مدرسے کی پابندیوں کو قبول نہیں کیا۔ چنانچہ گرے، کالنس اور گولڈ اسمتھ مثال کے طور پر پیش کئے جا سکتے ہیں۔ ایسے لوگ مدرسے کی پابندیوں کے فوائد سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ اور اپنے آزاد تخیل کو مطیع و منقاد بنا دینا ان کے نزدیک فطرت کی تذلیل ہوتی ہے۔ ایسی عقل و فراست جو "الفاظ" کی نظم ریزی کے لئے موزوں ہوتی ہے۔ مگر جس میں "اشیاء" کا کوئی دخل نہیں ہو سکتا۔ ایک

اور ایک خاص درجے سے تعلق رکھتی ہے۔ درمیانی سطح کی قوتِ دماغی اور قدرے ضعفِ اخلاقی دونوں مل کر ایک ایسی کشت زار بناتے ہیں جس سے کامیاب ترین اہلِ قلم پیدا ہوتے ہیں۔

علم (اکتسابی علم) اُس چیز کے علم کا نام ہے جو عام طور پر نامعلوم ہے۔ اور جو ہم محض کتب یا دیگر مصنوعی ذرائع سے حاصل کر سکتے ہیں۔ اُس چیز کا علم جو ہمارے سامنے ہے یا ہمارے اردگرد موجود ہے، جو ہمارے تجربہ، جذبات، مشاغل، قلوب اور کاروبار کو اپیل کرتی ہے علم نہیں۔ علم وہ ہے جسے عالم کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ وہ شخص سب سے زیادہ عالم ہے جو "زندگیٔ عام" اور "مشاہداتِ واقعی" سے بعید ترین شے کو جانتا ہے۔ جو ایسی چیز سے واقف ہے جو کہ عملی زندگی میں سب سے کم مفید اور تجربے کے دائرے سے سب سے زیادہ دور ہے اور جو سب سے زیادہ درمیانی مدارج سے گذرتی ہوئی ہم تک پہونچتے پہونچتے انتہائی طور پر غیر یقینی، دشوار اور متضاد ہو چکی ہے۔ ایسا علم غیروں کی آنکھوں سے دیکھنے غیروں کے کانوں سے سننے اور اپنے ایمان و اعتقاد کی بنا دیگروں کی فہم و قیاس پر قایم کرنے کے مترادف ہے۔ ایک عالم انسان فخر و ناز کرتا ہے اس پر نہیں کہ اُسے "انسان و اشیار" کا علم ہے۔ بلکہ اس پر کہ وہ "اسمار و تواریخ" سے واقف ہے۔ اُسے اپنے نزدیک ترین ہمسایہ کا علم ہے نہ خیال۔ اگر دور افتادہ قوموں کے عروج و زوال کی داستان اُسے ازبر ہے۔ اگرچہ وہ قسطنطنیہ اور پیکن کے طول و عرض کی پوری معلومات رکھتا ہے۔ لیکن خود اپنے محلے تک کے رستے سے واقف نہیں ہوتا۔ وہ یہ نہیں جانتا کہ اُس کا قدیم ترین دوست بدمعاش ہے کہ بیوقوف مگر ہر ایک اہم تاریخی شخصیت پر ایک شاندار تقریر کر سکتا ہے۔ وہ یہ بتانے سے معذور ہے کہ فلاں شے سیاہ ہے کہ سفید۔ مدعا یہ ہے کہ مرلح لیکن "الوانیات" وغیرہ کا ایک زبردست ماہر تسلیم کیا جاتا ہے۔ جس شے پر وہ بحث و مباحثہ کرتا ہے اُس سے وہ اتنا ہی واقف ہوتا ہے جتنا کہ ایک نابینا انسان اقسام رنگ سے۔ وہ سادے سے سادے سوال کا جواب باصواب نہیں دے سکتا نہ اُس کی رائے ہر اُس معاملے میں جو حقیقتاً اُس کے سامنے ہوتا ہے درست ہوتی ہے۔ مگر بایں ہمہ وہ اُن تمام معاملات میں جن کے متعلق کوئی بھی انسان قیاس کے علاوہ اور کسی ذریعے سے کچھ نہیں معلوم کر سکتا۔ خود کو ایک ناقابلِ خطا و سہو مصنف سمجھتا ہے۔ وہ تمام مردہ زبانوں اور بیشتر زندہ زبانوں کا ماہر کہلاتا ہے۔ لیکن خود اپنی مادری زبان روانی کے ساتھ لکھ سکتا ہے نہ بول سکتا ہے۔ ڈاکٹر برنے جو اپنے زمانے میں یونانی زبان کا دوسرا بہترین عالم تھا اِس قسم کے لوگوں میں شامل ہے۔ وہ ملٹن کے لاطینی طرزِ نگارش میں سینکڑوں لغزشیں بے نقاب کرتا ہے۔ لیکن خود اُس کی تحریر میں بامحاورہ و سلیس انگریزی زبان کا ایک جملہ بھی نہیں ہے۔

ایک "عالمِ محض" جو کتابوں کے علاوہ اور کچھ نہیں جانتا خود کتابوں سے بھی نا واقف ہوتا ہے: "کتابیں اپنا استعمال خود نہیں بتاتیں"؛ وہ شخص کسی تصنیف کو کیا سمجھ سکتا ہے جو اُس کے "نفسِ عنوان" کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتا۔ ہمارا عالم کتابوں سے اسی حد تک تعلق رکھتا ہے جس حد تک وہ اُن میں دوسری کتابوں سے رکھتی ہیں۔ وہ اُن کی کورانہ تقلید کرتا ہے جو دوسروں کی کورانہ تقلید کر چکے ہیں۔ وہ ایک لفظ کا ترجمہ دس مختلف زبانوں میں کر سکتا ہے۔ لیکن یہ نہیں جانتا کہ وہ "لفظ" درحقیقت کس "چیز" کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ وہ اپنے دماغ کو ایسی اسنادسے جو خود دیگر اسناد پر قایم ہیں ——— ایسی روایات سے جو دیگروں کیا سے روایت کی گئی ہیں بھر لیتا ہے اور اپنے ہوش و حواس، عقل و فہم اور دل و دماغ کے دروازے مقفل کر لیتا ہے۔ وہ دنیا کے طرز و طریقہ سے ناواقفِ محض ہوتا ہے۔ انفرادی طبائع کی نبض شناسی اُسے نہیں آتی۔ وہ "قدرت" اور "مصوری" میں کوئی حسن و جمال نہیں پاتا۔ "چشم و گوش" کی زبردست دنیا اُس کے لئے پنہاں ہوتی ہے اور علم کے تمام اصلی دروازے اُس کے لئے بند ہوتے ہیں۔ اُس کا غرور و پندار کی جہالت کا ساتھ دیتا ہے۔ یعنی جس قدر اُن اشیار کی تعداد بڑھتی جاتی ہے جن کی قیمت وہ نہیں جانتا اور جن سے وہ اسی لئے نفرت کرتا ہے اسی قدر اُس کے زعمِ باطل میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ تصاویر کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتا۔ اُن کی ہستی اُس کو "مُردہ خط" کی طرح کبھی محسوس نہیں ہوتی۔ ایسا ہونا بھی ضروری ہے کیونکہ اُس کے پاس وہ آنکھیں ہی نہیں ہوتیں جو اُن اشیار کو دیکھ سکیں جن کی تصاویر رفیقی ہیں۔ روبن کی بنائی ہوئی تصویر "پن گوٹ" یا کلاڈ کا مشہور نقش "سحر زدہ قصر" اُس کے کمرے میں برسوں بھی آویزاں رہے تو وہ ذرا بھی خیال نہ کریگا۔ اگر آپ اُسے اُن تصاویر کی طرف متوجہ کریں گے تو منہ پھیرے گا۔ فطرت کی زبان یا مصوری کی زبان (چونکہ مصوری خود ایک دوسری فطرت ہے) وہ نہیں سمجھتا۔ موسیقی سے بھی وہ بالکل ناآشنا ہوتا ہے۔ ماہر ترین نغمہ نواز سے لے کر پہاڑوں اور میدانوں کے بانسری والے چرواہے تک کی موسیقی اُس کے لئے ایک بے کیف شے ہوتی ہے۔ اُس کی سماعت کتابوں تک محدود ہوتی ہے۔ مختلف السنۂ عالم کی آوازاور مدرسے کی تعلیم کا شور و ہنگامہ اُس کے کانوں کو بحیس کر دیتا ہے۔ کیا وہ شاعری کے متعلق کچھ زیادہ جانتا ہے؟ وہ اس سے ضرور واقف ہے کہ "عروض" کیا شے ہے تمثیل میں ابواب کا شمار کتنا ہوتا ہے۔ لیکن جو چیز روح و جان شعر ہے وہ اُس کے لئے یکسر نامعلوم ہے۔ وہ ایک یونانی نظم کو انگریزی زبان کا جامہ پہنا سکتا ہے

ایک لاطینی زبان کی نظم کا ترجمہ یونانی زبان میں کرسکتا ہے۔ لیکن یہ امر وہ نقادوں پر چھوڑ دیتا ہے کہ وہ نظم اس قابل بھی تھی کہ نہیں۔ کیا وہ زندگی کے "عملی و واقعی" پہلو کو اصولی پہلو سے زیادہ جانتا ہے؟ —— نہیں! —— وہ ہاتھ یا مشین کے کسی فن سے واقف نہیں ہوتا۔ کسی تجارت و کاروبار کا کچھ علم نہیں رکھتا۔ "قوانین و اتفاقات" کا کوئی کھیل نہیں جانتا۔ وہ جراحی۔ زراعت، معماری، آہنگری وغیرہ سے قطعاً نابلد ہوتا ہے۔ ہمارا "عالم" کسی فن کے متعلق کوئی آلہ بنا سکتا ہے نہ بنے ہوئے آلے کو استعمال کرسکتا ہے۔ وہ کھیل کود، تیراکی وغیرہ میں بالکل اناڑی ثابت ہوتا ہے۔ تمام علوم و فنون کا ایک زبردست پروفیسر اپنے کسی علم و فن کو "عمل" میں منتقل نہیں کرسکتا۔ اگرچہ وہ انسائیکلوپیڈیا میں ان میں سے ہر ایک پر ایک طویل مقالہ لکھ سکتا ہے۔ اُسے اپنے ہاتھ پاؤں کے استعمال پر اختیار رکھتی نہیں ہوتا۔ نہ وہ بھاگ دوڑ سکتا ہے نہ تیر سکتا ہے۔ اور اُن تمام لوگوں کو ذلیل سمجھتا ہے جو ان فنون کے ماہر ہوتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ان فنون میں سے کسی ایک کو سیکھنے کے لئے ایک موزوں طبیعت اور خداداد اوصاف والے انسان کو بھی ایک زمانہ درکار ہوتا ہے۔ ہمارا "عالم" اپنے "علم" سے انتہائی فائدہ یہ حاصل کرسکتا ہے کہ تکلیف دہ پیہم مطالعہ کے بعد کسی تعلیمی ادارے کی اعلیٰ ترین ڈگری حاصل کرے اور باقی زندگی کھانے پینے اور سونے میں صرف کردے۔

دائرۂ علم کی اس تنگی کا راز بالکل صاف ہے۔ انسان جو کچھ "واقعی سمجھتا ہے" —— "جانتا ہے" اُس کے حدود بہت مختصر ہیں۔ روزانہ زندگی کے معاملات و تجربات میں وہ سب کچھ جو محض اتفاقی طور پر یا کسی خاص قصد کے سلسلے میں ہمارے وقوف میں آجاتا ہے وہی ہمارا "اصلی علم" ہے۔ باقی سب دنیا فریبی اور سراب نمائی ہے۔

عام لوگ اپنے اعضاء کا آزادانہ استعمال کرسکتے ہیں۔ کیونکہ وہ اپنی محنت یا ذہانت کے ذریعہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ اپنے کام کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ اور جن لوگوں کے ساتھ اُن کا ربط و ضبط رہتا ہے اُن کے کردار سے اچھی طرح واقف ہوتے ہیں کیونکہ ایسا اُن کے لئے اشد ضروری ہے۔ اپنے جذبات کو ادا کرنے کے لئے اُن کی زبان میں طاقت و روانی ہوتی ہے اور غصہ و مسرت کے لئے ارادے کے ماتحت ایک فطری اظہار ہوتا ہے۔ اُن کی گفتگو میں "علمیت" کا وہ مسخر آفریں رنگ نہیں ہوتا جو زندہ زبان کو مردہ زبان بنا دیتا ہے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں صاف و صحیح —— اور کہتے ہیں اس طرز سے جو دماغ اور فطرت انھیں بتاتی ہے۔ اسی لئے اُن کی گفتگو جدت و دلچسپی سے معمور ہوتی ہے۔ آپ اگر کسی مچھلی بیچنے والے کے پُرشور و گرم مباحث کو بغور سنیں تو یقیناً اُن میں دارالعوام House of Commons. کی خشک مجلس سے زیادہ صداقت کی باتیں ملیں گی۔ ایک چھوٹے سے گاؤں کی سن رسیدہ عورت کردارشناسی میں خوب ماہر ہوتی ہے۔ اور جب کسی کے کردار کو مثالوں کے ذریعہ سمجھاتی ہے تو اپنے زمانے کی کہی ان کہی "تاریخ" میں سے ایسے ایسے لطائف بیان کرتی چلی جاتی ہے کہ مثال زندہ معلوم ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے یونیورسٹی کی ایک گریجویٹ لڑکی جب کبھی اس امر کی کوشش کرے گی تو اپنے زمانے کے ناولوں اور طنزیہ نظموں کا سہارا ڈھونڈے گی۔ لیکن اُس کی گفتگو پھر بھی بے جان اور خشک معلوم ہوگی۔ کردارشناسی میں شہر کے باشندے یقیناً بہت نااہل ثابت ہوتے ہیں جس کی وجہ منظر کی نیم پوشیدگی ہے۔ اہلِ دیہات کسی انسان کی محض ذاتی تاریخ ہی سے واقف نہیں ہوتے بلکہ اُس کے آباؤ اجداد کے اوصاف و معائب کی روشنی میں اُس کے کردار کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ہمارا "عالم" خواہ گاؤں میں ہو یا شہر میں اس معاملہ میں بالکل نااہل ثابت ہوتا ہے۔ برائی کے عام افراد میں وہ "حسِ عامہ" موجود ہوتی ہے جس سے ہر ایک زمانے کا عالم محروم رہے۔ عوام جب کبھی معاملات میں ذاتی فیصلہ سے کام لیتے ہیں تو صحیح راستے پر ہوتے ہیں۔ لیکن جب اپنے نابینا لیڈروں کی پیروی کرتے ہیں تو ہمیشہ سخت ترین غلطی کے مرتکب ہوتے ہیں۔

مختصر طور پر یوں سمجھئے کہ سوسائٹی میں بہترین معقول انسان وہ ہیں جو عملی زندگی بسر کرتے ہیں۔ جو "ممکنات" کی اُلجھنوں سے آزاد ہو کر "موجودات" کے مشاہدات سے استدلال کرتے ہیں۔ وہ چیز جسے مذاقِ سلیم کہا جاتا ہے خواتین میں مردوں کی بہ نسبت اکثر زیادہ پایا جاتا ہے۔ وہ زعمِ باطل اور "اصولیات" کی پیچیدگیوں سے نسبتاً آزاد ہوتی ہیں۔ اور اُن کی ہر رائے براہِ راست اُن تاثرات سے متعلق ہوتی ہے جو اُن کے دل و دماغ پر مشاہدات سے بے اختیارانہ مرتسم ہوتے ہیں۔ اور اسی لئے اکثر اُن کا فیصلہ مطابقِ فطرت و صداقت ہوتا ہے۔ وہ غلط استدلال نہیں کرسکتیں۔ کیونکہ وہ استدلال کرتی ہی نہیں۔ وہ اصول کے ماتحت غور و فکر اور بحث و مباحثہ نہیں کرتیں۔ اور عام طور پر اُن کی زبان میں زیادہ سلاست و روانی۔ نزاکتِ ادا و شیرینی ہوتی ہے۔ جب وہ اپنی سہیلیوں کو خطوط لکھتی ہیں تو اُن کی طرزِ نگارش بیشتر مصنفین سے اچھی ہوتی ہے۔

غیر تعلیم یافتہ اشخاص اپنے اندر ایجاد و اختراع کا مادہ بیشتر رکھتے ہیں اور تعصب سے ممکن ترین حد تک آزاد ہوتے ہیں۔ شیکسپیئر ایک غیر تعلیم یافتہ دماغ کا مالک تھا مگر اُس کا تخیل تازہ و جدید اور نظریات متنوع ہیں۔ ملٹن عالمانہ ذہنیت رکھتا تھا لیکن اس کے خیالات [illegible] پیچیدگی سے مملو ہیں۔ شیکسپیئر نے اسکول میں نیکی کی موافقت اور بدی کی مخالفت میں مضامین نہیں لکھے تھے



قوسِ قزح

خنجرِ آبدار ہے، ابروئے تابدار ہے
ابروئے تابدار کیا، کعبۂ روزگار ہے

نرگسِ مے فروش نے دعوتِ بادہ نوش کی
ساغرِ ہفت رنگ میں میکدۂ بہار ہے

غنچۂ سربمہر سے محشرِ رنگ و بو اٹھا
عقدہ کشائے زندگی ناخنِ زرنگار ہے

نرگسِ نیم باز پر خونِ شہیدِ ناز کیا
سینۂ مہر و ماہ میں تیغِ نگاہِ یار ہے

دامنِ ابرِ شام پر کس نے شراب پھینک دی
تارِ نگاہ بھی خطِ ساغرِ آبدار ہے

طائرِ نوبہار آ، مژدۂ وصلِ یار لا
سینۂ مرغزار پر سینۂ شاخسار ہے

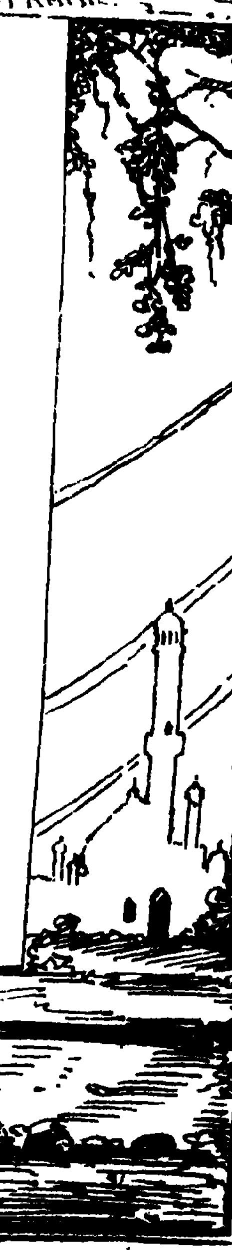
مطربِ نازنیں سنا، نغمۂ دلنشیں سنا
دامنِ کوہسار میں موجۂ آبشار ہے

ساقیٔ دل نواز آ، آتشِ جاں گداز دے
فرش سے تا بہ عرش ایک سلسلۂ شرار ہے

اے دلِ خوش خرام اٹھ، پیکرِ تیز گام اٹھ
لالہ و گل سے ہر روش جادۂ زرنگار ہے

آہ جو غم نصیب ہیں اُنکو نویدِ عیش کیا
قوسِ قزح دمِ سحر خنجرِ آبدار ہے

کشتۂ پیچ و تاب اُف، مورِدِ صد عتاب اُف
فیض کی سرنوشت کیا چینِ جبینِ یار ہے



فیض جھنجھانوی

عمر پر پیشوں کا اثر

کیا ہوتا ہے؟ اور کون کون سے پیشے کن اعضا کو قوی یا ضعیف بنا کر حیاتِ انسانی کی کمی یا زیادتی میں مدد دیتے ہیں۔

پیشہ	فائدے	نقصانات
مصنف یا مولف	دماغی اعصاب کو	قلب ضعیف ہوتا ہے اور اکثر مصنفین کو دل کی بیماریاں لاحق ہوتی ہیں۔
منشی یا کلرک وغیرہ جو بیٹھے بیٹھے دفتر سیاہ کرتے رہتے ہیں۔	قوت بصارت بشرطیکہ روشنی اور باقاعدہ جھکے لکھنے پڑھنے کا نقصان نہ ہو اور قلم والی انگلیوں کا	معدہ جگر، تلی اور آنتیں کمزور ہوتی ہیں، غور و فکر کی قوت اور استقلال ذہنی کم ہو جاتی ہے اور ایسے لوگ اکثر خونی یا بادی بواسیر میں مبتلا رہتے ہیں۔
وکالت یا مختارکاری	زبان کے پٹھے، پنڈلیاں قوی	حافظہ نباشد۔ ضعف دماغ، قلب و بصارت۔ جھوٹی بھوک
زمینداری یا ریاست	وہم و خیالات کو	مجمع امراض
حکیم، ڈاکٹر، دکاندار۔ تاجر۔	قیافہ شناسی کو۔ دماغی قویٰ اکثر صحیح رہتے ہیں	بدخوابی۔ امراضِ معدہ۔ بلغم و ریاح کی زیادتی۔ افعال معدہ و جگر کی خرابی۔ ذیابیطس وغیرہ امراض۔ گردہ و مثانہ۔
زرگر (سنار)	حافظہ کو	بصارت کو
آہنگر (لوہار)	قوت ہاضمہ۔ دونوں ہاتھوں کے پٹھے قوی ہوں	ریڑھ کی ہڈی۔ کمر کے پٹھے اور دماغ کمزور ہوتے ہیں۔ قوتِ سامعہ ضعیف ہو جاتی ہے۔
نجار (بڑھئی)	اکثر دایاں جسم قوی ہوتا ہے	اکثر اعضائے چپ ضعیف ہوتے ہیں اور فالج کا اندیشہ رہتا ہے۔
دھوبی	پھیپھڑے معدہ۔ دماغ قوی ہوتا ہے	اکثر دماغی امراض مثلاً نزلہ۔ صرع۔ مالیخولیا و عصبی امراض۔
کوزہ گر (کمہار)	اعصاب قوی	پھیپھڑے کی بیماریاں
طباخ (باورچی)	دماغ و اعصاب قوی ہوتے ہیں	پھیپھڑے، معدہ، جگر و آنکھوں کے امراض پیدا ہوتے ہیں۔
کیمیاگری یا دواسازی	قوتِ حاسبہ کو ترقی ہوتی ہے	عموماً آنکھوں اور پھیپھڑوں کی بیماریاں لاحق ہوتی ہیں۔
کہاری یا باربرداری	بواسیر و طحال و امراضِ جگر و معدہ سے حفاظت رہتی ہے	نقرس۔ عرق النساء، وجع مفاصل وغیرہ جوڑوں اور پٹھوں کے امراض لاحق ہوتے ہیں
کاشتکاری	اگر قابلِ برداشت محنت کریں تو بہترین تندرستی حاصل ہو سکتی ہے	بہت کم نقصانات ہوتے ہیں۔
معلمی	قویٰ دماغی ترقی پذیر رہتے ہیں	کھانے پینے کی حرص اور خواہ مخواہ کی بھوک بڑھ جاتی ہے۔ بدنی اعصاب عضلات آرام طلب ہو جاتے ہیں۔
گداگری شراب کشی	از سر تا پا تندرست۔ پٹھوں میں تحریک رہتی ہے	مگر سراپا مریض۔ پھیپھڑے اور دماغ مریض ہو جاتے ہیں۔

قادری مارہروی

بقیہ مضمون صفحہ ۱۱

یہی وجہ ہے کہ اُس کی تمثیلات کی جاندار ادا اخلاقیات کے زیور سے آراستہ نظر آتی ہے۔ اگر ہمیں انسانی ذہانت و ذکاوت کی قوت دیکھنی ہے۔ تو شیکسپیئر کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ اگر ہمیں انسانی "علم" کی بے مائگی دیکھنی ہے تو شیکسپیئر کے نقادوں کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

مسعود جاوید

ایک دل آویز افسانہ

چوڑیاں

پھول وتی کو بچپن ہی سے چوڑیوں سے محبت تھی، وہ کانچ کی چوڑیاں تھیں۔ کالے رنگ کی چوڑیاں تو اُسے بہت ہی پسند تھیں۔ شاید اس لئے کہ وہ گوری کلائیوں میں بہت بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ رجنی مسکرا کر کہتی "تیری کلائیوں میں تو یہ غضب کی بہار دیتی ہیں" اور پھول وتی کو رجنی کی موٹی اور کالی کلائیوں میں آسمانی رنگ کی چوڑیاں کس قدر بھدی معلوم ہو رہی تھیں، چچا کی لڑکی کملا جس کی صورت و شکل کالی چوڑیاں پہنتی تو پھول وتی جل کر کباب ہو جاتی اور جب وہ ہنس کر کہتی "پھول وتی اب کے رانو مائی چوڑی بیچنے آئی تو آٹھ آنہ درجن لوں گی" پھول وتی بھنا کر بولی "پہن لینا منع کون کرتا ہے؟ مگر کالے رنگ کے ساتھ کالی چوڑیاں کیا اچھی معلوم ہوں گی؟" کملا جل گئی تیوری چڑھا کر بولی "تو کون ہے ناک بھوں چڑھانے والی جیسی شکل ایشور نے بنائی ہے، وہی اچھی ہے، روپ پر اترا رہی ہو، دیکھنا کوئی چھین نہ لے۔"

پھول وتی بھاگی ہوئی گھر آئی، طوطا رام ڈنڈا لئے انگنائی میں کھڑا تھا بہن کو دیکھ کر بولا "کیوں ری بڑی پٹاری میں میرے دو پیسے دھرے تھے، کیا ہوئے؟" بھائی کو بگڑا ہوا دیکھ کر پھول وتی تنک کر بولی "میں کیا جانوں؟"

"تو نہیں جانتی، ماتا جی کہہ رہی ہیں، صبح تو ہی اندر گئی تھی، لا میرے پیسے ورنہ ——— ؟"

"ورنہ کیا ہوگا؟" بات کاٹ کر بولی۔

"سر توڑ دوں گا" طوطا اکڑ کر بولا

"میں بھی دیکھوں تو کیسے چھوڑے گا" پھول وتی خم ٹھونک کر کھڑی تھی۔

"میں کہتا ہوں میرے پیسے دیدے، کیوں جھگڑا کرتی ہے" طوطا نے ذرا نرم لہجہ میں کہا۔

"کیوں تیرے لئے میں چور ہوں"

"پکی چور" طوطا نے ڈنڈا گھماتے ہوئے کہا،

"اچھا ٹھہر تو ذرا" پھول وتی نے مضبوطی سے ہاتھ پکڑ لئے۔ ماں دونوں کو جھگڑتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ بوڑھا چاچا حقہ گڑگڑاتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔ طوطا ہارنے والی آسامی نہ تھا، گاؤں بھر میں لڑنے مارنے میں مشہور تھا، لڑکے اس کے ہاتھوں سے نالاں تھے۔ پھول وتی کی کئی مرتبہ چوڑیاں ٹوٹ چکی تھیں۔ آج وہ مارے غصہ کے بوکھلا رہا تھا۔ "دیکھنا ایسا ہاتھ دوں گا کہ یہ کالی کالی چوڑیاں دکھائی بھی نہ دیں گی۔ پھر بیٹھی روئے گی برسوں کو" کہتے ہوئے طوطا نے ایک ڈنڈا دیا چوڑیاں تڑسے ٹوٹیں "ہائے میری چوڑیاں" وہ تلملا کر بولی:

طوطا اپنی فتح پر مسکرا رہا تھا۔ "دیکھا اب ٹھیک ہوا، میں نہ کہتا تھا دیدے میرے پیسے، کیوں فضول جھگڑا کرتی ہے" پھول وتی رو رہی تھی۔ ٹوٹی ہوئی چوڑیاں انگنائی میں پڑی تھیں۔ ایک ٹکڑا کلائی میں چبھ گیا، خون کی دو بوندیں گریں بہن کو روتی ہوئی دیکھ کر طوطا کا سارا غصہ ہرن ہو گیا، ڈرتا ڈرتا پاس آیا۔

"چل دور ہو، راکشس" بپھر کر بولی۔

"جیجی پٹی باندھ دے، رانو مائی آئے گی تو چوڑیاں اور پہن لینا، ایک پیسہ میری جیب میں ہے، دیدوں گا نہیں، اور ایک دھنو کے پاس ہے، ابھی لے کر آتا ہوں ——— !"

پھول وتی جھلا کر بولی "آگ لگے تیرے پیسے کو، ہائے میری چوڑیاں!" کھاٹ پر گر پڑی۔

"جیجی روو مت، چوڑیاں تو اور بھی آجائیں گی، میں اب کبھی نہیں لڑوں گا تم سے" طوطا روتے ہوئے بولا، پھول وتی نے گھور کر دیکھا، روتی ہوئی آنکھیں کہہ رہی تھیں "بھیا تم نے بہت برا کیا۔ میری چوڑیاں نہیں توڑیں، دل توڑ دیا ہے" شریر طوطا چپکے سے نو دو گیارہ ہو گیا۔ پھول وتی چھجے پر کھڑی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی، اُس کی ٹکٹکی ہوئی نظریں رانو مائی کی راہ دیکھ رہی تھیں۔ چوپال سے پرے گھنے درختوں کی چھاؤں تلے رانو مائی ٹوکرا سر پر دھرے لاٹھی ٹیکتی ہوئی نظر آیا کرتی تھی: "شاید آج بھی آ رہی ہو" اس نے سوچا "بھونڈی آواز سے کہے گی "لے لو چوڑیاں" اُس کے کان رانو مائی کی آواز پر لگے ہوئے تھے۔ وہ آتے رانو مائی سے کہے گی "رانو آج طوطا نے سب چوڑیاں توڑ ڈالیں، وہ رانو سے طوطا کی شکایت کرے گی، اور رانو مائی حسب معمول شفقت سے کہے گی "بیٹی چوڑیاں تو ہوتی ہی اس لئے ہیں۔ کنواری کا بھیا توڑ ڈالتا ہے اور بیاہی ہوئی کی میاں کے ہاتھ سے ٹوٹ جاتی ہیں۔ ٹوٹ گئی ہیں تو اور پہن لو، لاؤ میں بیس بیس اور پہنا دوں"

طوطا بڑا شریر لڑکا ہے۔ میری لاٹھی بھی چھین لیتا ہے۔ پیسہ لئے بغیر واپس نہیں دیتا"

پھول وتی کی ہنسی کا چھوٹ گئی۔ اکیلی چھپت پر کھڑی مسکرا رہی تھی۔ طوطا دوڑ کر آیا۔ "بجی بجی، یہ۔ یا چوڑی والا ——— آؤ پہن لو" پھول وتی اچھلتی ہوئی آئی، ایک لڑکا کاندھے پر چوڑیوں کی گٹھری ڈالے کھڑا تھا۔ پھول وتی نے طوطا کو دیکھا "تیجی سوچ کیا۔ ہی ہو ——— لے لونا ——— ؟"

"رانو مائی سے تو لڑا جھگڑا کرکے لیتے ہیں۔ جانے یہ کیسے دیتا ہے؟" وہ بولی۔

"رانو بھی تو ہمارے ہی گھر کی ہے۔ وہی پیسے لگا دینا" چوڑی والا کاروباری لہجہ میں بولا۔

گٹھری زمین پر ڈال دی "یہ فیروزنگ کی ہیں، دو پیسے کی ایک جوڑی، نگینے سچے ہیں۔ اور یہ کالی چوڑیاں اصلی ہیں۔ نقلی مال میں نہیں بیچتا ہوں۔ ابھی شہر میں سے کر آیا ہوں۔ تین پیسے کی جوڑی ہوگی، ایک دام" پھول وتی بغور دیکھ رہی تھی۔ کالی چوڑیوں کو دیکھ کر مسکراہٹ کی ہلکی لہر لبوں پر دوڑ گئی۔ ہاتھ بڑھا کر بولی "پہنا دو چار ———"

چوڑی والا پھول وتی کا ہاتھ پکڑ کر بولا "رانو مائی کہاں بیچے گی، میرے پاس جو مال ہے کسی اور سے نہ ملے گا" پھول وتی کا ہاتھ دبایا۔ چوڑی ہاتھ میں ٹوٹ کر دو ٹکڑے ہو گئی "کچھ فکر نہ کرو۔ ٹوٹی میری ہیں" دوسری پہناتے ہوئے بولا "جانے آج صبح کس کا منہ دیکھا ہے۔ اتنی بکی نہیں، جتنی ٹوٹ گئی ہیں" کھلکھلا کر ہنسا، پھول وتی شرما گئی۔ چوڑی والا کھسیانی ہنسی ہنس رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد چوڑی والا صدا لگاتا ہوا گلیوں میں گم ہو گیا، پھول وتی چوکھٹ پر کھڑی ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کو دیکھ رہی تھی۔ "رانو مائی تو بڑی ہوشیار ہے۔ اُس کے ہاتھ سے کیا مجال جو ایک چوڑی بھی ٹوٹے۔ بیچارے کا ناحق نقصان ہوا" کبھی اُس کے کان کسی مدھم آواز کا تعاقب کرتے "لو چوڑیاں" دل قلابازیاں کھا رہا تھا، کسی کے دبانے سے ہاتھوں میں سنسناہٹ سی دوڑ رہی تھی، اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کسی نے آج ہاتھوں میں بیڑیاں ڈال دی ہیں۔

(۲)

اگلے روز رانو مائی لکڑی ٹیکتی ہوئی آئی "لے لو چوڑیاں" کی آواز لگا رہی تھی۔ پھول وتی کے گھر میں جھانک کر دیکھا "کیوں بیٹی نہیں پہنو گی؟ آج میں نئی چوڑیاں لائی ہوں، ذرا مہنگی ہیں، مگر ہیں بہت اچھی لے لو ———"

"نہیں رانو" پھول وتی بولی "میں نے کل ہی پہنی ہیں" پھول وتی نے چوڑیاں بجاتے ہوئے کہا "دیکھو کیسی اچھی ہیں، تیرے پاس ایسی کہاں ہوں گی"

"ہائے" رانو کا ماتھا ٹھنکا، ناک سکیڑ کر بولی "جہاں جاتی ہوں یہی کہتی ہیں، منہیا گاؤں میں کیا آیا، آگ ہی لگا گیا، سارے گاہک چھین لے گیا۔ کسی نے آج ایک پیسہ کی نہیں لیں" طوطا رانو کو دیکھ کر دوڑ کر آیا۔ لکڑی کھینچتے ہوئے بولا "آج تیری لاٹھی نہیں دوں گا"

"چل ہٹ شریر، ایک پیسہ کی بونی نہیں ہوئی آج، وہ کہیں مل گیا تو ایسی خبر لوں گی بیٹا، چوڑی بیچنا چھوڑ دے گا۔ غضب ہو گیا، کل کا چھوکرا مجھے بھی ٹھگ دیگا۔ کہیں ایسا بھی ہوا ہے دھرتی پر ——— ! ارے طوطا تو نے کیوں نہ اُسے وہیں کیا۔ پھوڑ دی ہوتیں ساری چوڑیاں! بیٹی پھول وتی اُدھار ہی لے لو آج ——— !"

"نہیں رانو اب اور نہیں پہنوں گی" رانو منہیا کی سات پشتوں کو کوستی ہوئی آگے بڑھی۔ آج اُس کی آواز بیٹھی ہوئی تھی۔ پاؤں ڈگمگا رہے تھے "رانو کیا ہوا تمہیں کل ———" ایک بولی۔

"بھول ہو گئی" رانو نے ماتھے کی شکن اُبھار کر کہا، پھر ذرا مسکرا کر بولی "بیٹی اب اگر وہ پھر آئے تو نہ لینا، میں پھول وتی سے بھی کہہ آئی ہوں۔ دو وقت کھانے کو مل جاتی تھیں سو وہ بھی چھین کرے گیا" رانو بڑبڑاتی ہوئی گاؤں سے نکل گئی۔ پھول وتی بڑھیا کو دھیرے دھیرے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ "اب وہ رانو مائی سے چوڑیاں نہیں پہنے گی۔ کیا منہیا پھر بھی آئے گا؟" اُس کا سانس زور سے چل رہا تھا "چوڑیاں کیسی اچھی ہیں" پھول وتی کی آنکھوں کے سامنے منہیا کی صورت پھر گئی۔ "میرا مال اچھا ہے، رانو کے پاس ایسا مال کہاں ہوگا" نگینے میں منہیا کی مسکراتی ہوئی تصویر دیکھ رہی تھی۔

"میرے ہاتھ کس زور سے دبائے تھے اُس نے" ہاتھ سوستے ہوئے۔ ٹوٹی ہوئی چوڑی لے کر بولی "دیکھوں اُسے مجھ سے کتنا پیار ہے؟" دو ٹکڑے کئے، چہرہ پھول کی طرح کھل گیا۔ چھجے پر ایک کوا آ کر بیٹھا، کوے کی کائیں کائیں کسی کی آمد کا شگون تھا "وہ ضرور آئے گا"

"پھول وتی" کملا نے آواز دی۔ پھول وتی مسکراتی ہوئی آئی، کئی مرتبہ اُس نے چاہا کہ دل کی بات کہہ دے مگر بات ہونٹوں پر آکر رک جاتی۔

"آج تو تم بڑی خوش ہو رہی ہو" پھول وتی شرما گئی، چاچا رات کہہ رہا تھا پھول وتی کی سگائی اگلے مہینے ہو جائے گی:

تم تو ایسی ہی باتیں کہتی ہو، تیری سگائی نہ ہو گی کیا ——— ؟"

رجو دونوں کو دیکھ کر گنگناتی ہوئی آئی "اچھے بالم پھر پہنا دے آسمانی چوڑیاں ———" پھول وتی ہنس پڑی، چاچا ماں دھن کو دیکھ کر گھر میں دوڑ گئی۔ آج اُسے نیند نہیں آتی تھی، کسی کی محبت کا رنگین سپنا دیکھ رہی تھی۔

(۳)

دن نکلا، پھول وتی گاگر کو لئے پر دوسرے اشلاقی ہوئی گھر سے نکلی، منہیا دلکش آواز کے ساتھ چوڑیوں کے ہار ہاتھوں میں ڈالے نکڑ سے نکلا، پھول وتی رُک گئی، گھوم کر دیکھا۔

"لو کی آج بھی۔ دیکھو کیسی اچھی لایا ہوں، بہت سستی دوں گا۔"

"پرسوں تو لی تھیں، روز روز کیا چوڑیاں پہنی جاتی ہیں۔"

"چار چار اور پہن لو۔ ایسی اچھی پھر ہاتھ تو نہیں آئیں گی۔"

"مگر پیسے کہاں سے دوں گی۔" پھول وتی مسکرا کر بولی۔

"پیسے پھر دے دینا، اُدھار ہی لے لو۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

"ہونے کو کیا نہیں ہوتا؟"

"نہیں منہیا۔"

"میری طرف سے پہن لو آج۔" منہیا نے گٹھری سے ایک ڈبیہ نکالی، کالی کالی چمکتی ہوئی چوڑیاں کسی کے دل کو موہ رہی تھیں۔

"یہ تو بہت اچھی ہیں سچ مچ۔ پرسوں کیوں نہ دیں تم نے۔"

"میرے پاس ہی کہاں تھیں، آج ہی تو لایا ہوں۔ تمہارے لئے۔"

پھول وتی کی آنکھیں جھک گئیں۔ دل دھڑک رہا تھا۔ کسی کے ہاتھ میں ہاتھ دیدیا۔ دل کی دھڑکن کہہ رہی تھی۔ "یہ تم چوڑیاں نہیں میرے ہاتھ میں محبت کی بیڑیاں ڈال رہے ہو، زنجیروں سے جکڑ رہے ہو۔"

"پھول وتی پیسوں کی فکر نہ کرنا، پھر کبھی دیدینا، تمہاری کلائیوں میں تو ایسی چوڑیاں ہونی چاہئیں۔"

"کیسی" پھول وتی مسکرا کر بولی۔

"جو گاؤں میں کسی اور کے ہاتھوں میں نہ ہوں۔" منہیا نے کہا۔

"پھر کب آؤ گے" وہ بولی۔

"جب تم کہو" پھول وتی خاموش تھی، کنکھیوں سے منہیا کو دیکھ رہی تھی۔ مسکراتے ہوئے، منہیا پھول وتی کا ہاتھ مسوستے ہوئے ہونٹوں تک لے گیا۔ آنکھوں سے دو آنسو گر پڑے۔

"پھول وتی" کانپتی ہوئی زبان سے نکلا۔

طوطا گاتا ہوا آیا، پھول وتی کا ہاتھ چوڑی والا چوم رہا تھا۔

"بھیّی" چلا کر بولا، پھول وتی نے ہاتھ کھینچ لیا۔ منہیا گھبرا کر اٹھا، چلتے ہوئے مڑ مڑ کر دیکھ رہا تھا۔ پھول وتی گاگر ہاتھوں میں لئے کسی کو ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی تھی۔ پانی سے کر پلٹ کر آئی تو طوطا ماں سے کچھ کہہ رہا تھا۔ اور چاچا بلبلا رہا تھا۔

"کیوں ری چڑیل" ماں بولی "یہ چوڑیاں کہاں سے لی ہیں۔"

"ماں دیکھو کیسی اچھی ہیں یہ۔" اصل واقعہ کو نہ سمجھتے ہوئے بولی۔

"پیسے کہاں سے لئے تھے تو نے۔"

"میرے پاس تھے۔" وہ بولی۔

"طوطا کہہ رہا ہے پہنایا تھا وہ ——" ماں رُک گئی۔ آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ "نہیں ماں وہ چوڑیاں پہنا رہا تھا۔" چاچا کھنکارتے ہوئے تیزی سے اٹھا۔ "حرامزادے سے ابھی کہتا ہوں کہ ہمارے گاؤں میں پھر کبھی نہ آئے، کسی پر شک کرنے کا سمے نہیں رہا ——"

طوطا پہلے آگے آگے ڈنڈا گھماتا ہوا جا رہا تھا، چاروں طرف نگاہ دوڑاتے ہوئے وہ رہا چاچا۔ چلا کر بولا۔

منہیا نے چونک کر دیکھا "کیا بات ہے ٹھاکر جی"

"ٹھاکر کے بچے ہمارے گاؤں میں کبھی مت آنا، سر پھوڑ دوں گا، آیا بڑا چوڑی والا۔ نو ماہ بھی گل رہی تھی۔ بٹیا چٹکی بھر راکھ بھی نہیں ملے گی تیرے گھر والوں کو۔ یہ ٹھاکروں کی بستی ہے ٹھاکروں کی ——!"

منہیا تھر تھر کانپ رہا تھا۔ آنکھوں کے آگے پھول وتی ناچ رہی تھی۔ پتھر سے ٹکرا کر گرا۔ چوڑیوں کا ایک ہار چکنا چور ہو گیا۔ اور پھول وتی چاچا اور طوطا کو بگڑتے ہوئے دیکھ کر کانپ رہی تھی۔ دوبارہ پانی بھرنے گئی تو گاگر ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اٹھاتے ہوئے تیزی سے کنوئیں پر آئی۔ رجنی اُس کے ہاتھوں میں چمکتی ہوئی چوڑیاں دیکھ کر بولی "بہت اچھی ہیں یہ ، رانو مائی سے لی ہیں کیا؟" پھول وتی خاموش تھی، چہرے پر افسردگی چھائی ہوئی تھی "بولو گی نہیں کیا؟"

"نہیں تو" اُس نے چونک کر کہا "چوڑی والے سے لی ہیں آج!"

"کے پیسوں کی؟ میں بھی بھیا سے منگاؤں گی"

پھول وتی کیا کہتی،

"ہاں دام بتانے میں کیا حرج ہے"

"مجھے معلوم نہیں"

"مفت ہی دے گیا کیا؟"

"ہاں مفت ہی سمجھو" پھول وتی بھرا کر بولی۔

"ہاں بہن تیرے کو چیز اچھی مل جاتی ہے، کیوں نہ ہو خود بھی تو ——" ہنستے ہوئے، لو بی، پھول وتی بھیگی ہوئی پلکیں جھپک رہی تھیں، گویا وہ کہہ رہی تھی، رجنی تم کیا جانو یہ سودا کتنا مہنگا پڑا ہے۔"

روشنی



ایک نور کا دریا ہے جو سُرمہ کی شکل میں آپ کے سامنے ہے۔ ہزارہا ضعف بصارت کے مریض اس سُرمہ کے استعمال سے اچھے ہوگئے اور انکی روشنی بہت بڑھ گئی۔ آخر یہ نسخہ کسی معمولی حکیم کا نہیں ہے بلکہ طبیب شاہی حکیم حاجی محمد بدرالدین خاں مرحوم کی بیاض خاص سے حاصل کیا گیا ہے۔ نہایت بیش قیمت اجزا سے مرکب ہے۔ ضعف بصارت کے علاوہ موتیابند کو بھی فائدہ پہنچاتا ہے۔ اور اکثر امراض چشم میں مفید ثابت ہوا ہے۔ تجربہ کیجیے +

قیمت فی شیشی ایک روپیہ دو آنے (عہ/)

ترکیب استعمال کا پرچہ ہمراہ ہوگا

مصفی اعلیٰ

خون کی دوا



فساد خون سے پیدا ہونے والی تمام بیماریوں کی اکسیری دوا ہے۔ اس سے بہتر اور زود اثر مصفی خون کوئی دوا نہیں ہو سکتی۔ خون کی خرابی اور غلظت سے خارش یعنی کھجلی۔ داد۔ چمبل۔ چھاجن۔ کیل۔ چھائیں۔ مہاسے۔ پتی۔ گرمی دانے و ہر قسم کے پھوڑے پھنسی وغیرہ امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور خون ہی کی خرابی سے آنکھیں آشوب کر آتی ہیں۔ سوزاک و آتشک بھی خون ہی کے فساد کا نتیجہ ہیں۔ اس لیے ان امراض میں فوراً اس دوا کا استعمال شروع کر دیں۔ اور یہ امراض نہ ہوں تو حفظ ماتقدم کے طور پر دو تین شیشیاں

مصفی اعلیٰ

کی ہر شخص کو سال میں ایک مرتبہ ضرور پی لینی چاہئیں +

ترکیب استعمال کا پرچہ دوا کے ہمراہ ہوگا + قیمت فی شیشی آٹھ آنے (۸/)

روغن زلف دراز



یہ کس ترکیب کا تیل ہے کہ جس نے بیگم کے بالوں کو اتنا بڑھا دیا ہے کہ کمر سے نیچے لٹک رہے ہیں ؟

یہ روغن زلف دراز ہے۔ اس کی تعریف یہی ہے کہ بالوں کو بڑھاتا ہے اور اُن کی جڑوں کو مضبوط کرتا ہے۔

اور جناب ؟ خوشبو دیکھئے۔ کیسی بھینی بھینی ہے گویا آپ کسی چمنستان کی سیر کر رہے ہیں۔

تو بس آج ہی ایک شیشی بیگم کے لیے منگا لیجئے۔ قیمت صرف ایک روپیہ ہے +

ترکیب استعمال: بقدر ضرورت سر میں ڈالکر اتنا ملیں کہ جذب ہو جائے۔

اکسیر خاتون



یہ عجیب و غریب دوا عورتوں کے پوشیدہ امراض کے لیے نہایت کامیاب ثابت ہوئی ہے سیلان الرحم کے لیے بالخصوص تیر بہدف ہے۔ عورتوں کی عام جسمانی صحت بحال کرتی ہے۔ ورم رحم ضعف رحم۔ اسقاط حمل اختناق الرحم اور ایام ماہواری کی بیقاعدگی کو دُور کرتی ہے۔ رحم کی خرابیاں رفع کرنیکے لئے اکسیر صفت ہے۔ تندرست عورتیں بھی استعمال کریں تو شباب کی رعنائی عرصے تک قایم رہتی ہے۔ اور وہ مستعدی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتی ہیں۔ ترکیب استعمال کا پرچہ ہمراہ ہوگا +



قیمت فی شیشی ۱۲/

مشہور دَوَاخانہ۔ دہلی

(۴)

دس روز کے بعد علی الصباح شام گڈھ سے نائی رام دھن کے گھر آیا، کڑھائی چڑھائی گئی، خوب آؤ بھگت ہوئی، پنڈت رام سروپ بھی آ لئے، باتیں مارے بر اجمان تھے "ٹھاکر جی سگائی ہوجانی چاہیئے۔ بڑے ٹھاکر نے مجھے اسی کارن بھیجا ہے" نائی بولا۔

پنڈت جی مسکرائے، توند پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے "بھائی یہاں ڈھیل کس بات کی ہے"

شام کو نائی خوشی خوشی لوٹ گیا، پھول وتی پر ایک بجلی سی گر پڑی، اسی رات کو کچھ سوچ کر گھر سے نکلی، دل کی مجبوری کھینچ کر لیجا رہی تھی۔ درختوں کے جھنڈ کے پاس کچی سڑک تھی، شہر سے گاؤں میں آنے کا یہی ایک راستہ تھا، جو پل سے گزری تو دل میں ایک کھٹکا سا دوڑ گیا، چوڑیاں مدھم آواز سے بج رہی تھیں، پرے سرسے پرکتے بھونک رہے تھے۔ مویشیوں کی گھنٹیوں کی آواز پچھواڑے سے صاف سنائی دے رہی تھی، آج چوڑیاں اسے بار معلوم ہو رہی تھیں، ان کی آواز سے دل سہما جا رہا تھا، اس نے ایک ایک کر کے اتار دیں۔ پلو میں باندھ کر دبے پاؤں آگے بڑھی۔ درختوں کی اوٹ سے چاند کسی نو عروس کی طرح جھانک رہا تھا، چھٹکے ہوئے ستارے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے، پھول وتی لمبے لمبے قدم اٹھاتی ہوئی گاؤں سے نکلی، سڑک کے پاس ایک بڑا پتھر چاندنی میں اس طرح دکھائی دے رہا تھا، جیسے کوئی ٹیک لگائے بیٹھا ہے، چوڑیوں کے ٹکڑے چاندنی میں کندن کی طرح چمک رہے تھے، جانے پھول وتی کے لئے ان میں کیا کشش تھی، ایک ایک ٹکڑا اٹھا کر دیکھا۔ بے اختیار چیخ رہی تھی۔ آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے، روتے روتے ہچکی بندھ گئی۔ کسی نے شانے پر ہاتھ رکھا، پھول وتی چونک پڑی، آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔

"تم ہو" گھبرا کر بولی

"پھول وتی" منہیا نے کہا "تم آج کیسے چلی آئیں"

"میں کیسے آئی، یہ بات بھی پوچھنے کی ہے منہیا"

"میں روزانہ رات کو یہاں آتا ہوں ——!"

"ہائے روز آتے ہو" آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

"ہاں تمہیں دیکھنے کے لئے، مگر" رک گیا، ایک لمحہ کے بعد بولا، گاؤں میں جانے کی ہمت نہیں پڑی، تمہارے چاچا نے دیکھ لیا تو بڑی آفت آئے گی، تمہاری گھر گھر رسوائی ہوگی" منہیا کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

پھول وتی تڑپ کر بولی "منہیا رو کر میرے دل کو نہ تڑپاؤ"

"میری چوڑیاں کیا ہوئیں" منہیا بولا

"تمہاری چوڑیاں میرے دل کے ساتھ ہیں، پھول وتی پلو کی گرہ کھولتے ہوئے بولی" لو انھیں پھر ایک مرتبہ میرے ہاتھوں میں ڈالدو —— !"

سڑک پر ایک بیل گاڑی جا رہی تھی، گاڑی بان بلند آواز سے کسی کے دیوگ کے گیت گا رہا تھا۔

"اب مجھے جانا چاہیئے" پھول وتی نے کہا،

"میں تمہیں نہیں جانے دوں گا"

"نہیں منہیا، چاچا کی ناک کٹ جائیگی، لوگ کہیں گے پھول وتی بھاگ گئی"

"پھول وتی میرا دل نہ توڑو، جگ تو ہنسا ہی کرتا ہے"

"ہمارا تمہارا سنجوگ کیونکر ہو سکتا ہے" پھول وتی بولی۔

"ہو سکتا ہے پھول وتی، جو محبت آج انہیں کھینچ کر یہاں لے آئی ہے ہم دونوں کو ایک ڈوری سے بھی باندھ سکتی ہے"

پھول وتی کے ہونٹوں پر مسرت ناچنے لگی، بانہیں منہیا کے گلے میں ڈالدیں۔

"منہیا ایک عورت محبت کرتے ہوئے یہ نہیں دیکھتی کہ وہ کس سے محبت کر رہی ہے۔ پہلے ہی روز جان گئی تھی کہ تمہاری چوڑیاں میرے ہاتھوں کو نہیں جکڑ رہیں، بلکہ دل کو باندھ رہی ہیں، صبر و قرار کو چھین رہی ہیں"

پھول وتی منہیا کی گود میں گر پڑی —— !

صبح ہوتے ہی یہ بات گاؤں میں ہر ایک کی زبان پر تھی کہ پھول وتی رات کو کہیں غائب ہوگئی —— —— !

محمد امین شہ قیوری



فریبِ عقل

یورپ کا دماغ تو معاشی اور سیاسی تفکرات نے خراب کر دیا ہے۔ لیکن ہندوستان محض نقالی کے شوق میں پاگل ہوا جاتا ہے۔ وہ آزاد ملک ہے، وہاں آقا بستے ہیں۔ اُنہوں نے اگر اپنے تمدنی احوال کی خرابی دور کرنے کے لئے کوئی تدبیر نکالی ہے تو ہم دست و پا بستہ قیدی کیوں اسے نقدیر سمجھ لیں۔ اُن کا جیسا مرض ویسا علاج۔ ہماری بیماری دیسی اور وہ افرنگی۔ اسی جذبۂ تقلید نے تو ہمیں غلامی کی دلدل میں پھنسا رکھا ہے۔ یورپ والے تو اپنی مشکلات کا اصلی سبب آبادی کی کثرت کو سمجھتے ہیں۔ ان کے معاشی نباضوں کے نزدیک اس کا صحیح علاج یہ ہے کہ افزائش نسل کو روکا جائے۔ ہر قسم کی پیداوار بڑھے مگر انسانی کھیتی سرسبز نہ ہو۔ ہم نے اپنے مصائب، اپنی نکبت کا مداوا اس کو کیوں کر سمجھ لیا۔

دراصل غلاموں کی سمجھ بھی غلام ہو جایا کرتی ہے۔ آزاد بننے کی جرأت تو رہتی نہیں، مگر آزاد قوموں کی پیروی ہی کو ایک شان خیال کرنے لگتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ بحث نہیں ہوتی، مغرب کی وہ نمودار قومیں جن کی دولت مندی و خوش حالی، طاقت و جبروت، شان و شوکت، عقل و ہنر نے ہماری آنکھیں چندھیا دی ہیں۔ اور جن پر انعاماتِ الٰہی کی پیہم بارشوں کے مشاہدے نے ہمیں دھوکا دیا ہے کہ یہ خدا کے بڑے ہی مقبول اور چاہتے بندے ہیں۔ اُن کے دل سے تو ذرا پوچھو کہ وہ کس اُلجھن میں مبتلا ہیں۔ اُن کی اندرونی حالت خوردبین لگا کر دیکھو، معلوم ہو جائے گا کہ وہ اپنے انتخاب و اختیار سے کس عذاب میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ وہی دولت کی فراوانی، وہی تجارت کی گرم بازاری۔ وہی سیاسی کامیابی، وہی سائنس کے اعجاز وہی نظامِ معاشرت کی سربلندی جس نے اُنھیں تمام دنیا پر غالب اور غلاموں کا آقا بنایا، آج ایک خطرناک جال بن کر اُن کے گلے کا ہار بن گئی ہے جس کے ہر پھندے میں ہزار در ہزار مصیبتیں ہیں۔ وہ اپنی عقل و تدبیر سے جس پھندے کو کاٹنے کی کوشش کرتے ہیں اُس کا ہر تار کٹ کر ایک نیا پھندا بن جاتا ہے۔

ان تو مغربی ممالک میں توالد و تناسل سے نفرت کا یہ حال ہو گیا ہے کہ وہ اپنی نسل کو اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھ بیٹھے ہیں۔ ضبطِ تولید یا دوسرے الفاظ میں نسل کشی کے نت نئے طریقے جو کبھی دیکھے تھے نہ سنے تھے۔ عام طور پر رائج ہو رہے ہیں۔ حمل ساقط کرنا جو کبھی جرم میں داخل تھا اب ایک معمولی بات ہو گئی ہے۔ گویا وہ عورت جس کے اندر فطرت نے ایک زبردست جذبۂ مادری رکھا تھا، اتنی شقی القلب ہو گئی ہے کہ اپنے پیٹ کی اولاد کو دنیا کی ہوا نہیں کھانے دیتی خواہ اسے اپنی جان کو بھی خطرے میں ڈالنا کیوں نہ پڑے۔ اس ضمن میں مغرب نے قانونِ الٰہی کو ایک کھیل بنا لیا ہے۔ مرد تو پیشگوئی چھوڑ کر دوسری اُلجھنوں میں پڑ گئے۔ لیکن عورتیں ضبطِ تولید کے پیچھے ہی پڑ گئیں۔ کچھ تو اس لئے کہ ان کی وہ صنفی کمزوریاں جو ماں بننے کا لازمہ ہیں، چھپ جائیں اور وہ پورے طور پر مردوں کی برابری کا دعویٰ کر سکیں۔ کچھ اس سبب سے کہ اُن کے غرورِ حسن کو شکست اور جوانی کو زوال نہ ہو، چنانچہ "یہ شوق خود نمائی کیا کچھ جنون سے کم ہے" ضبطِ تولید کے عجیب و غریب طریقے ایجاد ہو گئے۔ فرانس نے تھیلیاں پیش کیں، جرمنی نے مادۂ تولید کو فنا کرنے والی دوائیں نکالیں، اور جب یہ چیزیں نفسانی خواہشات کے مقابلہ میں زیادہ موثر ثابت ہوئیں تو بڑے حسین مجموعوں کی نوبت آئی تاکہ حصولِ تلذذ میں فرق نہ آئے، اور بچہ کشی سے نجات ملے۔ لیکن ہم جن کی نہ کوئی سیاست ہے نہ جن کو خدا سے مقابلہ کی طاقت، بلکہ جنھیں کثرتِ آبادی کی ضرورت ہے جنکی نجات آئندہ نسل پر منحصر ہے، جو اپنی بہتری کے لئے سپوت اولاد کے متمنی ہیں کیوں مغربی سورماؤں کی جدوجہد میں شریک ہوں اور "بے پردہ ہو کر آئیں خلوت سے انجمن میں"۔ وہاں تو اُن کی اپنی حکومتیں ہیں۔ انجمنیں اور جمعیتیں قائم ہو گئی ہیں۔ ہر قسم کی امداد مہیا ہے۔ ہر زحمت کا علاج موجود ہے۔ وہ جو کچھ کر رہے ہیں، اپنے وزن کا صحیح اندازہ کر کے کر رہے ہیں، ہمیں کس خدا نے بتایا ہے کہ مفت میں خودکشی پر آمادہ ہو جائیں۔

خداوندانِ مغرب کی اپنی مشکلات دُور کرنے کے لئے یہ تجویز غلط ہے یا صحیح۔ ہمیں اس سے غرض نہیں وہ جانیں اور اُن کی تدابیر کا انجام۔ لیکن ہم انکی تقلید سے کس مفید نتیجہ کی اُمید رکھتے ہیں۔ ضبطِ تولید کے حامیوں اور نسل کشی کے حمایتیوں کے پاس اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ انسانی تدابیر سے قانونِ الٰہی بدل جائے گا۔ عورت، عورت نہیں رہے گی۔ برتھ کنٹرول اور حمل گرانے کے ہزارہا طریقوں اور دواؤں کے باوجود ہم تو یہ دیکھ رہے ہیں کہ جس روح کو دنیا میں آنا ہے وہ آ کر رہتی ہے، بلکہ قدرت کے خلاف جدوجہد کرنے کی پاداش بھی بھگتنی

پڑتی ہے۔ اکثر ایسی عورتیں ہمیشہ کے لئے بیکار، روگی اور تباہ حال ہو جاتی ہیں۔ بچہ جو پیدا ہوتا ہے اُس کی زندگی بھی والدین کے حق میں ایک مجسم عذاب ہوتی ہے۔ خدا کی نعمتوں کا مذاق اُڑانا اور اس کی طاقتوں کے سامنے اپنی قوتوں کا مظاہرہ کرنا، ہنسی ٹھٹھا نہیں ہے۔ یہیں تو انسان مجبور ہے اور افسوس ہے کہ اسی میں مختار بننا چاہتا ہے۔ کس قدر گرا بڑی ہے۔ کتنا جاہلانہ تمرد ہے ؎

اس جبر پر تو ذوقِ بشر کا یہ حال ہے
کیا جانے کیا کرے جو خدا اختیار دے

ایک مشہور معزز شخص کا ذکر سنئے۔ نام نہ پوچھئے۔ آپ ڈاکٹر بھی ہیں بمبئی یا کلکتہ کے سین یا کپاڈیا جیسے بلکہ انصاری اور جوشی کے مقابلہ کے۔ مطب بھی نہایت کامیاب ہے۔ آپ کی شادی بھی اتفاق سے آپ ہی جیسی ایک قابلہ سے ہوئی تھی۔ دونوں جوان۔ دونوں حسین اور خوش نصیبی کہو یا بدقسمتی دونوں مغرب پرست یورپ زدہ۔ جانبین کی محبت کا نتیجہ نکلنا تھا نکلا۔ ڈاکٹرنی صاحبہ حاملہ ہوگئیں۔ صلاح ٹھیری کہ اس بوجھ سے ہلکا ہو جانا چاہئے۔ خدا نے اپنی ڈوری ڈھیلی چھوڑ دی اور یہ اپنی تدبیر میں کامیاب ہوگئے۔ آئندہ اس مصیبت سے بچنے کے لئے ضبطِ تولید کا انتظام شروع کیا۔ دو سال گزر گئے۔ اور اب یہ سمجھ لیا گیا کہ بچہ پیدا کرنا یا نہ کرنا انسان کے اختیار میں ہے۔ لیکن تیسرے سال باوجود انتہائی کوششوں کے پھر حمل رہ گیا۔ پھر مشیت کو حکمت سے دبانا چاہا۔ پچھلے نسخوں سے کام لیا۔ کچھ نہ ہوا تو اور آگے بڑھے۔ تیز دوائیں استعمال کیں۔ وہ بھی بیکار ثابت ہوئیں تو طرح طرح کے زہریلے مرکبات آزمائے۔ بھاری بھاری بوجھ اُٹھائے۔ چھلانگیں ماریں۔ کودیں۔ اُچھلیں۔ ساری ڈاکٹری ختم کی۔ ہزاروں جتن کئے مگر خدا کی طرف سے ان گستاخانہ اعمال کی سزا تجویز ہو چکی تھی۔ نو مہینے بعد بچہ پیدا ہوا۔ مگر کس طرح؟ ایک ہفتہ کامل ڈاکٹر صاحب کو کھانا پینا حرام ہو گیا۔ بیوی کی پٹی سے لگے بیٹھے رہے۔ بچہ کیسا پیدا ہوا؟ خیالی عیش کی لعنت۔ پیلا پیلا۔ بدن پر سیاہ داغ۔ ایک آنکھ سے کانا۔ ناک چپٹی موٹی۔ ٹھوڑی غائب۔ عجائب المخلوقات کی قسم کا۔ لیکن جیتا جاگتا۔

ادھر کی تو یہ ہوئی۔ اب ادھر ڈاکٹر صاحب کی سنئے۔ جب اُنہوں نے دیکھا کہ ضبطِ تولید مباشرت کے بعد اکثر ناکامیاب رہتا ہے اور استقرارِ حمل پر بھی انسان کا پورا قابو نہیں تو اُنھوں نے اپنا مادۂ تولید تباہ کرنا شروع کیا۔ بیسیوں جراثیم کش مرکب بنائے اور استعمال کئے یہاں تک کہ ایک عطائی تیر بہدف دوا سے اپنی قوتِ رجولیت ہی سے ہاتھ دھو بیٹھے اور عمر بھر کیلئے بیکار ہو گئے۔ قدرت کے ساتھ نبرد آزمائی کا نتیجہ یہ نکلا۔ اب ایک طرف تو ڈاکٹرنی صاحبہ امراض کا مجموعہ بنی ہوئی ہیں۔ حُسن کی بگڑی ہوئی تصویر۔ جوانی کا خاکہ۔ نامرادیوں کی باؤلی ہنڈیا۔ دوسری طرف بچہ عجیب الخلقت۔ نہالِ محبت کا سڑا ہوا ثمر۔ زندہ عذاب۔ ڈاکٹر صاحب ہیں تو وہ بایں ہمہ شان و شوکت۔ صرف دکھیت کے مردہ رہ گئے۔ گھر کا گھر مبتلائے آلام اور زندگی کے ولولوں سے محروم ہو گیا۔

یہ ہے اندھی تقلید کا انجام اور اس کو کہتے ہیں قدرت کا انتقام۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کی حدود توڑنے والے کبھی عذاب سے بچ نہیں سکتے۔ خدا سے مقابلہ کرنا اور اس کی نعمتوں کو ٹھکرانا اپنے مٹنے کی راہ نکالنی ہے۔ خدا کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ یہ کار خود اپنے اوپر ظلم کرتا ہے۔ خدا کسی کو نعمت دے کر اس سے کبھی نہیں چھینتا۔ ظالم خود اپنی نعمت کا دشمن ہو جاتا ہے۔ پھر بھی خدا کی طرف سے مواخذہ کرنے میں جلدی نہیں ہوتی۔ وہ ڈھیل دیتا ہے اور تنبیہیں کرتا رہتا ہے۔ لیکن یہ ڈھیل بھی جب اُنھیں راہِ راست پر نہیں لا سکتی تو عذاب کا حکم ہو جاتا ہے۔ اور پھر کوئی قوت اُس کو نہیں بچا سکتی۔

ڈاکٹر صاحب جیسے ہزاروں فیشن کے دلدادہ اور لطفِ زندگی کے جھوٹے دعویدار اس عذاب میں مبتلا ہیں۔ جو نہ دین کے کار آمد فرد بننے کے قابل رہتے ہیں۔ نہ دنیا کے۔ ضبطِ تولید اور نسل کشی کے تقلیدی شوق نے اُنھیں خدا کا مجرم اور سوسائٹی کا چور بنا دیا ہے۔

اشرف صبوحی دہلوی (منشی فاضل)



غزل

دیدہ و دانستہ اب اغماض فرمانے سے کیا
میری صورت دیکھ لیجے میرے افسانے سے کیا

پھر بتوں میں دیکھتا ہوں اک تجلّی کی نمود
پھر کوئی کعبہ نکل آئے گا مے خانے سے کیا

مسکرا اٹھتی ہے فوراً کائناتِ بے خودی
ملتے ہی دیوانہ کہہ دیتا ہے دیوانے سے کیا

سر پہ کیوں منڈلا رہی ہیں نور کی سی بدلیاں
آ رہی ہے بادۂ سرجوش پیمانے سے کیا

محوِ ذوقِ بے خودی ہے تار تارِ پیرہن
اور ہو سکتی ہے ہمت ایک دیوانے سے کیا

لٹ چکی دنیائے دل برباد بستی ہو چکی
ناصحِ مشفق بھلا اب مجھکو سمجھانے سے کیا

کچھ پرِ پروانہ ہیں اور ایک افسردہ چراغ
شامِ فرقت کو ملے گا میرے غمخانے سے کیا

ضبط کی تلقین کی یا دے گئی دادِ وفا
کہہ گئی خاموش ہو کر شمع پروانے سے کیا

کہہ رہے ہیں دیکھنے والے دلِ برباد کے
کوئی آبادی بھی بڑھ جاتی ہے ویرانے سے کیا

سن رہے ہیں سننے والے اور میں خاموش ہوں
اڑ رہا ہے رنگِ حسرت میرے افسانے سے کیا

عشرتِ ماضی کے قصے بھول جانے دے مجھے
ہم نفس ان تذکروں کو آج دہرانے سے کیا

اک خلش سی آج بھی پہلو میں باقی ہے امینؔ
کچھ تو تھا مفہومِ دل کا دل کے بہٹ جانے سے کیا

امین سلونوی لکھنؤ

دامنِ گل چیں

مغرب میں آجکل تہذیبِ جدید کیسی کیسی گل افشانیاں کر رہی ہے؟ اس کا اندازہ مندرجہ ذیل واقعہ سے ہو سکتا ہے۔

"ورلڈ نیوز" میں ایک خبر شائع ہوئی ہے کہ نیویارک کی ایک "ملکۂ حُسن" نے اپنے شوہر کے خلاف چیف پریسیڈنسی مجسٹریٹ کے اجلاس میں "ازالۂ حسن" کا دعویٰ پیش کیا ہے۔ مستغیثہ کا بیان ہے کہ شادی سے پہلے میں حسن و جمال کی ایک دلکش تصویر تھی۔ دُور دُور کے آدمی میری زیارت کے لئے آیا کرتے تھے۔ جو مجھے ایک نظر دیکھ لیتا اُس کا دل باغ باغ ہو جایا کرتا تھا۔ ہزاروں ڈیلروں نے بڑی بڑی قیمتیں خرچ کرکے میری تصویر حاصل کی۔ اور بہت سی فلم کمپنیوں نے لاتعداد نذرانے پیش کیا۔ لیکن آج میری صحت خطرے میں ہے۔ میری رعنائیاں اور امنگیں ختم ہو چکی ہیں۔ اب میرا چہرہ افسردہ سا رہتا ہے۔ اس غمگینی اور اداسی کا سبب یہ ہے کہ میرا شوہر "دُور اندیش" نہیں ہے۔ اُس نے شادی کے وقت وعدہ کیا تھا کہ میں "برتھ کنٹرول" پر عمل کروں گا۔ لیکن افسوس، میں ماں ہو گئی اور بچے کے پیدا ہونے کی وجہ سے میری خوبصورتی کو نقصان پہونچا۔ لہٰذا درخواست ہے کہ میرے شوہر کے لئے مناسب حکم دیا جائے۔"

دیکھئے "ناعاقبت اندیش" شوہر کے لئے کیا "مناسب حکم" صادر ہوتا ہے۔

اس جنگ یورپ کے "وحشت آفریں" زمانے میں "اضافۂ حُسن" اور "اعادۂ شباب" کے لئے کیسی کیسی "روح پرور" کوششیں کی جا رہی ہیں؟ اس کا اندازہ مندرجہ ذیل خبر سے کیجئے۔

"بوڈاپسٹ" کی ایک ہیڈ مسٹریس کے متعلق خبر شائع ہوئی ہے کہ اُسے "دلکش" اور "نوجوان" بننے کا بیحد شوق ہے۔ اس آرزو اور تمنا کو آغوش میں لیتے ہوئے اُس نے چار چار دن تک مسلسل فاقے کئے اور پھر "روغنِ زیتون" کی بریانی نوش فرمائی۔ جب اس سے فائدہ حاصل نہ ہوا تو کئی مہینے تک رات کر رہنے کر کے استراحت ہوئیں۔ جب یہ "تیر بہدف" نسخہ بھی کامیاب ثابت نہ ہوا تو ایک میل تک روزانہ بھاگنا شروع کیا۔ اسی عرصہ میں کسی کمبخت نے یہ کہہ دیا کہ "دلکش بننے اور "جوانی" حاصل کرنے کے لئے بلّی کا گوشت مفید ہے۔ اس "مژدۂ جانفزا" کو سُنتے ہی ہیڈ مسٹریس صاحبہ نے کئی درجن بلّیاں ہضم کر لیں۔ اس "گربہ خوری" کا اثر یہ ہوا کہ آنتوں میں خرابی پیدا ہو گئی اور دِق کے آثار ظاہر ہوئے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ آجکل یہ "محترمہ" سٹی ہسپتال میں "اعادۂ شباب" کے خواب دیکھ رہی ہیں۔ ع

اللہ کرے جوشِ جنوں اور زیادہ

یادش بخیر۔ گھاسی خاں صاحب تبسم آصف پور ضلع اناؤ کے ایک "زندہ دل" اور "سنسنی خیز" شاعر ہیں۔ آپ اپنے ایک "مکتوب گرامی" میں لکھتے ہیں۔

جنابِ عالی! سلامت باشد۔ بعد دعائے بسیار و پُرشوق گفتار کے واضح ہو کہ یہ حقیر فقیر نیازمند اس علاقے کا ایک "پُرجوش شاعر" ہے۔ ایک ہفتے میں کم از کم ستر اشعار "صبا رفتار" لکھتا ہے جن کو سب خورد و کلاں پسند کرتے ہیں۔ آپکو بھی یہ ضرور پسند ہوں گے۔ آج چند "دلپذیر" اشعار لکھے ہیں وہ آپ کو "ارسالِ خدمت" کرتا ہوں۔ افسوس ہے کہ "اس سعی حسنہ" کے باوجود اس طرف کے خورد و کلاں نے اب تک اس نیازمند کو کوئی خطاب نہیں پیش کیا۔ اُمید ہے آپ اس کلام کو "شمع" میں درج فرما کر ضرور اجر و ثواب حاصل کریں گے۔ (نیازمند گھاسی خاں تبسم)

اب ان "صبا رفتار" شاعر صاحب کا "کلامِ معجز نظام" بھی سُن لیجئے یہ شاعرِ "بیدل" اپنی محبوبہ کے ظلم و ستم سے تنگ آکر ارشاد فرماتے ہیں۔

رنگی ٹوپی لے لی اور کالی اچکن لے گئی — یوں چمن لٹتا رہا اور باغباں دیکھا کئے

ماشاء اللہ کیا دردناک شعر ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اس شعر کے لکھتے وقت آصف پور کے رنج و غم کے بادل چھا رہے ہوں گے۔ دوسرا شعر ملاحظہ ہو:۔

دل پہ قبضہ کرکے اُس نے ساری دولت چھین لی — اس طرح آنکھوں سے لٹتے آشیاں دیکھا کئے

زندہ باد۔ اللہ آپ کو جلد فردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ تیسرے شعر میں یہ "افسانۂ غم" ہے:۔

گھر سے ٹھوکر مار کر جس دن نکالا شوخ نے — دُور تک مُڑ مُڑ کے سوئے آسماں دیکھا کئے

سبحان اللہ۔ پروردگار آپ کا حشر ہٹلر کے ساتھ کرے۔ اور آصف پور والوں کو "صبرِ جمیل" عطا فرمائے۔

مُدیر

امریکہ کے نشہ باز مجرم

یوں تو منشیات اور زہریلی ادویات کو دُنیا کے ہر حصے میں کچھ لوگ محرک اور مسکن دوا کے طور پر استعمال کرنے کے عادی ہیں جن کے مضر اثرات جلد یا بدیر اُن کی صحت اور دماغی توازن پر نمایاں اثرات ڈالتے ہیں، اور ان کے اُن نقصانات سے بچانے کے لئے موجودہ زمانے کی ہر حکومت اپنے اپنے حلقۂ اثر میں اُن کی روک تھام کی کوشش میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کر رہی ہے لیکن اسی خیال کو مدنظر رکھکر لیگ آف نیشنز کے ماتحت دنیا کے بہت سے ممالک کے نمائندوں کی ایک کمیٹی منشیات اور زہریلی ادویات کے عام استعمال کو روکنے کے ذرائع پر برابر غور کرتی رہتی ہے۔ اور وقتاً فوقتاً اس سلسلہ میں مختلف ہدایات جاری کرتی رہتی ہے۔ انسانوں کو اس بڑھتی ہوئی وبا سے نجات دلانے کے سلسلہ میں جو اقدامات مختلف حکومتیں کر رہی ہیں وہ یہ ہیں کہ منشیات اور زہریلی ادویات کی پیداوار اور درآمد برآمد پر نہایت سختی سے پابندیاں عائد کر دی گئی ہیں، اور اُن کی ایک قلیل مقدار کو صرف ادویات کے طور پر استعمال کرنے کے لئے لائسنس کے ذریعہ سند یافتہ ڈاکٹروں کو استعمال کرنے کی اجازت ہے۔ اُن افراد کو جو ان قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور جو ان انسانیت سوز اور صحت انسانی کے لئے سم قاتل اشیاء کے ذریعہ ناجائز طور پر روپیہ کمانے کی کوشش کرتے ہیں سخت سے سخت سزائیں دی جاتی ہیں۔ پھر بھی بہت سے انسان نما شیطان روپیہ کے لالچ میں اندھے بن کر دوسروں کی صحت اور زندگیوں سے بے پروا اور قانونی نتائج سے بے خوف ہو کر اس تجارت سے باز نہیں آتے اور لاکھوں انسانوں کی تباہی اور بربادی کا باعث بن کر آخر کار کسی نہ کسی روز لمبی میعاد کیلئے سرکاری مہمان خانہ میں بھیج دئے جاتے ہیں۔

منشیات میں شراب ایک بہت پرانی اور مشہور چیز ہے۔ جسے اکثر مذاہب نے اس کے بُرے اثرات کی وجہ سے اس کا استعمال منع کیا ہے۔ اور مذہب اسلام نے اُس کو ام الخبائث قرار دیا ہے، یعنی کل برائیوں کی جڑ لیکن افسوس ہے کہ موجودہ تہذیب کے دور میں اس کا استعمال نئی تہذیب اور فیشن کے لوازمات میں داخل ہو گیا ہے۔ اُس میں وقتی طور پر خون کی حرکت کو تیز کرنے کی خاصیت ہے گو بعد میں خون کی حرارت اپنی اصلی حالت سے بھی کم ہو جاتی ہے۔ ٹھنڈے ممالک میں مصنوعی حرارت پیدا کرنے کے لئے اس کو استعمال کیا جاتا ہے۔ نیز عیاشی اور بدچلنی کے پیش خیمہ کے طور پر بھی استعمال ہوتی ہے جو لوگ اسے استعمال کرتے ہیں وہ بھی اُسے بہت اچھا نہیں سمجھتے جس کا ثبوت یہ ہے کہ جو اس کے پینے کے عادی ہیں وہ بھی اپنے آپ کو شرابی سننا برداشت نہیں کرتے اس میں اعتدال یا مقدار کا معیار قائم رکھنا ناممکن ہے اس کا استعمال یقینی طور پر صحت پر بُرا اثر ڈالتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں جو دنیا میں بہترین تہذیب یافتہ اور ترقی یافتہ ملک قرار دیا جاتا ہے۔

کچھ عرصہ گذرا وہاں کی حکومت نے شراب کو اخلاق انسانی اور صحت انسانی کو خراب کرنے والا قرار دے کر شراب کی کشید، درآمد، برآمد، فروخت، استعمال اور قبضہ میں رکھنا قانوناً جرم قرار دیدیا تھا۔ اور اس قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سخت سے سخت سزائیں دی گئی تھیں۔ لیکن امریکہ کے پرانے رندانِ مے آشام کو بھلا یہ قانون کب اچھا معلوم ہو سکتا تھا، اُنھوں نے اپنی پیاس بجھانے کے اور سامان پیدا کر لئے۔ پرانے گنہگاروں نے خراب سے خراب شراب ہی پر روزہ کھولنا شروع کر دیا۔ دیگر متمدن ممالک نے وہاں شراب خفیہ طور پر بھیجنی شروع کر دی۔ حکومت نے اپنا سا مقابلہ کرنے میں کسر اُٹھا نہ رکھی۔ لیکن آخر کار یہ دیکھکر کہ لوگ پینے سے باز نہیں آتے اور آتے بھی کیسے جبکہ صدیوں سے شراب اُنکی گھٹی میں پڑ چکی تھی۔ مجبوراً حکومت نے شراب کی بندش کے تمام قوانین کو منسوخ کر دیا اور پھر وہاں شراب کے جام پر جام بے خوف و خطر چلنے لگے۔ ایشیائی ممالک میں افیون۔ چرس۔ مدک۔ گانجہ۔ سُلفہ۔ بھنگ۔ پوست۔ اور دیگر زہریلی ادویات کا استعمال صدیوں سے جاری ہے۔ ان سب میں جو بین الاقوامی شہرت۔ بی جنیا بیگم۔ یعنی افیون کو حاصل ہے۔ اس کے آگے سب مات ہیں۔ چینی و ایرانی خاص طور پر اور بعض ہندوستانی اس کی عادت میں مبتلا ہیں۔ باوجود اس امر کے کہ چین دنیا میں سب سے زیادہ مقدار میں افیون پیدا کرتا تھا۔ پھر بھی وہاں کی مانگ پوری کرنے کے لئے انگریز ہندوستان سے افیون لے جا کر مہنگے داموں سے بیچ کر عرصہ تک روپیہ پیدا کرتے رہے چینی قوم چونکہ جفاکش اور محنتی تھی اسلئے اس کے من چلے افراد روٹی کمانے کے سلسلے میں دیگر ممالک میں کافی تعداد میں

پہنچے اور امریکہ میں تو وہ اس کثرت سے گئے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے ہر بڑے شہر میں اُن کی نوآبادی بن گئی اور یہ سلسلہ سنہ ۱۹۲۰ء تک جاری رہا جبکہ حکومت نے مجبور ہو کر نئے چینیوں کا داخلہ قانوناً بند کر دیا۔ لیکن جو چینی اس قانون کے پاس ہونے سے پہلے وہاں موجود تھے۔ اُن کو وہاں رہنے کی اجازت مل گئی۔ چینیوں کی گھٹی میں افیون تھی اور افیون کے استعمال کی عادت اُن کے دم کے ساتھ تھی۔ جب یہ امریکہ پہنچے تو اُنھوں نے ساتھ ساتھ خفیہ طور پر اپنی ضرورت پوری کرنے کے لئے افیون منگانے کا انتظام بھی کیا، اور یہ سلسلہ چلتا رہا۔ چینیوں سے میل جول رکھنے کی وجہ سے سفید فام لوگوں نے پہلے شوقیہ دل لگی کے طور پر افیون پائپ میں پی۔ کچھ چینیوں نے مالی منفعت کے خیال سے اُن کو چاٹ پر لگایا۔ یہاں تک کہ اُن میں سے بد اطوار اور بدمعاش طبقہ میں اسی کا مستقل رواج ہو گیا۔ اور گو چین کی موجودہ حکومت نے افیون کی کاشت اور خرید و فروخت اور استعمال کی سزا موت مقرر کر کے افیون کے استعمال کو چین سے ایک قلم موقوف کر دیا۔ لیکن وہ چینی جو عرصہ سے دیگر ممالک میں آباد ہیں اُن میں افیون کا استعمال اب بھی برابر جاری ہے اور یہ واقعہ ہے کہ دنیا میں منشیات کی تجارت کے سب سے بڑے بیوپاری اب بھی چینی ہیں۔ کیونکہ صدیوں سے وہ اس کام کو کر رہے ہیں۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے سفید فام باشندے جو نسبتاً نفیس الطبع واقع ہوئے ہیں اُنھوں نے افیون کو اصلی حالت میں استعمال کرنے کے علاوہ افیون کے ست۔ مارفیا کے انجکشن لے کر کیف حاصل کرنا شروع کیا۔ مارفیا سے بھی تیز ایک دوسرا افیون کا جوہر ہیروئین بھی استعمال ہونے لگا۔ کوکین بھی استعمال کی جانے لگی۔ نیز ایک دوسری زہریلی دوا لاڈنم بھی استعمال میں آنے لگی۔ جنھوں نے جرائم پیشہ طبقہ پر خاص طور پر اور اُن کے علاوہ دیگر افراد پر آج پوری پوری گرفت حاصل کر لی ہے۔ منشیات اور زہریلی ادویات کا کثرت سے استعمال ہی امریکہ میں بہت سے خوفناک اور سفاکانہ جرائم کا سبب بنا ہوا ہے۔ جس کے ثبوت میں کیلیفورنیا ریاست کے سب سے بڑے جیل خانے "سان کیونٹن" کے ڈاکٹر لیو لیو نی ڈاس سٹینلے ایم۔ ڈی کے ایک مضمون سے اقتباس پیش کرتا ہوں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امریکہ میں دلیرانہ و سفاکانہ جرائم کا منشیات اور زہریلی ادویات سے کس قدر گہرا تعلق ہے۔ ڈاکٹر موصوف کا بیان ہے کہ جو لوگ افیون اور افیون کے ست مارفیا کے استعمال کے پرانے عادی ہو جاتے ہیں اُن کو شراب سے نفرت ہو جاتی ہے۔ نیز قوتِ شہوانی بالکل معدوم ہو جاتی ہے اور وہ اپنے مشاہدے کی بنا پر بیان کرتے ہیں کہ اس حیثیت میں کبھی کوئی مارفیا کا عادی شخص شہوانی جرائم کے سلسلے میں قید ہو کر نہیں آیا۔ جب یہ مارفیا استعمال کرنے کی عادت راسخ ہو جاتی ہے تو وہ اس کا غلام ہو جاتا ہے

اور طلب پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اگر یہ زہریلی ادویات اس کو وقت پر نہ ملیں تو اسکا دماغی توازن خراب ہو جاتا ہے۔ اور اس کے دل و دماغ کے سامنے صرف ایک خیال ہوتا ہے جو رہ رہ کر اس کو پریشان کرتا ہے کہ کسی قیمت پر بھی طلب پوری کی جائے اور وہ روحانی اور جسمانی تکلیف دور کی جائے جو ادویات کے نہ ملنے کی وجہ سے اس پر طاری ہوتی ہے۔ اس طلب کے اثر کی وجہ سے دنیا کی ہر چیز کا خوف خطر اور نتائج کا خیال اس کے دل سے زائل ہو جاتا ہے۔ اور وہ ان زہریلی ادویات کو حاصل کر کے طلب مٹانے کی غرض سے نڈر ہو کر دلیرانہ طور پر قتل و غارتگری اور بدترین جرائم کے ارتکاب کے لئے بغیر سوچے سمجھے تیار ہو جاتا ہے۔ چنانچہ زہریلی ادویات کے عادی مجرموں سے گفتگو کرنے اور اُن کے واقعات معلوم کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب موصوف کی یہ رائے ہے کہ ان مجرموں کے بدترین جرائم کرنے کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں تھی کہ اُن جرائم کے ذریعہ حاصل کردہ روپیہ سے زہریلی ادویات کی طلب پوری کر سکیں۔ ان زہریلی ادویات کے عادی اشخاص میں ایک چیز نمایاں نظر آتی ہے اور وہ یہ کہ وہ متواضع ہوتے ہیں۔ اور اگر کوئی دوسرا عادی شخص خواہ وہ کسی حیثیت اور درجہ کا ہو ان کو مل جائے تو وہ فراخ دلی اور خندہ پیشانی کے ساتھ بلا معاوضہ اس کو منشیات کے استعمال میں شریک کر لیتے ہیں۔ اُن میں رتبہ اور مرتبہ کا کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ نیز وہ اپنے علاقہ کے سب عادی اشخاص کو جانتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب موصوف بیان کرتے ہیں کہ ان ادویات کے عادی مجرموں کے لئے یہی کافی نہیں ہوتا کہ اُن کو جیل میں بھیج دیا جائے۔ کیونکہ ناجائز طور پر ان ادویات کو حاصل کرنے کے ذرائع وہ وہاں بھی پیدا کر لیتے ہیں، اور جن کو ادویات جیل میں بہم نہیں پہنچتیں اُن کی صحت اور حالت خراب ہو جاتی ہے اور وہ ناقابل برداشت جسمانی تکلیف محسوس کرتے ہیں۔ نیز یہ کہ اگر عادی اشخاص کو یونہی حالت ہی پر چھوڑ دیا جائے تو وہ جیل سے باہر آنے کے بعد پھر اپنی طلب پورا کرنے کے لئے جرائم کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں، اس لئے حکومت نے یہ انتظام کیا ہے کہ زہریلی ادویات کے عادی مجرموں کو جیل ہسپتال میں داخل کر کے اُن کا وہاں باقاعدہ علاج کیا جاتا ہے۔ پہلے تو اس کا رجسٹر میں نام درج کیا جاتا ہے اور اس کی تصویر لی جاتی ہے۔ اور اس کے بعد وہ علاج کی غرض سے جیل کے ڈاکٹری عملے کے سپرد کر دیا جاتا ہے، اور چونکہ اس کو اس کی طلب بجھانے کے لئے زہریلی دوا میسر نہیں ہوتی۔ اس لئے اس کا دماغی توازن ٹھیک نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر اس سے پوچھتے ہیں کہ وہ کتنی مقدار میں اور کس طریقے سے اُس کے استعمال کرنے کا عادی ہے، اور اُس کے بعد اُس کو وہ دوا مہیا کر دی جاتی ہے

اور خواہش پوری ہو جانے کے بعد اُس کی طبیعت اور دماغی حالت کسی قدر درست ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد اس سے اس کی حالت عادات اور اس کے جرائم سے تعلق کی بابت تفصیلی حالات پوچھے جاتے ہیں اور اس کے ہر جواب کو صحت کے ساتھ تحریر کرلیا جاتا ہے اور بعد میں دوسرے عادی افراد کے بیانات سے تقابل کرکے اس بڑھتی ہوئی خوفناک وبا کی بابت پوری پوری واقفیت پیدا کی جاتی ہے۔ تاکہ اس کی روک تھام کرنے کے ذرائع پیدا کئے جاسکیں۔

سب سے پہلا جو سوال کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اُس نے کس عمر میں زہریلی دوا کا استعمال شروع کیا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف بیان کرتے ہیں کہ تجربۃً ساٹھ آدمیوں کے حالات کا تقابل کیا تو معلوم ہوا کہ اُن میں سے ایک نے آٹھ سال کی عمر میں شروع کیا، ایک نے تیرہ سال کی عمر میں۔ ایک نے چودہ سال کی عمر میں اور دو نے پندرہ سال کی عمر میں۔ سات نے سولہ سال کی عمر میں۔ دو نے سترہ سال کی عمر میں۔ چھ نے اٹھارہ سال کی عمر میں۔ سات نے انیس سال کی عمر میں۔ دو نے بیس سال کی عمر میں۔ چوبیس اشخاص نے پندرہ اور اکیس سال کی عمر کے درمیان اس کا استعمال شروع کیا جس کے معنی یہ ہیں کہ نصف تعداد یعنی پچاس فیصدی یہ عادت جوان ہونے سے پہلے راسخ ہو چکی تھی اور وہ یہ عمر ہے جس میں بُرے اثرات قبول کرنے کی قابلیت زیادہ ہوتی ہے۔

دوسرا سوال جو کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ شروع میں اُس نے کس طریقہ سے اس کا استعمال شروع کیا تھا۔ چنانچہ مذکورہ ساٹھ افراد میں چھتیس نے شروع میں افیون پائپ کے ذریعہ پی۔ بارہ افراد نے مارفین کو انجکشن کے ذریعے شروع کیا۔ پانچ افراد نے اُس کو منہ کے ذریعے کھایا۔ تین نے "ین شی" یعنی افیون کی راکھ کھانی شروع کی۔ باقی چار افراد نے شروع میں کوکین پوڈرم اور افیون کو کھانا شروع کیا تھا۔ چنانچہ اس سے یہ ثابت ہوا کہ بیشتر حصہ افراد نے شروع میں افیون کو پائپ کے ذریعہ پیا۔ تیسرا سوال یہ کیا جاتا ہے کہ اب وہ کس طریقہ سے دوا کو استعمال کرنے کا عادی ہے۔ چنانچہ جو جوابات مذکورہ ساٹھ افراد نے دئے اس سے نتیجہ نکلا کہ اُن میں سے اٹھائیس انجکشن کے ذریعہ مارفین استعمال کرتے ہیں۔ آٹھ افراد مارفین منہ کے ذریعہ کھاتے تھے۔ سترہ مارفین اور کوکین استعمال کرتے تھے اور کچھ ہیروئین اور لاڈنم استعمال کرتے تھے۔ اس تحقیقات سے یہ نتیجہ نکلا کہ گو شروع میں بیشتر افراد نے افیون کو پائپ کے ذریعے پینے کی ابتدا کی۔ لیکن آخر میں وہ مارفین کو انجکشن کے ذریعہ استعمال کرنے لگے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف بیان کرتے ہیں کہ مذکورہ ساٹھ افراد میں سے سب کی صحیح روزانہ استعمال کی مقدار کا اُن کے بیانات سے اندازہ لگانا مشکل تھا کیونکہ اُنمیں سے بہت سے یہ اندازہ نہیں رکھتے تھے کہ وہ روزانہ کس مقدار میں مارفین استعمال کرتے ہیں۔ دوسروں کی یہ حالت تھی کہ اُن کو جس قدر ایک وقت مل سکتی تھی وہ استعمال کرلیتے تھے۔ دس افراد نے یہ تسلیم کیا کہ وہ روزانہ پانچ گرین سے کم استعمال کرتے ہیں۔ اٹھارہ اشخاص نے بیان کیا کہ وہ روزانہ پانچ سے دس گرین تک استعمال کرتے ہیں۔ بیس افراد نے اقرار کیا کہ وہ بیس گرین روزانہ استعمال کرنے کے عادی ہیں۔ تین نے اقرار کیا کہ وہ بیس سے تیس گرین روزانہ استعمال کرنے کے عادی ہیں۔ تین نے اقرار کیا کہ وہ روزانہ تیس سے چالیس گرین تک استعمال کرنے کے عادی ہیں۔ اور تین اشخاص نے اقرار کیا کہ جب مل جاتی ہے تو وہ ساٹھ گرین تک روزانہ استعمال کرنے کے عادی ہیں۔ اور جب یہ خیال میں رکھا جائے کہ ایک آدمی کو طبی طور پر چوتھائی گرین مارفین کی خوراک کرائی جاسکتی ہے، تو اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح رفتہ رفتہ انسان زیادہ سے زیادہ مقدار میں زہریلی ادویات استعمال کرنے کا عادی بن جاتا ہے۔

جن حضرات نے "مشہور" بطور نمونہ طلب فرمایا ہے یا دفتر بعض احباب کو از خود رسالہ بھیج رہا ہے، اور متواتر کئی پرچے موصول بھی ہو چکے ہوں تو اُن کا **اخلاقی فرض ہے کہ سالانہ چندہ عہر** منی آرڈر کے ذریعہ بھیج دیں یا دفتر کو اطلاع دیں کہ وی۔پی بھیج دے۔ یا خریداری منظور نہ ہو تو خط بھیج کر رسالہ کی ترسیل بند کرادیں۔ اگر ان میں سے کوئی صورت اختیار نہ کی گئی تو دفتر اُن کی خدمت میں وی۔پی بھیج دیگا، جس کا وصول کرنا اُن کا قومی اور وطنی فرض ہوگا۔

مینیجر

شربت فولاد جدید



معدہ کو قوت دیتا ہے۔ جگر کو تقویت بخشتا ہی۔ خون صالح پیدا کرتا ہی۔ بھوک لگاتا ہی۔ عام جسمانی حالت کو قوی کرتا ہی۔ چہرہ کو خوشرنگ بناتا ہی۔ بیماری کے بعد کی کمزوری کو دُور کرتا ہی۔ ضعفِ معدہ کے باعث جو دست آتے ہیں انکو روکتا ہی۔ جگر و طحال بڑھ جانیکو مفید ہی+ پرچہ ترکیب استعمال ہمراہ ہوگا۔ قیمت فی شیشی عہ/

معجون نشاط



نہایت ہی پُر کیف سُرور آگیں اور رغایت مقوی و ممسک معجون ہے۔ اس کی ضرورت عام طور پر شادی شدہ مرد کو رہتی ہے۔ اور ہم نے شوقین حضرات کے لیے خاص طور پر اسے ترتیب دے کر بنایا ہی۔ اس کے استعمال سے سلسلہ مُباشرت دیر تک قایم رکھا جا سکتا ہے اور تھکن بالکل محسُوس نہیں ہوتی، خلوت کی باتیں جلوت میں نہیں لانی چاہئیں۔ ورنہ ہم بتا دیتے کہ معجون نشاط کیا چیز ہے۔ بس یونہی سمجھ لیجئے کہ دولہا دلہن کی محبت استوار کرنیکا یہ بہترین ذریعہ ہی۔ قیمت فی شیشی تین روپیہ۔ پرچہ ترکیب ہمراہ ہوگا۔

سنون ممتاز



دانتوں کی جملہ بیماریاں اس کے استعمال سے رفع ہوتی ہیں۔ ہلتے ہوئے دانت جم جاتے ہیں۔ مسوڑھوں سے خون اور پیپ بہتا ہو تو اسکے لگانے سے زخم بھر جاتے ہیں۔ دانتوں کو صاف کرنے میں بیمثل ہ گندی رطوبت نکال دیتا ہی اور منہ کو صاف رکھتا ہی۔ جو شخص اپنی صحت کی حفاظت چاہتا ہی اُسے لازم ہے کہ روزانہ اس سنون کو ملے + ترکیب استعمال کا پرچہ ہمراہ ہوگا +

قیمت فی شیشی ۶ر چھ آنے

اکسیر مفاصل



وجع المفاصل عرق النسا، نقرس اور تمام عصبی دردوں کے لیے مشہور دواخانہ کی یہ ایک خاص دوا ہی جو بے شمار تجربات کے بعد بنائی گئی ہے۔ پیشاب میں ایک خاص مادے کی زیادتی کو جسکو انگریزی میں یورک ایسڈ کہتے ہیں کم کرتی ہی۔ سینکڑوں گٹھیا کے مریض اس دوا کی بدولت صحتیاب ہو چکے ہیں لہٰذا جن لوگوں کے چھوٹے یا بڑے جوڑوں میں درد رہا کرتا ہی وہ اس دوا کے استعمال سے فائدہ اٹھائیں۔ قیمت فی شیشی ۳۰ قرص عہ/ ترکیب استعمال کا پرچہ ہمراہ ہوگا +

مشہور دواخانہ - دھلی

گو اس قدر زیادہ مقدار میں استعمال کے باوجود موت واقع نہیں ہوتی. لیکن صحت بالکل خراب ہو جاتی ہے. مارفین کو شروع میں استعمال کرنے کے اسباب کی بابت تحقیقات پر معلوم ہوا کہ ان ساٹھ افراد میں سے اکثر نے بری صحبت میں مات کر ناچ گھروں. نائٹ کلبوں. جوئے خانوں وغیرہ میں دوسروں کے کہنے سے پہلی مرتبہ افیون پائپ کے ذریعہ پی. اور بعد میں وقتاً فوقتاً یہ سلسلہ جاری رہا. اور پھر بلائے جان ہو گئی. کیونکہ اس میں یہ خاصیت ہے کہ ایک دفعہ اس کو استعمال کرنے کے بعد پھر اگر دوبارہ کوئی اُس کو استعمال کرنے دیکھے تو انکار کرنے کی ہمت باقی نہیں رہتی. دس افراد نے بدمعاش عورتوں کے ذریعہ اس کی عادت سیکھی. چند نے جیل میں دوسرے قیدیوں کے ساتھ پینی شروع کی. اور چند نے گٹھیا اور دیگر قسم کے دردوں کی تکلیف سے وقتی آرام پانے کے خیال سے شروع کی. عرضکہ پچیس فی صدی افراد کا یہ بیان تھا کہ وہ افیون اور مارفین استعمال کرنے کے بعد پینک میں عجیب و غریب خواب دیکھتے ہیں. باقیوں کا بیان تھا کہ یا تو اُن کو کوئی خواب دکھائی نہیں دیتا اور دکھائی بھی دیتا ہے تو خوفناک اور بھیانک جس میں وہ قید خانوں میں سے بھاگنے کی کوشش کرتے ہوئے یا مرنے کی حالت میں یا ایسی حالت میں کہ پولیس اُن کے پیچھے لگی ہوئی ہے، دکھائی دیتے ہیں. ان زہریلی ادویات کی عادت چھڑانے کے لئے جو علاج کئے جاتے ہیں. اُن میں سب سے زیادہ ضروری چیز یہ ہے کہ مریض خود بھی اُسکو چھوڑنے کی نیت رکھتا ہو ورنہ بعد میں پھر شروع کر دینا ممکن ہے. دوسری چیز یہ ہے کہ جس ہسپتال میں علاج کے لئے اُن کو رکھا جائے وہاں ہر ایک کے کمرے الگ الگ ہوں اور قابل اعتبار اور دیانتدار نگہداشت کرنے والے ملازمین ہوں. تاکہ خفیہ طور پر مریض کو دوا نہ پہنچ سکے. اس عادت کو چھڑانے کے لئے ابتک چند طریقے برتے جاتے ہیں. ایک طریقہ تو یہ ہے کہ ایک شیشی میں مارفین سولیوشن لے لیا جاتا ہے اور اُس میں سے انجکشن دیا جاتا ہے. ہر دفعہ پچکاری بھرنے کے بعد ایک پچکاری پانی کی اُس میں ڈالدی جاتی ہے جس سے سولیوشن کمزور ہوتے ہوں. آخر میں صرف پانی رہ جاتا ہے. دوسرے طریقے میں مریض کو ادویات دینے سے پہلے ہفتہ بھر پسینہ لانے والے غسل دئے جاتے ہیں اور مالش وغیرہ کرائی جاتی ہے اور دیگر ذرائع سے زہریلے اثرات کو دور کیا جاتا ہے. پھر خاص ادویات کے انجکشن دئے جاتے ہیں. یہ طریقہ کافی کامیاب ہے. تیسرے طریقہ میں چند روز تک صرف نمک کے سولیوشن کے روزانہ متعدد انجکشن دئے جاتے ہیں. مذکورہ طریقوں سے عادی افراد کا کامیاب طریقہ سے علاج ضرور کر دیا جاتا ہے. لیکن ابتک کوئی علاج ایسا نہیں جو کہ یقین دلا سکے کہ آئندہ یہ صحت یافتہ شخص پھر اس کی طرف کبھی مائل نہیں ہوگا.

(بابو) کاظم. بی اے دہلوی



جفائے عشق و جورِ آسمان کو بھول جاتا ہوں
وہ کیا ملتے ہیں، میں دونوں جہاں کو بھول جاتا ہوں

قفس کی زینت نو رنگینیوں کا پوچھنا کیا ہے
چمن کا ذکر کیا؟ میں آشیاں کو بھول جاتا ہوں

ہزاروں داغ ملتے ہیں، ہزاروں پھول کھلتے ہیں
غلط کیا ہے، کہ میں بزمِ جہاں کو بھول جاتا ہوں

فسانہ اور وہ بھی ایک بربادِ محبت کا؟
میں اپنا درد، اپنی داستاں کو بھول جاتا ہوں

پلاتا ہے کوئی آنکھوں ہی آنکھوں میں وہ پیمانے
کہ میں ہستی کے ہر سُود و زیاں کو بھول جاتا ہوں

تمیزِ این و آں کیسی؟ وفورِ ذوقِ سجدہ میں
ستم یہ ہے، کہ اُن کے آستاں کو بھول جاتا ہوں

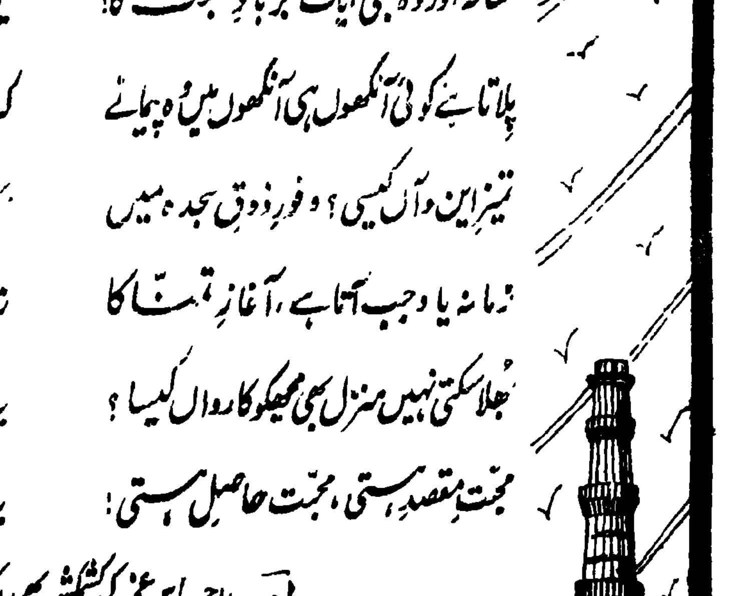
زمانہ یاد جب آتا ہے، آغازِ تمنا کا
زمانے بھر کے دردِ جانستاں کو بھول جاتا ہوں

بھلا سکتی نہیں منزل بھی مجھکو کارواں کیسا؟
یہ میں ہوں، جو سلوک کارواں کو بھول جاتا ہوں

محبت مقصدِ ہستی، محبت حاصلِ ہستی:
یہ نام آتے ہی میں کون و مکاں کو بھول جاتا ہوں

ادیب احساسِ غم کی کشمکش بھی اک قیامت ہے
نکل کر امتحاں سے امتحاں کو بھول جاتا ہوں!

ادیب مالیگانوی



مزاحیہ

مغرب زدہ چڑیا

ہمارے مکان میں جس چڑے اور چڑیا کا گھونسلا ہے اُنھیں مجھ سے یا تو بغض ہے یا محبت۔ اور اگر ایسا نہیں تو پھر وہ خانہ بدوش ہیں، کیونکہ گاہے گاہے نقلِ مکان کرتے رہتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ ہمیشہ میرے ساتھ ہی مکان تبدیل کیوں کرتے ہیں؟

جس زمانہ میں میں اوپر کے کمرہ میں رہتا تھا تو اُن کا گھونسلا عین میری میز کے اوپر تھا، اور وہ گاہے گاہے مجھ پر کرم بھی فرمایا کرتے۔ یعنی میری میز کو ڈلاؤ سمجھ کر خوب مزے سے اپنے گھر کا تمام کوڑا کرکٹ اُس پر ڈال دیتے، میں پڑوسی سمجھ کر رعایت سے کام لیتا اور اُن کی اِس حرکت پر اُنھیں ہاتھ سے اُڑا دینے ہی پر اکتفا کرتا۔

گرمی کا موسم آگیا۔ مکان کے اوپر کی منزل تپنے لگی، اس لیے میں نیچے کے حصے میں آجانا مناسب سمجھا، نیچے کے کمرے میں میز پر اپنی کتابیں قرینہ سے لگانے میں مصروف تھا کہ میز پر تاگوں کا گچھا اور کچھ تنکے گرے، اوپر دیکھتا ہوں تو ایک کارنس پر بی چڑیا بیٹھی اس سامان کا معائنہ کر رہی ہیں جو میاں چڑا اپنے مکان سے نئے مکان میں ڈھو رہا تھا۔ بیوی رانی میاں مٹھو، یہ تو آجکل کا فیشن ہے۔

مختصر یہ کہ وہاں بھی تبدیلِ مکان کی تیاری ہو رہی تھی۔ اور مکان میرے ہی پڑوس میں تعمیر ہو رہا تھا۔ بڑا تاؤ آیا کہ خدا خدا کرکے اِن کی آفت سے نکلنے کی ٹھانی تھی۔ وہ کمبخت پھر ملک الموت کی طرح جان کے پیچھے پیچھے لگے۔ خون کے سے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ مارنا مناسب نہ سمجھا، کیونکہ یہ شکل سے جانور بڑا عبادت گزار ہے۔ اُس وقت جب کہ خدا کی تمام مخلوق لمبی تانے پڑی سوتی ہے یہ خدا کے نام کی مالا جپنے لگتا ہے۔ اور اُس کی حمد کے ترانے گاتا ہے۔ میں نے چڑے چڑیا کو اُڑایا نہیں، اور اُنھوں نے اس کا کنبہ سمجھ کر نئے مکان میں مستقل بود و باش اختیار کرلی۔ رفتہ رفتہ میں اُن کا عادی ہو گیا، وہ میرے یعنی وہ میری موجودگی کی وجہ سے ڈر کر اُڑتے نہیں تھے بلکہ میز کے اسٹینڈ، قلمدان اور قلمدان سے کتابوں پر لونگ جمپ کی پریکٹس جاری رکھتے، اور میں بھی اُن کی چیں چیں سے چیں بہ جبیں نہ ہوتا

ایک روز میں اپنی میز کے قریب کرسی پر بیٹھا ہوا مضمون لکھنے میں مصروف تھا۔ مضمون کا عنوان مذہبی سا تھا۔ اس لئے میرے لئے خشک اور غیر دلچسپ تھا۔

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

خیر اپنی طبیعت کو گھیر گھونٹ کر بمشکل تمام دو چار سطریں لکھنے میں کامیاب ہو سکا۔ گھونسلے کے نزدیک بیٹھے ہوئے چڑے نے چوں چوں کی رٹ لگا دی۔ مضمون خشک، چڑے کی چوں چوں، خیالات منتشر۔ دماغ صاف۔ مضمون ختم۔ کاپی بند چڑے کو اُڑانے کی کوشش کی۔ مگر وہ نہ اُڑا، بلکہ اور زور زور سے بولنے لگا۔ فریادی معلوم ہوتا تھا۔ سوچا اس نے میرے مضمون کا ملیامیٹ کیا ہے۔ اب اس سے کوئی کہانی سُن کر ہی لکھ لوں گا۔ اور اس طرح بیچے مضمون کے خراب ہونے کی تلافی ہو سکے گی۔ چڑا بولا۔

"بابوجی ایک دوسرے کے پڑوس میں رہتے رہتے اب ہم اور آپ ایک دوسرے سے بخوبی واقف ہو چکے ہیں۔ بلکہ میں تو آپ کو اپنا دوست سمجھتا ہوں، ایک خاص بات میں آپ سے مشورہ لینا چاہتا ہوں، عجیب مصیبت میں جان ہے" ہم نے پہلے ارادہ کیا کہ چڑے سے صاف کہدیں بندہ پرور کوئی اور مشیر قانونی تلاش کیجئے، شہر وکیلوں سے بھرا پڑا ہے لیکن ہم نے اِسے رسمِ دوستی کے خلاف سمجھا۔ اِس کے علاوہ ہم کوئی کہانی بھی سننا چاہتے تھے۔ چنانچہ ہم نے اُس سے کہا

"چشم ما روشن، دلِ ما شاد۔ ارشاد کیجئے کیا حکم ہے اور آپ تو ہمارے پرانے "کرم فرما" ہیں۔ کسی چڑیا سے چھیڑ چھاڑ؟ .... یا کسی کے عشق کا بھوت؟" یہ سوال کرکے ہم چاہتے تھے کہ چڑے کے پوشیدہ رازِ دل کو اُس سے اُگلوالیں۔

"جی نہیں معاملہ یہ نہیں ...... میری لاڈو نے مجھے پریشان کر رکھا ہے۔ نئی روشنی کی پلی ہوئی لڑکی ہے، کہتی ہے یہ تمہارے بابوجی کس کام آئیں گے مجھے تھوڑی سی انگریزی پڑھا دیں تو اِن کا کیا حرج ہے؟"

یہ سنکر مجھے ہنسی آگئی۔

چڑا بولا۔ "جی، اس میں اُس کا کچھ قصور نہیں۔ میری بیوی کے مزاج بگاڑنے میں آپ کے اُن دوست کا بہت حصہ ہے جو آپ کے ہاں ہر اتوار کو ہیٹ لگا کر معہ بیوی بچوں کے آتے ہیں۔ اُن کی بیوی شان سے خالی ہاتھ ہلاتی آتی ہیں، اور بابو جی ایک بچہ کی اُنگلی پکڑے اور دوسرے کو سینے سے لگائے تھپکاتے رہتے ہیں...... میری بیوی اتوار کو تمام دن گھونسلے میں بیٹھی بیٹھی اُن کی باتیں سنتی رہتی ہے اور اُن کی ہر نقل و حرکت کو بغور دیکھتی رہتی ہے۔ اُسے اُن کی وضع انگریزی بہت پسند آتی ہے۔ بلکہ انگریزی کے کچھ الفاظ تو اُس نے یاد بھی کر لئے ہیں وہ ہمیشہ ہمارے ننھے کو بیبی (BABY) اور مجھے لاڈو پیارے مائی چائلڈ MY CHILD. پکارتی ہے۔ مجھ سے کہتی ہے مجھے بیوی مت کہا کرو، ہمیشہ مائی ڈارلنگ (میری پیاری یا میری جان) MY DARLING کہا کیا کرو۔ بس اب انگریزی سیکھنے کی دھن سمائی ہے۔ انگریزی پڑھوا دو اس میں تمہارا کیا حرج ہے"

میں نے ہنسکر کہا

"جی حرج تو بہت ہے پر وہ کسی طرح مانے بھی؟"

"کیا حرج ہے، ہم بھی تو سنیں۔"

"اجی اول تو کہیں وہ فرنگن نہ بن جائے۔ دوسرے ملک کے تمام لیڈر پکار پکار کر کہہ رہے ہیں "نہیں رکھنی جی نہیں رکھنی سرکار..... نہیں رکھنی" "ہندو مسلم سکھ عیسائی، پارسی، بدھ اور جینی بھائی، سب مل کر بولو ایک آواز اپنے دیس میں اپنا راج۔ جب اپنا راج ہوگا تو اپنی زبان ہوگی۔ جب سرکار ہی نہیں رکھنی تو اُس کی زبان کو کیا لے کر چاٹیں گے۔"

میں نے گھبرا کر کہا۔

"میاں یہ کیا بک رہے ہو، میں سرکاری ملازم ہوں بابا۔ کیا میرے پیچھے سی۔ آئی۔ ڈی لگواؤگے، تم تو کانگریسی نکلے۔ مجھے یہ پتہ ہوتا تو کب کا یہ مکان چھوڑ کر جا چکا ہوتا۔ میرا مکان کانگریس کا پنڈال یا مسلم لیگ کا پلیٹ فارم نہیں۔ تم نے جو سرکار دولتمدار کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا ہے، کیا ہے اس کی حقیقت۔ نمک خواروں سے پوچھو۔ رہا یہ سوال کہ تم اپنی بیوی کو انگریزی پڑھانی نہیں چاہتے؟ تو اُس سے کہو: بیگم صاحبہ ہماری اردو زبان سے زیادہ شیریں اور پیاری زبان اور کون سی ہوگی۔ یہ تو ہمارے ملک کی قومی زبان ہے جسے بچہ بچہ بولتا ہے۔ پھر دیکھنا وہ اس زبان کی فریفتہ نہ ہو جائے تو سہی اور اگر پھر بھی نہ مانے تو اُسے اردو بازار، اردو پارک، اور کبھی کبھی اردو مجلس کی سیر بھی کرا دینا۔"

چڑے نے کہا، "مجھے آپکا یہ مشورہ تو بہت ہی پسند آیا۔ اب اور بھی بہت سی باتیں جلدی جلدی پوچھ لوں کیسے، میں چڑیا بھی سیر سپاٹے کو گئی ہوئی ہے۔ بابو جی کیا کہوں چڑیا پھر بہت ہی حاوی ہے۔ میری ایک بات بھی نہیں مانتی۔ اُلٹی مجھ پر دھونس جمانی ہے۔ کہتی ہے کما کر لاؤ، گھر کا تمام کام کرو اور پھر سب سے بڑی مصیبت یہ کہ بچے بھی میں ہی پالوں۔ ابھی دو آفتوں کو سُلا کر آیا ہوں۔ انڈے اور بچے دئے جاتی ہے، اب کچھ دنوں میں تیسرے کی تیاری ہے۔ مجھے ابھی سے ہول سوار ہے۔ بیگم صاحبہ کو کیا پروا، اُنھیں صبح شام کی ہوا خوری ہی سے فرصت نہیں۔ جاتے وقت ہدایتوں کا ایک دفتر میرے سپرد کر جاتی ہیں۔ "دیکھو بچوں کے پاس رہو، اودھم نہ مچنے پائے۔ تاکہ اُن کے آرام میں خلل نہ آئے۔ یاد کر کے انھیں

اشکِ اوّلیں

آہ اے آنسو ترے بہنے سے میں تو لُٹ گئی

جب قدم رکھتا ہے کانوں میں کوئی غمگین راگ
کروٹیں لیتی ہے آنکھوں میں مرے اشکوں کی آگ

آہ بھرتا ہے کوئی حسرت زدہ جب شام کو
چشمِ گریاں میں نہیں رہتا ہے پانی نام کو

جب ٹہلتا ہے حسیں ہونٹوں پہ آہوں کا ہجوم
جھلملاتے ہیں مری مغموم آنکھوں میں نجوم

جب جوانی کے حسیں گالوں کو تڑپاتی ہوں میں
سازِ گریہ پر غموں کی راگنی گاتی ہوں میں

آہ اے آنسو ترے بہنے سے میں تو لُٹ گئی

(مس نواب ذکیہ سلطانہ ذکی مراد آبادی)

اُٹھتے ہی پہلے نہلا دینا۔ دودھ پلاتا بھول نہ جاتا بازار کا! اُن کا دل بہلانے کے لئے بچوں کی طرح اُن سے کھیلنے لگنا۔ کھانے کے وقت ٹماٹر کا رس نکال کر ضرور پلا دینا۔ یہ بچوں کی صحت کے لئے از حد ضروری ہے! غرض یہ کہ ناک میں دم ہے، کیا کروں کیا نہ کروں۔

طلاق دیدو اور کیا کرو گے؟

چڑا ذرا سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا "ایسا تو نہ کہئے سرکار، کوئی ایسی ترکیب بتایئے کہ سانپ مرے اور لاٹھی نہ ٹوٹے۔ اگر میری بیوی کوئی اور ہوتی تو چھوڑ بھی دیتا مگر؟

مگر کے بعد چڑے کی خاموشی میں کوئی راز معلوم ہوتا تھا۔

مگر کیا؟ کیا کوئی خاص بات ہے!

چڑے نے شرمندہ سا ہو کر کہا۔ بڑی لمبی داستان ہے اور ——

مجھے آپ کے سامنے سناتے ہوئے شرم بھی آتی ہے۔ ابھی آپ کنوارے ہیں۔

کہو بھی کنوارا لڑکا ہوں لڑکی نہیں۔

آپ کو شاید معلوم نہیں۔ چڑے نے کہا ہماری "سول میرج" ہوئی ہے مذہبی رسم و رواج کے مطابق نہیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے پریم کرتے تھے۔ میں نے اِسے سب سے پہلے ایڈورڈ پارک میں چہچہاتے ہوئے دیکھا تھا۔ ابرو سنوارے —— سینہ تانے ——

حسن میں مقناطیس کی سی کشش ہوتی ہے۔ میں بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ میری نظریں اِس پر جم گئیں، اور میں نے عاشقانہ انداز سے اِس شعر کو گنگنانا شروع کیا۔

عاشق کی دلداری دلبر کیا ہی خدارا کرتے ہو!
اِن نیچی نیچی نظروں سے تم کام ہما! کرتے ہو!

میں بھلا سرکار گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہوا چار دن کی چھوکری کو رام کر لینا کونسی بات تھی۔ ابھی کے آدمی کے پیر شدی۔ دودھ کے دانت ہی نہ ٹوٹے ہوں گے۔ وہ لچھے دار باتیں بنائیں کہ میرا کلمہ پڑھنے لگی۔ شادی کے قول و اقرار ہونے لگے۔ اِس کے بعد ایک دن میں نے ایک کبابی کی دوکان پر لیجا کر اسے بھی مدعو کیا۔ کباب کھا کر ایسی مرچیں لگیں کہ بیچاری کے آنسو نکل آئے۔ میں نے آنسو پونچھے اور لپک کر کھیر لا کر اِس کا منہ میٹھا کیا۔ ہماری ملاقاتیں بڑھنے لگیں۔

میں نے بھی وہ چال چلی کہ اِس کا منگیتر یاد ہی کرتا ہو گا، شادی ٹھیرائی، اور میں ہونے والی دولہن کو لے کر چمپت ہو گیا۔ اغوا کا مقدمہ قائم ہو جاتا مگر اتفاق سے یہ بالغ ہو چکی تھی۔ چنانچہ ہم نے سب سے پہلے سول میرج کر لی۔ تاکہ بعد میں کسی قسم کی روک ٹوک نہ ہو سکے۔ اپنے گھر سے دور نیا مکان بنایا اور آپ کے پڑوس میں آن بسے۔

اب آپ ہی انصاف کیجئے کہ جس کے لئے میں نے عمر گھر بار چھوڑا ہو اُس کے ساتھ کس دل سے اتنی سختی کروں۔ پہلے اچھی خاصی تھی۔ آپ کے دوست اور انکی بیوی نے ہوا لگا دی ہے۔ مثل مشہور ہے خربوزے کو دیکھکر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ اس نے دیکھا جب آپ کے دوست اپنی بیوی کے آگے رشتہ خطمی ہوئے جاتے ہیں تو اُس نے مجھ سے بھی ایسی ہی توقع کی —— سب ٹھیک ہو جائے گی۔ جب آپ کی بیوی آ جائیں گی اور اُن کی صحبت کا اچھا اثر پڑیگا۔

غریب چڑے کو کیا معلوم۔ اب ہمارے دیس کا باوا آدم ہی نرالا ہو گیا ہے۔ سب لڑکیاں ایک ہی رنگ میں رنگی ہوئی ہیں۔ ایک توے کی روٹی کیا چھوٹی کیا موٹی۔ شادی کا سہانا خواب۔ بیوی کا پُرفسون نقطہ۔ .. .. غلامی کی آہنی زنجیریں ...... بیچارہ مرد ....

کیوں مجھے دوزخ میں پہنچانے کی دعائیں مانگ رہا ہے دیوانہ!—— مجھے آزاد رہنے دے —— ایک پرندہ کی طرح آزاد —— دنیا اور اسکے جھمیلوں سے کوسوں دور —— تجھے بیوی مبارک —— میں بھی دعا کروں کہ کاظمی ایکٹ کی رُو سے کہیں وہ تجھ سے پہلے تجھے طلاق نہ دیدے۔ اِتنے میں چڑیا کی آمد کا نقارہ بجا اور یہاں چڑے دُم دبا کر بھاگے۔

سید ضمیر کاظمی۔ بی اے (دہلوی)

مولوی عتیق الحق کا خطبہ

مولوی عتیق الحق صاحب آج ہی سفر سے گھر واپس آئے ہیں۔ طبیعت کسلمند ہے۔ ابھی سامان بھی کھولا نہیں تھا کہ ڈاک آن پہنچی۔ اس میں — ROYAL ASIATIC SOCIETY. کا دعوت نامہ موجود ہے۔ جس کی پچیس سالہ جوبلی ہے۔ دور دور سے مشہور وقت تشریف لائیں گے۔ اپنا اپنا ہنر دکھائیں گے۔ غدر کے بعد کا زمانہ ہے۔ اہل علم کا کال نہیں۔ ہمارے مولوی صاحب نام و نمود کے طالب۔ خود بین۔ خود نما۔ خود ستا۔ ایسے موقعے کب بار بار ہاتھ آتے ہیں۔ دوسرے کلکتہ کی سیر کا بھی شوق دامنگیر ہے۔ کبھی پہلے جانا نہیں ہوا۔ سنا ہے شہر قابل دید ہے۔ پھر SOCIETY. مالدار۔ قیام و طعام کا انتظام بھی خاطر خواہ ہوگا۔ مولوی کی ذات۔ کوئی اتوہو جو ایسا موقع چھوڑ دے۔ مولوی صاحب نے فوراً دعوت منظور کر لی اور لکھ بھیجا۔ بندہ حاضر ہے۔ قیام کا انتظام کر لیا جائے۔ آج کے تیسرے دن انشاء اللہ روانہ ہو جاؤں گا۔ بروقت روانگی تار دوں گا۔ کیجئے سامان کھلا بھی نہ تھا کہ پھر بندھنا شروع ہو گیا۔ گھر والی نے بہت کہا کہ ابھی مہینہ بھر میں تو آئے ہو۔ پھر جا رہے ہو مگر یہ کس کی سننے والے تھے۔ یہ کہکر ٹال دیا کہ وہاں جانا بڑا ضروری ہے۔ القصہ بخیر و خوبی دہلی سے روانہ ہوگئے اور متعاقب خط میں لکھ بھیجا کہ میرے خطبہ یا مقالہ کا مضمون "مغلیہ سلطنت کی کوچہ بندیاں" ہوگا۔ اس مضمون پر تقریر کرنے کی ایک خاص وجہ تھی۔ گذشتہ سفر کے دوران میں ایک معتبر سرکاری افسر نے اُن سے اس بارے میں استفسار کیا تھا۔ اُس وقت تو اُنھوں نے مختصر سا جواب دیدیا تھا۔ مگر دل میں یہ ٹھان لی تھی کہ کسی موقعہ پر اس مضمون پر ایک مقالہ لکھ ماریں گے۔ تاکہ آئندہ نسلوں کی آگاہی کا باعث ہو۔ قدیم دور ختم ہو رہا تھا۔ اُس زمانے کے قواعد و ضوابط یا کتابوں میں محفوظ رہ گئے تھے یا سینوں میں۔ جو سینوں میں تھا وہ روز بروز محو ہوتا جاتا تھا۔ کتابیں بھی بھجو رہوتی جاتی تھیں۔

منگل کے دن صبح کے وقت مولوی صاحب وارد کلکتہ ہوئے۔ اسٹیشن پر شہر کے معتبر آدمی پذیرائی کو آئے ہوئے تھے۔ ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور بہترین ہوٹل میں لے جا کر اتارا۔ دوسرے دن جلسہ منعقد ہونے والا تھا۔ دس بجے اجلاس شروع تھا۔ مولوی صاحب نہا دھو، بن سنور، جلسہ میں جا دھمکے۔ دہلی کی پرانی وضع کی تصویر تھے۔ مگر یہاں اُس زمانہ میں ان پر خاص نظریں نہیں پڑتی تھیں۔ اب تک پرانی تہذیب پٹنہ اعظم گڈھ اور نگر میں زور وں پر تھی۔ وہاں کے آدمی آئے دن کلکتہ آتے جاتے رہتے تھے۔ اور مٹیا برج آباد تھا۔ جو لکھنؤ کی شائستگی کا نمونہ تھا۔ پھر تعجب کی کیا گنجائش تھی۔ جلسہ شروع ہوتے ہی صدر نے اشارہ کیا کہ مولوی صاحب اپنا مقالہ شروع فرمائیں۔ یہ بڑے سج دھج سے اسٹیج پر جا پہنچے۔ مردانہ وار کھڑے ہو کر اپنی پاٹ دار آواز میں اس طرح سخن سرا ہوئے۔

خُطبَہ

کوچہ بندیاں

میں آپ صاحبوں کا بیحد مشکور ہوں کہ آپ نے مجھے اس جلسہ میں دعوت دیکر میری عزت افزائی فرمائی۔ میرے خطبہ کا مضمون جیسے پہلے اعلان ہو چکا ہے "کوچہ بندیاں" ہے۔ اس موضوع پر میں جو کچھ آپ صاحبوں کی خدمت میں عرض کروں گا وہ میری دیرینہ کتب بینی کا نتیجہ ہے جس زمانہ میں اس قسم کی کتابیں میرے پیشِ نظر تھیں میرے وہم و گمان میں بھی یہ نہ تھا کہ مجھے اپنی عمر میں کبھی اس مضمون پر لکھنا پڑے گا۔ نہیں تو نوٹ لے لیتا۔ اب اس کام میں بیحد آسانی ہو جاتی۔ کتابوں کی ورق گردانی بہت ہے۔ اور وہ بھی معمولی کتابیں نہیں بلکہ کتابوں کے پشتارے۔ میری کا کام نہیں۔ جو کچھ حافظہ میں محفوظ ہے اس کو سپرد قلم کرتا ہوں۔ اس میں ایک بڑی دشواری پیش آ رہی ہے۔ یہ ناممکن ہو گیا ہے کہ میں کتابی علم کو سماعی علم سے علیحدہ کر سکوں۔ کتابی علم کے تو بمشکل حوالے مل سکتے ہیں۔ سماعی علم کا حوالہ میں خود ہوں۔ راویوں کو اس کا کہاں سے علم ہوا۔ کچھ نہیں بتا سکتا۔ ممکن ہے کہ اُنھوں نے تو تاریخ کی ایسی کتابیں دیکھی ہوں جو مجھ تک نہیں پہنچیں۔ یا اپنے بزرگوں سے سنا ہو۔ میں نے تو سنا اور سب کچھ مگر دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔

آمدم برسرِ مطلب۔ مغلیہ سلطنت کے زمانہ میں دو قسم کی آبادیاں تھیں، محصور اور غیر محصور۔ محصور یا وہ غیر محصور نام چار کو۔ شہر کہاں قصبے تک محصور ہوتے تھے۔ اور کیوں نہ ہوتے۔ آئے دن فتنہ و فساد مار دھاڑ ہوتی رہتی تھی۔ ڈاکہ پڑتے تھے، خون ریزی ہوتی تھی۔ اگر پناہ مل سکتی تھی تو چار دیواری کے اندر۔ شہر کا ہر مکان ایسا بنایا جاتا تھا کہ دشمن سے مدافعت ہو سکے۔ دروازے وہ محکم کہ خدا کی پناہ۔ یہ تو ہر شہر کے گھروں کا نقشہ تھا، امیروں کے محل تو بذاتِ خود گڑھیاں ہوتے تھے۔ دروازہ پر پھاٹک، بیچ میں کھڑکی۔ شام ہوئی، پھاٹک بند۔ پہرہ دار حاضر۔ کھڑکی کھلی ہوئی وہ بھی پھر دو پہر رات گئے تک، پھر بند۔ اگر کھلوانے کی ضرورت ہو تو کھڑے پکارا کرو۔ دس پندرہ منٹ بعد دعا قبول ہوگی۔ اور پہرے دار صاحب بیدار ہو کر پہلے تو سوالوں کی بوچھاڑ کریں گے، جب اُن کا اطمینان ہو جائے گا تو کھڑکی کھول دی جائے گی۔ یہ انگریزی حکومت نہ باشد کہ رات بھر دروازہ چوپٹ پڑا ہے اور میاں ٹانگ پسارے پڑے سو رہے ہیں۔ بلا کا کھٹکا نہیں۔ یہاں تو ذرا غفلت ہوئی اور جان کے لالے پڑ گئے جان و مال دونوں کا۔

شہر کے دروازے نو بجے کی توپ دغی اور بند ہو گئے۔ پہرہ چوکی کا انتظام ہو گیا۔ اب رات بھر باہر کھڑے سر پھوڑا کرو۔ دروازہ کھلنے والا نہیں۔ جب صبح کی توپ چلے گی کھل جائے گا۔ یہ تو شہر کے دروازوں کا انتظام تھا، اب گلی کوچوں کا حال سنیئے۔

کوچے دو قسم کے ہوتے ہیں۔ سربستہ اور نافذہ۔ سربستہ وہ جنہیں آمد و رفت کا صرف ایک راستہ ہو کوچہ کی دوسری جانب سے کوئی باہر نہ نکل سکتا۔ ایک ہی راستہ ہے جس سے آمد و رفت ہو سکتی ہے۔ نافذہ وہ جس میں ایک طرف سے اندر گھسو اور دوسری طرف سے باہر نکل جاؤ۔ دہلی شہر میں نوے فیصدی کوچے سربستہ ہیں یا تھے۔ لاہور اس کے خلاف ہے۔ وہاں سربستہ کوچے کا پتہ نہیں۔ سب نافذہ۔ پشاور اور دہلی آدھے آدھے ویسے۔ کلکتہ کی خبر نہیں یہاں ابھی آیا ہوں۔ رہے کہ شہر، چار دیواری نہیں، اور ہوتی بھی کیوں۔ یہ شہر ان کو آباد کیا ہوا ہے۔ اس کی ضرورت ہی اس زمانہ میں باقی نہیں رہی تھی۔

اب یہ سنئے۔ کوچہ خواہ نافذہ ہو یا سربستہ۔ پھاٹک چڑھے ہوئے ہوتے لازمی تھے۔ دہلی میں یہ پھاٹک غدر کے بعد تک چڑھے رہے۔ پھر سرکار کے دل میں یہ آیا کہ ان کو گرا دیا جائے۔ حکماً گرا دئے گئے۔

اب محلوں کے انتظام کا حال سنیئے۔ ہر محلہ میں ایک میر محلہ تھا۔ یہ حکومت کی طرف سے مقرر ہوتا تھا اور حکومت کے سامنے اپنے قول و فعل کا جوابدہ۔ محلہ کا باضابطہ حاکم تھا۔ انتظام کے واسطے مقررہ رقم ملتی تھی۔ اسکا حساب نہیں لیا جاتا تھا۔ چاہے کھا جائے چاہے صرف کرے۔ حکومت کو اس سے سروکار نہیں۔ ہاں انتظام میں خلل نہ آنے پائے۔ اور کسی قسم کی شکایت پیدا نہ ہو۔ اپنے پہرے دار محلہ کے پھاٹک پر تعینات رکھتا تھا۔ یہ مسلح ہوتے تھے۔ سارے محلہ کی نگرانی کرتا تھا۔ ہر معاملہ میں اُس کا حکم ناطق تھا۔ محلہ کا دروازہ اُس کے حکم پر مقررہ وقت پر بند ہوتا اور مقررہ وقت پر کھلتا۔ پھر رات کو اگر ضرورت ہو تو اُسی کے حکم سے کھل سکتا تھا۔ خواہ پھاٹک کھولا جانے یا کھڑکی۔ جیسی ضرورت پیش آئے۔ اگر کسی اہلِ محلہ کو اپنی ضرورت کا پہلے سے علم ہوتا تو اجازت قبل از وقت حاصل کر لیتے۔ ورنہ عین وقت پر۔ احکام پہرہ داروں کے نام جاری ہو جاتے تھے۔ اسکی اجازت بغیر کوئی مہمان رات کو محلہ میں نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ دن دن رہو۔ رات کو اپنے اپنے گھر چلے جاؤ۔ شادی بیاہ کے موقع پر اجازت حاصل کر لی جاتی تھی۔ زچگی وغیرہ کے لئے بھی یہی دستور تھا۔

کوئی شخص محلہ میں میر محلہ کی اجازت بغیر مکان نہ کرایہ پر لے سکتا تھا نہ دے سکتا تھا۔ پہلے میر محلہ کا اطمینان کر دو۔ پھر ایک محلہ سے اُٹھ کر دوسرے محلہ میں آباد ہو۔ محلہ کے ہر فرد بشر کے چال چلن کی نگرانی اس کا فرض منصبی تھا۔ جس کے رویہ میں خرابی پاتا یا اُس کی آمدنی کے ناجائز طریقے ہوتے، مختار تھا کہ اُس کو محلہ بدر کر دے۔ پھر اگر دوسرے کسی محلہ کا میر محلہ اجازت دیتا تو وہاں جا کر آباد ہو جاتا۔ یہاں یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اگر کوئی میر محلہ اجازت نہ دے تو وہ غریب کہاں جائے۔ جناب ایسے اوباش اور بدچلن آدمی شہر کے باہر غیر محصور بستیوں میں رہتے تھے۔ دیکھ بھال کا ایکٹ ہر وقت جاری تھا۔ چنانچہ جو اجنبی کسی کاروبار کے سلسلہ میں کسی شہر میں وارد ہوتا، شہر کے اندر نہیں رہ سکتا تھا۔ اس زمانہ کی ساری سرائیں محصور شہروں کے باہر تعمیر ہیں۔ وہاں یہ لوگ رہ سکتے تھے۔ اور یہاں بھی پولیس انکی سخت نگرانی کرتی تھی۔ دن بھر شہر میں کاروبار کرتے۔ رات ہوتے سرائے میں چلے جاتے۔

بیوہ، یتیم اور اپاہج جو محلہ میں آباد ہوتے، اُن کا انتظام بھی میر محلہ کے سپرد ہوتا۔ صورت یہ تھی میر محلہ، محلہ کے صاحب مال لوگوں کے

خیرات کی رقموں میں سے تھوڑا بہت لے لیتا تھا۔ اور اس سے ان کی امداد کرتا تھا۔ یا بعض محتاجوں کی خبرگیری اُن کی رضامندی سے خاص خاص لوگوں کے ذمہ کر دیتا۔ جیسے POUR LAWS بھی موجود ہیں۔

محلہ کی مسجد کا انتظام۔ مساجد کے متولی خواہ مساجد کے متعلق اوقاف کی آمدنی سے کرتے یا محلہ کے چندہ سے۔ تاہم امام اور موذن کا تقرر بغیر میر محلہ کی صوابدید کے نہ ہو سکتا۔

ہر مسجد کے متعلق بسا اوقات مدرسہ بھی ہوتا تھا۔ اس میں بیشتر کلام پاک کی تعلیم محلہ کے بچوں کو دی جاتی تھی۔ مدرس کی تنخواہ یا تو محلہ کے ذی استطاعت لوگ برداشت کرتے تھے یا کسی وقف سے دی جاتی تھی۔ مگر مدرس کا تقرر میر محلہ کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ اعلیٰ تعلیم شہر کی بڑی درسگاہوں میں ہوتی تھی۔ اس کا مفصل ذکر بے محل ہے۔ ہاں یہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ اگر کسی محلہ میں کوئی امیر یا رئیس آباد ہے تو وہ اپنی اولاد کی تعلیم کے لئے ہر قسم کے اعلیٰ مدرس بہم پہنچاتا تھا۔ اُنکے ساتھ محلہ کے غریب لڑکے بھی اس سے استفادہ اُٹھاتے۔ خاصا چھوٹا سا مدرسہ اُس کے گھر میں قائم ہو جاتا تھا۔

لڑکیوں کی تعلیم کا یہ طریقہ تھا کہ محلہ کی شریف خاندانی بیویاں محلہ کی لڑکیوں کو درس دیتی تھیں، اور تربیت کرتی تھیں۔ لڑکیاں گھر گھر سے تعلیم اور تربیت حاصل کرنے اُن کے پاس جاتی تھیں۔ کہیں کہیں اُستانیاں بھی ملازم ہوتی تھیں۔ وہ بھی اہلِ دولت کی لڑکیوں کے ساتھ ساتھ محلہ کی غریب لڑکیوں کو بھی تعلیم دیتی تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ محلہ کے غریبوں اور امیروں میں مستقل روابط قائم ہو جاتے تھے جو نسلوں جاری رہتے تھے۔ اور ہمدردی اور امداد کے باعث ہوتے تھے۔ کسی قسم کی بے عنوانی محلہ کی لڑکی کے ساتھ روا نہیں رکھی جاتی تھی۔

چوری یا اور کسی قسم کی واردات اگر محلہ میں پیش آتی تھی تو اس کی تفتیش اور سُراغ رسانی میر محلہ کا فرض ہوتا تھا۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ اگر تلف شدہ مال برآمد نہیں ہو سکا تو میر محلہ کو اپنی ذات سے تلافی کرنی پڑی ہے۔

اب صرف ایک امر قابلِ غور ہے، اگر میر محلہ شریر النفس آدمی ہو اور اہلِ محلہ پر ظلم روا رکھے تو اُس کے ہاتھ سے نجات کیونکر ہو، اُس کے اقتدارات تو بیشک ایسے تھے کہ وہ سب کچھ کر سکتا تھا۔ اس کا انسداد منہی یا پرچہ نویسوں کے ذریعے سے ہوتا تھا۔ یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان پرچہ نویسوں کی بابت کچھ عرض کیا جائے، ورنہ یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔

منہی یا پرچہ نویس حکومت کے خبر رسانوں کا نام تھا۔ یہ ایک بہت بڑا محکمہ تھا۔ جو امیر اس محکمہ کا افسر اعلیٰ ہوتا اُس کو سب جانتے تھے۔ مگر جو کارکن اس کے زیر دست ہوتے تھے اُن کی کسی کو خبر نہیں ہوتی تھی۔ رقم یکمشت سردار منہیان کو ملتی تھی جس کا حساب اُس سے کبھی طلب نہیں کیا جاتا تھا۔ سب سے زیادہ معتبر اور راست باز امیر اس کام پر مقرر کیا جاتا تھا۔ کیونکہ یہ ایک منٹ میں سارے ملک کا نظام درہم و برہم کر سکتا تھا۔ اس کا فرض تھا کہ حکومت کے ہر ادنیٰ اور اعلیٰ عہدہ دار کے قول و فعل کی نگرانی کرے۔ اُس کے آدمی ہر محکمہ اور ہر مقام اور ہر افسر پر تعینات رہتے تھے۔ مگر اس طرح کہ کسی کو شبہ نہ ہونے پائے، اگر کسی کا راز کھل جاتا تو وہ فوراً علیحدہ کر دیا جاتا۔ ملک کے ہر گوشہ سے ڈاک علیحدہ میر منہیان کے پاس آتی تھی۔ اس کی ڈاک کا انتظام خاص طور پر ہوتا تھا۔ کوئی شخص اس سے خبردار نہیں ہو سکتا تھا۔ یہاں تک کہ صوبوں کے حاکم بھی دخل نہیں دے سکتے تھے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ عالمگیر کے کسی بیٹے نے منہی کی ڈاک میں کچھ دخل دیا تھا۔ شاہزادہ کو سخت سرزنش کی گئی۔ اس محکمہ کے مفصل حالات لکھنے کے واسطے ایک دفتر درکار ہے۔ اتنے ہی پر اکتفا کرتا ہوں۔

یہاں اتنا اور کہہ دینا ضروری ہے، اگر پرچہ نویس کسی میر محلہ کے خلاف سخت پرچہ گزارتے تو وہ اپنے عہدہ سے علیحدہ کر دیا جاتا، اور کوئی شخص بادشاہ کی طرف سے مقرر ہو جاتا۔

مولوی عتیق الحق صاحب نے اپنا خطبہ ختم کیا۔ حاضرین نے تحسین اور آفرین کے نعرے بلند کئے اور وہ اسٹیج پر سے اُتر کر اپنے مقام پر آن بیٹھے۔ صدر مجلس نے اُن کا شکریہ ادا کیا۔

(خواجہ) عبد المجید دہلوی

رباعیات

رباعی

یا دشمن اربابِ وفا بن بیٹھے
یا مرکزِ تسلیم و رضا بن بیٹھے
جلوہ کیا محفل میں تو بُت کہلائے
پردے میں چھپے جب تو خدا بن بیٹھے

سید ابن الحسن فکر

کب نور مٹا دے گا ہوا کا جھونکا
کب شمع بجھا دے گا ہوا کا جھونکا
ہوں قطرۂ شبنم کی طرح برگ نشیں
کب مجھ کو گرا دے گا ہوا کا جھونکا

آغا شاعر دہلوی مرحوم

مانا یہ کہ سب خاک ہو جائے گا
عالم افسوسناک ہو جائے گا
کچھ دن جو یونہی رہے گی ناپائیداری
آدھا یورپ ہلاک ہو جائے گا

سہاب اکبرآبادی

فلسفہ علم و حکمت

ازحضرت احقر پھپھوندوی

دُنیا والو! خیالِ دُنیا کبتک
محویتِ اعتبارِ فردا کبتک
ہے صلحِ عناصر پہ مدارِ ہستی
ظاہر ہے کہ اتفاقِ اعدا کبتک

آگاہِ دلِ ہر کس و ناکس ہم ہیں
آئینۂ نیک و بدِ نفس ہم ہیں
ہم جانتے ہیں مرتبۂ عز و جل
سب کہتے ہیں درویش خدا رس ہم ہیں

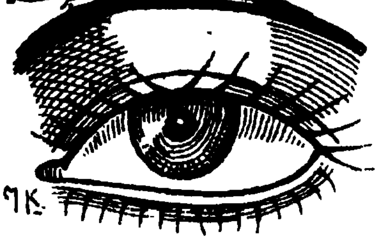
حمید، دہلوی

[illegible] زندگی کا مقصد سمجھے
سمجھے جب گناہ و [illegible] سبب
بے سکون دل [illegible] بیٹھا
[illegible] دنیا میں چلا [illegible] ضبطی سرزد

منشی [illegible] لکھنوی

بھولا ہوا افسانہ بنا جاتا ہوں
اپنے سے بھی بیگانہ بنا جاتا ہوں
ناصح! یہ نصیحت ہے کہ تبلیغ جنوں
میں اور بھی دیوانہ بنا جاتا ہوں

(وحشت شیرکوٹی)



چشمِ انسانی

(ترجمہ)

آنکھ۔ قوتِ بصارت کا ایک مخصوص آلہ ہے، جو آنکھ کے حلقے میں محفوظ رہتا اور متعلقہ عضلات کے وسیلے سے حرکت پذیر ہوتا ہے۔ آنکھ کے ملحقات سات ہیں۔

(۱) ابرو (۲) پپوٹے (۳) پلکیں (۴) ڈھیلے کے اوپر کی جھلی (۵) آنسوؤں کے غدود (۶) آنسوؤں کی تھیلی (۷) ناک کی نالی۔

(۱) ابرو۔ EYE BROW ابروؤں کی بلندیاں آنکھ کو زائد روشنی سے بچاتی ہیں۔ اور اُن کے بال پسینہ کو آنکھ میں داخل ہونے نہیں دیتے۔

(۲) پپوٹے EYE LID اوپر کا پپوٹا نیچے کے پپوٹے کی نسبت بڑا اور زیادہ متحرک ہوتا ہے۔ آنکھ جھپکنے کے وقت یہی حرکت کرتا ہے۔ ہر دو پپوٹوں کی اندرونی اور بیرونی جائے ملاپ کو کوشہ کہتے ہیں۔ بیرونی کونا اندرونی کی نسبت اونچا ہوتا ہے۔ اندرونی کونے میں ایک چھوٹی سی بلندی ہوتی ہے جس میں آنسوؤں کی نالی کا سوراخ ہوتا ہے۔ ہر ایک پپوٹے کے کنارے میں ایک باریک سی کُرّی ہوتی ہے۔ پپوٹے بھی آنکھ کی حفاظت کرتے ہیں۔ اور وقتِ ضرورت دونوں مل کر آنکھ کو چھپا لیتے ہیں۔

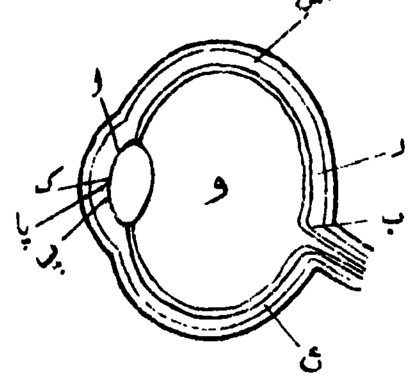
(۳) پلکیں EYE LASHES یہ وہ بال ہیں جو پپوٹوں کے کناروں پر ہوتے ہیں۔ عموماً ان بالوں کی دو یا تین قطاریں ہوتی ہیں۔ بالائی پلکیں زیرین پلکوں کی نسبت لمبی اور اوپر کو مڑی رہتی ہیں۔ پلکیں آنکھوں کو گرد و غبار وغیرہ سے بچاتی ہیں۔

(۴) آنکھ کی جھلی۔ یہ جھلی پپوٹوں کی اندرونی سطح اور ڈھیلے کی سامنے والی سطح کو استر کرتی ہے۔

(۵) آنسوؤں کے غدود: LACHRYMAL GLAND ہر ایک غدود جسامت میں ایک چھوٹے بادام کے برابر اور ابرو کے استخوانی ابھار کے بیرونی حصے کے نشیب میں رہتا ہے۔ یہ غدود بوقتِ ضرورت آنسو پیدا کرتا ہے۔ اور اُس سے سدا تھوڑی سی مقدار میں رطوبت رستی رہتی ہے، جو آنکھ کے اوپر والے حصے کو صاف اور تر رکھتی ہے۔

(۶) آنسوؤں کی تھیلی LACHRYMAL SAC. یہ نالی اندر کے کونے والی بلندی سے شروع ہو کر پپوٹے کے اندر کی طرف جا کر آنسوؤں کی تھیلی سے جا ملتی ہے۔ جو بیضوی شکل کی اور ناک کی جڑ کے اندر کی طرف آنکھ کے اندرونی کونے کے پیچھے ہوتی ہے۔

(۷) ناک کی نالی۔ یہ جھلی کی بنی ہوئی نالی سے پون انچ لمبی ہوتی ہے۔ اور آنسوؤں کی تھیلی کے زیرین حصے سے شروع ہو کر ناک کے نیچے والے سوراخ میں ختم ہوتی ہے۔



انسانی آنکھ

و۔ کانچ کی مانند رطوبت۔	VITREOUS HUMOUR.
س۔ سفید سخت پردہ۔	SCLEROTIC COAT.
ک۔ شفاف پردہ۔	CORNEA
ا۔ پتلی والا پردہ۔	IRIS.
پ۔ پتلی۔	PUPIL.
پا۔ پانی کی سی رطوبت	AQUEOUS HUMOUR
ب۔ زرد نقطہ۔	BLIND SPOT.
ل۔ بلّور	LENS.
ع۔ عروقی۔	CHORID
ر۔ نورانی پردہ	ROBINA

ساخت چشم

(۱)——— آنکھ کا ڈھیلہ۔ EYE BALL اس کا اُفقی قطر قریباً ایک انچ اور عمودی اس سے ایک انچ سے کچھ کم۔ یہ ایک پتلی سی جھلی میں سربند آنکھ کے حلقے کی چربی میں رہتا ہے۔ اور اپنے متعلقہ عضلات کے ذریعے اُن پر نیچے دائیں بائیں حرکت کرتا ہے۔

اس کی بناوٹ میں تین طبقے یا پردے اور تین رطوبتیں پائی جاتی ہیں

(ا) SCLEROTIC COAT یعنی آنکھ کا سپید سخت پردہ

یہ سفید، سخت اور مضبوط طبقہ دو تری ریشوں CONNECTIVE TISSUES سے بنتا ہے، اور آنکھ کے بڑے قطر کا عقبی ⅚ حصہ بناتا ہے۔ یہ سامنے کی نسبت پیچھے بہت موٹا ہوتا ہے۔ اس کے پچھلے حصے میں ایک سوراخ ہوتا ہے جس کے راستے آنکھ کا عصب MUSCLE اور عروق JUICES داخل ہوتے ہیں۔ اس کے سامنے ⅙ حصہ میں پردۂ قرنیہ CORNEA ہوتا ہے، جو درحقیقت اسی کا ایک حصہ ہوتا ہے۔

(۲)——— آنکھ کا شفاف پردہ CORNEA یہ پردہ شیشے کی طرح شفاف ہوتا ہے اور آنکھ کا ⅙ سطحی حصہ بناتا ہے۔ یہ آنکھ کے سفید پردے سے چپٹا رہتا ہے۔ اس کا آڑا قطر اس کے عمودی قطر سے لمبا ہوتا ہے۔ اس پردے کی سامنے والی سطح اُبھری ہوئی ہوتی ہے۔ مختلف انسانوں میں اور عمر کے مختلف حصوں میں یہ اُبھار کم و بیش ہوتا ہے مثلاً جوانی میں زیادہ اور بڑھاپے میں کم۔ اس پردے میں خون کی رگیں نہیں ہوتیں۔

(ب) CHORID COAT یعنی آنکھ کا عروقی پردہ

یہ عروقی سیاہی مائل یا ارغوانی پردہ آنکھ کے سفید پردے کے اندر کی طرف ہوتا ہے۔ اور آنکھ کے پچھلے ⅚ حصے پر مسلط رہتا ہے۔ سامنے کی نسبت عقب کی طرف موٹا ہوتا ہے۔ جہاں آنکھ کے عصب کے گزرنے کے لئے اس میں بھی سوراخ ہوتا ہے۔

(۳)——— IRIS یعنی آنکھ کی پتلی والا پردہ۔ یہ گول نازک سکڑنے اور پھیلنے والا پردہ جو دراصل عروقی پردے کا پھیلاؤ ہوتا ہے۔ رطوبت بیضیہ کے پیچھے اور رطوبت جلیدیہ کے سامنے لگا رہتا ہے۔ اس کے درمیان ایک سوراخ ہوتا ہے۔ جسے پُتلی کہتے ہیں۔ مختلف اشخاص میں اس طبقہ کا رنگ مختلف ہوتا ہے۔ مثلاً کسی میں زردی مائل اور کسی میں سیاہی مائل۔

(ج) آنکھ کا نورانی پردہ RETINA یہ نازک پردہ آنکھ کے عصب (MUSCLE.) کا پھیلاؤ ہوتا ہے، اور کل چیزوں کا عکس اسی پردے پر معکوس انداز ہوتا ہے۔ یہ پردہ اپنی بیرونی پر عروقی پردے سے اور اندرونی سطح پر رطوبت زجاجیہ VITREOUS HUMOUR سے متصل رہتا ہے۔ انسان جب بقید حیات ہوتا ہے تو یہ پردہ شفاف اور گلابی ہوتا ہے۔ مگر مرنے کے بعد دُھندلا اور زردی مائل ہو جاتا ہے۔ اس پردے کے عین وسط میں ایک زرد سا نقطہ BLIND SPOT ہوتا ہے جس پر بصارت نہایت ہی تیز ہوتی ہے۔ آنکھ میں تین قسم کی رطوبتیں پائی جاتی ہیں۔

(ا) AQUEOUS HUMOUR یعنی پانی کی سی رطوبت

یہ شفاف انڈے کی سفیدی کی مانند رطوبت آنکھ کے سامنے اور پچھلے جوفوں CAVITIES میں رہتی ہے۔ آنکھ کا سامنے والا جوف پردہ قرنیہ اور پردہ عنبیہ کے درمیان ہوتا ہے اور پچھلا خانہ (جوف) پردہ عنبیہ اور رطوبت جلیدیہ کے درمیان۔

CRYSTALLINE LENS یعنی بلور کی مانند رطوبت

یہ رطوبت پتلی کے پیچھے اور رطوبت زجاجیہ VITREOUS HUMOUR کے سامنے رہتی ہے۔ شفاف مگر سخت اور ایک نازک شفاف جھلی میں سربند ہوتی ہے۔ یہ دونوں طرف سے محدب CONVEX مگر اس کی پچھلی سطح سامنے والی سطح کی نسبت زیادہ محدب ہوتی ہے۔ ایک نازک پتلی اور شفاف جھلی جو رطوبت زجاجیہ اور عروقی پردے کے سامنے کناروں کے درمیان رہتی ہے۔ اور رطوبت زجاجیہ کے سامنے کناروں کو رطوبت بلوریہ ——— CRYSTALLINE LENS کی سطح کے ساتھ ملاتی ہے۔ اس رطوبت کو اپنی جگہ پر قائم رکھتی ہے۔ اس جھلی کے اوپر کی طرف چند عضلاتی ریشے لگے رہتے ہیں جو رطوبت جلیدیہ کے متعلق ہوتے ہیں موتیا بند کی بیماری اسی رطوبت بلوریہ کے رنگین ہو جانے سے ہوا کرتی ہے۔

(ج) VITRIOUS HUMOUR. یعنی کانچ کی مانند رطوبت

یہ رطوبت کانچ کی مانند شفاف ایک باریک شفاف TRANSPARENT جھلی میں ملفوف ہو کر نورانی پردے کے سامنے اور رطوبت جلیدیہ کے پیچھے رہتی ہے اور کل ڈھیلے کا ⅘ حصہ بناتی ہے۔

ہم کس طرح دیکھتے ہیں——— ؟

اس مضمون کے پڑھنے والے کے دماغ میں یقیناً یہ سوال پیدا ہوگا کہ ہم دیکھتے کس طرح سے ہیں ———؟

آنکھ میں ایسا پردہ جس پر ہر ایک روشن شے کا عکس منعکس ہوتا ہے



جواب

دو دونوں سیر کر رہے تھے۔ پہاڑ کی سب سے بلند اور برفپوش چوٹی پر —— اوپر تھا لامحدود ادا، خوبصورت آسمان اور نیچے طویل و وسیع سینۂ زمین! —— برفانی پہاڑیوں کے لامتناہی سلسلے دُور تک اپنے سائے ڈالتے ہوئے چلے گئے تھے —— دُور تک —— جیسے انکی کوئی انتہا ہی نہ ہو ——!

شام کا وقت تھا اور آفتاب کا چہرہ دن بھر کے سفر کے تکان سے تمتما رہا تھا —— اس کے عکس سے مغرب کی ساری سمت لالہ زار بن گئی تھی اور دُور مشرق کی طرف بادل کے ایک ٹکڑے کو بھی اسکا انعکاس سرخ بنائے ہوئے تھا۔

نوجوان لڑکی بادل کے اِس ٹکڑے کو دُور سے دیکھ رہی تھی، اس کے معصوم و سادہ لوحِ دل میں یہ بات کوئی جگہ نہ حاصل کر سکی تھی، کہ مغرب میں غروب ہوتا ہوا سورج، مشرق کے بادل کے ٹکڑے کو کس طرح رنگین بنا سکتا ہے؟ —— آخرکار وہ فکرِ معصوم کی اس بیتاب کُن اُلجھن سے تنگ آکر اپنے ساتھی سے یہ مسئلہ دریافت کرنے پر مجبور ہو ہی گئی۔

نوجوان لڑکا تھا پورا فلسفی —— اُس نے اپنے علم کی رُوح نکال کر رکھدی —— اور قوسِ قزح کے سات رنگوں کی تخلیق کے اسباب و علل پر روشنی ڈالتے ہوئے لڑکی کو یہ سمجھانیکی کوشش کی کہ —— "ایک چیز کا عکس دوسری چیز پر کیسے پڑتا ہے؟" ——

مگر لڑکی کی سمجھ میں خاک بھی نہ آیا —— اس کا دل تو صرف محسوس کرنا جانتا تھا —— تحقیق و تجزیہ اور کاوشِ نقد و نظر کی دماغ سوزیوں سے اسے کیا نسبت —— ؟ اُسے سمجھانے کے سارے دلائل و براہین اور تمثیلات و توضیحات رائیگاں جاتے ہوئے دیکھکر بیدار مغز نوجوان جھلا اُٹھا —— اس نے سوچا فلسفہ اور سائنس کی عقل طرازیوں کا سارا سرمایہ اور علم و عقل کے تمام تر ذخیرے آج شکست کھا رہے ہیں —— وہ حیران و متفکر تھا اور سوچ رہا تھا کس طریقہ پر لڑکی کو اس کے سوال کا جواب سمجھائے؟ یکایک اُس کے پیدا احساسات نے دل میں ایک چٹکی لی —— اور عقل کی درماندگیوں اور بیچارگیوں [illegible] جو آنکھ

کے بعد اب انہی کی باری تھی نا! —— محسوسات کیساتھ محبت بھی انگڑائیاں لیتی ہوئی بیدار ہو گئی، اور راہِ فکر کی ساری تاریکیوں کو دُور کرتی ہوئی منزل کو قریب کھینچ لائی! —— نوجوان کی سمجھ میں فوراً ایک بات آگئی اور اس نے لڑکی سے کہا —— "اچھا، میں ایک سوال کرتا ہوں، اِس کا جواب بھی تمہارے سوال کا جواب ہوگا" ——!

"کیا ہے؟" —— دوشیزہ کی حسین آنکھوں نے بزبانِ خاموشی استفسار کیا۔

نوجوان نے اُس کے رُخسار پر اپنے لبوں سے چھلکتی ہوئی محبت کی ایک مہر لگادی —— دوشیزہ کے سارے جسم میں بجلی کی سی ایک تیز لہر دوڑ گئی اور شرم و انفعال کے حسیات نے اُس کے تمام چہرہ کو سُرخ بنا دیا۔

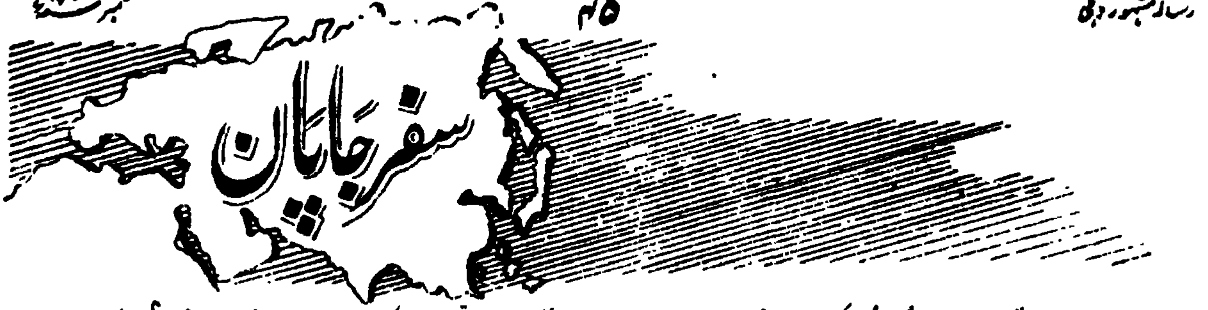
نوجوان اپنے جذبات کی حشر آفرینیوں کو سنجیدگی و متانت کے آبگینے میں سمیٹتا ہوا بولا —— "تمہارے ایک طرف کے رُخسار کی سُرخی کا سبب میں جانتا ہوں، مگر کیا تم بتا سکتی ہو کہ دوسرا رُخسار کیوں سُرخ ہو گیا ہے؟" ——

لڑکی نے اپنی مے فروش آنکھوں سے جذبات و محسوسات کے بے پناہ طوفان سے لبریز نگاہوں کا ایک چھلکتا ہوا جام لڑکے پر اُنڈیل دیا —— وہ کوئی جواب نہ دے سکی اور نہ اُس کے لبوں پر کوئی ہلکی سی لغزش ہی پیدا ہوئی —— لیکن اُس کی ساحر و عشوہ طراز آنکھیں زبانِ خاموشی سے یہ کہتی ہوئی صاف سُنائی دے رہی تھیں —— "بڑے شریر ہو تم!!!"

اور نوجوان اپنے جواب کی کامیابی پر مسکرا رہا تھا! ——

مخمور عثمانی

(بقیہ صفحہ ۴۲) وہ پردہ نورانی RETINA ہے۔ روشنی کی کرنیں آنکھ کے سامنے پردہ قرنیہ اور پانی کی سی رطوبت میں سے گزر کر اور جمع ہو کر پتلی کے راستے اندر جاکر اور پھر رطوبت بلوریہ اور رطوبت زجاجیہ سے گزر کر آنکھ کے نورانی پردے پر منعکس ہوتی ہیں، اور پھر وہاں سے [illegible] کے ذریعہ شے کے نظر آنے کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ (اعزاز ضیاء صدیقی)



سفرِ جاپان

محترمہ قمر جہاں صاحبہ، اُردو دُنیا کی قابلِ قدر انشا پردازوں میں ہیں۔ محترمہ نے [illegible] میں جاپان کا سفر کیا تھا اور اسی زمانے میں سفرنامہ بھی مرتب کر لیا تھا۔ راقم الحروف نے اس سفرنامے کے کچھ اقتباسات محفوظ کر لئے تھے، آج اُن کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔ (زاہد القادری)

عام طور پر یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ [illegible] میں جاپان کی حالت کچھ زیادہ بہتر نہ تھی۔

اس زمانے میں جاپان کسمپرسی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ وہاں کے باشندے مختلف طبقوں، فرقوں اور جماعتوں میں منقسم تھے۔ طرزِ حکومت بھی قدیم نہج کا تھا۔ لوگوں میں بے انتہا جہالت پھیلی ہوئی تھی۔ اور وہ تباہ کن رسموں کے پابند تھے۔ زندگی کے کاموں میں ایک عجیب بدنظمی اور بے ترتیبی تھی۔ وسائلِ معاش بھی محدود تھے۔ ان حالات کی بنا پر اُن کو حقارت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔

جب ذلت کا یہ طوفان برپا تھا تو قوم کے سمجھدار، دردمند، مخلص اور بااثر لوگوں نے اصلاح و ترقی کا عہد کیا اور قوم کو ذلت کی پستی سے اُٹھا کر عزت کی بلندی پر پہونچا دیا۔

اس مخلصانہ کوشش کا نتیجہ یہ ہے کہ آج جاپانی بہتر حالت میں ہیں۔ اُن کو عزت و احترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ اور کوئی اُن کو ذلیل نہیں سمجھتا۔

اب سوال یہ ہے کہ کس طرح جاپانیوں نے وہ حیثیت حاصل کر لی جو آج باعثِ فخر ہے؟ اس کا جواب صرف یہ ہے کہ جاپانیوں نے اپنی ذلت کو محسوس کر کے اپنی بے ترتیبی، پریشان حالی، بیکاری، نا اتفاقی اور اپنی تباہ کن رسموں کا خاتمہ کیا۔ اور سادگی، کفایت شعاری، قومی ہمدردی اور دیانتداری کو رہنما بنایا۔ یہی اُن کی ترقی کا راز ہے۔

آج دنیا کے ہر گوشے میں جاپانی موجود ہیں۔ شاندار کاروبار کے مالک ہیں۔ اعلیٰ پیمانے پر صنعتی اور تجارتی کام کر رہے ہیں۔ اب کوئی اُن کو حقیر نہیں سمجھتا۔ ہر جگہ اُن کا سر بلند رہتا ہے۔ اور وہ اپنی ترقی پر نازاں ہیں۔ اور رات دن آگے قدم بڑھانے کی فکر میں رہتے ہیں۔

جاپانیوں کو پستی سے نکالنے اور ترقی کے میدان میں لانے کیلئے قوم کے بااثر لوگوں نے بڑی محنت، ایثار پسندی اور خالص ہمدردی سے کام لیا ہے۔

سب سے پہلے انہوں نے لازمی تعلیم نافذ کی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ننانوے فیصدی آبادی لکھ پڑھ سکتی ہے۔ لوگوں کی جہالت کا خاتمہ ہوتے ہی تباہ کن رسمیں بھی ختم ہو گئیں۔ بہت سے نوجوانوں کو امریکہ اور یورپ بھیجا گیا تاکہ وہ مختلف صنعتوں کی تعلیم حاصل کریں۔ صنعت و حرفت سکھانے کے لئے بہت سے صنعتی اور تجارتی اسکول اور کارخانے قائم کئے گئے جس سے بیکاری کا طوفان کم ہو گیا۔

امدادی بنک بھی قائم کئے گئے جن سے تجارت کو ترقی حاصل ہوئی۔ بیرونی مقامات سے صنعت و حرفت اور تجارت کا انتظام کیا گیا۔ رسل و رسائل کے ذرائع سستے کر دئے گئے۔

روزمرہ کی زندگی میں سادگی، کفایت شعاری اور دیانتداری کی تبلیغ کی گئی۔ اور بے ترتیبی، بدنظمی، اور بداخلاقی کا خاتمہ کیا گیا۔

جاپانیوں کے طرزِ معاشرت کو دیکھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کو سادگی سے عشق ہے۔ جاپان کا ہر باشندہ اپنی سادگی کا بہترین نمونہ پیش کرتا ہے۔

جاپانیوں کا معمول ہے کہ وہ علی الصباح بیدار ہوتے ہیں اور ضروری حوائج اور غسل سے فارغ ہو کر معمولی سا ناشتہ کرتے ہیں، اور اپنے کام میں مشغول ہو جاتے ہیں۔

غروبِ آفتاب کے قریب لوگ گھروں کو واپس آتے ہیں اور تھوڑا وقت سیر و تفریح میں گزارتے ہیں۔

جاپانیوں کے مکانات میں بھی سادگی کی خاص شان نظر آتی ہے۔ اکثر و بیشتر لکڑی کے مکانات ہیں۔ اُن پر خوشنما چھپر ہیں۔ اندر فرنیچر زیادہ نہیں ہوتا۔ دیواروں پر چند تصویریں اور تھوڑا سا آرائش

کا سامان نظر آتا ہے۔

اکثر جاپانی فرش پر بیٹھکر کھانا کھاتے ہیں۔ اور فرش پر ہی سوتے ہیں۔ امرار کے مکانات بھی کچھ زیادہ پُرتکلف نہیں ہوتے۔ سرکاری دفاتر اور اُن کے فرنیچر میں بھی حکومت نے کفایت شعاری اور سادگی سے کام لیا ہے۔

یہ سادگی اور کفایت شعاری افلاس کی وجہ سے نہیں بلکہ اصلاح و ترقی کے جذبے کے ساتھ ہے۔ عام طور پر جاپان کے باشندے خلیق، انکسار پسند، مہمان نواز اور دیانتدار ہیں۔ وہ کسی کو حقیر نگاہوں سے نہیں دیکھتے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے ملازموں اور ادنیٰ کام کرنے والوں سے بھی اچھا سلوک کرتے ہیں۔

سرکاری ملازموں میں بھی یہ انکسار پسندی اور خلوص موجود ہے۔ وہ درحقیقت اپنے آپ کو پبلک کا سچا خادم سمجھتے ہیں۔ اور کسی کے ساتھ ناز یبا برتاؤ نہیں کرتے۔

جاپانیوں کی ہمیشہ یہ خواہش رہتی ہے کہ وہ دوسروں کو خوش کریں اور کسی کو ناراض ہونے کا موقع نہ دیں۔

آپ خواہ کسی دفتر میں جایئے، یا ہوٹل میں۔ یا اسٹیشن پر یا کسی تفریح گاہ میں۔ آپ کے ساتھ ہمدردانہ اور شریفانہ سلوک کیا جاوے گا۔ مسافروں کو ہر طرح کا آرام پہونچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

آپ جہاں بھی جائیں گے مسکراہٹ اور خوش آمدید کے ساتھ آپ کا استقبال کیا جائے گا۔ اور جب آپ رخصت ہوں گے تو لازمی طور پر آپ کا شکریہ ادا کیا جائے گا۔ اور ایک مسرت آفرین مسکراہٹ کیساتھ آپ کو الوداع کہا جائے گا۔

جاپانیوں کو قدرتی مناظر سے بے انتہا عشق ہے۔ جب اُن کو فرصت حاصل ہوتی ہے تو وہ اپنا زیادہ وقت پہاڑوں۔ چوٹیوں۔ باغوں دریاؤں۔ اور جھیلوں کے قریب گزارتے ہیں۔ پبلک کے ان محسوسات کا لحاظ رکھکر حکومت نے بہت سے باغ اور تفریحات کے مرکز بنوادئے ہیں۔

جاپان کے ہر گوشے میں دلفریب چمن۔ اور تفریحی مراکز موجود ہیں۔ جہاں امیر و غریب سب لوگ تفریح کے لئے جاتے اور پھولوں کی خوشبو اور تازہ ہوا سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

کاروباری دفتروں اور تفریح گاہوں میں ہر جگہ ایک خاص تہذیب شائستگی سلیقہ شعاری اور تنظیم نظر آتی ہے۔ ہندوستان میں اکثر سنیماؤں اور ریلوے اسٹیشنوں پر خلاف تہذیب حرکتیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ لیکن جاپان میں یہ مصیبت نہیں ہے۔ وہاں نہ گالیوں کی بارش ہوتی ہے اور نہ ایک دوسرے کو ذلیل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ بلکہ اگر اتفاق سے کوئی غلطی ہوجاتی ہے تو فوراً اظہار افسوس کرتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ گھروں میں، اسکولوں میں، کارخانوں میں۔ تفریحگاہوں میں ہر جگہ ایک بہترین سماجی تنظیم اور ایک دلنواز شائستگی نظر آتی ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ ۱۸۶۸ء میں جاپان کے ہر گوشے میں جہالت کی گھٹائیں چھارہی تھیں اور یہ خیال بھی نہیں تھا کہ یہ ملک آسانی کے ساتھ زیورِ تعلیم سے آراستہ ہوسکے گا۔ لیکن ہمت۔ محنت۔ استقلال اور خلوص کے اندر بڑی طاقت ہے۔ آج اس حقیقت سے انکار نہیں ہوسکتا کہ جاپان درسگاہوں کا ایک مجموعہ ہے۔ ہر طرف علم کی روشنی نظر آتی ہے۔ آج وہاں ننانوے فیصدی آبادی تعلیمیافتہ ہے۔

جاپان میں ایک گاؤں بھی ایسا نہ ہوگا جہاں لوگ تعلیمیافتہ نہوں۔ ایک سرکاری رپورٹ کے پڑھنے سے معلوم ہوا کہ اکتوبر ۱۸۹۰ء میں تعلیم کے متعلق ایک سرکاری فرمان جاری ہوا تھا جس میں ملک کی تعلیمی پالیسی کو واضح کیا گیا تھا۔ اس کے بعد ذمہ دار لوگوں نے اُن ہدایات پر عمل شروع کردیا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ایک ایسا تعلیمی نظام قائم ہوگیا ہے جو ہر طرح کی قومی ضروریات کے لئے کافی ہے۔

جاپان کا سارا نظام تعلیم حکومت کے ماتحت اور سرکاری محکمہ تعلیم کی نگرانی میں ہے۔ بااثر حضرات کو یہ اجازت ہے کہ وہ پرائیویٹ درسگاہیں بھی قائم کریں۔

آجکل جاپان میں تقریباً پینتالیس ہزار درسگاہیں ہیں۔ جن میں ایک کروڑ بیس لاکھ سے زیادہ طلبا تعلیم حاصل کررہے ہیں۔

ہر شہر، ہر قصبے اور ہر گاؤں کے باشندوں کا یہ فرض ہے کہ وہ لازمی طور پر دو اسکول ضرور قائم کریں۔ اگر وہاں کے باشندے تعلیم کے مصارف برداشت نہ کرسکیں تو حکومت کی طرف سے امداد کی جاتی ہے۔ اوقاف کی آمدنی کا بھی زیادہ حصہ تعلیم پر خرچ کیا جاتا ہے۔

حکومت نے طریقۂ تعلیم، اُستادوں کی قابلیت، حفظانِ صحت اور نصابِ تعلیم کا ایک خاص معیار مقرر کردیا ہے۔ اُس معیار کی روشنی میں اس فرض کو انجام دیا جاتا ہے۔

زنانہ درسگاہوں کے نصابِ تعلیم کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ لڑکیوں کو

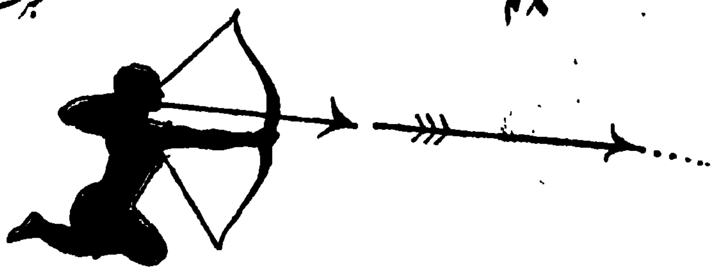
آداب مجلس شرت ۔ اُمورِ خانہ داری، اور تمدنی فرائض بھی سکھائے جاتے ہیں۔ جاپان کا نصاب تعلیم اتنا جامع ۔ اور وسیع ہے کہ زندگی کی تمام ضرورتیں اُس کے اندر ہیں۔ یعنی ہر اُس موضوع کی تعلیم کا مکمل انتظام ہے جو انسان کے مفید مطلب ۔ اور مستقبل کی کامیابی کے لئے ضروری ہے۔ سارے ملک میں ابتدائی تعلیم لازمی اور مفت ہے۔ اور تمام درسگاہوں میں اوّلی سے لیکر اعلیٰ تک ذریعۂ تعلیم جاپانی زبان ہے۔ لڑکیوں کو درسگاہوں میں مفید اور ضروری کام سکھائے جاتے ہیں۔ مثلاً کھانا پکانا ۔ کپڑے دھونا سینا ۔ پردنا ۔ کشیدہ کاری ۔ خیاطی ۔ موسیقی ۔ چائے کا انتظام اور پھولوں کی آرائش وغیرہ ۔ بعض ممالک میں یہ کام غیر ضروری سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن جاپان صحیح قسم کی تعلیم دے کر خدمتِ وطن کا جذبہ عورتوں کے اندر پیدا کر رہا ہے۔

جاپان کے نسوانی نصابِ تعلیم میں جہاں "لائق بیوی" اور "لائق ماں" بننے کی ہدایت ہے وہاں زندگی کے دوسرے دروازے بھی بند نہیں کئے گئے ہیں۔ عورتوں کو سائنس اور علوم و فنون کی عملی تعلیم بھی دیجاتی ہے۔ وہ گھر کے اندر اگر لائق ماں اور لائق بیوی بن سکتی ہیں تو گھر کی چہار دیواری سے باہر ہسپتالوں کی ڈاکٹر۔ محکموں کی افسر۔ پروفیسر۔ جج ۔ وکیل اور سب کچھ بن سکتی ہیں۔ اہلِ جاپان یہ محسوس کرتے ہیں کہ زمانے کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے مردوں کو اور عورتوں کو یکساں طور پر میدانِ عمل میں کامیاب ہونا چاہیئے۔ اس میں شک نہیں کہ مغربی تہذیب کا اثر جاپان میں بھی نمایاں ہے عورتوں نے قدیم لباس کی جگہ یورپین لباس پہننا شروع کر دیا ہے، اور غازہ کا استعمال اور زلف تراشی کا سلسلہ بھی نظر آتا ہے۔ لیکن یہ غنیمت ہے کہ ابھی دخترانِ جاپان کا دلی احساس یہ ہے کہ مشرقی تمدن اور مشرقی تہذیب زیادہ قیمتی سرمایہ ہے۔ اور مشرقی عورت ایثار و قربانی کا مجسمہ ہے اور مغربی عورتیں صرف ذاتی فائدے کی فکر میں رہتی ہیں۔

خدا کرے کہ یہ احساس اُن کو مغربی تہذیب کے سیلاب میں بہنے سے محفوظ رکھے۔

مس قمر جہاں بی اے (علی گڑھ)

مجربات



مُدرِ حیض

اخروٹ کے چھلکے، املتاس کے چھلکے۔ مولی کے بیج گاجر کے بیج۔ سوئے کے بیج۔ بھٹیہ۔ اجوائن میتھی۔ سونٹھ۔

سب دوائیں ہموزن لیکر پانی میں اس قدر جوش دیں کہ پانی کا چوتھائی حصہ رہ جائے۔ اسمیں بقدر مناسب پُرانا گڑ حل کر لیں۔ بندحیض کو کھولنے کے لئے یہ جوشاندہ اکسیر صفت اور آزمودہ ہے۔

حبِ حمل

مشک دُورتی۔ افیون۔ جوزبوا۔ زعفران ہر ایک ایک ماشہ قرفل گجراتی ۳ عدد قرنفل چار عدد بھنگ کی پتی ۲ ماشہ۔

سب دواؤں کو کوٹ پیس کر جنگلی بیر کے برابر گولیاں بنائیں ایام حیض سے فراغت پانے کے بعد یہ گولیاں تین دن تک کھائی جاتی ہیں۔ یہ ساری دوائیں دن کی خوراک کی ہے۔ ان گولیوں کا فائدہ یہ ہے کہ ان کے اثر سے بانجھ عورت کے حمل قرار پایا جاتا ہے۔

برائے دردِ فتق

۵ عدد برگ آک پختہ برنگ زرد لے کر ایک پاؤ روغن کنجد میں جلالیں۔ پھر کسی پتھر پر خوب پیس کر مرہم بنا لیا جائے اور نیم گرم کرکے فوطوں پر لگائیں پھر لنگوٹ باندھ دیں۔ انشاء اللہ فائدہ ہوگا۔

(جناب حکیم سید محمد اسد علی صاحب ایم۔آر۔اے۔ایس لندن۔ایف۔ٹی۔ایس۔ایم۔ایم۔بی۔ جودھپور

برائے دردِ سر

دردِ شقیقہ وعصابہ و زکام وغیرہ کے لئے مفید ہے۔ نسخہ پٹاس پرمگنیٹ دو گرین۔ کافور ایک تولہ دونوں کو خوب باریک کرکے شیشی میں رکھیں وقت ضرورت بطور نسوار کام میں لائیں۔

برائے تپ و لرزہ

پھٹکڑی سرخ خام ایک تولہ۔ الائچی کلاں ایک تولہ باریک کریں۔ خوراک دو ماشہ آب تازہ کے ساتھ۔

اس سفوف سے بخار کی شدت اور تکلیف میں فوراً کمی ہوگی۔

دافعِ قبض

زہر سفید دو تولہ۔ عصارہ ریوند ۲ ماشہ باریک کرکے پانی کا ذریعہ چنے کے برابر گولیاں بنائیں اور رکھا ہے گا ہے رات کو سوتے وقت ایک گولی سے دو گولی تک کنکنے پانی کے ساتھ استعمال کریں۔

دردِ چوٹ کے لئے

آب کمرک ۳ تولہ۔ زردی وسفیدی بیضہ مرغ میں ملاکر نیم گرم مقامِ درد پر پلستر لگا دیں۔ دو ایک بار لگانے سے درد جاتا رہتا ہے۔

برائے خنازیر

عجیب و غریب اور مجرب نسخہ ہے۔ کشتہ ناقوس ۳ گرین کیلسم سلفائد ½ گرین۔ سوڈیم کلورائڈ ایک گرین۔ سب کو ملا کر باریک کرلیں۔ خوراک روزانہ ۲ گرین تازہ پانی کے ساتھ۔

جناب حکیم اکبر حسین صاحب اکبرآبادی)

اُردو ہندی تنازع

(دوسری قسط)

تنازع کے اثرات

(۱) ہند و مسلم فسادات

ہندی اتحوا ہندوستانی کے مبہم اور نامناسب نام سے عوام میں ایک قسم کا تذبذب اور انتشار پیدا ہوگیا۔ ہندو مسلم فسادات بھی اسی زنجیر کی ایک کڑی ہیں۔ جب مسلمانوں کو پتہ چلا کہ یہ ہندو تہذیب کو منصۂ شہود پر لانا چاہتے ہیں تو وہ ایک دوسرے کو دشمن سمجھنے لگے۔ کیونکہ یہ زبان تو ہے

یہ زبان ہند یعنی ترجمانِ اتحاد
مژدۂ امن و سکون روحِ روانِ اتحاد

آج جو چیز ہندو اور مسلمانوں کے درمیان باعث نزاع ہے وہ دراصل گاؤکشی۔ باجا یا دیگر مراسم کا سوال نہیں۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ کچھ عرصے سے ہندوؤں میں یہ مسموم ذہنیت پیدا ہوگئی ہے کہ مسلمانوں کی تمام قومی اور تہذیبی خصوصیات کو ہندوستانی قومیت سے علیحدہ کردیا جائے۔ اور اس کے بجائے ایک ایسا نظام قائم کیا جائے جو اُن کی ذاتی تخلیق ہو یا قدیم اصولِ زندگی پر مبنی ہو۔

اس فرقہ پرستی کی ابتدا کرنے والے تو وہ خود ہیں۔ لیکن جب کبھی یہ کہا جاتا ہے تو جواب میں کہا جاتا ہے کہ فرقہ پرست تو تم ہو۔ لیکن افسوس اگر گاندھی جی اس فرقہ پرستی کا جال مسلمانوں کو فریب دہی کے لئے نہ پھیلاتے تو دونوں قوموں کو یہ روزِ بد دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ لیکن گاندھی جی کا منتہائے مقصد فرقہ پرستی تھا اور وہ ظاہر ہوکر ہی رہا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ زبان کی کرامت ہے کہ وہ ایک دوسرے کو اس طریق سے اتحاد کی زنجیروں کے اندر جکڑ دیتی ہے کہ پھر اُن کا جُدا ہونا ناممکن ہوتا ہے لیکن جہاں زبان ہی بدلی جارہی ہو تو وہاں فسادات نمودار نہ ہوں تو اور کیا ہو؟

(۲) آزادی کی راہ میں روڑا

اس تنازع کے رونما ہونے سے پہلے اکثر لوگ اردو زبان کو چونکہ باہمی اتحاد کیلئے بیحد ضروری ہے استعمال کرتے تھے۔ مسٹر تیج بہادر سپرو نے کہا ہے۔

"یہ مسئلہ محض زبان کا مسئلہ نہیں بلکہ درحقیقت ہماری تہذیب کا مسئلہ ہے اس کا تعلق ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترک تہذیب سے ہے اس لئے اگر اس زبان کو مٹا دیا گیا تو پھر ہندو مسلم اتحاد کا سوال خواب و خیال بن کر رہ جائے گا:"

وہ لوگ لسانی اتحاد کو آزادی کا پیش خیمہ خیال کرتے تھے۔ وہ لوگ تو بس اس کی ترقی کے لئے دن رات کوشاں رہتے تھے، جیسا کہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جب گاندھی جی نے ہندی کا ڈھونگ رچایا، اور اسے ہندوستان کی واحد زبان قرار دینے کے لئے کوششیں شروع کیں تو اُس آزادی کو جس کے متعلق آپ اعلان کیا کرتے تھے کہ

"میں ہندستان کو ایک سال میں آزاد کرا دوں گا"

آج تک حاصل نہ کرسکے۔ آخر اس کا کوئی سبب بھی تو ہونا چاہئے۔ بس یہی سبب ہے کہ زبان کے مسئلہ تنازع کے ماتحت ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کو دشمن تصور کرنے لگے۔ اور وہ پہلی سی محبت نہ رہی۔

اردو زبان تو ہندو مسلم اتحاد اور باہمی تعلقات کا قدیم اور واحد ذریعہ ہے۔ اردو کی ترقی و ترویج میں بے شمار ہندوؤں نے مسلمانوں کے دوش بدوش سعی کی۔ آج بھی ہندوؤں میں ایسی مثالیں ادیبوں اور اردو کے ہمدردوں کی ملتی ہیں جن کو ثبوت کے طور پر ملک کے سامنے پیش کرسکتے ہیں۔ بہرنوع آج جو کچھ ہو رہا ہے اور اردو کے گلے پر جس بُری طرح چھُری پھیری جارہی ہے اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اس کا نقصان صرف مسلمانوں کو ہے بلکہ خود ہندو حضرات بھی کچھ کم مصیبت میں مبتلا نہیں ہونگے۔ جبکہ یہ قدیم رشتۂ اتحاد پورے طور سے ٹوٹ جائے گا۔ اور ایک دوسرے کی بولی سمجھنے میں دشواریاں پیدا ہونے لگیں گی۔ ظاہر ہے کہ پھر کوئی ایسا سیاسی محاذ ہی قائم نہ ہوسکے گا جس پر ہندو اور مسلمان مجتمع ہوکر ہندوستان کی جنگ آزادی میں حصہ لے سکیں بلکہ اس کے بجائے دونوں قوموں میں ایک ناقابل عبور خلیج حائل ہوجائے گی جس کی ابتدا ہوچکی ہے۔

(۳) کانگرسی حکومتوں پر اثر

اثر کیا ہوا کانگریسی حکومتیں تو گاندھی جی کے ایما اور اشارہ ہی سے چلتی تھیں. وہ جو کہتے تھے ، زرار اُن پر بہ رضا و رغبت عمل کرتے تھے اس کو یوں کہئے کہ کانگریسی حکومتیں گاندھی جی کے نظریات و تخیلات کا آئینہ تھیں ۔ اُنھوں نے فرقہ پرستی کے رنگ میں آکر ہندی کو لازمی قرار دیا۔ لیکن بعض جگہوں پر اس کارروائی کے خلاف سخت کوششیں ہوئیں ۔ چنانچہ مدراس میں ہندوؤں نے اس کے خلاف بھوک ہڑتال بھی کی۔ (ایجز لہ دکن ٹائمز مدراس)

اسی طرح اور صوبوں میں بھی " ہندستانی " کا نام چسپاں کرکے در پردہ ہندی تعلیم کو عام کیا گیا ۔ اور عوام کے حقوق کو غصب کرنے کی کوشش کی گئی کیونکہ اردو ہندوستان کی کسی خاص قوم کی ملکیت نہیں بلکہ جملہ اقوام ہند کا حق ہے ۔ ہندو حضرات کا بھی فرض ہے کہ وہ اس کے تحفظ اور ترقی میں پورا پورا حصہ لیں۔ لیکن چونکہ اُن کا مقصد ہندوستان کو دو ہزار برس پیچھے لے جانا ہے اور وہ اسی میں فلاح دیکھ رہے ہیں ۔ اس لئے وہ ان چیزوں کو چھوڑ رہے ہیں جو مختلف قوموں کے میل جول سے وجود میں آئی ہیں.

(۴) واردھا سکیم

اس میں زبان کے لئے چالیس منٹ جو وقف کئے گئے ہیں وہاں پر لفظ "ہندستانی" استعمال کیا گیا ہے ، اور اس سے آپ گاندھی جی کی مراد سمجھ سکتے ہیں.

(۵) انکشاف حقیقت

اگار رسان وتاسی نے ان "فرقہ پرستوں" کی خوب قلعی کھولی ہے اور وہ اپنے خطبات میں اس جھگڑے سے متعلق لکھتا ہے ۔

" اردو ہندی کا جھگڑا ابدستور چلا جا رہا ہے بالخصوص ہندو اس معاملہ میں تعصب سے کام لے رہے ہیں. وہ اپنے حب وطن کے جوش میں ان تمام چیزوں کی یاد کو پس پشت ڈالنا چاہتے ہیں. جن سے ہندوستان میں اسلامی حکومت کی یاد تازہ ہوتی رہے "

تھوڑا آگے چل کر اُن کے مقصد کو وہ یوں بیان کرتا ہے ۔

" میرے خیال میں اردو کے مقابلہ میں ہندی کی جانب توجہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے آج کل کی جدید یونانی کی بجائے قدیم یونانی کی طرف توجہ کی جائے "

رسم الخط

بابو سروپرشاد نے دیوناگری رسم الخط کو تمام زبانوں کے رسم الخطوں پر ترجیح دی ہے اس کے جواب میں لکھتا ہے ۔

———— نے دیوناگری رسم الخط کی بہت تعریف کی ہے اور یہ دعویٰ کیا ہے کہ دنیا بھر کی زبانوں میں دیوناگری رسم الخط ہی ایسا ہے کہ جس میں یہ صلاحیت بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے کہ صوت انسانی کے ہر نازک فرق کو واضح کر سکے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ خود اردو میں ایسے بے شمار الفاظ ہیں جنھیں دیوناگری حروف سے نہیں ادا کیا جا سکتا۔ چنانچہ ح خ. ص ض ۔ ط، ظ ۔ ع ۔ غ اور ق کا اظہار نہیں کیا جا سکتا "

مختصر یہ کہ جہاں تک حقائق کا تعلق ہے، کوئی بھی دھرم بھکشو ہندو اس سے انکار نہیں کر سکتا ، یہ اور بات ہے کہ گاندھی جی اور ان کے ہم خیال اسکو نہ مانیں اور اپنی عاقبت اندیشی کی بنا پر وہی کریں جس کا وہ ارادہ کر چکے ہیں۔ لیکن نتیجہ ہر حال میں ناکامی ہے جو مستقبل قریب میں اُن کے سامنے آئے گا۔

مصالحت کے اصول

(۱) ہندی کو لازمی قرار نہ دیا جائے۔

(۲) اردو میں فارسی اور عربی کی مشکل ترکیبیں استعمال کرنے سے پرہیز کی جائے۔

(۳) اسی طرح ہندو بھائی بھی سنسکرت کے غیر مانوس الفاظ کے استعمال سے پرہیز کریں۔

دنیا کی تمام زبانوں کے دو اصول ہیں ۔ پہلا یہ ہے کہ ماہر زبان اس زبان کی ترقی کے مختلف راستے ڈھونڈھتا ہے ، اور اس کو ہر اعتبار سے سہل الحصول بنانے کی کوشش کرتا رہتا ہے ۔ دوسرا اصول بازاری زبان کا ہے۔ جس کو خالص ادبی زبان سے بہت کم تعلق ہوتا ہے لیکن اس زبان کو ایک ادیب سے لیکر معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے لیکن اس ملک کی بازاری زبان معیاری نہیں کہلاتی۔

اسی طرح سے ....

ہندوستان میں بھی دیہات اور بازار کی زبان کو معیاری قرار دینا حماقت ہے ۔ اس لئے دو اصول ہونے چاہئیں ایک تو یہ کہ ادیب اور شاعر اپنی خصوصیت کو نہ چھوڑے ۔ یعنی جن عربی اور فارسی یا سنسکرت الفاظ سے وہ مدد لیتا ہے ۔ اس سے لیتا رہے ۔ دوسرا اصول یہ ہے کہ سہل الحصول الفاظ کی ایک لغت مرتب کی جائے ، جس کو محکمۂ تعلیم مدرسوں اور ریاستوں کے لئے بکثرت شائع کرے ۔ اور اسی کے مطابق چھوٹی چھوٹی کتابیں لکھی جائیں ، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندو اور مسلمان بچے ایک عام زبان سے پہلے ہی سے روشناس رہیں گے ۔ لہٰذا عربی اور فارسی آمیز اردو کے پڑھنے کے بعد بھی رشتۂ ارتباط منقطع نہ ہوگا۔

(بقیہ صفحہ ۵۱ پر)

خارش

کیفیت مرض - یہ ایک متعدی مرض ہے۔ جو جرثومہ اس تکلیف کو پیدا کرتا ہے وہ نظر نہ آنیوالا ایک چھوٹا سا گول چپٹا کیڑا ہے۔ جس کی شکل صورت کچھوے سے ملتی جلتی ہے۔ نر کیڑا جلد کی سطح پر رہتا ہے اور مادہ دُور تک جلد کے اندر چلی جاتی ہے۔ اور وہاں انڈے دیتی ہے۔ مگر انڈے دینے کے بعد خود مر جاتی ہے۔ ان انڈوں میں سے تقریباً دس روز میں بچے پیدا ہو جاتے ہیں۔ یعنی جب کسی شخص کو پہلے پہل خارش ہو تو سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ کم از کم دس یوم سے اس مرض میں مبتلا ہے۔ مادہ کے مرجانے پر جو بچے پیدا ہوتے ہیں وہ جلد کے اندر گھر بنا لیتے ہیں اور توالد و تناسل کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ جراثیم سارے بدن میں پھیل جاتے ہیں اور خارش کی تکلیف کو برابر جاری رکھتے ہیں۔ **اقسام طبی**۔ طبی رو سے یہ مرض دو قسم کا ہوتا ہے خشک و تر۔ چنانچہ خشک خارش کا مادہ صرف خلط سودا یا بلس ہوتا ہے۔ اور تر خارش میں رطوبت بلغمیہ بھی شامل ہوتی ہے۔ **اسباب** اکثر یہ شکایت خون کے احتراق اور سوداویت سے پیدا ہوتی ہے۔ بدن کا میلا کچیلا رکھنا۔ ہاضمہ کا خراب ہونا۔ میٹھی چیزوں کے زیادہ کھانے اور تیل اور گڑ کے کثرت استعمال سے خون میں احتراق ہو کر اور کبھی اچھی عمدہ صاف غذا نہ ملنے سے یہ مرض ہو جایا کرتا ہے۔ عموماً غریب بچوں اور کمزور اشخاص کو یہ مرض دیا دیا ہوتا ہے۔ عورتوں میں ایام ماہواری کی خرابی سے بھی اکثر یہ شکایت ہو جایا کرتی ہے۔ **علامات** خارش اگر خشک ہو تو چھوٹی چھوٹی پھنسیاں متفرق طور سے سارے بدن پر ظاہر ہوتی ہیں جن میں دوسرے کے طور پر شدت کی مگر خوش کن خارش ہوا کرتی ہے، اگرچہ تھوڑی بہت ہر وقت رہتی ہے۔ لیکن رات کے آخری حصہ میں زیادتی کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات شب میں اس قدر شدید ہوتی ہے کہ جبتک کھجاتے کھجاتے خون نہ نکل آئے چین نہیں پڑتا۔ عموماً یہ سارے بدن میں ہوتا ہے۔ لیکن خصوصیت سے بازو، ٹانگیں یا نیچے کا دھڑ مبتلائے مرض ہوتا ہے۔ خارش اگر تر ہو تو جسم پر باریک دانے ہو جاتے ہیں۔ جنمیں پیپ بھری رہتی ہے۔ اور ان میں حد درجہ کی سوزش ہوتی ہے یہ کھجلی اکثر پنڈلیوں اور ہاتھوں کی گھائیوں سے شروع ہوا کرتی ہے۔ **علاج**۔ اگر عورتوں میں ایام ماہواری کی خرابی اس مرض کا باعث ہے۔ تو اس کی اصلاح کریں۔ اگر ہاضمہ یا جگر کا فعل خراب ہے تو اسے درست کرلیں۔ چونکہ یہ مرض سوداویت کی زیادتی اور خون کے احتراق کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ لہذا بالترتیب یہ نسخہ جات استعمال کرائیں۔

ہوالشافی۔ عناب ۵ دانہ۔ منڈی ۷ ماشہ۔ شاہترہ ۷ ماشہ۔ سرپھوکہ ۷ ماشہ۔ بلیلہ سیاہ نیم کوفتہ ۷ ماشہ۔ صندل سرخ ۷ ماشہ۔ اگر موسم سرما ہو تو عشبہ مغربی ۷ ماشہ رات کو گرم پانی میں بھگو دیں۔ صبح مل چھان کر شربت عناب ۲ تولہ ملا کر پلائیں۔ شام کو یہ نسخہ دیں ھوالشافی معجون عشبہ ۹ ماشہ پہلے کھلا کر اوپر سے

(مضمون بقیہ صفحہ ۵۰)

کچھ اپنوں سے میری مراد اردو کے بہی خواہوں سے ہے کہ وہ مندرجہ ذیل باتوں کو ٹھیک سمجھتے ہوئے ہاتھ پر ہاتھ دھر کر نہ بیٹھے رہیں۔

(۱) زبانیں خود بخود بنتی ہیں، کسی کے بنائے نہیں بنتیں۔

(۲) اردو میں ایسے جوہر موجود ہیں جو اس کو مٹنے سے بچا سکتے ہیں

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے یہ فلسفہ دورِ حاضرہ میں غلط ثابت ہو چکا ہے، کیونکہ ابھی ابھی تجارتی مفاد کے پیش نظر ایک زبان "اسپرانٹو" نامی بنائی گئی ہے اور جو دن بدن ترقی کر رہی ہے، اس لئے ضروری ہے کہ زبان کی حفاظت کے لئے ہر ممکن کوشش کی جائے ورنہ کہیں یہ ہندی زبان ہماری غفلت کی بدولت ہمارے ہی گلے کا ہار نہ ہو جائے۔

دوسری بات اردو سے متعلق کچھ حد تک ٹھیک ہے۔ لیکن اگر ہم اس کو بالکل اُس کے حال پر چھوڑ دیں تو ممکن ہے کہ وہ پودا جسے ہمارے آباؤ اجداد نے بڑی محنت سے لگایا تھا خشک ہو کر رہ جائے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم اس کے لئے حتی الوسع آبیاری کرتے رہیں۔

ظفر علی راجپوت سکرٹری انجمن ترقی اردو گجرات

نمک بار بی ۱ تولہ فلفل سیاہ ۵ دانہ عرق عشبہ ۱۲ تولہ میں پیس چھان کر پلائیں۔ عرق گلاب۔ آب لیموں۔ روغن چنبیلی ان سب کو ملا کر خارش کی جگہ ملیں۔ ایک ہفتہ تک یہ دوائیں پلا کر پھر مطبوخ ہفت روزہ مسہل باضافہ ریشہ خطمی ۲ تولہ گل سرخ ۲ تولہ افتیمون پوٹلی بستہ ۱۰ تولہ۔ بسفائج فستقی ۱ تولہ۔ خار خسک ۱ تولہ یہ تیار کرکے پلائیں۔ مگر شام کو وہی نسخہ دیں جو پہلے لکھا گیا ہے۔ سات روز یہ مطبوخ پلا کر آٹھویں روز تبرید کا نسخہ دیں۔ ھوالشافی۔ خمیرہ گاؤزبان جواہر والا ۵ ماشہ۔ ورق نقرہ ۱ عدد میں لپیٹ کر اول کھلائیں۔ اوپر سے شیرہ عناب ۵ دانہ۔ لعاب ریشہ خطمی ۶ دانہ۔ عرق مرکب مصفی خون ۱۲ تولہ میں نکال کر شربت عناب ۲ تولہ ملا کر تخم ریحاں ۳ ماشہ چھڑک کر تین روز تک صبح و شام استعمال کرائیں۔ اس کے بعد ان نسخہ جات میں سے کوئی نسخہ ایک ڈیڑھ ہفتہ تک پینے کی ہدایت کریں۔ ھوالشافی معجون عشبہ ۹ ماشہ یا اطریفل شاہترہ ۹ ماشہ۔ پہلے کھلا کر اوپر سے عرق مرکب مصفی خون ۱۲ تولہ۔ شربت عناب ۲ تولہ یا شربت مرکب ملا کر دونوں استعمال کرائیں۔ عموماً اس طریقۂ علاج سے مریض کو بالکل آرام ہو جاتا ہے۔

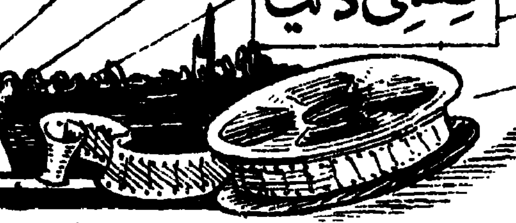
اگر خارش کے ساتھ دانوں میں سوزش بھی ہو تو روغن صندل ۱ تولہ کو عرق گلاب ۵ تولہ میں ملا کر مالش کرائیں۔ اس کے علاوہ یہ مرہم بھی خارش کیلئے مفید ہے۔ ھوالشافی سلفر سلی میٹ ۸ ماشہ۔ پوٹاس بائی کارب ۲ ماشہ۔ کو ملا کر پھر ان کو زرد ویسلین ۲۰ تولہ میں خوب اچھی طرح ملا کر جہاں جہاں خارش ہو ملیں۔ ۲-۳ گھنٹہ کے بعد کاربالک یا نیم کے صابن سے خوب اچھی طرح نہا ڈالیں۔ یہ عمل دن میں کم از کم دو مرتبہ ضرور کریں۔ پرہیز جسم کو میل سے صاف رکھیں لباس عمدہ اور صاف ستھرا پہنیں۔ صاف اور تازہ ہوا اور اچھے پانی کا انتظام کریں۔ روزانہ غسل کرنا ضروری ہے۔ دھوپ میں چلنے پھرنے گرم اور میٹھی چیزوں، مصالحہ دار غذاؤں سے پرہیز کریں۔ پالک۔ خرفہ چقندر توری۔ ٹنڈا۔ کدو۔ نیز دیگر ٹھنڈی ترکاریاں کم مرچ کی پکا کر چپاتی کیساتھ کھائیں۔ دودھ، گھی، مکھن تازہ بقدر ہضم کھا سکتے ہیں۔ اب میں اس مرض کے چند کھانے اور لگانے کے چند مجرب نسخے عام نفع رسانی کی خاطر تحریر کرتا ہوں۔ یہ مجربات عالیجناب شمس الاطباء شفاء الہند حکیم حافظ علی رضا خاں صاحب کے مطب میں روزانہ مریضوں پر برتے جاتے ہیں۔ اُمید ہے قارئین کرام اس سے

فاسد ۔ آخر خارش کو دماغ چیز سے یاد کریں گے۔ **سفوف خارش** صندل جیوالا گندھک آملہ سار مصفی ۱ تولہ۔ پوٹاس بائی ٹارٹراس ۴ تولہ دونوں پیس کر ایک جان کرلیں۔ اسمیں چار ماشہ صبح ۴ ماشہ شام عرق مرکب مصفی خون کے ساتھ استعمال کرائیں۔ **سفوف شاہترہ** اس سفوف کو سفوف گزروالا بھی کہتے ہیں تنقیہ کے بعد خارش کے لئے عجیب و غریب چیز ہے۔ برگ شاہترہ ۳ ماشہ۔ پوست ہلیلہ کابلی ۲ تولہ۔ پوست ہلیلہ ۲ تولہ۔ چوب گز ۱۱ ماشہ۔ ہلیلہ سیاہ ۱۰ ماشہ۔ آملہ خشک ۱۰ ماشہ۔ گل سرخ ۶ ماشہ ریوند چینی ۵ ماشہ۔ برگ سنا مکی ۱۲ ماشہ کوٹ چھان کر شکر سفید ہموزن ادویہ ملائیں۔ خوراک ۶ ماشہ سے ایک تولہ تک پانی یا مناسب بدرقہ کے ساتھ استعمال کرائیں۔ **دوائے خارش سیماب والی** سیماب ۱ تولہ۔ گندھک آملہ سار ۱ تولہ۔ مردار سنگ ۱ تولہ نیلا تھوتھا ۱ ماشہ۔ سرکہ خالص ۲ تولہ روغن سرسوں ۵ تولہ۔ گلاب کے پھول ۵ تولہ۔ پہلے گلاب کے پھولوں کو رات کو پاؤ سیر پانی میں بھگو دیں۔ صبح جوش دیں جب ۱۰ تولہ کے قریب پانی رہ جائے تو خوب مل کر چھان کر اس پانی میں پانی سرکہ اور روغن سرسوں ملا کر آگ پر رکھدیں۔ جب سرکہ اور پانی جل جاوے اور تیل رہ جاوے اُس وقت اتار لیں۔ پھر اس میں اول الذکر ادویہ جو خوب باریک اور کھرل شدہ ہوں اچھی طرح ملا دیں۔ اس مرکب تیل میں سے تھوڑا سا مل کر دو گھنٹے کے بعد گرم پانی سے کاربالک صابون یا نیم کے صابن سے مل کر خوب اچھی طرح نہا ڈالیں۔ ہر دو اقسام کی خارش کو مفید و مجرب ہے۔ **دوائے خارش کافور والی** مردار سنگ ۱ تولہ۔ کشتہ سفید ۱ تولہ۔ کافور ۱ تولہ۔ کمیلہ ۱ تولہ۔ بورک ایسڈ ۱ تولہ۔ زنک آکسائڈ ۱ تولہ۔ نیلا تھوتھا ۳ ماشہ۔ ان دواؤں کو الگ الگ پیس کر ململ کے کپڑے میں چھان لیں اور ایک شیشی میں محفوظ رکھیں۔ ضرورت کے وقت اس تیار شدہ دوا میں سے ۳ ماشہ دوا لے کر مسکہ گاؤ تازہ ۲ تولہ میں ملا کر استعمال کرائیں۔ (تر و خشک دونوں قسم کی خارش کے لئے مفید ہے)

نوٹ ضروری اگر اس دوا کو آتشک یا سوزاک والوں کو استعمال کرائیں تو نیلا تھوتھا نکال دیں۔ ورنہ بڑے بڑے سرخ دھبے پڑ جائیں گے۔

ماخوذ (حکیم حاذق گجرات)

فلمی دُنیا



فلم اور سماجی اصلاح

انسان فطری طور پر قدامت پرست واقع ہوا ہے اور نئی باتوں کو شبہ اور غیر مطمئن نگاہوں سے دیکھنے کا عادی ہے۔ وہ اپنے قدیم رسم و رواج پر جائز تنقید اور اپنی سوشل کمزوریوں کا ذکر تک سننا پسند نہیں کرتا۔ کبھی کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ قدیم رسم و رواج سے محبت کرنے والے اصحاب اپنی غلطیوں کو تسلیم نہیں کرتے اور اس معاملہ میں زیادہ سے زیادہ نقصان برداشت کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں سب سے پہلی ضرورت اس بات کی ہے کہ سماج سدھار سے متعلق ہم جیسی بھی تحریک چلائیں وہ بالکل غیر جانبدارانہ اصول پر قائم ہو۔ کوئی بھی جانبدارانہ تحریک ملک کے تمام فرقوں اور اقلیتوں کو مطمئن نہیں کرسکتی۔ یہی سبب ہے کہ لوگ قدیم زمانے سے سوشل اصلاح کے لئے کہانیاں نظم۔ ناول۔ ناٹک وغیرہ کا استعمال کرتے آئے ہیں۔ موجودہ زمانے میں یہ مقصد ٹاکی سنیما کے ذریعہ بہت کچھ واضح کیا جا سکتا ہے کیونکہ ناطق معکوسات کی تخلیق مندرجہ بالا اصولوں کے ارتباط سے ہوتی ہے۔ اور اس کے ذریعہ ہر قسم کے پیغامات بہت تھوڑے وقت میں اور زیادہ سے زیادہ موثر طریقے سے عوام تک پہونچائے جا سکتے ہیں۔ ایک انگریز مفکر کہتا ہے۔

"صحیح واقفیت۔ عمل کی پاکیزگی۔ خیالات کی روانی اور دیگر امور پر عبور حاصل کرنے کے لئے ہی تعلیم دی جاتی ہے۔ جن ذرائع سے ان مقاصد کی تکمیل میں امداد مل سکے انھیں نصاب تعلیم میں شامل کر لینا چاہیئے۔ سینما ایک ایسا ہی ذریعہ ہے"

انگلستان کے لارڈ چیف جسٹس ہیورٹ نے بھی ایک موقع پر کہا تھا۔

"جو طاقت اور اعمال موجودہ زمانہ میں عوام کے مذاق پر اثر ڈالتے ہیں اُن میں سینما سب سے زیادہ موثر ایجاد ہے"

اس میں شبہ نہیں کہ مندرجہ بالا بیانات کے مطابق سینما واقعی ایک قابل قدر ایجاد ہے۔ اگرچہ ہمارے ملک میں اس کا استعمال محض تفریح کے طور پر کیا جاتا ہے۔ لیکن اگر ہم چاہیں تو اسے کارآمد بنا کر ملک اور سوسائٹی کو بہت کچھ فائدہ پہونچا سکتے ہیں۔ اس حقیقت سے شاید کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ فلم تعلیم پھیلانے کا بہترین ذریعہ ہے۔ اس کی امداد سے بہت قلیل عرصہ میں عوام کو پڑھنا لکھنا سکھایا جا سکتا ہے۔ اور دیگر کام کی باتیں بتائی جا سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ حفظان صحت سے متعلق واقفیت پھیلانے کے لئے بھی یہ ایک مفید ترین ایجاد ہے۔ دُنیا کے تمام ترقی یافتہ اور مہذب ملکوں میں سلولائڈ کے ان ٹکڑوں کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ وہاں سینما کے ذریعہ تاریخ جغرافیہ حساب۔ جیومٹری۔ طب۔ سائنس۔ عسکریت۔ جہاز رانی۔ صنعت و حرفت۔ مہاجنی اور دیگر ضروریات زندگی سے متعلق تمام امور سمجھائے جاتے ہیں۔ روس کے ڈکٹیٹر اسٹالن نے گذشتہ پنجسالہ اسکیم میں کسانوں کی ترقی کا جو خیال رکھا تھا اُس میں سینما کو بہت اونچا درجہ دیا گیا تھا۔

ہنری ہشتم بادشاہ انگلستان اپنی نفس پرستی کے باعث تاریخ میں بہت بدنام ہے۔ طلبار کتاب میں صرف اتنا ہی پڑھتے ہیں کہ اس کی نظر جس نوجوان حسینہ پر پڑتی تھی وہ اسے حاصل کرنے کے لئے تخت تک بدل لیا کرتا تھا۔ لیکن اب وہ "ہنری ہشتم" نام کے فلم کے ذریعہ (جسے انگلستان کی ایک کمپنی نے ہزاروں پاونڈ کے صرفہ سے تیار کیا ہے) یہ تمام باتیں چلتی پھرتی تصویروں میں دیکھ لیتے ہیں۔

اب ہندوستان کو لیجئے۔ ہمارے ملک میں صرف تفریحات تک محدود ہے۔ اور یہ تفریحات کسی کارآمد اور پاکیزہ مطمح کے پیش نظر عوام کے سامنے نہیں رکھی جاتیں۔ آپ ہندوستان کے کسی بھی فلم پر نظر ڈالئے خواہ وہ نیو تھیٹرز کا ہو۔ پربھات کا یا اور کسی کمپنی کا۔ آپ کو یہ سمجھنے میں ذرا بھی دشواری نہیں ہوگی کہ تعلیمی نقطۂ نگاہ سے اس کو کوئی معیاری درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ حکومت ہند بھی اس طرف سے تقریباً غافل رہی ۱۹۲۸ء میں ہندوستان کی مرکزی حکومت نے ایک "انڈین سینماٹوگراف کمیٹی" کی بنیاد رکھی تھی جس نے اپنی رپورٹ میں کہا تھا کہ فلم کے ذریعہ طریقۂ تعلیم میں جان پیدا کی جا سکتی ہے۔ لیکن حکومت نے اس کمیٹی کی سفارشات پر توجہ مبذول نہیں کی۔ مرکزی وزیر تعلیم اور صوبائی محکمۂ تعلیم ہمیشہ اقتصادی بدحالی کو سامنے رکھ کر طریقۂ تعلیم میں سینما کو مناسب جگہ دینے میں معذوری ظاہر کرتے آئے۔

۱۹۳۷ء کے موسم خزاں میں شملہ کی پہاڑیوں پر صوبائی محکمۂ تعلیم کے وزراء کی کانفرنس میں سینما کے ذریعہ تعلیم دینے کے طریقے کو قابل قبول سمجھا گیا تھا۔

ریویو

جناب آغا سرخوش دہلوی خلف حضرت آغا شاعر قزلباش مرحوم کی ادارت میں "چمنستان" ایک ماہانہ صحیفہ دہلی سے شائع ہو رہا ہے۔ اس کا دوسرا نمبر ہمارے سامنے ہے۔ اصولاً ہم کسی رسالے پر اس وقت تک تنقید نہیں کرتے جب تک اس کے پانچ چھ نمبر شائع نہ ہو جائیں۔

لیکن "چمنستان" کی خصوصیات نے ہمیں اپنے قاعدے کے خلاف تبصرے پر مجبور کر دیا۔ پہلے ہی نمبر کی دلکشی عروسِ نوخیز بن کر نگاہ کو دعوتِ حسن دے رہی تھی اور دستِ شوق چاہتا تھا کہ فوراً گھونگھٹ اُلٹ دیا جائے کہ دوسرا نمبر بصد ناز و تمکین ہمارے سامنے آیا، اور ہم نے کہا کہ واقعی یہ بالکل سچ ہے کہ ع

نقاش نقشِ ثانی بہتر کشد ز اول

اب جو ورق گردانی کی جاتی ہے تو سر سے پاؤں تک مرصع نظر آتا ہے۔ حصۂ نظم کو دیکھتے ہیں تو "ارشاداتِ عالیہ" "سازِ ہستی" "نغیرِ فطرت" "باقیاتِ فانی" ایسا پاکیزہ کلام ہے، جسے بار بار پڑھتے ہیں اور طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ حصۂ نثر پر جب نظر پڑتی ہے تو "پوشیدہ" "دلی اور دلی والے" "آغا شاعر" وغیرہ ایسے شاہکار مضامین ہیں۔ جن پر ہماری زبان برسوں ناز کرے گی۔ لکھائی چھپائی۔ کاغذ سب دیدہ زیب۔ غرض ہر خوبی آپ اپنا جواب ہے۔ پس ہم اپنے قارئین سے سفارش کرتے ہیں کہ وہ چمنستان کو بنظرِ غائر دیکھیں اور اس ہونہار صحیفہ کی قدر دانی فرمائیں۔ قیمت سالانہ دو روپے۔ ملنے کا پتہ۔ قصرِ شاعر نکلسن روڈ دہلی۔

(مُدیر)

(بقیہ مضمون صفحہ ۵)

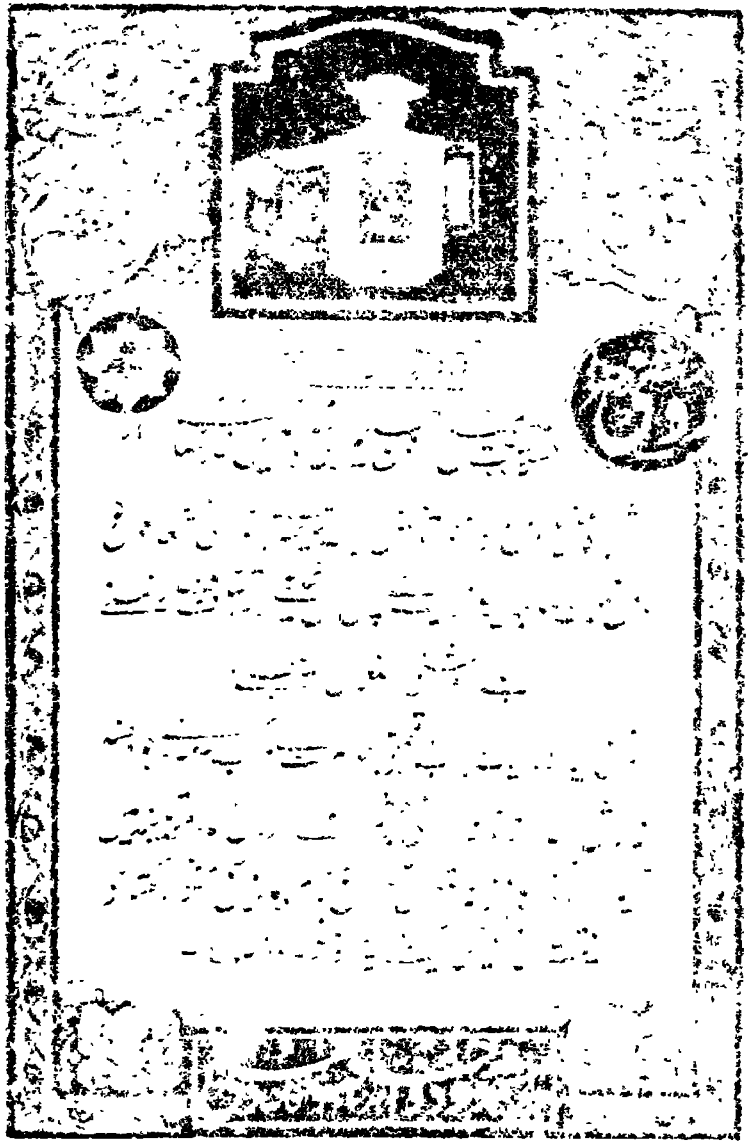
اس کے بعد کئی مرتبہ اس قسم کی خبریں سننے میں آئیں۔ لیکن نتیجہ کیا برآمد ہوا یہ ہمارے سامنے ہے۔

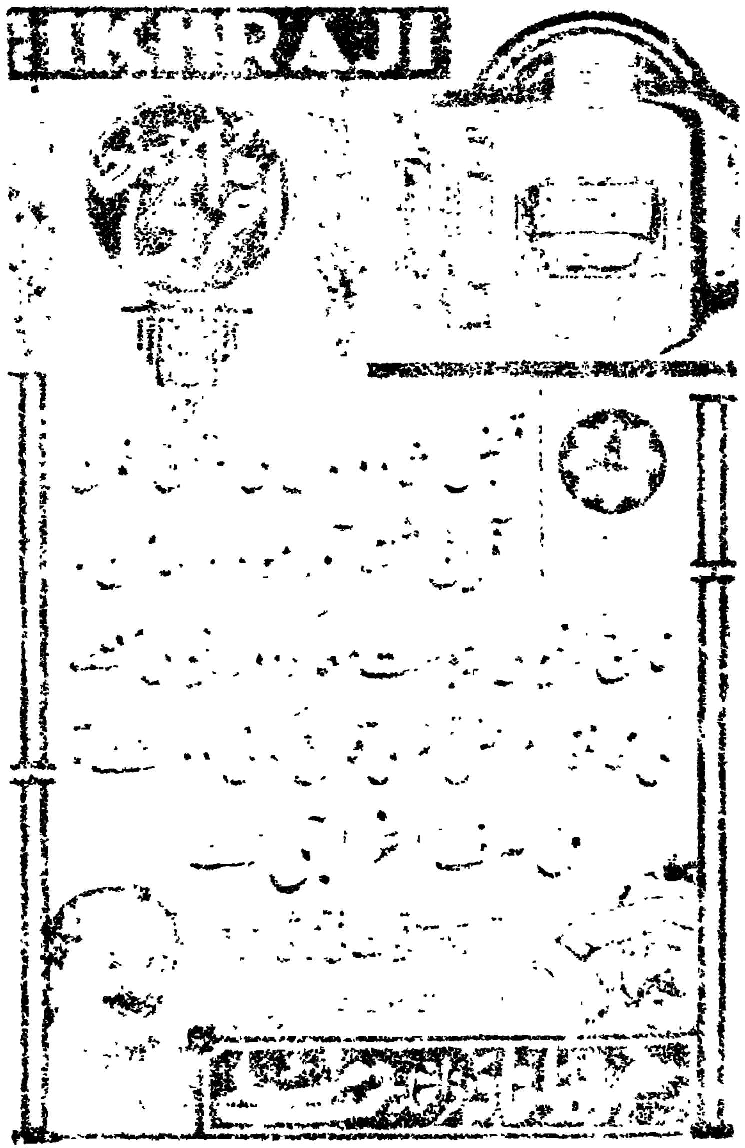
ہم نے اس مضمون میں تعلیم کو اس لئے اہمیت دی ہے کہ سوسائٹی کی اصلاح کے لئے سب سے پہلا قدم تعلیم ہے۔ اب بڑے لوگوں کے دماغ میں یہ بات آگئی ہے کہ سینما کو سماج سدھار کا بہترین ذریعہ بنایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس طرح کے چند فلم سرکاری اور غیر سرکاری اداروں نے تیار کرائے ہیں اور وقت وقت پر شہروں اور دیہاتوں میں ان کی نمائش کی جاتی ہے۔ لیکن اس ملک کی ضرورت کو دیکھتے ہوئے ابھی اس میں اصلاحات کی حد سے زیادہ گنجائش ہے۔ سینما صرف امراض سے بچنے کی تعلیم نہیں دیتا۔ بلکہ عوام کو ضروریاتِ زندگی کے متعلق سب کچھ بتا سکتا ہے۔

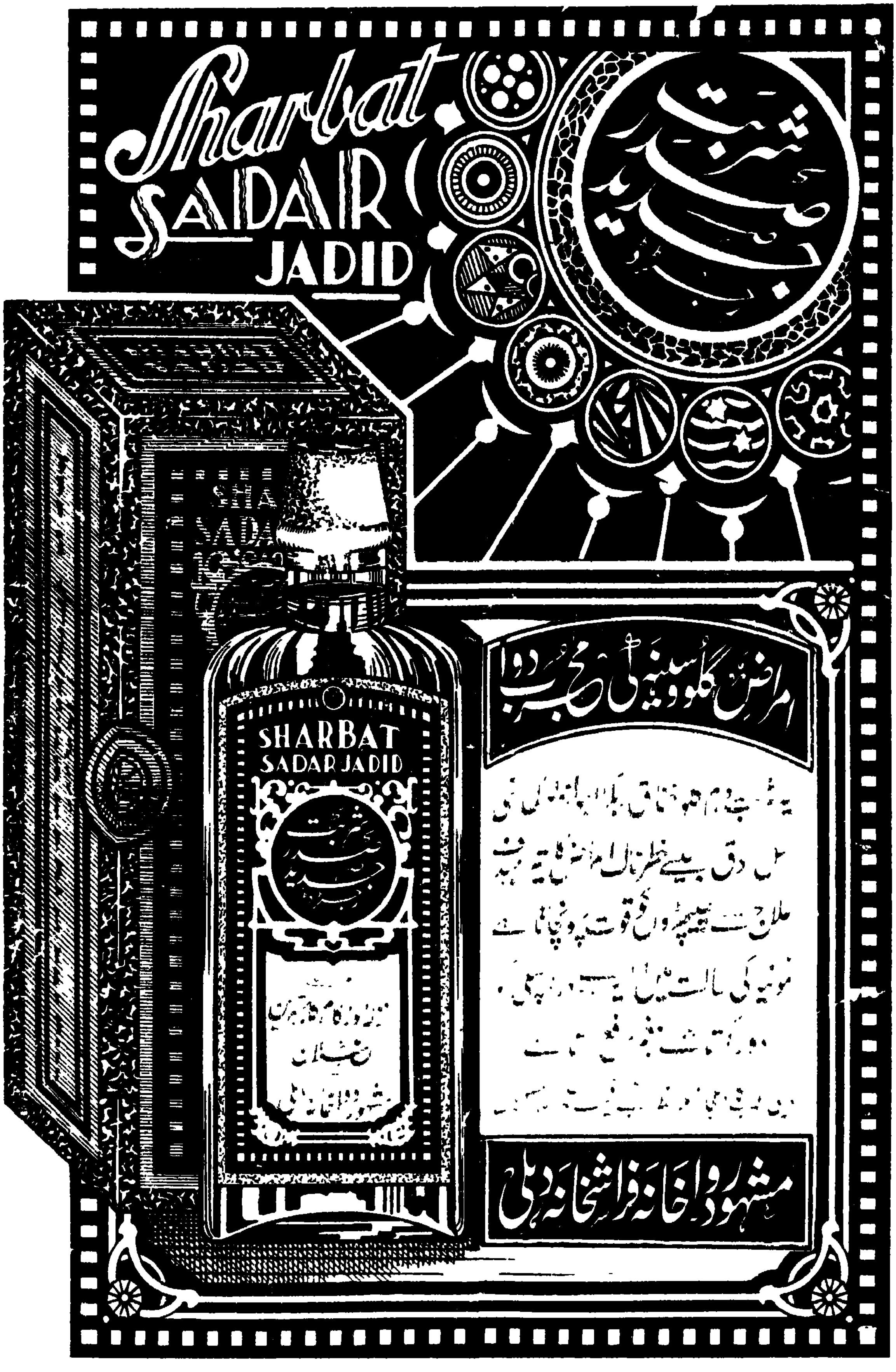
ہماری ہندوستانی سوسائٹی پرانے رسم و رواج کی حامی ہے۔ اس لئے سینما کو نصابِ تعلیم میں شامل کرنے سے پہلے نتائج پر غور کر لینے کی ضرورت ہے۔ فلم "پکار" کے متعلق ہم نے یہی سمجھا تھا کہ یہ ایک عظیم الشان فلم ہوگا۔ لیکن دیکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ شہنشاہ جہانگیر کے انصاف پر اُلٹی چھری پھیر دی گئی ہے، "اچھوت کنیا" "جنم بھومی" "ابھاگن" "دنیا نہ مانے" بیشک اچھے قسم کے فلم ہیں۔ لیکن ان میں جنسی محبت اس قدر غالب آگئی ہے کہ اصلاح کا کوئی پہلو نمایاں نہیں ہوتا۔ خصوصاً نیو تھیٹرز نے محبت کی تعلیم کا ایک خاص معیار قائم کر دیا ہے اور لفظ "پریم" کو عالمگیر شہرت دے کر اچھے خاصے ہوشمندوں کو مجنوں بنا رکھا ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ہندوستانی فلم انڈسٹری ابھی اپنے گہوارہ میں ہے۔ کہنے کے لئے اس کی داغ بیل گذشتہ جنگِ عظیم سے پہلے پڑ چکی تھی۔ لیکن ۱۹۲۰ء کے بعد کچھ قابلِ قدر ترقیاں ہوئی ہیں ۱۹۳۰ء میں تقریباً دو کرور روپے فلموں کی تیاری پر لگائے گئے تھے۔ اور اس سے چار گنا زیادہ منافع حاصل کیا گیا تھا۔ لیکن فلموں سے عوام کو جو کچھ فائدہ پہونچ سکا ہے اور پہونچ رہا ہے اس کا اندازہ ان فلموں کے گانوں سے لگایا جا سکتا ہے جو اکثر نیچے درجے کے فلم بین حضرات سڑکوں پر گاتے پھرتے ہیں۔

(وحشی آروی)



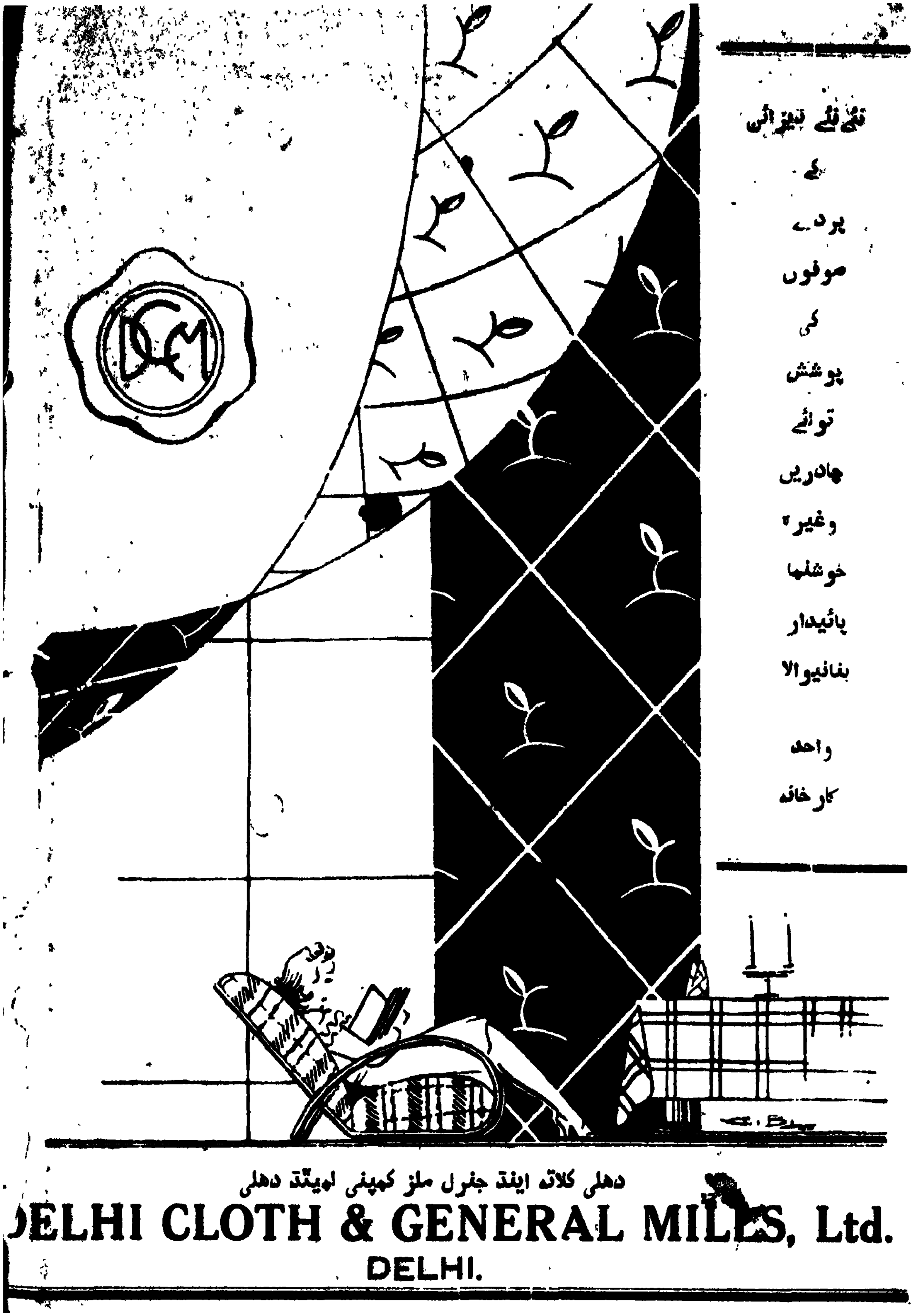

IKHRAJI



Sharbat
SADAR
JADID
شربت صدر جدید
امراض گلو و سینہ کی مجرب دوا
SHARBAT
SADAR JADID
مشہور دواخانہ فراشخانہ دہلی



لیتھا آرٹ پریس، روشن محلہ، لاہور



نئے نئے ڈیزائن
کے
پردے
صوفوں
کی
پوشش
تولئے
چادریں
وغیرہ
خوشنما
پائیدار
بنانیوالا
واحد
کارخانہ
DCM
دہلی کلاتھ اینڈ جنرل ملز کمپنی لمیٹڈ دہلی
DELHI CLOTH & GENERAL MILLS, Ltd.
DELHI.

مشہور دہلی

ایڈیٹر: حکیم محمد تقی

ہندوستان کا علمی، ادبی، اخلاقی، طبی اور فلمی ماہنامہ جو دارالسلطنت دہلی سے ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے

جلد | بابت ماہ ستمبر اکتوبر سنہ ۱۹۴۱ء | نمبر ۶

قیمت سالانہ: اعزازی چندہ
ایک روپیہ آٹھ آنے: پانچ روپیہ

دارالاشاعت
ممتاز منزل۔ فراش خانہ دہلی

ممالک غیر سے: قیمت فی پرچہ
چار شلنگ: ڈھائی آنے

نوٹ:- مشہور بابتہ ماہ اگست سنہ ۴۱ء میں "تذبذب" کے زیر عنوان جناب سید محبوب الرضوی دیوبندی کا افسانہ شائع ہوا تھا۔ ناظرین کرام نوٹ فرمالیں۔

عید نمبر

کی تیاری میں عملہ "مشہور" پورے انہماک کے ساتھ مصروف ہے اور اس غیر معمولی مصروفیت کی وجہ سے ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اکتوبر کا مشہور شائع نہ کیا جائے اور اُس کے بدلے نہایت ہی ضخیم شاندار عید نمبر پیش کیا جائے لہٰذا اس رسالہ کو ستمبر اکتوبر کا مشترک پرچہ سمجھئے۔

عید نمبر کی معنوی خصوصیات

اس نمبر کے لئے خاص طور پر ہندوستان کے مشہور ارباب قلم کو مضامین لکھنے کی دعوت دی گئی ہے چند حضرات کے اسمائے گرامی تحریر کئے جاتے ہیں:۔ پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی، ڈاکٹر شیخ عبدالحق صاحب سیکرٹری انجمن ترقی اُردو، پنڈت برجموہن صاحب دتاتریہ کیفی، خواجہ محمد شفیع صاحب، شاہد احمد صاحب مدیر ساقی، حکیم عبدالحمید صاحب نگران "ہمدرد صحت"، ملا رموزی صاحب، ملا واحدی صاحب، حضرت ماہر القادری صاحب، مولانا ظفر علی خاں صاحب۔ مولینا اظہر صاحب امرتسری، جناب شوکت تھانوی، جناب کوثر چاندپوری، حاجی لق لق صاحب، سندباد جہازی اور ان کے علاوہ بعض نئے نئے ادبا بھی اس بزم میں شریک ہوں گے لہٰذا یہ نمبر ہر لحاظ سے دلکش۔ دلچسپ اور جاذب نظر ہی نہیں ہوگا۔ بلکہ اُردو ادب کا ایک ایسا بے مثل ذخیرہ جمع ہو جائے گا جس پر ہماری زبان برسوں ناز کرے گی۔

مصوّری کے شاہکار نمونے

چونکہ شاعری، موسیقی، آرٹ ادب ہی کے اجزا ہیں اس لئے کوشش کی جا رہی ہے کہ آرٹ کے ایسے دلفریب نقوش پیش کئے جائیں کہ ہر ناظر بے ساختہ "سبحان اللہ" کہہ دے۔

بعض تصاویر کے متعلق سحر انگیز نظمیں بھی پیش کی جائیں گی اور ہندوستان کے مشہور شعرا حضرت بیخود دہلوی۔ حضرت سائل دہلوی۔ حضرت فانی بدایونی علامہ سیماب اکبرآبادی۔ حضرت ساغر میرٹھی۔ حضرت احسن پھپھوندی۔ حضرت بہزاد لکھنوی۔ حضرت نوح ناروی، حضرت نازش رضوی۔ جگر مرادآبادی۔ حضرت ساحر دہلوی کا شورش انگیز تازہ کلام اسی نمبر میں ملاحظہ فرمائیگا پس یہ۔

محشر خیز نمبر

جس کی قیمت ۱۰ر ہوگی اگر آپ مفت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو آج ہی عہر سالانہ چندہ بھیجکر خریدار بن جائیے۔ بک سیلر و ایجنٹ حضرات کے لئے یہ نادر موقع ہے۔ عید کی مسرتوں میں ہر شخص اس شاہد معنی کو خریدنے کی کوشش کرے گا۔ لہٰذا جس قدر کاپیاں مطلوب ہوں ابھی سے دفتر کو اطلاع دے دیں بعد میں کسی قیمت پر بھی یہ نمبر دستیاب نہ ہوگا۔

المشتہر

منیجر رسالہ مشہور فراش خانہ دہلی



ہندوستانی لائبریریاں

(از جناب سید سجاد حسین صاحب رضوی جارچوی - لائبریرین میرٹھ کالج - میرٹھ)

ہندوستان میں لائبریریوں کی طرف عدم توجہی

ملک کی وسعت کو دیکھتے ہوئے ہندوستان میں لائبریریوں کی کمی اتنی ہی حیرت انگیز ہے جتنا کہ عام تعلیم یافتہ لوگوں کا ملک کی آبادی سے تناسب۔ کچھ دن ہوئے لکھنؤ یونیورسٹی کے آنریری لائبریرین ڈاکٹر ولی محمد نے یو۔پی کی لائبریریوں کی ڈائرکٹری تیار کی۔ اس میں چھوٹی بڑی، اچھی بُری، سب ہی قسم کی لائبریریاں ہیں ان کی کل تعداد ۵۱۹ ہوئی جن میں سے ایسی لائبریریاں جن میں پانچ ہزار یا اس سے زیادہ کتابیں ہوں کُل اڑتالیس تھیں۔ ایسی لائبریری کہ جس میں ایک لاکھ کتابیں ہوں ایک بھی موجود نہیں۔ حالانکہ جیسا فاضل لائبریرین نے تمہید میں بتایا ہے کہ ملک اٹلی میں جو رقبہ میں اور آبادی میں قریب قریب اس صوبہ (یوپی) کے برابر ہے۔ ۵۷ لائبریریوں میں ایک لاکھ سے اوپر کتابیں موجود ہیں۔ اگر لائبریریوں کی قلت کے بعد اس امر کی طرف غور کرتے ہیں کہ اس قلیل تعداد ہونے کے باوجود موجودہ لائبریریوں سے بھی کس قدر کم فائدہ اٹھایا جاتا ہے تو اور زیادہ افسوسناک نتیجہ پر پہونچتے ہیں۔ ایک طرف صحیح فن لائبریری کا نہ ہونا اور دوسری طرف عام لوگوں کی بے توجہی۔ نتیجہ یہ ہے کہ عام آدمی جن کو سڑک کی لالٹینوں کی روشنی کی ضرورت کا صحیح اندازہ ہے علم کی روشنی کو غیر ضروری سمجھتا ہے۔ ہندوستانی لائبریریاں اس وقت ملک کی عام معاشرتی اور ثقافتی زندگی میں اس مقام سے بہت دور ہیں جو ان کا صحیح مقام ہونا چاہیئے۔

لائبریریوں کا مشن

یہ محسوس کرنے کی بات ہے کہ اس ملک میں لائبریریوں کی کس قدر ضرورت ہے۔ ہندوستان میں ایسے آدمی جو اپنا نام بھی لکھنا نہیں جانتے کتنی تعداد میں ہیں۔ ملک میں کتنے ہی ذی علم اور بلند اخلاق و بلند مذاق افراد کیوں نہ ہوں۔ ملک کی تعلیمی اور ثقافتی سطح کا اندازہ ایک عام آدمی کی تعلیم و تربیت کے معیار سے لگایا جائے گا۔ ملک میں کسی قسم کی ترقی یا اصلاح کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہر آدمی کو اپنے فرائض اور حقوق کا صحیح اندازہ ہو اور نیز اس بات کا صحیح احساس ہو کہ وہ کسی سماجی سلسلہ کی کڑی ہے۔ اب اکثر صوبجاتی حکومتیں اس اہم ضرورت کی طرف متوجہ ہوئی ہیں۔ لیکن ان کے عزم میں ابھی اتنی پختگی نہیں آئی ہے کہ وہ اس جہالت کے دیو کو پچھاڑ لیں۔ ہر اس شخص کو جو اس فن کا ایک فرد ہے۔ یا اس فن سے دلچسپی رکھتا ہے یا کروڑوں بندگان خدا کی اس حالت کو درست کرنے کی ضرورت سمجھتا ہے۔ یہ سوچنا لازمی ہے کہ لائبریریاں اس مبارک جہاد میں کس طرح صرف آلاتِ حرب ہی کا کام نہیں بلکہ طریقۂ حرب کو بھی زیادہ موثر بنا سکتی ہیں۔

اکثر وہ لوگ جو ابتدائی تعلیم کے بعد ایسی زندگی کے دھندوں میں پڑ جاتے ہیں جن میں لکھنے پڑھنے کا بہت کم ہوتا ہے کچھ دن کے بعد اس تعلیم سے بھی جو انھوں نے حاصل کی تھی بالکل معرا رہ جاتے ہیں۔ اس طرح اس روپیہ کی جو ان کی ابتدائی تعلیم پر صرف کیا جاتا ہے ایک کافی تعداد محض ضائع جاتی ہے۔

ہندوستان میں لائبریریوں کے مشن کا دوسرا کام یہ ہے کہ وہ اس حقیقت کو زندہ کردے کہ پڑھے لکھے آدمی کے معنی ایسی آدمی کے نہیں ہیں جو اپنے دستخط کرنا جانتا ہو اور آسان خط پڑھ سکتا ہو۔ بلکہ ایسے آدمی کے ہیں کہ جو چھپے ہوئے الفاظ سے کچھ فائدہ بھی حاصل کر سکتا ہو۔

ایک اور بات جو اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہے وہ یہ ہے کہ اکثر وہ لوگ بھی جو اعلےٰ تعلیم حاصل کرتے ہیں اور یونیورسٹی کی سند حاصل کر لیتے ہیں اپنے کام کاج میں پڑ کر اپنی کتابوں کو بالکل

خیرباد کہدیتے ہیں اور ان کی علمی دلچسپی زیادہ سے زیادہ اخبار پڑھنے تک محدود رہ جاتی ہے۔ ایسے لوگ علمی دنیا کے مرتد کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔ جہاں تک ان کا واسطہ ہے لائبریریوں کا مشن اس فتنہ کی روک تھام کرنا ہے اور کتابوں کا حسن اور صداقت دکھا کر پھر راہ راست پر لاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ کوئی مشن کتنا ہی مفید اور سچا کیوں نہ ہو۔ جب تک اس کے کارکن آپس میں منظم اور دوسروں سے بااخلاق نہ ہوں۔ اس وقت تک وہ مشن پورے طور پر ترقی نہیں کرسکتا۔ اسی طرح تاوقتیکہ لائبریریوں میں کام کرنے والے آپس میں منظم اور متحد نہ ہوں سو قت تک لائبریریاں اپنے فرض سے بحسن وخوبی سبکدوش نہیں ہوسکتیں۔ تعجب ہے کہ لائبریریوں کی الماریاں بنانے کے لئے تو ایک ہوشیار اور تجربہ کار مستری کی ضرورت پڑتی ہے لیکن لائبریری کو چلانے کے لئے صرف اتنی قابلیت کی ضرورت سمجھی جاتی ہے۔ جتنی ایک قبرستان کے رکھوالے کی۔ جو مُردوں کے نام رجسٹر میں لکھنا جانتا ہو اور قبروں کی دیکھ بھال کرسکتا ہو۔

جہاں تک عام پڑھنے لکھنے والوں کا تعلق ہے۔ لائبریرین کو یہ بات جان لینی چاہیئے کہ اس کی ہر کتاب کا کوئی پڑھنے والا ہے اور ہر پڑھنے والے کے لئے ایک کتاب ہے۔ اور اس کا فرض یہ ہے کہ اس کتاب اور اس پڑھنے والے کو انتہائی سہولت کے ساتھ اور بلا کسی رکاوٹ کے آپس میں ملا دیا جائے۔ ہر پڑھا لکھا آدمی یہ محسوس کرے کہ اس کو وہ حرف طلسم آتا ہے جس کے زبان پر آتے ہی علم اور معلومات کے خزانے کے دروازے اس کے لئے کھل جائیں گے صرف یہی نہیں بلکہ اس کی خواہش کے مطابق جو چیز وہ چاہتا ہے خود اسکے سامنے آجائے گی۔

جہاں تک آپس میں لائبریریوں کا تعلق ہے وہ ایسے لین دین کے رشتہ میں منسلک ہوں کہ ایک ہی جسم کے دوران خون کی نالیاں معلوم ہوں ہر اس طالب علم کو جو کسی خاص شعبہ میں مصروف تحقیق ہو یا ہر شہری کو جو کسی خاص مضمون پر کوئی کتاب جانتا ہے۔ اس بات کا یقین ہو کہ لائبریری کے ذریعہ اس کی ضرورت بلا کسی دشواری کے پوری ہوجائیگی

ہندوستانی موجودہ لائبریریوں کا ایک اور اہم مشن پہلے زمانہ میں لوگوں کے پرائیویٹ کتب خانے ہوتے تھے۔ ان کتب خانوں میں اکثر نادر کتابیں موجود ہوتی تھیں۔ چونکہ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر شخص کی اولاد بھی وہی علمی ذوق وشوق رکھتی ہو۔ جو اس میں ہے خود ہماری آنکھوں دیکھی بات ہے کہ دو صاحبان کی نادر کتابوں اور قلمی نسخوں کے ذخیرے اولاد کی ناقدردانی کی وجہ سے گرد وغبار کی نذر اور کیڑوں کی خوراک ہوگئے۔ دوسرے اگر اس قسم کے ذخیروں کے نسخے کسی ایک جگہ محفوظ ومقفل بھی ہوں تو لوگوں کو دنیا کو ان کی بقا سے کیا فائدہ ان کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ لہذا موجودہ لائبریریوں کا یہ ایک ضروری اور اہم مشن ہے کہ وہ اس قسم کے نسخہ جات کو مہیا اور اکٹھا کرکے کسی ایسی **مرکزی ریفرنس لائبریری** تک پہونچائیں کہ جہاں ان کی بقا کی بھی ضمانت ہو اور دنیا کے لئے بھی یہ مفید ثابت ہوں۔

بچوں اور عورتوں کی لائبریریاں ضمناً یہ بات بھی عرض کردینی بے موقع نہ ہوگی کہ کسی ملک کی ترقی میں بچوں اور عورتوں کا کافی حصہ ہوتا ہے۔ بچے تو ہماری آیندہ امیدوں کا مرکز ہے۔ کل یہی قوم بنیں گے۔ اگر ان میں ابھی سے کتابیں پڑھنے کی عادت نہ ڈالی جائے گی تو یہ فائدہ اور لطف کا ابدی سرچشمہ ان کیلئے ہمیشہ بند رہیگا۔ دیگر ممالک میں لائبریریاں بچوں کی ضروریات کا بہت خیال رکھتی ہیں۔ یہاں تک کہ پبلک لائبریریوں میں بچوں کی کتابوں کا ایک علیحدہ سیکشن ہوتا ہے۔ اور تجربہ بتلاتا ہے کہ بچوں میں یہ شوق بہت جلد پھیلتا ہے ہندوستان میں بھی یہ تجربہ بہت آسانی کے ساتھ کیا جاسکتا ہے۔ کہ ہر ایک (پبلک) لائبریری میں کم ازکم ایک ایسی الماری بچوں کے لئے مخصوص کردی جائے کہ جس میں آسان۔ خوشنما اور باتصویر ایسی کتابیں رکھی جائیں جن میں قومی۔ مذہبی۔ معاشرتی اور ملکی ترقی کے بہادرانہ قصوں کو نہایت آسان زبان میں لکھا ہو۔ اور جن کے پڑھنے سے بچوں کے شوق میں زیادتی ہو۔ اب رہا عورتوں کا سوال۔ ہمارے ملک کے مخصوص معاشرتی حالات نے اس مسئلہ کو ہمارے لئے اور بھی دشوار بنا دیا ہے لیکن کسی مسئلہ سے آنکھیں بند کرلینا یقیناً اس مسئلہ کا حل نہیں ہے۔ لائبریریوں اور ان کے اراکین کا فرض ہے کہ اس طرف جلد از جلد متوجہ ہوں۔

ہندوستان میں لائبریری تحریک یہ چند مقاصد ومسائل

رہیں جو ہندوستان میں لائبریریوں کے پیش نظر ہیں۔ یہ بات قابل تسلیم ہے کہ اس کام کے لئے حکومت کی اعانت کی سخت ضرورت ہے۔ صرف زبانی ہمدردی ہی نہیں۔ بلکہ اس ہمدردی سے اور زیادہ مفید اور مادی چیز یعنی روپیہ کی فراخدلی سے امداد۔ حکومت کو اس ضرورت کا احساس دلانے اور اس پر زور ڈالنے کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم ملکر صوبہ وار لائبریری انجمنیں قائم کریں اور ان کے ذریعہ سے اپنی ضروریات کو پورا کرانے کے لئے گورنمنٹ کی توجہ مبذول کرائیں۔ دوسرے اگر ہم متحد ہو جائیں تو بہت سا کام خود بھی انجام دے سکیں گے۔

یہ امر قابل اطمینان اور امید افزا ہے کہ ہمارے ملک میں گو لائبریری تحریک بہت نئی ہے اور انڈین لائبریری ایسوسی ایشن" کی تو عمر ہی کل سات برس کی ہے مگر اس عرصہ میں اس نے کافی کام انجام دیا ہے۔ اس نے ملک کے بڑے بڑے محکمہ تعلیم کے افسروں کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کر لیا۔ ملک کی اکثر لائبریریوں کو تنظیم کے سلسلہ میں پرو دیا۔ حکومت اور ملک پر لائبریری کے مسائل کو اچھی طرح واضح کر دیا۔ اور اسطرح اپنے وجود کی اہمیت کو اچھی طرح ثابت کر دیا ہے اسکا مستقبل اس کے ماضی سے بھی زیادہ شاندار ہے۔ اور امید ہے کہ عنقریب کہ یہ ایک ایسی انجمن بنجائے گی کہ جس سے ملک کی امیدیں بھی وابستہ ہونگی اور حکومت بھی اس کی بات کو نہ ٹال سکے گی۔ اکثر مقامات پر لائبریرین ٹریننگ کے لئے کلاسیں بھی قائم کر دی گئی ہیں۔ اور اس طرح ملک کی ایک نہایت اہم ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ممکن ہے بعض اور لائبریریاں بھی اس تعلیم و تربیت کے لئے اپنے یہاں کلاسیں کھولدیں۔ اگر ملک میں لائبریریاں بڑھتی رہیں تو ان کلاسوں کا کھلنا لازمی ہوگا۔

سر تیج بہادر سپرو نے تو اپنی رپورٹ میں اس کو بے روزگاری دور کرنیکا ایک ذریعہ تجویز کیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لائبریرین کی وقعت بڑھ جائیگی اور وہ لوگوں کی نگاہ میں گریجویٹ کلارک نہیں رہیگا اور لوگوں کو بھی اس تحریک میں دلچسپی پیدا ہوگی۔ اور ان مسائل کو محسوس کریں گے جن کو پورا کرنے کے لئے " لائبریری ایسوسی ایشن" وجود میں آئی ہے۔

پنجاب لائبریری ایسوسی ایشن۔ لاہور سے ایک رسالہ دی ماڈرن لائبریرین The modern Librarian

بھی جاری ہے۔ جس میں اس فن کے متعلق نہایت مفید اور کارآمد مضامین ہوتے ہیں۔

ہندوستانی لائبریریوں کے تین اہم موضوع

اب ہم اس باب میں تین اہم موضوعات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ جن کا علم ہر لائبریرین کو ہونا نہایت ضروری ہے۔ اور جو ہندوستان کے حالات کو دیکھتے ہوئے بہت زیادہ توجہ طلب ہیں۔

(۱) لائبریریاں اور ان کے حلقہ اثر کی توسیع۔

(۲) لائبریریوں کا باہمی اتحاد اور آپس کا لین دین

(۳) لائبریریاں اور تعلیم بالغان و تعلیم عامہ

لائبریریاں اور ان کے حلقہ اثر کی توسیع کی ضرورت

اس میں کوئی شک نہیں کہ لائبریری کے قیام کے لئے پہلی شرط تعلیم یافتہ آدمیوں کی موجودگی کی ضرورت ہے۔ غیر تعلیم یافتہ آدمیوں کے ملک میں دنیا کی بہترین لائبریری از خود علم نہیں پھیلا سکتی۔ اور پھر یہ بھی ضروری ہے کہ لائبریری کا نظام اور تنظیم نہایت با اصول طریقہ پر اور حالات کے موافق ہو۔ کہا جا سکتا ہے کہ لائبریری کا فرض محض ایک ضرورت کو پورا کرنا ہے۔ پیاسوں کو پانی سے سیراب کرنا ہے۔ کنویں کا یہ فرض نہیں ہے کہ وہ پیاسوں کے پاس جائے۔ پیاسوں کو اگر ضرورت ہو تو وہ کنویں کے پاس آئیں۔ مگر اس استدلال میں ایک نقص ہے وہ یہ کہ اگر اسی اصول پر کاربند ہوا جائے تو دنیا میں کوئی ترقی یا اصلاح ناممکن ہے جاہل آدمی علم کی ضرورت محسوس نہیں کرتا تاوقتیکہ اسکو اس ضرورت کا احساس نہ دلایا جائے غلام آزادی کی ضرورت نہیں سمجھتا جب تک اس کو اس کا احساس نہ دلایا جائے اسی طرح وہ لوگ بھی جو کتابیں پڑھنے کے شوقین نہیں ہیں کتاب پڑھنے کی ضرورت کو نہیں جانتے۔ کتاب پڑھے بغیر بھی ان کی زندگی گذر جاتی ہے۔ لیکن جو لوگ اس ضرورت کو سمجھتے ہیں ان کا یہ فرض ہے کہ وہ دوسروں کو اس ضرورت کا احساس دلائیں۔ مغربی ممالک جہاں کتابیں اتنی کس مپرسی کی حالت میں نہیں ہیں جتنی ہندوستان میں وہاں لائبریریاں اس قسم کے کاموں میں بہت دلچسپی لیتی ہیں جن سے لوگوں میں کتابیں پڑھنے کا اور زیادہ شوق پیدا ہو۔ چہ جائیکہ ہندوستان جیسے ملک میں کہ جہاں یہ شوق سرے ہی سے بہت کم ہو

یہاں تو ہم کو اس امر کی سخت ضرورت ہے کہ جس ممکن طریقہ سے ہو سکے یہ بات لوگوں کے ذہن نشین بلکہ دل نشین کر دیں کہ لائبریریاں کس اہم ضرورت کو پورا کر رہی ہیں۔

توسیع کے مقاصد } اس توسیع کے کام میں دو مقاصد مدنظر ہیں۔

(۱) لوگوں میں لائبریری کی آگہی Library Consciousness پیدا کرنا ان کے دل سے یہ خیال مٹا دینا کہ کتب بینی کا شوق کسی خاص طبقے سے متعلق ہے۔ اس بات کو ان کے دل میں جما دینا کہ کتب بینی ہر شخص کا محض فرض ہی نہیں ہے۔ بلکہ ہر شخص کے لئے ایک صفت کی تفریح ہے۔ یہ آگہی پڑھے لکھے آدمیوں میں پیدا کرنا۔ تعلیم یافتہ لوگوں میں پیدا کرنا۔ بچوں اور عورتوں میں پیدا کرنا۔ اور نہایت دلکش طریقے سے پیدا کرنا۔

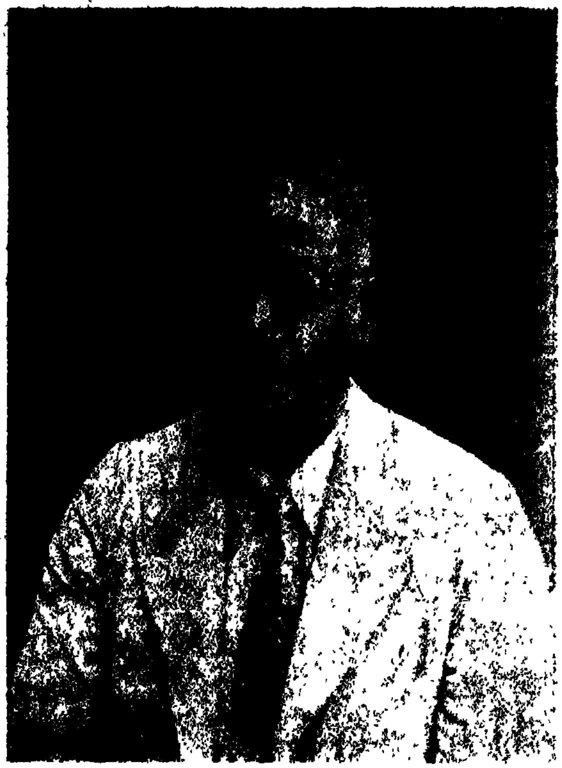
(۲) لائبریریوں کو ملک کی ثقافتی (   ) تحریکوں کا مرکز بنانا۔ اس بات کی کوشش کرنا کہ لائبریریاں سماج کی زندگی کی خاص لہر سے علیحدہ کوئی نمائشی چیزیں نہیں ہیں۔ بلکہ اس زندگی کے ایک خاص پہلو یعنی ثقافتی پہلو کا مرکز ہیں۔ اس طرح لائبریریوں کا سماج کے نقشہ میں ایک خاص مقام پیدا ہو جائیگا۔ اور ان کی ضرورت کا احساس اور زیادہ بڑھ جائیگا۔

توسیع کے طریقے } اس مقصد کو پورا کرنے کے بہت سے طریقے سوچے جا سکتے ہیں۔ یہ لائبریرین کی سمجھ۔ ہمت اور شوق کی بات ہے۔ اکثر باتوں میں اس کو دوسرے لائبریرین اور پبلک کے اکثر آدمیوں کی ہمدردی اور مدد کی ضرورت ہے لیکن اگر لائبریرین اپنی لائبریری کا اپنے آپ کو مرکز تصور کرتا ہے۔ اور لائبریری کو ایک مردہ عجائب گھر نہیں۔ بلکہ زندہ چیز سمجھتا ہے اور اس کے غور و پرداخت کو اپنا فرض جانتا ہے تو یہ ہمدردی حاصل کرنا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ ہم ذیل میں نہایت اختصار کے ساتھ کچھ طریقے لکھتے ہیں۔ جو لائبریریوں کی توسیع کے کام میں لائے جا سکتے ہیں۔ نیز ہمیں امید ہے کہ یہ مفید ثابت ہونگے۔

(۱) لائبریریاں اپنے گرد و پیش کی ادبی ثقافتی اور سائنٹفک سوسائٹی کی کارروائی میں حصہ لے کر پبلک کو اپنی طرف کھینچ سکتی ہیں۔ شہر میں یوم ٹیگور۔ یوم غالب۔ یوم اقبال وغیرہ وغیرہ منایا جا سکتا ہے۔ لہذا نہایت آسانی کے ساتھ لائبریرین ان مصنفین کی کتابیں اور ان کے متعلق جو کتابیں لکھی گئی ہیں عام پبلک کے دیکھنے کے لئے رکھ سکتی ہیں۔ کیونکہ جس روز اکثر ادب دوست حضرات کے ذہن میں ایک مصنف یا مفکر کی یاد تازہ ہوتی ہے تو وہ اس کی کتاب کے اور خود اس کے متعلق اور معلومات بہم پہونچانے کے شائق ہوتے ہیں۔ اگر ایسے وقت میں وہ کتابیں ان کی نگاہوں کے سامنے پڑ گئیں تو بہت ممکن ہے کہ ان کتابوں سے ایک قائم رہنے والا رابطہ پیدا ہو جائے۔ اسی طرح اگر کسی سائنٹفک انجمن کا جلسہ ہے تو اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اسی قسم اور اسی مضمون کی کتابوں کی نمائش کی جائے بلکہ جہاں تک ممکن ہو سکے ایسے جلسوں کو اپنے ہال میں منعقد کرنے کی دعوت دیجائے یہ لازمی بات ہے کہ ایسی تقریروں اور خطبوں میں اکثر کتابوں کے حوالے ہوتے ہیں۔ اور لوگوں کے دلوں میں فطری طور پر ان کتابوں کے دیکھنے کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ لہذا ایسے موقعوں پر۔ اس قسم کی کتابوں کو ایک نمایاں جگہ پر رکھا جائے تاکہ حاضرین جلسہ کی نگاہ ان پر بہ آسانی پڑ سکے۔ اسکولوں میں بھی اس قسم کے جلسے ہوتے رہتے ہیں ان میں بچوں کے شوق کی کتابیں جو باتصویر اور رنگین بھی ہوں نمائش کی جائیں۔ اگر کوئی سیاسی کانفرنس ہے تو سیاست کے بڑے بڑے ہیروؤں کی سوانحعمریاں۔ سیاست کی عام پبلک کے لئے لکھی ہوئی کتابیں نمائش کے طور پر رکھی جائیں۔ کنووکیشن کے مواقع بھی اس کام کے لئے بہت موزوں ہیں۔ اس سے ایک تو لوگوں میں اس شعبہ کی کتابیں پڑھنے کا ذوق پیدا ہوگا۔ دوسرے یہ خیال پیدا ہوگا کہ لائبریری کس طرح ملک کی۔ ادبی سیاسی، سائنٹفک۔ ہر شعبہ سے وابستہ ہے۔ اور تیسرے لائبریری ملک کی ادبی۔ ثقافتی تحریکوں کا مرکز بن کر سماج میں ایک باعزت جگہ حاصل کرے گی۔

(۲) کانفرنسوں اور کنووکیشن سے فائدہ اٹھانے کے علاوہ لائبریریوں کو از خود لوگوں کو اپنی طرف راغب کرنے کی سبیلیں اختیار کرنی چاہئیں۔ عام دلچسپی اور ضروریات کے مضامین پر لکچر دلوانے چاہئیں اگر کوئی مفید اور بہت دلچسپ مضمون ہو تو اس پر لکچروں کا ایک سلسلہ قائم کرنا چاہیئے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ یہ لکچر جہانتک ممکن ہو سکے لائبریری ہی کے احاطہ میں ہوں اور ان سے متعلق کتابیں لوگوں کے سامنے ہوں۔ مگر یہ تقریریں ضلع کے مختلف مقاموں میں

ریاستی دنیا کی ایک محبوب شخصیت



عالیجناب "خانصاحب" حشمت علی
با القابہ وزیرآعظم ریاست دتیا

ہونی چاہئیں بجائے اسکے کہ ایک خشک تقریر کتابوں کی ضرورت پر دیجائے جو یقیناً بیکار ہوگی۔ تقریر ان چیزوں کے متعلق ہو جو کتابوں میں ہوتی ہیں۔ اس قسم کی تقریر یقیناً دلچسپ ہوگی اور ساتھ ہی ساتھ اس کے وہ کتابیں بھی وہاں ہوں تاکہ لوگوں کو ان کے پڑھنے کا شوق پیدا ہو۔ ان تقریروں میں لوگوں کے مذاق اور ضروریات کا ضرور لحاظ رکھا جائے۔ خاص خاص دن یوم لائبریری (Library Day) منایا جاسکتا ہے۔ ریاست بڑودہ میں بسنت پنچمی کو یوم لائبریری مناکر لوگوں کے اندر لائبریری کے کام میں کافی دلچسپی پیدا کردی جاتی ہے۔ کبھی کبھی ڈرامے بھی کئے جا سکتے ہیں۔ گاؤں میں یہ طریقہ بہت موثر ثابت ہوگا کہ لائبریری کی کتابوں کے قصے یا اور دیگران کی دلچسپی کے اقتباسات سُنائے جائیں۔ شہروں میں بھی خاص مصنفین کے کلام کے نہایت ہوشمندی سے انتخاب کئے ہوئے اقتباسات سلیقہ کیساتھ سنانا خالی از فائدہ نہیں۔ اکثر ریڈیو کے پروگرام میں کتابوں پر تبصرہ ہوتا ہے۔ یا شعراء اور ادیبوں کے کلام کے اقتباسات ہوتے ہیں۔ اس کام میں براڈکاسٹنگ کے کارکنوں کے ساتھ مشارکت کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ اس سے ان کے پروگرام کا معیار بھی بلند ہوگا اور ملک میں کتابوں کا چرچا بھی ہوگا۔

(۳) توسیع کے کام میں اشتہار (Publicity) کو اتنا ہی اہم سمجھنا چاہیئے جتنا تجارت میں کٹ لاک (فہرست کتب) نئی کتابوں کی آمد۔ نہایت سلیقہ اور خوبصورتی کے ساتھ لوگوں کے سامنے ہو۔ نئی کتابیں نہایت دلکش انداز میں ان کو دعوت نظر دیں۔ اس ذہنی اور نفسیاتی (Psychological) حقیقت کو لائبریرین نہ بھولے کہ کان کا اثر سمجھ سے زیادہ اور آنکھ کا اثر کان سے زیادہ ہوتا ہے۔ ایک بہت اچھی کتاب محض اس وجہ سے لوگوں کے دل سے اتر جاتی ہے کہ ان کی آنکھیں اس کے ظاہری نمود کو قبول نہیں کرتیں۔ اب تو ہندوستان میں بھی گوکمی کے ساتھ۔ اچھی گٹ اپ (تیاری) کی کتابیں شائع ہونی شروع ہو گئی ہیں۔ لائبریرین کو چاہیئے کہ دنیائے اشاعت کی اس تحریک کو یہ عملی امداد پہونچائے کہ ایک مضبوط اور خوشنما جلد میں بندھی ہوئی کتاب کو اس کے بدنما اڈیشن پر ترجیح دے۔ اس طرح اس کی لائبریری کی نمود میں بھی اضافہ ہوگا اور لوگ بھی اس کتاب کی طرف زیادہ راغب ہوں گے۔ اور اگر صحیح حساب لگایا جائیگا کہ ایک آدمی کے ایک دفعہ پڑھنے میں کیا قیمت پڑی تو وہ کتاب سستی بھی پڑے گی مثلاً ایک بھدی کتاب کہ جس کی ایک روپیہ قیمت ہے دس آدمی پڑھنے کے لئے لے گئے تو اس کی وہی قیمت ہوگی جو ایک مضبوط اور خوشنما جلد کی۔ جس کی قیمت دو روپیہ ہے اور جس کو بیس آدمی پڑھنے کے لئے لے گئے۔ اور یہ بات نفع میں رہی کہ اول الذکر کتاب دس آدمیوں کے پڑھنے کے بعد خراب ہو جائے گی اور آخر الذکر بیس آدمیوں کے پڑھنے کے بعد بھی اچھی حالت میں رہے گی لائبریریوں میں اس قسم کی پبلسٹی (Publicity Advertisement) کا وہی مقصد ہے۔ جو دکانوں میں اور زینت کا۔

(۴) میجک لینٹرن، عام آدمیوں کے لئے اور خصوصاً بچوں اور کم پڑھے لکھے لوگوں کو کتابوں کی طرف راغب کرنے کے لئے بہت اچھا ذریعہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ بچوں کے لئے انعام رکھنا۔ میجک لینٹرن کے نظارہ دکھانا اور دیگر تفریح کی چیزیں بہم پہونچانا۔ مثلاً ان کے لئے لائبریری میں جو کمرہ ہو اس میں دلکش فطرتی مناظر حسین اور معصوم زندگی کے سین تصویروں میں رکھنا۔ تاکہ بچوں کے دل میں کھیل کے میدان کے ساتھ ساتھ لائبریریوں کے لئے بھی ایک جگہ ہو۔

(۵) کتابوں کے سفری گاڑیاں (Travelling Vans) اس ملک میں بہت ضروری ہیں کیونکہ اول تو یہ ملک دور و دراز فاصلوں کا ہے۔ دوسرے اس ملک کی آبادی کا ایک خاص حصہ گھروں کے اندر ہے۔ ہندوستان میں جہاں سفری گاڑیوں کا تجربہ کیا جارہا ہے۔ وہاں اس سے مفید نتائج برآمد ہو رہے ہیں لائبریرین کو یہ باتیں بیکار اور بیگار نہیں سمجھنی چاہئیں۔ ایک طرف تو ان سے خود اپنے کام میں دلچسپی پیدا ہوگی کیونکہ اول تو یہ کام اس قدر دلچسپ ہیں کہ خود اس تکلیف کا نعم البدل ہیں کہ جو ان کے کرنے میں اٹھائی جائے۔ دوسرے

ان کا فائدہ دیکھکر اپنے تجربہ کی کامیابی پر ایک خاص فخر و کامرانی کا احساس ہوتا ہے۔ اس سے زیادہ مبارک اور کیا بات ہو سکتی ہے کہ انسان خود بھی خوش ہو اور دوسروں کو بھی خوش کرے اور اس خوشی میں ان کا فائدہ بھی ہو۔

لائبریریاں اور ان میں آپس کا لین دین

مسٹر جان سارجنٹ ایجوکیشنل کمشنر گورنمنٹ آف انڈیا نیو دہلی۔ صدر آل انڈیا لائبریری ایسوسی ایشن کانفرنس پٹنہ اپنے خطبۂ صدارت میں فرماتے ہیں۔ " اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے طالبعلموں کے لئے اور ان لوگوں کے لئے جو قیمتی اور کمیاب کتابیں چاہتے ہیں۔ لائبریریوں کی علاقہ وار تنظیم سب سے زیادہ کم خرچ طریقہ ہے۔ خود میرے ملک میں لائبریریوں کی علاقہ وار تنظیم جو کچھ سال ہوئے تمام ملک میں قائم ہوئی۔ بہت کامیابی کے ساتھ چل رہی ہے اور اس سے بہت بچت ہو رہی ہے۔ علاقہ وار (Regional) لائبریریوں کے علاوہ ایک مرکزی لائبریری یا لائبریریاں ہونی چاہئیں۔ جو علاقہ وار تنظیم کے وسائل ختم ہونے کے بعد لائبریری کی ضرورت کو پورا کرنے کی کفیل ہوں۔

مسٹر ایچ۔ ڈبلو کرا ور تحریر فرماتے ہیں۔" ہمارا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ ہم ہر کتاب کے متلاشی کو وہ کتاب پہونچائیں جس کی اُسے ضرورت ہے۔ اور جب اس کو ضرورت ہے۔ اور اگر وہ نہیں جانتا ہے تو ہم یہ بتانے کے بھی اہل ہونے چاہئیں کہ یہ کتاب کیا ہے اور اس کو یا تو اپنی لائبریری میں سے یا کسی اور جگہ سے مہیا کر دینی چاہیئے۔

آ بھی جا

از شاعر فطرت شناس مولانا عامر عثمانی صاحب

آ بھی جا اے بھولنے والے خدارا آ بھی جا
ایک تو ہے زندگانی کا سہارا آ بھی جا

یہ قمر کے نور میں بھیگے ہوئے تاروں کی رات
یہ نشیلے، دم بخود، پرکیف نظاروں کی رات
کہکشاں کی چاندی پرنور سیاروں کی رات
یعنی یہ حسنِ ازل کے آئینہ داروں کی رات

ایسے رنگیں وقت میں خلوت نشینی ہے حرام
آ کہ تجھ بن نامکمل ہے بہاراں کا نظام

یہ گلاب و لالۂ و نسریں قطار اندر قطار
یہ عروسِ ماہ کے رخ پر جوانی کا نکھار
یہ نشیلی چاندنی بہتی ہوئی چاندی کی دھار
چاند کے پربت سے گویا گر رہا ہے آبشار

جلوہ فرما ہے بساطِ چرخ پر ماہ تمام
لے رہی ہے ہر کلی بادِ بہاری کا سلام

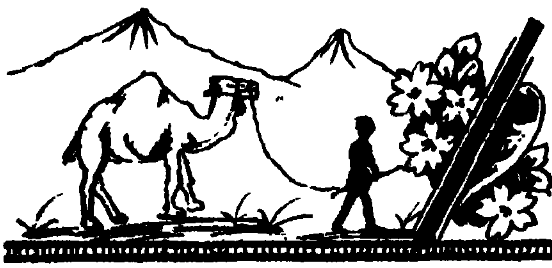
نغمہ پرور ہے فضائے دہر میں سازِ بہار
آ رہی ہے چرخ کی وادی سے آوازِ بہار
لکھ گئی ہر پھول پر بادِ صبا رازِ بہار
بن گیا ہے ذرہ ذرہ آج غمازِ بہار

بادۂ گلرنگ سے لبریز ہیں پھولوں کے جام
آرزو پرور ہے مستانہ ہواؤں کا خرام

ہے چراغِ ماہ سے روشن تمناؤں کی راہ
آ کہ ایسے وقت میں خلوت گزینی ہے گناہ
آ بھی جا اے آسمانِ دل کے ماہِ نیم ماہ
منتظر ہے تیرے شب بیدار شاعر کی نگاہ

دید کے قابل ہے بزمِ زندگانی کا نظام
آ کہ تجھ پر فرض ہے اپنے کرم کا احترام

ایسے کیف انگیز عالم میں خدارا آ بھی جا
ایک تو ہے زندگانی کا سہارا آ بھی جا



اونٹ والے کی سرگذشت

مترجمہ امتیاز نسیمی

میں نے ایسا کیوں کہا تھا؟ اس کا سبب بیان کرنے سے پیشتر مجھے اپنی زندگی کا ایک اہم ترین واقعہ بیان کرنا پڑے گا۔ جب میں اپنا حال بیان کر چکوں گا تو حضور کو میری بیان کردہ بات درست معلوم ہوگی۔

جیسا کہ میرے کپڑوں سے ظاہر ہے میں ایک کسان کا بیٹا ہوں میری موجودہ زندگی افلاس کے ساتھ بسر ہو رہی ہے۔ لیکن اس سے میرے ماضی کے متعلق یہ نہ قیاس کیا جائے کہ میں ابتدائے حیات سے ایسا ہی مفلس اور غریب ہوں۔ میرے والد کے پاس کئی اونٹ تھے وہ انھیں سوداگروں کو جب کہ ان کا قافلہ آمادہ سفر ہوتا کرایہ پر دیا کرتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد میں ان اونٹوں کا واحد مالک تھا۔ میرے والد کے احباب نے میرے ساتھ ہمدردی ظاہر کی۔ ان کا ہمدردانہ سلوک نتیجہ خیز ثابت ہوا۔ مجھے خوب کام ملنے لگا۔ میرے اونٹ کبھی خالی نہیں رہتے تھے۔ میں اپنے اونٹوں کے ساتھ اکثر سفر میں جایا کرتا تھا تاکہ ان کے ساتھ کوئی نامناسب برتاؤ نہ کیا جائے۔

جیسا کہ میری اس ہری پگڑی سے عیاں ہے۔ میں کئی بار مکہ ہو آیا ہوں۔ یہ سفر اکثر مصیبت و آلام سے پُر ہوتے ہیں۔ اسلئے جب میں کسی سفر سے صحیح و سلامت گھر لوٹ کر آتا تھا تو مجھے اپنی بیوی اور بچوں سے ملکر بے انتہا مسرت ہوتی تھی۔ میں نے خوب محنت کی میرا نصیب چمکا اور کچھ ہی عرصہ کے بعد ایک دولتمند آدمی بنگیا

ایک مرتبہ جب ہم سفر کر رہے تھے ایک اونٹنی کے بچہ پیدا ہوا ابتداءً تو میں نے سوچا کہ اسکو یہیں چھوڑ دیا جائے۔ لیکن بچہ پر نظر غائر ڈالنے سے معلوم ہوا کہ وہ اپنی منازل ارتقا کے عروج آفریں ایام میں ہر ایک عمدہ اور بہترین نسل کا اونٹ ثابت ہوگا

یہ دیکھکر میں نے اسکو اپنے ساتھ لیجانیکا عزم مصمم کر لیا۔

ایک اونٹ کا نصف سامان دوسرے اونٹوں پر تقسیم کر کے اس بچہ کے لئے جگہ خالی کی۔ ہم اس بچہ کو لے کر "کیرو" شہر میں بخیریت پہنچ گئے۔ یہ بچہ روز بروز خوبصورت اور مضبوط ہوتا گیا۔ اونٹوں کے ہوشیار ماہرین نے بتلایا کہ اعلےٰ ترین نسل کا اونٹ ہے۔ اور پیشین گوئی کی کہ یہ کسی دن قرآن شریف لے جانے والا پاک جانور ہوگا۔ ان کی پیشین گوئی کے پانچ سال بعد جب یہ اونٹ جوان ہوا۔ تو اس کی اونچائی دیگر اونٹوں سے تین فٹ زیادہ تھی میں اسے شیخ کے پاس لے گیا اور درخواست کی کہ اسے قرآن شریف لے جانیکا کام دیا جائے۔ انھوں نے میرے اونٹ کو اس کام کے لئے بہت پسند کیا۔ لیکن ایک فقیر درمیان میں دخل انداز ہو کر کہنے لگا۔ کہ اگر یہ اونٹ اس مقدس کتاب کو لے جائیگا تو سارے قافلہ کو ایک ہلاکت خیز مصیبت سے دو چار ہونا پڑے گا وہ فقیر اس جگہ وقعت و عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اسلئے شیخ میرا اونٹ لینے سے ہچکچانے لگا۔ مجھے فقیر کا یہ دخل بیجا سخت ناگوار گذرا۔ میں نے اس کو سخت و سست کہنا شروع کیا۔ اس پر اس نے چین بجبیں ہو کر بہت شور مچایا۔ اور بہت سے آدمیوں کے ساتھ ملکر مجھے اس قدر مارا کہ میں مرتے مرتے بچا اور بمشکل وہاں سے جان بچا کر بھاگا۔ مجھے بھاگتے دیکھ اس نے میرے پیچھے خاک دھول پھینکی اور چلا کر کہا "دیکھ۔ اگر یہ اونٹ پیغمبر کی پاک کتاب لیجائیگا تو سارا کارواں اسی طرح برباد ہو جائیگا۔

ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک کم نسل اونٹ منتخب کیا گیا اور میں اپنی تمام امیدوں کو شکستہ دیکھکر کف افسوس ملتا رہ گیا۔ لیکن دوسرے سال وہ فقیر وہاں نہیں تھا۔ میں نے پھر اپنا اونٹ شیخ کے

سامنے پیش کیا انھوں نے سابق کی طرح اس کو منظور کرلیا۔ اپنے ونٹ کو اتنی بڑی عزت ملتے دیکھکر مجھے کس قدرت مسرت ہوئی یہ میں بیان نہیں کرسکتا۔

ہمارا یہ کارواں ایک زبردست کارواں تھا۔ اس میں تھا ہزار اونٹ تھے۔ اتنا بڑا کارواں اس شہر سے کبھی نہیں گیا تھا۔ جہاں پناہ خیال فرمائیں۔ کہ مجھے اپنے پیارے اونٹ کو اسقدر اونٹوں میں صاحب عزت دیکھکر کتنی بے پایاں مسرت حاصل ہوئی ہوگی۔ اس کی مہار میں سونے کا کام ہو رہا تھا اور ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ اس کی پیٹھ پر پیغمبر کی متبرک کتاب ایک چھوٹے سے صندوق میں رکھی ہوئی تھی۔

کارواں دوسرے دن جانے والا تھا۔ میں اپنا اونٹ ایک معاون کی نگرانی میں چھوڑ کر اپنی بیوی بچوں اور دیگر متعلقین سے ملنے گھر آیا میں نے جب ان سب سے ملنے کے بعد واپسی کا قصد کیا۔ تو میری چھوٹی بچی جو صرف دو سال کی تھی زور سے چلائی اور دونوں ہاتھ پھیلا کر اشارہ کیا کہ میں اسے گود میں لے لوں۔ میں اسے لیکر پیار کرنے لگا۔ اس نے حسب عادت میری جیب میں ہاتھ ڈالدیا۔ وہ شاید یہ دیکھ رہی تھی کہ میری جیب میں پیسے یا کھانے کے لئے کوئی چیز موجود ہے یا نہیں۔ میں پیار کرنے کے بعد اسے اپنی بی بی کو دیکر رخصت ہوا۔

ہم لوگ اسی رات کو روانہ ہوگئے۔ دوران سفر کرنے کے بعد ہم نے نہر سوئز کے کنارے ایک شہر میں قیام کیا۔ تاکہ ہم لوگ اور ہمارے جانور کچھ آرام کرلیں۔ کیونکہ اب ہم کو الثائی کا ریگستان طے کرنا تھا۔

روانگی سے پیشتر جب میں اپنے اونٹوں کے درمیان آرام کررہا تھا۔ تو میں نے دور سے ایک اونٹ بڑی تیزی سے اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا وہ کیرو کی طرف سے آرہا تھا۔ قریب آنے پر معلوم ہوا کہ اسپر وہی فقیر سوار ہے جس سے پیشتر میری لڑائی ہوچکی ہے۔ فقیر امیر کارواں کے خیمے کے پاس جاکر رکا اور اتر کر اندر چلا گیا۔ میں یہ معلوم کرنے کے لئے کہ وہ امیر سے کیا گفتگو کرنے آیا ہے۔ قدم بڑھاتا ہوا جلدی سے وہاں پہونچا وہ سب کو مخاطب کرکے کہہ رہا تھا کہ اگر میرا اونٹ فوراً ہلاک نہ کیا گیا تو سارے قافلہ کا ایک مہلک مصیبت سے دوچار ہونا یقینی ہے۔ اسنے یہ الفاظ خوفزدہ کرنے کے لئے بلند آواز سے کہے اور فوراً اپنے اونٹ پر بیٹھ کر واپس چلا گیا۔

امیر کے دل میں کھٹکا ہوا۔ اور باقی لوگ بھی آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔ میں ڈرنے لگا کہ کہیں فقیر کی بات درست تسلیم نہ کرلی جائے اور میری یہ تمام عزت خاک میں ملجائے۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا "غریب پرور! آپ اس آدمی کی بکواس کا خیال نہ کریں۔ یہ میرا دشمن ہے۔ کچھ عرصہ ہوا یہ ہمارے یہاں آیا تھا۔ میں نے اسکو نہایت عزت سے ٹھہرایا۔ اور خوب تواضع کی مگر اس بدمعاش نے میری بی بی کی عزت پر دست درازی کی سعی ناکام کی۔ میں نے اسے گھر سے نکال دیا۔ اس وقت سے یہ میرا دشمن ہے۔ اسکے دل میں انتقامی شعلے بھڑک رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسنے یہاں تک میرا تعاقب کیا اور آپ سے جھوٹی باتیں بنائیں۔ اگر میں جھوٹ بولتا ہوں تو مجھ پر اور میرے کارواں پر مصیبت نازل ہو" میری ان باتوں سے امیر کا اطمینان ہوگیا۔ اور فقیر کی بات کا کوئی اثر نہ لیا گیا۔ ہم لوگوں نے اسی رات الثائی کے ریگستان کا سفر شروع کردیا۔

چونکہ حضور نے کبھی مکہ کا سفر نہیں کیا اس لئے حضور الثائی کے عظیم ریگستان اور وہاں کے مصائب و آلام کا تصور نہیں کرسکتے دور تا حد نظر ریگستان ہی ریگستان دکھائی دیتا ہے۔ بے آب وگیاہ ریگستان۔ ریت دور سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا کسی دریا میں صاف وشفاف پانی بہہ رہا ہے۔ لیکن پانی کہاں۔ وہ تو سراب ہوتا ہے۔ صرف سراب۔

فقیر کی پیشین گوئی کے خلاف ہم پر اب تک کوئی مصیبت نازل نہیں ہوئی۔ ہم ایک ہفتہ تک سفر کرتے ہوئے مقام تاخیل پر پہنچ گئے یہاں ہم نے اپنی مشکوں میں پانی بھر لیا۔ اب ہمارا سفر صرف تین رات کا باقی رہ گیا تھا۔ چونکہ کوئی خاص واقعہ فقیر کی پیشین گوئی کے مطابق ظہور پذیر نہ ہوا تھا۔ اس لئے اب کسی اہل قافلہ کو اس کے دروغگو ہونے میں کلام نہیں رہا تھا۔

دوسرے دن صبح ہم نے ابھی اپنے خیمے ایستادہ ہی کئے تھے کہ فقیر کی بات پوری ہوتی ہوئی معلوم ہونے لگی ہم نے دور سے ایک ہیبتناک سیاہ بادل اوپر اٹھتا ہوا دیکھا۔ یکایک اس کی سیاہی زردی میں تبدیل

ہو گئی اور وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ چشم زدن میں ہم پر ایک طوفان سا ٹوٹ پڑا۔ ہمارے سروں پر منتوں ریت آپڑا۔ امیر کاروان کا شاندار اور بہترین شامیانہ بڑے زور سے اکھڑ کر میرے پاس سے اڑتا ہوا نکل گیا۔ سب چیزیں ہوا میں طرف ناچتی ہوئی اڑنے لگیں۔ یہ تھا طوفان۔ اب ہم لوگوں کا سانس گھٹنے لگا جانور چاروں طرف چلانے لگے۔ اونٹوں نے ریت سے بچنے کے لئے اپنے تھوتھنے بالو میں لگا دیئے۔ ان ہی کو دیکھ کر دوسرے لوگ بھی منہ کے بل بالو میں لیٹ گئے۔ چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی چھا گئی۔ اور یہ تاریکی جانوروں، بچوں اور عورتوں کی دردناک چیخ و پکار سے اور بھی دردناک ہو گئی۔ اونٹ اور گھوڑے اپنی رسیاں تڑا کر ادھر ادھر بھاگنے لگے۔

میں خود کو بچانے کے لئے ایک اونٹ کی بغل میں چھپ گیا تھا۔ اور اپنا سر اس کی گردن کے نیچے چھپا لیا تھا۔ میں خوب سمجھ رہا تھا کہ یہ قہر خداوندی میری ہی دروغگوئی کا ثمرہ ہے۔ میں ایک گھنٹہ تک اسی حالت میں پڑا رہا۔ اس ایک گھنٹہ میں مجھے کس قدر ہیبتناک مصیبت کا سامنا کرنا پڑا گرم بالو میرے کپڑوں سے گذر کر میرے بدن پر چپک گئی تھی۔ اور زندہ رہنے کے لئے مجھے گرم بالو میں سانس لینا پڑ رہا تھا۔

جب طوفان بند ہو گیا میں آہستہ آہستہ اٹھا۔ میں نے دیکھنے کی کوشش کی لیکن مجھے کچھ نظر نہیں آیا میں نے خیال کیا کہ شاید میں اندھا ہو گیا ہوں۔ آہ یہ خیال کس قدر روح فرسا ثابت ہوا میں سوچنے لگا ایک نابینا اتنے عظیم ریگستان کو کیونکر قطع کر سکتا ہے یہیں کھڑے کھڑے مجھے اپنے بال بچوں اور شریک حیات کا تصور آیا۔ میں بیان نہیں کر سکتا۔ کہ اس قسم کے تصورات میرے لئے کس قدر تکلیف دہ ثابت ہوئے۔ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا

اشک باری میرے حق میں مفید ثابت ہوئی مجھے کچھ آرام سا محسوس ہونے لگا۔ میں نے اپنا سر اٹھایا معلوم ہوا کہ میں دیکھ سکتا ہوں۔ لیکن میں نے اسوقت کیا دیکھا۔ ایک صاف آسمان اور ریت کے ٹیلے۔ نہ کہیں امیر کاروان کا پتہ نہ دوسرے اہل قافلہ کا ریت نے ان کی قبریں بنا دی تھیں۔ اور ہر جاندار اور بیجان چیز اس کے نیچے دفن ہو گئی تھی۔ چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ موت کی سی خاموشی۔ ادھر ادھر چند مردہ جانوروں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ میرے سوا ہر چیز برباد ہو گئی تھی۔ میں صرف یہ دیکھنے کے لئے بچ گیا تھا کہ میری غلطی اور دروغگوئی کیا رنگ لائی ہے۔

آہ مجھ میں یہ بیان کرنے کی ہمت نہیں ہے کہ یہ مناظر میرے لئے کس قدر وحشتناک ثابت ہوئے۔ میں سوچنے لگا۔ کیا مجھے بھی یہیں مرنا پڑے گا۔ اسی کے ساتھ مجھے اپنے پیارے بچوں کا خیال آیا۔ میں نے حتی الامکان کوشش کرنے کی ٹھان لی۔ اب سوچ و بچار میں وقت کھونا مناسب نہ تھا۔

میں نے اپنی پگڑی میں سے ایک ٹکڑا پھاڑ کر ناک سے نکلتا ہوا خون پونچھا۔ اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنا شروع کیا۔ میں نے دیکھا کہ چند مردہ اونٹ ایسے تھے جو ریت کی قبر سے کسی قدر بچے ہوئے تھے۔ میں نے اپنے پانی کے تھیلے پر جو نظر ڈالی۔ تو اس میں ایک بوند بھی نہیں تھی۔ پھر چند تھیلیاں جو ادھر ادھر پڑی ہوئی تھیں دیکھیں تو وہ بھی سب سوکھی ہوئی تھیں۔ یہ دیکھ کر میں نے کچھ اونٹوں کے پیٹ میں سے پانی والی تھیلی کو چیر کر اس کا پانی ایک تھیلے میں بھر لیا۔ اپنی پیاس اسی پانی سے بجھا کر تھیلے کو پیٹھ پر لادا اور آگے چل دیا۔ راستہ مجھے ٹھیک معلوم تھا۔ میں نے ایک دن رات سفر کیا۔ صبح ہونے پر ٹھہر گیا۔

مگر ابھی ایک رات کا سفر اور باقی تھا۔ کھانے کے لئے میرے پاس کوئی چیز نہیں تھی۔ البتہ پینے کے لئے پانی کافی موجود تھا۔ آفتاب کی تپش رفتہ رفتہ ناقابل برداشت حد تک پہنچ گئی میں اس سے بچنے کے لئے ریت کے ایک ٹیلے کے نیچے بیٹھ گیا دوپہر کے وقت گرمی شباب پر آگئی۔ میرا سر چکرانے لگا۔ مجھے اپنی بینائی میں بھی فرق محسوس ہونے لگا۔ جگہ جگہ پانی کے چشمے اور ان کے کنارے درخت نظر آنے لگے میں کئی بار گرمی سے بچنے کے لئے اس طرف دوڑا مگر وہاں کیا تھا۔ گرتا پڑتا لوٹ آیا میں دن بھر اسی دھوکہ میں مبتلا رہا۔ میں جب اپنی اس حالت کا تصور کرتا ہوں تو میرے بدن میں خوف کی سرد لہریں دوڑنے لگتی ہیں۔ آخر خدا خدا کر کے سورج غروب ہوا تارے بھی نکل آئے۔ میں پھر اپنے تھیلے سے پانی پی کر آگے چلنے کے لئے مستعد ہو گیا۔

رات بھر چلنے کے بعد جب کعبہ کا قلعہ دور سے دکھائی دیا تو میری

جان میں جان آئی۔ میں اپنا تھیلا پھینک کر ایک فوارہ کے پاس جو قریب ہی مسافروں کے لئے بنا ہوا تھا۔ جا کر لیٹ گیا اب مجھ میں چلنے کی بالکل قوت نہیں تھی۔

پانی کی فراوانی۔ ٹھنڈی ہوا۔ پیڑوں کا سایہ۔ آہ یہ چیزیں اس وقت میرے لئے کس قدر مسرت بخش ثابت ہوئی تھیں معلوم ہوتا تھا کہ جنت ارضی اسی کا نام ہے۔

میں سو گیا جب بیدار ہوا تو سر میں چکر اور تیز بھوک معلوم ہوئی۔ آہستہ آہستہ اٹھا اور دیکھنے لگا شاید کوئی قافلہ آتا ہو مگر دور تک کچھ دکھائی نہ دیا۔

دو دن اسی حالت میں گذر گئے۔ مگر اب بھی کوئی نہ آیا میں سوچنے لگا یا خدا کیا میری موت اسی فوارے کے پاس ہوگی۔ میں مرنے کے لئے وہیں لیٹ گیا۔ اب مجھ میں بیٹھنے کی بھی طاقت نہیں تھی۔ آہ مجھے اس وقت کیسی سخت تکلیف تھی۔

یکایک میں نے کروٹ بدلی۔ کوئی سخت چیز میرے بدن میں چبھتی ہوئی معلوم ہوئی۔ شاید کوئی پتھر کا ٹکڑا ہے۔ یہ سوچ کر میں نے اپنا ہاتھ جیب میں ڈالا۔ تاکہ اسے نکال کر پھینک دوں مگر پھینکنے سے پہلے جو اس پر نظر ڈالی تو ہاتھ میں روٹی کا ایک سوکھا ٹکڑا دکھائی دیا۔ یہ دیکھ کر مجھے کسی قدر حیرت ہوئی۔ لیکن مجھے یاد آیا کہ قافلہ کی روانگی کے وقت جب میں اپنے بیوی اور بچوں سے ملنے گھر گیا تھا۔ تو یہ ٹکڑا میرا بچہ کھا رہا تھا۔ اور جب آتے ہوئے اسنے میری جیب میں ہاتھ ڈالا تھا تو اسے وہیں چھوڑ دیا تھا۔

میں آہستہ آہستہ فوارہ کے پاس گیا۔ اور اسے پانی سے بھگو کر کھانے لگا۔ خدا کا شکر ادا کرنے کے لئے میری آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔

میری جان بچ گئی۔ دوسرے دن کیرو شہر جانیوالا قافلہ آگیا سوداگروں اور مسافروں نے میرے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کیا مجھے ایک اونٹ پر جگہ دی۔

اب میں سمجھتا ہوں کہ جہاں پناہ میری بات کو درست تسلیم کر لیں گے کہ " وہ آدمی خوش قسمت ہے جس کے پاس کھانے کے لئے روٹی کا ایک ٹکڑا ہمیشہ موجود رہتا ہے " (فریڈرک میریٹ)

اکبر کے عہد میں مذہبی اور تعلیمی حالت

از جناب آیت اللہ بیگ صاحب عارف دہلوی

ان پڑھ اکبر کے عہد میں ہندوستان کے کلچر نے علم و فن کے شعبوں میں غیر معمولی ترقی کی۔ کمزور حکومتوں کے ایک طویل دور کے بعد مغلوں کے عہد میں ملک کی نئی سرے سے شیرازہ بندی ہوئی۔ اگرچہ عہد انتشار کی اسلامی و غیر اسلامی ریاستیں بھی علم و فضل کی قدرداں تھیں مگر ایک بڑی اور طاقتور مرکزی حکومت کے قائم ہو جانے سے اہل علم کی کوششوں کو بھی ایک نقطے پر جمع ہونے کا موقع ملا۔

اس وقت مسلمانوں کو اس ملک میں رہتے سہتے صدیاں بیت چکی تھیں۔ اب وہ بیرونی فاتحوں کے رتبے سے بڑھکر ملک کی مشترک قومیت کا جزو بن گئے تھے۔ اسلام اور ہندو مت کے عقائد دونوں مذاہب کے پیرؤں پر اپنا اثر ڈال رہے تھے۔ اسلامی تہذیب اور کلچر کی یہ خصوصیت بھی برابر اپنا اثر دکھا رہی تھی کہ وہ دنیا کی ہر تہذیب سے اچھی ہے اور قابل قبول چیزوں کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔ ہندوؤں کے بہت سے طور طریقوں نے مسلمانوں میں اور مسلمانوں کے بہت سے رسم و رواج نے ہندوؤں میں اپنا عمل دخل کر لیا تھا۔ بڑے بڑے برہمن فارسی اور عربی پڑھتے، مسلمان سنسکرت کی تعلیم حاصل کرتے اور ہندوؤں کی مذہبی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کرتے تھے غرض اس قومیت متحدہ کی بنیادیں استوار ہو رہی تھیں جسے فنا کرنے کی ناپاک کوشش نے اس جنت نشان کو آجکل جہنم زار بنا رکھا ہے

آپس کے اس اختلاط کا اثر زندگی کے ہر شعبہ میں نمایاں تھا۔ امیر خسرو کے وقت سے فارسی اور بھاشا کے میل سے ایک نئی بولی پیدا ہو چکی تھی۔ اگرچہ اسوقت فارسی زبان نظام حکومت کے ہر شعبے پر چھائی ہوئی تھی مگر یہ نئی زبان بھی آہستہ آہستہ پروان چڑھ رہی تھی۔

ملک میں فراغت اور خوشحالی کا دور دورہ تھا۔ علم کے پودے کو پھلنے پھولنے کی ہوا راس تھی۔ ملک میں قدردانوں کی کمی نہ تھی۔ کیا بادشاہ اور کیا امرا سب کے سب جوہر شناس تھے اور صاحبانِ کمال کو ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے خود بھی وہ اہل ہنر میں سے تھے۔ عبدالرحیم خانخاناں کی علمی فضیلت علم دوستی اور عالم نوازی اس وقت کے امراء کی بلند ذوقی کا ایک نمایاں ثبوت ہے اور پھر اکبر کا دربار تو اہل علم کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ ہر مذہب اور ملت کے علماء، فقہا، صوفی، مجتہد، شاعر، فلسفی اور ہنرور وہاں جمع ہوتے تھے اور بادشاہ کی سرپرستی ان کے شوق کو مہمیز کرتی تھی۔ ملا عبدالقادر، شیخ تھانیسری، حاجی ابراہیم سرہندی، ملا شیرازی سیالکوٹی، ابوالفضل، فیضی، ملا نظام الدین۔ نقیب خاں اور مولانا شاہ محمد اسی مجلس کے رتن تھے۔ بہت سی سنسکرت کی کتابوں کا ترجمہ ان ہی حضرات کی کوششوں کا مرہون منت ہے۔ ابوالفضل کا اکبرنامہ اور ملا عبدالقادر بدایونی کی تاریخ بیش بہا کتب ہیں۔ عہد اکبری کے ہر پہلو پر اچھی طرح روشنی ڈالتی ہیں ابوالفضل کی کتاب آئین اکبری میں ملکی نظم و نسق کا جو خاکہ دیا ہوا ہے وہ اعلےٰ نظام حکومت کی ایک اچھی مثال ہے اکبرنامے اور ملا عبدالقادر کی تاریخ سے اکبر کے عہد کے مذہبی رجحانات پر بھی اچھی طرح روشنی پڑتی ہے۔

فارسی کے ساتھ ساتھ ہندی شاعری بھی خوب پھل پھول رہی تھی۔ خانخاناں کو فارسی کے زبردست شاعر عرفی کی سرپرستی کا فخر حاصل ہے۔ نظیری اور شکیبی کے فارسی اشعار کے ساتھ سورداس اور تلسی داس کے دوہے بھی دنیائے ادب میں گونج رہے تھے۔

فارسی اور ہندی کے ان نغموں کی گونج ہمیں اس وقت کے فن تعمیر میں مجسم نظر آتی ہے۔ چنانچہ اس زمانہ کی عمارتیں۔ ہندی اور ایرانی اثرات کی باہمی آمیزش کا پتہ دیتی ہیں۔ فتحپور سیکری کی خوبصورت عمارتیں اور آگرے کا قلعہ ہندو مسلمانوں کے اتحاد کی منہ بولتی یادگاریں ہیں۔

فن موسیقی کو اکبر کے زمانہ میں زبردست عروج حاصل ہوا تان سین جیسا شہرۂ آفاق استاد اسی گوہر شناس کے دربار کا رتن تھا۔ موسیقی کے

بہت سے راگ، راگنیوں اور گیتوں کو تان سین ہی ہاتھوں تخلیق کا فخر حاصل ہے۔

علم و فضل کے گرم معرکوں، شعر و شاعری اور گانے بجانے کے چرچوں میں اہل عقیدت کو روحانیات کے پرسکون چشموں سے فیضیاب ہونے کا پورا موقع حاصل تھا پیری مریدی کے سلسلے جاری تھے۔ مریدوں کے حلقے ہوا کرتے تھے۔ آپس میں شکر رنجیاں بھی ہوتی تھیں مگر زیادہ شاید نہیں۔ جویائے حق کو تلاش اور جستجو کے بعد سچا رہنما ضرور ملجاتا تھا۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ ایک شخص دو حلقوں میں ایک ساتھ شریک ہوتا۔

اس مقام پر غیر مناسب نہ ہوگا اگر دربار اکبری کے مذہبی معرکوں کا بھی سرسری ذکر کر دیا جائے۔ بچپن میں اکبر کی مذہبی تعلیم" یا تو بالکل ہی نہیں ہوئی تھی یا اگر ہوئی تھی تو وہ ایسے طرز کی نہ تھی کہ آئندہ کسی وقت غیروں کے عقائد سنکر اس کی طبیعت متاثر نہ ہوتی"۔ اس کی کمی تعلیم اور جستجوئے علم نے اسے مختلف الخیال لوگوں سے تبادلہ خیالات کا شوق دلایا۔ علمار سے تبادلہ خیالات کرنے کی غرض سے اس نے ایک عبادت خانہ بنوایا جس میں شروع میں تو شیعہ علمار کا اثر جاری رہا مگر بعد میں اور مذاہب والے بھی آنے لگے مگر اکبر کو علمار کی قیل وقال میں گوہر مقصود نہ مل سکا۔ اس نے عبادت خانہ توڑ دیا اور مختلف مذاہب والوں کو خلوت میں بلاکر ان سے تبادلہ خیالات کرنے لگا۔ مختلف اثرات نے اس کی کچی طبیعت پر عجیب اثر ڈالا۔ حرم میں ہندو رانیوں کی وجہ سے وہ ہندوانی رسموں کی طرف پہلے ہی سے مائل تھا۔ اب اس نے ایک نیا مذہب دین الٰہی نکالا جس میں رمضان کے روزوں، حج اور نماز جمعہ کو موقوف کر دیا بادشاہ کو سب سے بڑا مذہبی پیشوا اور مجتہد قرار دیا گیا۔ اس کو نص قرآنی سے اسلام کے اختلافی مسائل میں فیصلہ کرنے کا اختیار دیا گیا۔ دربار اکبری کے مذہبی حالات کی تفصیل بہت طویل ہے اور موضوع سے دور بھی ہے کیونکہ ان درباری معرکوں کا ملک اور قوم کی عام تعلیمی اور مذہبی حالت پر کوئی گہرا اثر نہیں پڑا اور اکبر کے بعد یہ سب چیزیں بند ہو گئیں۔ بہرحال اس میں شبہ نہیں کہ عہد اکبری میں علم و فضل کا پودا خوب پھلا پھولا۔

مفت۔ تمام سول سرجن، طبیبان، اور لینے علی سرکاری ڈاکٹر کوئی سی دوا سرکاری ہسپتالوں میں مریضوں تک آزمانے کے لئے اور طب کا معجزہ دیکھنے کے لئے صرف محصول ڈاک بھیجکر بالکل مفت منگا سکتے ہیں

سفید داغ (پھلبہری) کو پورا فائدہ

جناب بابو محمد حیات خاں ریٹائرڈ کلرک و چیف انجینئر و سکریٹری پی، ڈبلیو ڈی بلڈنگ برانچ پٹیالہ تحریر فرماتے ہیں مجھے یہ تصدیق کرتے ہوئے خوشی ہے کہ سفید داغ پھلبہری کی جو دوا میں نے گذشتہ ماہ آپ کے ہاں سے منگائی تھی اس کے استعمال سے میری رشتہ دار لڑکی کو فائدہ ہوا اور مجھے یقین ہوگیا ہے کہ آپ کی دیگر دوائیاں بھی ایسی ہی کارآمد ثابت ہوں گی

مبلغ ایک ہزار روپیہ نقد انعام

سفید داغ، برص، پھلبہری کا مجرب علاج۔ اگر اس فقیری مرہم کو تین یوم مالش کرنے سے بغیر کسی درد تکلیف کے سفید داغ جڑ سے نہ جاتے رہیں تو کل قیمت واپس۔ اعتبار نہ ہو تو اقرار نامہ لکھوالیں۔ اپنی حالت اور عمر ضرور تحریر فرمائیں قیمت فی شیشی تین روپے آٹھ آنہ ۸/۳ عہ

مندرجہ بالا سرٹیفکیٹ غلط ثابت کرنیوالے کو ایکہزار روپیہ نقد انعام

بواسیر کی خبر لیجئے دوا۔ پہلے روز درد خون بند ۳ روز میں مکمل آرام قیمت ۶؍

مست ہو راجہ خوش ہو رانی

آجکل کے زمانہ میں ہر طرف یہی چرچے ہیں، حسن ہو جوانی ہو، کامرانی ہو شادمانی ہو اس خیال کو مدنظر رکھتے ہوئے پروپرائیٹر صاحب نے چند مجربات اپنی قلمی بیاض سے اخذ کر کے پیش کئے ہیں **مست شباب**۔ یہ طلا لذت و امساک کے لئے بےنظیر، عشق و محبت کی جان ہے۔ اس قدر لذت و امساک پیدا کرتا ہے کہ معشوق خود عاشق بن جاتا ہے تمنائیں پوری ہو جاتی ہیں۔ قیمت فی شیشی عہ/ **من کی موج** گیا ہیں کہ قوت مردمی کی بادشاہ ہیں، انسان کو فیول بنا دیتی ہیں۔ منٹوں کی لذت گھنٹوں تک بڑھ جاتی ہیں، پٹھوں اور رگوں میں بیحد قوت دیتی ہیں۔ فی شیشی ایک درجن عہ/ **پُر لطف**۔ یہ عجیب و غریب دوا عورتوں کے لئے تیار کی گئی ہے جو چند منٹ پہلے لگانے سے شادی کی پہلی رات کا لطف پیدا کر دیتی ہے۔ دس بچوں والی عورت کی بھی وہی کیفیت ہوگی۔ قیمت فی شیشی صرف ایک روپیہ۔

گہری نیند کا لطف

سائنس کی حیرت انگیز ایجاد ویسٹن Westminster کسی سوتے یا جاگتے کو سنگھا دیجئے وہ ایک گھنٹہ کے لئے گہری نیند سو جائیگا اور ہلانے جلانے سے بھی نہ جاگیگا قیمت دو روپے (عہ) محصول سات آنہ اگر ایک گھنٹہ سے پہلے جگانا ہو تو ریکشن Reaction سنگھا دیجئے قیمت صرف دو روپے عہ۔ کم مقدار یا نمونہ مفت نہیں مل سکتا۔ ضمانت کی جاتی ہے کہ ویسٹمنسٹر یا ریکشن حل کو کسی قسم کا نقصان نہیں دیتیں

بغیر آپریشن فوطہ بڑھ جانے کا علاج

اگر فوطہ میں آنت اتر آئی ہے یا پانی آگیا ہے تو اسکی حیرت انگیز دوا کنول رجسٹرڈ استعمال کیجئے۔ خواہ کیسا ہی پرانا مرض ہو ایک ہفتہ میں مستقل طور سے فائدہ ہو سکتا ہے۔ اس خطرناک بیماری کے لئے نہایت مجرب دوا ہے۔ کنول رجسٹرڈ کی مالش سے پسینہ کے ذریعہ مادہ خارج ہو کر فوطے اپنی اصل حالت پر آجائیں گے۔ آپریشن کی ضرورت نہیں مکمل فائدہ کے لئے ایک شیشی کی قیمت عہ اور نمونہ کی شیشی دو روپے عہ/ جواب طلب امور کیلئے سوا آنہ کا ٹکٹ آنا لازمی ہے

امراض ناک کا واحد اکسیری نسخہ

ناک میں سوزش یا پھنسیاں ہو گئی ہوں، مسہ ہو گیا ہو، ناک سے بدبو آتی ہو، سونگھنے کی قوت میں فتور آگیا ہو، ناک سے چھیچھڑے یا کیڑے نکلتے ہوں جما ہوا لمبا سا مواد نکلتا ہو اکثر نزلہ یا زکام رہتا ہو نکسیر اکثر پھوٹتی رہتی ہو ناک اکثر بند رہتی ہو یا چھینکیں زیادہ آتی ہوں یا نزلہ حلق گلے میں ٹپکتا رہتا ہو جس کے باعث گلے میں مستقل خرابی رہتی ہو ان تمام شکایات کیلئے ہماری کھانے کی ناک کی دوائی تریاق خاکی تیر بہدف ثابت ہو چکی ہے۔

قیمت ڈیڑھ روپیہ ۸/۱ عہ

محصولڈاک آٹھ آنہ (۸،) علاوہ

بجیرون عظیم مالاخنازیر

کے مریضوں کے لئے جیسا کہ عام پبلک کو معلوم ہے کہ ہم ایک عرصہ دراز سے ہجیرون یعنی کنٹھ مالا کے لئے ایک حیرت انگیز سنیاسی اکسیری نسخہ تقسیم کر رہے ہیں اور ہزارہا مریض نیا سے مختلف ملکوں میں اس سے مکمل صحت پا چکے ہیں مکمل علاج کے لئے قیمت صرف لہ محصول ڈاک لہ

اصلی کالا تیل سنگار

اس تیل کے چند روز کے استعمال سے سفید بال بالکل کالے ہو جاتے ہیں، اور پھر جڑ سے ہی کالے پیدا ہوتے ہیں۔ قیمت صرف ڈیڑھ روپیہ ۸/۱ عہ

ملنے کا پتہ:۔ امریکن میڈیکل اسٹور۔ ناہن انبالہ

گلہائے پریشاں

(از جناب مولانا ماہر القادری صاحب)

جس گیت کو زندگی نے گایا　　سچ یہ ہے وہ گیت تھا پرایا
ہستی کا فریب کھانے والو!　　شعلوں کو سمجھ رہے ہو سایا[۱]　　سایہ[۱]

۲

پھولوں کی ہنسی، ہنسی نہیں ہے　　یہ موت ہے زندگی نہیں ہے
یہ رات، یہ غم کی رات توبہ!　　تاروں میں بھی روشنی نہیں ہے

۳

جس سمت تری نگاہ مڑ جائے　　ٹوٹا ہوا آئینہ بھی جڑ جائے
ساقی کی اگر نہ ہو نوازش　　مے، جام سے پھول بنکے اڑ جائے

۴

لالہ کا جگر کہاں سے لاؤں　　نرگس کی نظر کہاں سے لاؤں
شاید کہ درِ قبول ہے بند　　آہوں میں اثر کہاں سے لاؤں

۵

ساغر میں شراب انڈیلتا ہوں　　میں آگ سے روز کھیلتا ہوں
سچ یہ ہے کہ درد و غم کو ماہر　　اِک فرض سمجھ کے جھیلتا ہوں

لاوارث

شریمتی جیوترمئی دیوی کا ایک بنگالی افسانہ

(از جناب سید نجم الحسن صاحب وحشی آروی)

بہت بڑا خاندان تھا۔ دادا۔ دادی، چاچا۔ چاچی۔ بھائی بھاوج، اور پھر ان کی اولاد۔ گھر میں ہر وقت چہل پہل رہتی۔ کشن نے اسی گھر میں پرورش پائی تھی۔ بہت چھوٹی عمر میں اس کا باپ مرگیا تھا۔ اس لئے باپ کے پیار کو وہ سمجھ نہ سکا تھا۔ مگر ماں اُسے اچھی طرح یاد تھی۔ ابھی دو سال ہی تو ہوئے جب اس کی ماں آٹھ سال کے کشن کو بزرگوں اور سرپرستوں کے حوالے کرکے مری تھی۔ ماں نے مرتے وقت جو کچھ کہا تھا اسے وہ ہر وقت یاد رکھتا اور شاید اسی لئے زندگی کا امتحان اس کے لئے آسان ہوگیا تھا۔

گھر میں کام کاج کی کمی نہیں تھی۔ کشن کو ہر وقت کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑتا۔ پان، چھالیہ، دہی۔ دودھ، سبزی، ترکاری اور اسی طرح کے چھوٹے چھوٹے کاموں کے لئے کشن کو گھڑی گھڑی بازار دوڑنا پڑتا گھر کا سودا کبھی اکٹھا نہیں آیا کرتا تھا۔ جو چیز جس وقت یاد آئی اسی وقت کشن پر حکم چلا دیا گیا۔

ماں کی زندگی میں کشن نے معمولی حروف شناسی سیکھی تھی مگر اب تو اس کو۔ کورا جاہل ہی سمجھنا چاہئے۔ اسے اتنی فرصت کہاں تھی کہ وہ کبھی کتاب لے کر بیٹھتا۔ بہت مشکل سے رات کو چھ گھنٹے سونے کا وقت مل جایا کرتا تھا۔ باورچی خانہ کے بغل میں جو کباڑ خانہ تھا اسی میں وہ سویا کرتا تھا۔ سردیوں میں دو پرانے کمبل مل جایا کرتے تھے۔ ایک کو بچھانا اور ایک کو اوڑھنا۔ زیادہ سردی معلوم ہوتی تو اپنے ہاتھ پیروں کو مینڈک کی طرح سکیڑ لیتا۔ گرمیاں کسی قدر آرام سے گذر جاتیں کیونکہ باہر بہت بڑا میدان تھا۔

گھر میں جو کچھ پکتا تھا اس میں وہ کبھی برابر کا حصہ دار نہیں ہوا کچھ ملا۔ کچھ نہیں ملا۔ بچی کچی روٹی۔ اور بسی ہوئی ترکاری بڑے شوق سے کھالیا کرتا۔ اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح رکھنا اس کی ماں نے بہت چھوٹی عمر میں سکھایا تھا۔ اس لئے اس نے کبھی دکھ کو دکھ نہیں سمجھا۔

جاڑے کا موسم تھا۔ رات کے دس بجے تھے۔ کشن کمبل میں لپٹا ہوا سو رہا تھا۔ اتنے میں بڑی چاچی نے آکر جگایا:۔

"کشن!۔ کشن!!—"

کشن گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ چاچی نے کہا:۔

"آج ماں جی کی دوائی کے لئے مصری نہیں آئی ہے"

"مگر اس وقت تو بڑی سردی ہے۔ کل سویرے لادوں گا"

کشن نے کہنے کے لئے تو کہہ دیا۔ مگر فوراً ہی اسے ماں کی بات یاد آئی۔ ماں نے مرنے کے وقت کہا تھا "بڑوں کی عزت کرنا اور ان کا حکم ماننے سے انکار نہ کرنا" چاچی بولی:۔

"کھا کھا کر موٹا ہوا ہے۔ جاتا ہے یا نہیں؟"

خواہ غلطی کسی کی ہو۔ مگر کشن نے اپنی غلطی تسلیم کی اور کمبل چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ چاچی نے اسے دو پیسے دیتے ہوئے کہا:۔

"بھاگ کے آئیو"

کشن نے آدھی دھوتی جسم سے لپیٹی اور دروازے سے باہر نکل پڑا کوئی بڑا شہر ہوتا تو خیر چھوٹا سا گاؤں تھا۔ کل تین چار دوکانیں تھیں۔ جاڑے کے موسم میں آٹھ ہی بجے سارا گاؤں سنسان ہو جایا کرتا تھا کشن نے اپنے اردگرد دیکھا۔ ہولناک تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ ہو کا عالم تھا کہیں سے ایک کتے کے بھونکنے کی بھی تو آواز نہیں آرہی تھی۔ جیسے یہ مردوں کی بستی ہو۔ اس نے سوچا۔ کہیں چل کر پڑ رہوں۔ مگر فوراً ہی ماں کی بات یاد آگئی۔ اور کسی غیبی طاقت نے اسے کھینچ کر بنئے کی دوکان تک پہونچا دیا۔

دوکان بند تھی مگر بنیا اندر ہی سویا کرتا تھا۔ کشن نے پکارا:۔

"جگو دادا! "

جگو نے دوکان کا ایک تختہ سرکا کر باہر جھانکا:۔

"کون ہے!"

"میں ہوں کشن"

"اتنی رات گئے کیا کام ہے بیٹا!"

"دادی کے لئے دو پیسے کی مصری چاہئے"

بوڑھے بنئے نے مصری کی پڑیا دیتے ہوئے پوچھا:۔

"تم کس راستے سے آئے ہو!"

"تالاب کے کنارے کنارے آگیا ہوں"

"مگر ادھر سے مت جانا۔ راستہ میں جو پیپل کا درخت ہے۔ وہ بڑا منحوس ہے۔ پکی سڑک سے جانا!"

آتے وقت کشن کو یاد نہیں رہا تھا۔ کہ یہ راستہ خطرناک ہے مگر اب بنئے کے کہنے سے چڑیل کے متعلق جتنی کہانیاں مشہور تھیں وہ سب یکے بعد دیگرے کشن کے دماغ میں چکر لگانے لگیں۔ کشن نے دوکان سے کچھ دور ہٹ کر سوچا "پکی سڑک سے بہت دور پڑے گا۔ ایک میل۔ ادھر ہی سے نکل چلوں۔ ڈرنے کی کیا بات۔ جیسے آیا تھا ویسے ہی چلا جاؤں گا!" یہ سوچ کر اس کے دل کو تقویت پہونچی اور وہ اسی تالاب والے راستہ پر چلنے لگا دل کی دہشت کو مٹانے کے لئے اس نے گنگنانا شروع کیا پھر زور سے گانے لگا:۔

"چل چل رے نوجوان"

اب وہ پیپل کے نیچے پہونچ گیا تھا۔ گانا بند ہوگیا۔ دہشت کے مارے اس کا دل بیٹھنے لگا۔ یکایک ہمت کر کے وہ بھاگا۔ مگر تھوڑی دور جانے کے بعد اس نے ایسا محسوس کیا۔ جیسے کسی نے پیچھے سے اس کی دھوتی پکڑ لی ہو۔ وہ اوندھے منہ دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔ ایک تو دل میں دہشت بیٹھی ہوئی تھی۔ دوسرے ہاتھ اور ناک میں ایسی شدید چوٹ آئی کہ وہ بیہوش ہوگیا۔

ہوش ہونے پر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور دھوتی کے کنارے سے ناک کا خون پونچھتا ہوا گھر کی طرف چل پڑا۔ مصری کی پڑیا اب بھی اس کی مٹھی میں دبی ہوئی تھی۔

بہت آوازیں دینے کے بعد دروازہ کھلا۔ چاچی نے غصہ میں کہا:۔

"اب آیا ہے تین بجے رات کو، کہیں تاڑی پینے لگ گیا ہوگا۔ دیکھو نا۔ جھگڑا کر کے آیا ہے، چل دور ہو۔ ایسے نشہ باز دل کے لئے اس گھر میں جگہ نہیں ہے" کہہ کر چاچی نے دروازہ بند کر لیا۔

کشن رات کے سناٹے میں منہ لٹکائے ہوئے ایک طرف کو چل دیا پتہ نہیں کہاں! اس دن کے بعد کشن کو کسی نے نہیں دیکھا۔

(آزاد ترجمہ)



میں جاسوسی کروں گی

از
جناب رئیس امروہوی

ہر ہٹلر کے پنچویں کالم نے موجودہ جنگ میں ایک اہم حصہ لیا ہے اور یہ ایسا کہ —— پولینڈ، فرانس، بلجیم، ... ہالینڈ وغیرہ کو صرف مارشل گورنگ کے ہوابازوں اور ہر فان بریخش کے مشینی دستوں نے فتح کیا ہے۔ ہر ہٹلر اور گسٹاپو جرمن خفیہ پولیس کے دوسرے رہنماؤں کے ساتھ ناانصافی ہوگی کیونکہ امر واقعہ ہے کہ جرمنی کی بھاری فوجی مشین کے لئے انہیں لوگوں نے زمین ہموار کی ہے۔ اگر ہر ہمبرگ کا سندھ سے ناروے اور ڈنمارک کی رائے عامہ کو سراسیمہ نہ کر دیتے۔ تو مشکل تھا کہ جرمنی کی فوجی طاقت اس قدر آسانی سے انہیں چت کر دیتی۔ اگر پانچویں دستے والے۔ مسٹر نولائن کے اس پار فرانسیسی قوم کی اخلاقی طاقت کو منتشر کرنے میں اپنی ذہانت کے تمام وسائل استعمال نہ کر لیتے تو کس طرح ممکن تھا۔ کہ جون ۱۹۴۰ء میں ہر ہٹلر کی قہار فوجیں میجنو لائن کو اس آسانی سے توڑ دیتیں۔

درحقیقت ہر ہٹلر نے فنون جنگ کی تاریخ بدل دی ہے۔ نازی جب کسی ملک کی طرف جارحانہ پیش قدمی کرنا چاہتے ہیں۔ تو پہلے وہ اعصابی جنگ شروع کرتے ہیں۔ اعصابی جنگ سے وہ ناقابل دفاع حملہ مراد ہے۔ جو ریڈیو سینما۔ اخبارات، اور پانچویں دستے والوں کے ذریعہ اس قوم پر کیا جاتا ہے۔ کسی ملک کے خلاف فوجی نقل و حرکت کرنے سے پہلے ڈاکٹر گوبلز کے دفتر۔ ہر ہٹلر کے جاسوسی مرکز اور ... سلیمنڈ سرابلنگ ڈوشرز امی۔ (جرمن خفیہ پولیس کی جاسوس عورتوں کے مستقر) کی غیر معمولی سرگرمی شروع ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر گوبلز، ریڈیو، سینما اور صحافت کی پروپاگنڈا مشین کا مرکزی بٹن دبا دیتا ہے اور اچانک مائیکرو فون کی زبان، اسکرین کا لب و لہجہ اور اخبارات کی آواز بیک وقت تینوں عظیم الشان طاقتیں اس بدنصیب ملک کے خلاف زہریلا پروپگنڈا شروع کر دیتی ہیں۔ اس پر طرح طرح کے الزام لگائے جاتے ہیں۔ برسر اقتدار حکومت کو طرح طرح سے بدنام کیا جاتا ہے، کبھی اقلیت کے مسائل چھیڑ دیئے جاتے ہیں۔ کبھی نسلی و قومی منافرت پھیلائی جاتی ہے کبھی اقتصادی و معاشی سوالات پیدا کئے جاتے ہیں۔ کبھی نازیوں کی شاندار فتوحات کا راگ اُلاپا جاتا ہے۔ کبھی دھمکیاں دی جاتی ہیں۔ غرض کوئی دقیقہ اس کی قوت ارادی کو مضمحل کرنے کا باقی نہیں چھوڑا جاتا۔ ٹھیک اس وقت جبکہ ریڈیائی لہروں۔ سینمائی نظاروں اور صحافتی وسیلوں کے ذریعہ یہ طوفان برپا ہوتا ہے۔ ہر ہٹلر کے ہزاروں ایجنٹ، سیاحوں۔ طالب علموں۔ تاجروں مزدوروں۔ انجینیروں اور مشیروں کے بھیس میں جوق در جوق اس ملک کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔ اور اس کی قومی زندگی میں اس طرح گھس جاتے ہیں۔ جس طرح کسی مہلک وبا کے جراثیم ... ان کے عقب میں ایک اور فوج ہوتی ہے۔ بلکہ اور لشکر جرار۔ حسین دوشیزاؤں کا۔ کیوپڈ اپنا تیر و کمان لئے جس کے آگے آگے چلتا ہے، یہ حسین تتلیاں۔ جاسوسی اور ذہانت و حسن کے تمام بے پناہ آلات سے مسلح ہوتی ہیں۔ اور مشکل ہے کہ اس معصوم فوج کا مقابلہ کیا جاسکے۔ جو فقط قاتل نگاہوں۔ بانکے تیوروں اور غارت گر اداؤں کے ہتھیاروں سے آراستہ ہے —— ظاہر ہے کہ انسان، دنیا کی ہر طاقت کا مقابلہ کر سکتا ہے، لیکن جب بھولا بھالا کیوپڈ اپنا ننھا منا تیر کمان لے کر مٹ کرنے لگے۔ تو ... ؟ —— درحقیقت نازیوں کا پانچواں دستہ انہیں حسین دوشیزاؤں سے عبارت ہے جو ہر ہملر (جرمن خفیہ پولیس کے افسر اعلیٰ) کی بھتیجی۔ مس ایڈ تھ فان کوہلر۔ کی زیر نگرانی قوموں کی تاریخوں اور سلطنتوں کی قسمتوں سے کھیلتی رہتی ہے۔

مس ایڈتھ فان کوہلر

آپ کیسے یقین کر سکیں گے کہ یہ حسین لڑکی۔ جس کے چہرے پر معصومیت کھیلتی ہے، جس کی خوبصورت آنکھوں میں حیا آمیز کیفیت جھلکتی رہتی ہے۔ جس کے سنہری ریشمی بالوں کو دیکھ کر بے اختیار انھیں چوم لینے کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے، نازی جاسوس لڑکیوں کی۔ رہنمائے اعلیٰ ہے۔ وہ بلا خیر حسن و جمال کی مالک ہے، قیصر ولیم کی مشہور جاسوسہ ماتا ہری (...) کی طرح مگر اس سے کہیں زیادہ ذہین و چالاک ہے۔ ماتا ہری نے ۱۹۱۴ء کی لڑائی میں زیادہ

سے زیادہ چیدہ تحادی افسروں اور فوجوں کو تباہ کیا تھا۔ مگر مس ایڈ یتھ فان کو طر نے رومانیہ کا تخت و تاج الٹ دیا۔ شاہ کیرول اسی غارتگر جاسوسہ کی سازشوں کا شکار ہوا ہے اور جنرل انٹی نسکو رومانیہ کا آمر، اسی سنہری ناگن کا آوردہ ہے مس ایڈیتھ فان کو طر ہیر ہٹلر کی بھتیجی ہے۔ یہ میونک میں پیدا ہوئی اور وہیں اس نے رقص۔ موسیقی اور نرسنگ کی تعلیم پائی۔ جب مس ایڈیتھ سے معلوم کیا گیا کہ وہ کس پیشے کو اپنے مستقبل کے لئے پسند کرتی ہے؟ تو اس نے بے ساختہ جواب دیا:۔

"میں تو جاسوسی کرونگی!"

اور دوسرے ہی روز وہ "اسلینڈ سابلنگ دوشنزا" کے جاسوسی دفتر میں کام کرنے لگی۔ مس ایڈیتھ کی جاسوسانہ زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ رومانیہ کا انقلاب ہے۔ جو آئرن گارڈز کے ذریعہ عمل میں آیا اور پرنس کیرل کی معزولی جلاوطنی اور بدنصیبی کا باعث بنا۔ مس ایڈیتھ رومانیہ میں پہلے پہلے اک نرس کی حیثیت سے آئی۔ اور آئرن گارڈز (باغی جماعت) میں طبی خدمات انجام دینے لگی۔ رفتہ رفتہ اس نے اپنی سرگرمیوں کا دائرہ وسیع کر لیا۔ اب وہ پرنس کیرل اور اس کی یہودی محبوبہ میڈم لوپسکو کے خلاف عملاً بغاوت و انقلاب کی تخم ریزی کر رہی تھی۔ مس ایڈیتھ نے رومانیہ کی عورتوں کی منظم جماعتیں بنائیں۔ اور نازی نظام کی خوبیاں اس شدت سے ان کے ذہن نشین کر دیں کہ جب جولائی ۱۹۴۰ء میں پرنس کیرل کے خلاف آئرن گارڈز نے بغاوت کی تو رومانیہ کی عورتوں نے کھلم کھلا باغیانہ سرگرمیوں میں حصہ لیا۔ آج کل یہ بلقان کی جاسوسانہ سرگرمیوں کی نگران ہے



امن و جنگ

(از فکر رسا حضرت بشارت صاحب دہلوی)

یہ بولا امن اک دن جنگ سے آکر بعد منت   کہ سُن غارت گرِ امن و اماں اے بانیٔ کلفت
گھٹا ادبار کی چھائی جہاں تیرا قدم آیا   نحوست آکے منڈلائی جہاں تیرا قدم آیا
زمانہ کانپتا ہے تجھ سے دنیا تجھ سے ڈرتی ہے   ترقی کے۔ تو آکر راستہ مسدود کرتی ہے
تجھے عاقل شبِ غم اور شبِ تاریک کہتے ہیں   مجھے صبحِ سعادت کہتے ہیں وہ ٹھیک کہتے ہیں
ترقی اور خوش حالی کی میں راہیں دکھاتا ہوں   زمانہ کو میں بامِ عیش و راحت پر چڑھاتا ہوں
بھلا کیا تاب جو میرے مقابل آسکے ناکامی   رسولِ ہاشمی حضرت محمدؐ تھے مرے حامی
جہاں کی صنعتوں کا در حقیقت رازداں میں ہوں   جو سچ پوچھو فنِ سائنس کی روحِ رواں میں ہوں
مزے کی نیند سوتا ہے زمانہ عین راحت ہے   قیامِ دولتِ دارین میری ہی بدولت ہے
میں جس جا جلوہ افگن ہوں وہاں رحمت ہی رحمت ہے   قدم میرا جہاں آیا وہاں برکت ہی برکت ہے
محلاتِ شہنشاہی کا مجھ سے بول بالا ہے   غریبوں کے مکانوں میں مرے دم کا اجالا ہے
ڈکیتی۔ رہزنی ہے۔ بیکسی ہے اور نہ بیکاری   خوشی کا دور ہے، جس جا ہوئی میری عملداری
خدا کے واسطے اے جنگ دنیا میں نہ آیا کر   نہ اپنے ظلم سے دنیا کو تو آکر ستایا کر

(✱)

کہا یہ جنگ نے سُن کر غضب کے جوش میں آکر   کہ شاہانِ جہاں میرے گدا ہیں اور ذرا جاکر
شہنشاہی کی زیبائش ہوں میں ہوں تاج کی زینت   سپاہی کا میں زیور ہوں میں ہوں محتاج کی زینت
مرے نزدیک اک ہموار ہے گہرائی غاروں کی   مری نظروں میں پستی ہے بلندی کوہساروں کی
مری چینِ جبیں سے موجِ دریا بچ کے چلتی ہے   مرے غصے سے کوہ و دشت کی چھاتی دہلتی ہے
لرزتی ہے زمیں مجھ سے فلک بھی کانپ جاتا ہے   مرے غازی کے گھوڑے کی قسم اللہ کھاتا ہے
غرور و سرکشی کا سر میں ٹھوکر سے کچلتی ہوں   حقیقت مٹلریزم کی ہے کیا چٹکی سے ملتی ہوں
شجاعت ہوں، ہمت ہوں۔ میں ہمت ہوں، میں طاقت ہوں   خزانہ بادشاہوں کا جواں مردوں کی دولت ہوں
شبِ وصلت مجھی کو عاشقانِ رزم کہتے ہیں   بہادر میرے ہی دیدار کے مشتاق رہتے ہیں
میں بزدل کے لئے ہوں موت میں جانِ بہادر ہوں   مری قیمت نہیں، انمول ہوں میں بے بہا دُر ہوں
تری ہستی تو دنیا میں فقط بے کار ہستی ہے   نہ تجھ کو خوفِ رسوائی نہ تجھ کو فکرِ پستی ہے
چل اپنا راستہ لے۔ تو بڑا ناصح بنا آکر   ہمیشہ میرے کاموں میں مخل ہوتا ہے آ آ کر

✱ ✱ ✱ ✱

یہ باتیں امن کی اور جنگ کی انصاف سنتا تھا — مخاطب کرکے دونوں کو ہوا وہ اس طرح گویا
تعجب ہے کہ تم دونوں میں یہ کیسی لڑائی ہے — فقط یہ فرق سمجھو۔ اک بہن ہے ایک بھائی ہے
یہ جھگڑا چھوڑ دو آپس کا یہ کیوں غل مچاتے ہو — مصیبت میں تم ہی اک دوسرے کے کام آتے ہو
دمِ مشکل لڑائی۔ امن کو بس یاد کرتی ہے — مصیبت امن پر آئی۔ تو جنگ امداد کرتی ہے
ہر اک ہے لازم و ملزوم بے شک اپنی اپنی جا — خدا تو کوئی شے بے کار پیدا ہی نہیں کرتا
مرے نزدیک تم دونوں کی ہستی کی ضرورت ہے — زمانہ کو بلندی اور پستی کی ضرورت ہے

(*)

یہ سُن کر مل گئے دونوں نہ پھر کچھ بدگمانی کی — کہ گنجائش نہ تھی اس فیصلے میں نظرِ ثانی کی

غرض انصاف نے دونوں کی بڑھتی آگ کو روکا
بشارت نے بھی رہوارِ قلم کی باگ کو روکا



(از جناب وزیر زادہ شجاعت خاں صاحب مہر)

کسی کا درد دل میں میہماں ہے — اسی سے زندگانی شادماں ہے
تمہارے ہی ستم کا یہ بیاں ہے — مگر کہنے کو میری داستاں ہے
کنارے پر کہاں لگتی ہے دیکھو — روانہ کشتیٔ عمر رواں ہے
وہ بربادِ تمنا ہوں جہاں میں — کہ مجھ سے آرزو دامن کشاں ہے
نگاہیں ڈھونڈھتی پھرتی ہیں جس کو — خدا جانے کدھر ہے وہ کہاں ہے
نہ پہونچا میں سرِ منزل تو غم کیا — مری حسرت شریکِ کارواں ہے
ہوا برباد جو راہِ طلب میں — اُسے حاصل حیاتِ جاوداں ہے
چھپے کیونکر عنادل کی محبت — چمن کا پتہ پتہ رازداں ہے
اگر ذوقِ جبیں سائی ہے تجھ کو — تو ہر ذرہ کسی کا آستاں ہے
نہیں ہوتا کسی صورت میسّر — ترا ملنا نصیبِ دشمناں ہے

یہی ہے مہرؔ دستورِ زمانہ
کوئی ناشاد، کوئی شادماں ہے

ہزاروں ہندوستانی عورتیں دعائیں دے رہی ہیں

کیونکہ جب کوئی عورت سیلان الرحم، عام جسمانی کمزوری، ورم رحم ضعفِ رحم، اسقاط حمل، اختناق الرحم، ماہواری بیقاعدگی یا ہر اس پوشیدہ اندرونی شکایت جسکا عورت کے جسم سے تعلق ہے مبتلا ہوتی ہے تو وہ دہلی کے **مشہور دواخانے اکسیر خاتون** کی ایک شیشی منگوالیتی ہے اور ان تمام امراض سے جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے نجات حاصل کرلیتی ہے اپنے حسن کی رعنائی قایم رکھنے کے لئے تندرست عورتیں بھی **اکسیر خاتون** کا استعمال کرتی ہیں غرضکہ **اکسیر خاتون** فرقۂ نسواں کے لئے ایک ایسا زریں تحفہ ہے جسے حاصل کرکے عورتیں اپنے آپ کو ہر نسوانی مرض سے محفوظ کرلیتی ہیں اور اسکے موجد کو دعائیں دیتی ہیں اور اسی جذبہ کے ماتحت بعض عورتیں ایک شیشی کیلئے ۱۲؍ کی بجائے بارہ روپئے ادا کرنیکو تیار ہوتی ہیں لیکن مشہور دواخانہ نے فیصلہ کیا ہے کہ اکسیر خاتون کی ایک شیشی بارہ آنہ سے زیادہ فروخت نہ کی جائے تاکہ ہر خاص و عام فائدہ اٹھاسکے۔ بلکہ اس کے ساتھ

دوائے کیلہ کے نام سے ایک ایسی دوا تیار کی ہے جو نہ صرف پوشیدہ نسوانی امراض کا واحد علاج بلکہ ان عورتوں کو جنکی گود اولاد سے خالی ہوتی ہے بامراد کردیتی ہے اور شرطیہ حمل ٹھہر کر ایکسال کے اندر اندر بچہ پیدا ہوجاتا ہے

دوائے کیلہ کی قیمت صرف ایکروپیہ چار آنہ ہے دونوں دوائیں یا ایک محصولڈاک ہر حالتمیں گیارہ آنہ علاوہ ہوگا

اکسیر خاتون قیمتی بارہ آنہ (۱۲؍) ـــ اور ـــ **دوائے کیلہ** قیمتی سوا روپیہ (عہ)

منگوانے کا پتہ مشہور دواخانہ فراشخانہ دہلی

بڑے آدمیوں کی پہچان

(از جناب امین سلونوی)

اگر کوئی شخص اتفاقیہ یا جان بوجھ کر آپ سے یہ سوال کرے یا کر بیٹھے یا ارادہ ہو کہ بھائی بڑا آدمی کسے کہتے ہیں اور اس کی کیا پہچان ہے؟ پہلے تو آپ اس سوال کے سنتے ہی بوکھلا جائیں گے، اس کے بعد جب ذرا ہوش و حواس بجا ہوں گے تو اس کے ہر پہلو پر غور کریں گے۔ اور کس طرح؟ کہ باقاعدہ کبھی تو فلسفیوں کے نظریئے تلاش کریں گے اور حکماء کے اقوال کی طرف متوجہ ہوں گے، کبھی برٹش میوزیم کا قصد کریں گے۔ اور کبھی پٹنہ میں خدا بخش کی لائبریری کا خیال فرمائیں گے اور کوئی تعجب نہیں کہ (ایم۔ آر۔ اے۔ ایس) والوں سے اس مسئلہ پر خط و کتابت بھی شروع کر دیں۔ پھر ممکن ہے کہ آپ یہ جواب بھی دے بیٹھیں کہ یہ تو علم ہندسہ اور اصول مساحت سے متعلق سوال ہے اس لئے جو پورے پانچ فٹ لانبا ہو اور فوج و پولیس میں رہ کر وکٹوریہ کراس یا خان بہادری کا مستحق ہو چکا ہو وہ بڑا آدمی ہے۔ چاہے رفتار زمانہ نے اسے صراط مستقیم رہنے دیا ہو یا خط محنی۔ مگر بڑا تعجب ہوگا جب آپ سنیں گے کہ جواب غلط ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی اندیشہ ہے کہ کہیں آپ کا "ہارٹ فیل نہ ہو جائے"۔ بڑے آدمیوں سے مراد وہ نہیں ہے۔ بلکہ حیثیت میں، مرتبہ میں، عادات میں۔ اطوار میں، اس کی کیا پہچان ہے بڑا آدمی کوئی آفات ارض و سماوات سے متعلق بات سے نہیں ہے کہ جس کو عام نظریں فوراً محسوس کر لیں۔ اس کے لئے تحریر کی ضرورت ہے — جانی بوجھی اور سمجھی سمجھائی باتوں کا تو خیر کوئی ذکر نہیں ہے کیونکہ وہ اپنے موقع و محل کے اعتبار سے خود ہی بتا دیتی ہے، کہ وہ کیا چیز ہے مگر جن چیزوں میں کوئی ظاہری علامت ہے، وغیرہ کی قسم کی نہیں ہوتی۔ البتہ اس کے پہچاننے میں ذرا ایڑی چوٹی کا زور لگانا پڑتا ہے۔ اور اس کے مضامین کی ہر ڈگری پر ہوشیاری سے نظر رکھنا پڑتا ہے ہم نے

آپ نے اور سب نے دنیا میں قدم رکھتے ہی بڑے بوڑھوں کے علاوہ گاؤں کی اسمبلیوں میں، اور شہر کے کمیٹیوں کی منڈیروں پر لوگوں کو کھس پھس (کانا پھوسی) کرتے دیکھا اور سنا ہوگا۔ کہ فلاں بڑا آدمی ہے کم از کم ہم کو اس بات پر ہمیشہ تعجب رہا کہ لوگ آخر کس طرح سمجھ لیتے ہیں کہ یہ بڑا آدمی ہے، اور اس میں کون سی ایسی عجوبہ روزگار بات موجود ہے۔ یا پائی جاتی ہے کہ جس سے بڑا آدمی ہو گیا۔ اگر بھائی دو ہاتھ دو پاؤں دو آنکھ ایک ناک اور ایک سر والے (سر سے مراد لال سر نہیں یا چھوٹی کھوپڑی نہیں) انسان یا جانور کو بڑا آدمی کہتے ہیں تو آخر ہم بھی تو انسان نما جانور ہیں (انسان تو اس لئے کہ سب انسان ہیں اور جانور اس لئے کہ پہلے بندر تھے) اور ہم میں بھی یہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں اور اگر ہم بڑے آدمی نہیں ہو سکے تو گروہ انسان میں کوئی بڑا آدمی نہیں ہو سکتا۔ گروہ ملائک کی ہم کو کوئی خبر نہیں، تو پھر جانوروں میں بڑے آدمیوں کو تلاش کرنا چاہئے اور گدھا بدرجہ افضل بڑا آدمی ہو سکتا ہے اس لئے کہ ان تمام خصوصیات کے علاوہ بھی ایک دم کی ایسی خصوصیت اس سے وابستہ ہے، کہ وہ بڑا آدمی مانا جا سکتا ہے۔ اور اگر جانوروں میں بھی گدھے کو اس افضلیت کا شرف نہیں حاصل ہے، تو اونٹ یا ہاتھی ہی باقی رہ جاتے ہیں اور ہاتھی میں دم کی خصوصیت کے علاوہ ایک سونڈ بھی رکھتا ہے۔ اور جسامت میں بھی بظاہر اس کو فوقیت دی جا سکتی ہے اور اس حساب سے آدمی بیچارے کے پاس ان میں سے کوئی خصوصیت نہیں کہ جس سے اس کو فوقیت ہو مگر پھر بھی ہم نے بہ نظر احتیاط ایسا کیا کہ بڑے آدمی کا نام سنتے ہی چونکے دیکھا اور اس کے گرد بھی گھوم پھر کر اطمینان کرنا چاہا کہ شاید کوئی دم یا سونڈ۔ وغیرہ کی قسم کی کوئی چیز دبی دبائی سکڑی سکڑائی کہیں چھپی ہو اور ہمیں

نظر آتی ہو جب ہم نے ادھر سے اطمینان کر لیا۔ تو آخر کار ہمیں یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ ہو نہ ہو یہ بڑا آدمی یا تو گدھے کی صورت کا کوئی جانور ہے یا ہاتھی نما کوئی امرود کی شکل کا پھل ہے۔ مگر پھر بھی اطمینان نہ ہوا۔ تو استفتے لکھے اور علماء سے دریافت کرے۔ اسمبلی میں پہلے تو سوالات کرائے۔ پھر اس مسئلہ کو شارد ا بکث کی صورت پیش کرنے کا ارادہ کیا الہ کے نوٹس دلائے تاکہ ان کی سرمائی موسم میں جبکہ نئی دہلی کا افتتاح کرنے بڑے لاٹ صاحب وغیرہ تشریف لائیں یا جب مہاتما جی صلح کی گفتگو کرنے جائیں۔ تو اس کا بھی نوٹس دیدیا جائے مدتوں یہ کھچڑی پکا کی۔ ممبروں سے مشورے کئے جو ناہموار تھے ان کو ہموار کیا اور اپنا ہمخیال بنایا۔ اور اس بل کا ڈرافٹ بھی کر لیا۔ مگر دفعتاً ایک بزرگ خضر صورت نے میری پریشانی میں امداد کی، اور فرمایا کہ میاں کس چکر میں ہو در اصل بڑا آدمی گروہ انسان ہی میں ہوتا ہے۔ یا ہو جاتا ہے۔ اس میں بھی معذرت کو دخل ہوتا ہے دو ہی چار ایسے صاحب دماغ ملیں گے جنہیں بڑا آدمی کہا جائے۔ یا جو خاندان، سوسائٹی، قوم ملک سب ہی کے لئے فخر کا باعث ہوتا ہے۔ میں تمہیں چند پہچانیاں بتائے دیتا ہوں۔ کسی وقت دیکھ لینا۔ اتنا جان لینے کے بعد کہ بڑا آدمی انسان ہی میں ہوتا ہے توبہ توبہ کی کان پکڑے، سات دفعہ اٹھا بیٹھی کی، کہ بھائی اب تو اس کی تحقیق میں پھنس گئے ہیں۔ اب آئندہ ایسی حرکت نہ کریں گے۔ چنانچہ شوق ہوا کہ ان کی زیارت کر لینا چاہیئے۔ کیونکہ اگر ان کو نہ دیکھا تو دنیا میں کچھ نہ دیکھا۔ آپ جانئے کہ آدمی کا شیطان بھی آدمی ہی ہوتا ہے۔ کسی نے مذاق اڑایا، کسی نے پاگل سمجھا۔ بعض نے جیل کی طرف رہنمائی کی۔ بعض نے آگرہ جانے کی صلاح دی، جو میری مصیبت میں شریک تھے۔ انہوں نے کہا کہ ریلوے اسٹیشن پر ایسے لوگوں کی زیارت نصیب ہو سکتی ہے۔ چنانچہ اس خبط فرما یہ کو لے کر تجربہ کے لئے کئی بار گھر سے اسٹیشن کا رخ کیا اور رج بھی کیسا پیدل، مگر اس تجربہ میں راستہ بھر جو جو مصائب و تکالیف کا سامنا ہوا ہے۔ شاید حجاج کو بھی بدوؤں سے اتنی تکلیف نہ پہونچی ہوگی۔ جس کو ہمیں خوب جانتے ہیں۔ جہاز کی طرح کبھی ہم کو داہنی طرف اور کبھی بائیں سڑک کے بھاگنا پڑتا۔ اس لئے کہ یکہ تانگہ۔ گاڑی بائیسکل موٹر برابر گذر رہی تھیں۔ اور ان میں کوئی شریف اور غیر شریف کا پہچاننے والا نہ تھا۔ یکہ والوں کو تو ہم اکثر آنکھ دکھا دیتے تھے اور وہ بیچارے شاید خود ہم کو بڑا آدمی سمجھ کر یا نہ جانے خدا کے خوف سے بچہ کو دبا کر نکال لے جاتے تھے مگر تانگہ اور گاڑی والے البتہ دو ہی فرلانگ سے چلانا شروع کر دیتے، "سادہ آدمی ہٹ جاؤ" جگہ سے کنارے جاؤ" غرضکہ کبھی تو ہم ادھر ادھر ہو جاتے۔ اور کبھی خود بچنے جھکتے اپنی زبان میں برا بھلا کہتے گذر جاتے۔ مگر موٹر والوں سے خدا بچاوے تو بچ سکتے تھے۔ اس لئے کہ بالکل تازہ ولایت جانور نہ کسی کی زبان سمجھتا ہے نہ کسی کی کوئی پرواہ کرتا ہے۔ وہ ایک مرتبہ تو گدھے کی طرح سیپوں سیپوں کر دیتا ہے۔ لیکن تیسری بار اگر راستہ چلنے والے نے سنا اور سڑک چھوڑ کر کسی نالی وغیرہ میں نہ پھاند پڑا تو سمجھ لیجئے کہ وہ موٹر معہ ڈرائیور ایک دفعہ اوپر سے گذر جائے گا۔ اور اتفاقیہ حادثہ کہہ کر ٹرافک کنسٹبل کی جیب میں دو ایک چمکتے ہوئے رائج الوقت سکے ڈالدے گا اور یہ بھی اس وقت جبکہ وہ وہاں موجود ہو ورنہ یونہی بغیر پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے چلتا ہوگا۔ پھر اب جانئے وہاں سے خود ایک پانوں سے لنگ کرتے ہوئے آئیں یا بدست دیگرے دست بدست دیگرے اٹھا کر لائے جائیں تو بھائی آپ کچھ سمجھے یہ کون ہو سکتا ہے۔ وہی بڑا آدمی۔ کہ جو اسی لئے بنایا گیا ہے۔ کہ اس کی موٹر بجائے سڑکوں پر چلنے کے چھوٹے انسانوں کے سروں پر سے گذر جائے۔ مگر بہرحال خاکسار بھی اپنی دھن کے پکے "سر جان سائمن" کی طرح تمام سرد و گرم برداشت کرتے اور بغیر "گو بیگ" کے نعرۂ دلخراش کی پرواہ کئے اسٹیشن تک ضرور پہونچے۔ اب سنئے اول تو خود مجھے ایسا اتفاق کم ہوتا ہے کہ میں اسٹیشن پر صحیح وقت سے پہونچوں اور اگر کبھی بہ ہزار خرابی دو وقت پر پہونچے بھی تو ریلوے والوں کی یہ ضد کہ ہماری آمد کی اطلاع پاتے ہی نوٹس بورڈ پر پہلے ہی سے لکھ دیا جاتا ہے کہ پشاور میل ایک گھنٹہ ۴۵ منٹ لیٹ ہے،، بہرحال ہم کو بھی اسٹیشن پر گاڑی کا انتظار کرنا ہے اور ٹہل ٹہل کر ایک ایک بو سونگھنا منظور، دیوانہ بکار خویش کہیئے۔ یا بکار خود ہشیار والا مضمون میں بھی اپنی خورد بینی اور دور بینی کی سیر میں مصروف ہو جاتا ہوں۔ اور چونکہ یہ سن چکا تھا کہ اکثر اسٹیشن پر بڑے آدمیوں کی زیارت ہو جاتی ہے۔ اس لئے میں بھی بیچین ادہر سے اُدھر دوڑتا پھرتا۔ یوں تو میں اب تحصیل کے مذکوری

اور صاحب کے اردلی، میونسپلٹی کے جمعدار، پولیس کے کنسٹبل و چوکیدار کو بھی بڑا آدمی سے کم نہیں سمجھتا۔ اس لئے کہ تحصیل کا مذکوری جہاں اپنی نحاس والی گھوڑی پر بلا چار جامہ سوار ہوکر دیہاتوں میں کھیت کی مینڈوں سے ہوکر گذرا۔ بس چوہوں نے بل تلاش کرنا شروع کر دیا سب کے سب لرزاں و ترساں، اگر موقع مل سکا۔ تو اپنے اپنے ڈربے میں چھپ گئے۔ تاکہ بیگار کی زحمت سے نجات ملے اور بھوسہ و گھاس ڈھوتے ڈھوتے کمر میں درد نہ ہونے لگے یا بڑے صاحب کے اردلی کے چپراسی کو لیجئے، ان کی مرضی کے بغیر بنگلہ کے اندر قدم رکھنا مشکل ادھر آپ نے پھاٹک میں قدم رکھا۔ اور ادھر ہڑلداک کتوں کی طرح آپ سے لپٹ گئے۔ پہلے کچھ نذر کیجئے۔ تب کہیں جاکر وہ صاحب سے ملنے کی اجازت دیتے ہیں میونسپلٹی کے جمعدار صاحب ہیں کہ خواہ مخواہ کسی سے ٹھن بھن ہو جائے :: دیکھئے دفعہ ۳۴ میں چالان رکھا ہوا ہے۔ جو آپ پیشاب... نہ سہی کی نالی میں بیٹھ کر پیشاب کریں مگر جمعدار ہیں کہ جو شخص سڑک پر بیٹھا پیشاب کرنے کا ثبوت دے کر جرمانہ کرا ہی دیتے ہیں۔ پولیس کے کنسٹبل و چوکیدار کو لیجئے کہ معمولی ... ہو جائے اور یہ ڈاکہ و قتل عمد کی رپورٹ لکھانے بیٹھے ہیں کسی شخص کو رات چلتے اندھیرے میں پا جائیں بس ۱۰۹ میں ایک سال کی سزا کا انتظام رکھا ہوا ہے۔ کوئی حقہ چلم کی تواضع نہ کرے۔ بس اس کی ہسٹری شیٹ کھلی ہوئی ہے۔ تو بھائی میں تو ان میں سے ہر ایک کو بڑا آدمی تصور کرتا ہوں۔ تو ہاں میں اسٹیشن پر ٹہل رہا تھا کہ پسنجر میل بھی آگیا۔ ناگاہ ایک سیکنڈ کلاس کے ڈبہ سے کچھ نئی نئی جمعدار کی نگرانی میں بڑے بڑے بنڈل اسباب کے بندی جلدی اتارے جا رہے تھے۔ اور جمعدار صاحب نگرانی میں مصروف بات بات پر بگڑ بیٹھتے تھے، کبھی کبھی ہیڈ ماسٹر کی طرح اپنے ہنٹر کو بھی ہلاتے رہتے تھے، میرے لئے یہ ایک غیر معمولی بات تھی، اس لئے میں بھی قریب سے تماشہ دیکھنے میں مصروف ہوگیا کہ اسی ڈبہ سے ایک صاحب جو بالکل کو برا پالش کا ٹریڈ مارک معلوم ہوتے تھے، برآمد ہوئے کھال تو ہندوستانی ہی تھی۔ لیکن اوپر کی ساخت بالکل غیر ہندوستانی معلوم ہوتی تھی مجھ سے نہ رہا گیا۔ اور چپکے سے لپک کر ایک قلی سے دریافت کیا کہ بھائی، یہ کون ہیں؟ پہلے تو اس نے مجھے اس طرح گھور کر دیکھا جیسے میں کوئی مفرور مفسدہ ہوں، مگر بعد کو نہایت ترش روئی سے صرف اتنا جواب دیا کہ آپ کو معلوم نہیں ہوتا یہ ایک بڑے آدمی ہیں اتنا سننا تھا سننے کے بعد مجھے بڑی خوشی ہوئی جیسے کسی کو پڑی ہوئی دولت مل جائے، کیمرہ نہ تھا ورنہ تصویر لے لیتا مگر نوٹ بک نکال کر نوٹ کر لیا کہ بڑے آدمی کی پہچان یہ ہے۔ بہت لوگوں کا یہ خیال بھی ہے کہ بڑے آدمی کی ایک یہ بھی پہچان ہے۔ کہ اس کے سر کی اوپری سطح بالوں سے بالکل خالی ہو اور چاند کا حصہ تپتے ہوئے تانبے کی چادر کی طرح ہو۔ مگر مجھے اس پہچان میں تھوڑا سا شبہ معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ میرے سر کی بھی اوپری سطح۔ رفتار زمانہ کے ساتھ ساتھ بالوں سے بالکل پاک ہو چکی ہے اور چاند کا حصہ تپتے ہوئے تانبے کی چادر کی طرح ہوتی جا رہی ہے۔ . . . .

. . . .

. . . .

مگر مجھ کو آجتک کسی نے بڑا آدمی نہیں بتایا ورنہ میں شاید اپنے دوستوں کو بھی مشورہ دیتا اس لئے یہ تو قصہ پارینہ معلوم ہوتا ہے ہو بھی تو وہ گذشتہ دور کی بات ہے ہمیں اس سے کوئی بحث نہیں البتہ موجودہ دور میں بڑے آدمیوں کی پہچان اب یہ ہے کہ جس کے سر کے بالوں کے بجائے مونچھ ڈاڑھی کے بالوں کا صفایا ہو چکا ہو۔ اور دونوں منتہائے نظر بلند پرواز ہوکر رہ گئی ہوں بڑے آدمی ایک یہ بھی پہچان ہے کہ جس کے ساتھ ہر وقت ولایتی تازی النسل کا پیارا کتا بھی رہتا ہو۔ اور صاحب کی حاضری میں برابر کا شریک سمجھا جاتا ہو۔ اس کے پہچاننے کے بھی اصول مقرر ہیں یہ ہر گو بریلے دماغ والے انسان کا کام نہیں ہے کہ جو پہچان سکے۔ کسی خاص مجمع یا سوسائٹی میں جہاں بہت سے لوگ موجود ہوتے ہیں اور بقول دیہاتیوں کے زنانی کی برات میں سب ٹھاکر ہی ٹھاکر ادنیٰ و بڑے آدمی پہچاننا مشکل ہوتا ہے، لیکن ایک موٹی سی پہچان یہ بھی ہے کہ ان میں سے جس کسی جنٹلمین کی جیب میں کئی کئی رومال رکھے ہوں۔ جو مختلف حالات کے لئے علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک رومال تو محض اس لئے ہوتا ہے کہ اگر وارنش کے بوٹ پر گرد وغبار آجائے تو اس کو جھاڑ دیا جائے دوسرا باریک ریشمی رومال جو کسی نفیس خوشبو دار

لیونڈر میں بسا ہوا ہوتا ہے۔ اس سے کبھی کبھی چہرہ کا پسینہ پونچھ لیا جائے یا شدت گرمی کے وقت پنکھے کا کام دے سکے اتیسرا بقیہ۔ رومال زکام کی وقتی ریزش کی وجہ سے بار بار جیب سے نکال کر ناک پر رکھ کر دبایا جائے۔ اور ناک و رومال کے درمیان سے ایسی ایسی شریلی آوازیں پیدا ہوں۔ جیسے چھوٹی لین کا انجن کی اسٹیم کی آواز یا ستار باز کے ستار درست کرتے وقت تاروں سے جھنجھناہٹ پیدا ہو تو سمجھ لیجئے۔ کہ وہ کوئی بڑا آدمی ہے۔ اس کے علاوہ بڑا آدمی وہ بھی ہے جو اپنے ہندوستانی ساخت کے جسم پر بہترین ولائتی کپڑے کا سوٹ ڈالتے ہو لیکن سر پر احمد آبادی نمونہ کی کھدر کی گاندھی کیپ لگائے ہو۔ اور جس کی دیواریں پیمائش میں پوری آٹھ آٹھ انچہ کی ہوں۔ یا بھائی بڑا آدمی اب وہ ہو سکتا ہے جس کے مرنے کے بعد کئی روز تک شہروں میں ہڑتال رہے اور اس کے ماتم کے لئے ہر طرف جلوس نکالے جائیں جلسے کئے جائیں اور ان میں تعزیتی رزولیوشن پاس ہوں، دھواں دھار تقریریں ہوں، یادگاریں قائم کرنے کے مشورے ہوں۔ ایسی صورت میں میں اپنے تمام دوستوں کو مشورہ دیتا ہوں کہ اگر وہ کچھ بھی دنیا میں ترقی کر چکے ہوں، ان کو فوراً اپنے ہاتھ سے اپنا گلا گھونٹ کر مر جانا چاہئے۔ بلکہ میرا تو اب یہ ارادہ ہو گیا ہے کہ لاؤ لپنے تمام ملنے والوں اور تمام ایسے نمایاں کام کرنے والوں کے گلے اپنے ہاتھ سے دبا دوں اور کہیں قبر کھود کر دفن کر دوں۔ تاکہ یہ سب لوگ بھی بڑے آدمیوں میں شمار ہونے لگیں۔ لیکن جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ اس میں تھوڑی سی قانونی پابندیاں عائد ہوتی ہیں۔ لیکن ایسا نہ ہو کہ میں خود ہی پھانسی کے تختہ پر لٹکا دیا جاؤں۔ تو مجبور ہو جاتا ہوں۔ لیکن لوگوں کو خود بخود مرنے کی کوشش ضرور کرنا چاہئے۔ اور ہاں بڑا آدمی وہ بھی ہو سکتا ہے کہ جس کے ولائتی بوٹ کی ٹھوکر سے کسی کالے آدمی کا پتہ پھٹ جائے اور وہ صاف قانونی گرفت سے بچ جائے۔ یا زیادہ سے زیادہ دو چار مہینہ پوڈ بین پارک میں لیٹا لیٹا اخبار بینی کرتا رہے اور دونوں وقت مزے سے مکھن ڈبل روٹی اور چائے اڑاتا رہے بڑے آدمی کی ایک پہچان ہمارے یہاں اور بھی ہے وہ یہ ہے کہ جو ماہوار مہاجنوں کو اپنے قرضہ کی سود میں سینکڑوں روپیہ ادا کرتا ہے مگر بی منی جان کی فرمائشوں میں کوئی

۔۔۔۔۔۔۔۔ کمی نہ ہونے پائے یا وہ کہ جس کا تعلق چوک میں جتنی بڑی بڑی رنڈیاں ہوں سب سے وقتاً فوقتاً موجود رہتا ہو۔ اب بیاس وضعداری صرف ان دروازوں کے طوائف تک محدود ہو۔ ایک پہچان اور بھی ہے میاں جو بندہ پابند ہو، جو راستہ گلی چلتے سوائے اپنے خاص ملاقاتیوں کے اور کسی سے بات چیت نہ کرے اور ہمیشہ پتلون یا شیروانی کی جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنی ظاہری وجاہت سے دوستوں کو مرعوب کرنے کی کوشش کرے اس معاملہ میں مختلف نظریہ اور مختلف تجربہ ہیں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بڑا آدمی وہ بھی ہے کہ جو ہر قسم کے وعدے کرے لیکن ایفائے وعدہ ہمیشہ تحاریر وعدہ کی زد میں آجائے یا سہو نسیان، دماغی کمزوری وغیرہ کی نذر ہو جائے مثلاً ولائنڈ جارج کو ملاحظہ فرمایئے کہ وعدہ کیا اور فوراً بھول گئے یا وہ وعدہ صرف وعدہ کئے جانے کی خبر نکلی ان میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ جن کی صوفیانہ زندگی ہمیشہ خلوت در انجمن یا انجمن در خلوت بنی رہتی ہے اور حجرہ سجادہ نشینی عروسی حجلہ بنا رہتا ہے مگر ڈائری کے اوراق کی ترتیب نماز تہجد کے بعد کی جاتی ہے ایسے لوگوں کا بھی شمار بڑے آدمیوں میں ہوتا ہے جنہوں نے کبھی تین پیسہ کا اخبار ہمت خرید کر نہ پڑھا ہو۔ لیکن تمام سیاسی معاملات پر پورا عبور رکھتے ہوں اور جب کبھی ریل کا سفر درپیش آئے تو ریلوے ٹائم ٹیبل اور ٹائمس آف انڈیا یا ہندوستان ٹائمس کے پرچے ضرور ساتھ ہوں اور مطالعہ کے وقت صفحات کے نمبر نیچے کی طرف ہوں۔ گھڑی کا تسمہ ہمیشہ داہنے ہاتھ پر بندھا ہو۔ اور جن میں یہ تمام اوصاف موجود ہوں وہ بڑا آدمی ہو سکتا ہے۔ آپ کہیں گے کہ اجی مولینا امین سلونوی صاحب آپ کچھ خبطی ہو گئے ہیں آپ کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ یا کیا۔ تو بھائی میرے یہ واقعہ تو نہیں ہے لیکن اگر ایسا ہو جائے تو کوئی تعجب بھی نہیں۔ بڑے تجربہ کی باتیں بتاتا ہوں۔ بڑے آدمی کی ایک پہچان اور بھی ہے کہ جس سے غیر تو غیر اپنا باپ بھی بغیر کارڈ نہ مل سکے اور نہ اس کے معاملات میں دخل دے سکے ایسے لوگ بھی بڑے آدمیوں میں گنے جاتے ہیں۔ جو بظاہر نام و نمود کو ایک مہمل بات سمجھتے ہیں اگر ایک روز کا بھی سفر درپیش آجائے تو اپنے پرائیویٹ سکرٹری کے ذریعہ سے اپنے سفر کا پروگرام اخباروں میں احتیاطاً ضرور بھیجدیتے ہیں یہی نہیں اس صفت کے لوگ صبح کو دس بجے کے بعد شہر سے

اینٹھتے ہیں۔ اور بھائی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ بات بات پر نکتہ چینی کرے حتّٰی کہ اللہ میاں تک کے وجود کو لغو و مہمل کہہ کر مذاق میں اڑا دے غرضکہ یہ تمام باتیں بڑے آدمی کی پہچان میں داخل ہیں اور میں چونکہ خود بھی بڑا ایک آدمی بن گیا ہوں۔ اس لئے جو میں بتاؤں یا بتا رہا ہوں یہ بڑے گر کی باتیں ہیں ایسے ویسے لوگ تو شاید اس کو سمجھ بھی نہ سکیں البتہ منہ پھیلا کر تین بار اس زور سے ہنس دیں گے۔ کہ ان کے منہ کا اوگال و تھوک سب آپ کی شیروانی پر ہوگا۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ جو اس مضمون کو پڑھے گا اور سمجھے گا۔ تو یقیناً اس کی عاقبت درست ہو جائے گی۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ اس مضمون کے پڑھنے کے بعد ہر شخص اپنے کو غلط فہمی سے بڑا آدمی سمجھنے لگے۔ تو میں اس کا ذمہ دار نہیں۔ یہ ان کا فعل ہے میں تو اتنا کہہ کر چپ ہو رہوں گا۔

وما علینا الا البلاغ۔ یا بر رسولاں بلاغ باشد و بس

اس کے بعد دو کلمہ داستان ذریعہ عزت و شان و طلسم نام ونمود کے وجود پر مقصور کا بیان ہے۔ جس کے سننے کے بعد انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ باقی انشاء اللہ دوسری صحبت میں دیکھا جائے گا۔ اگر زندگی باقی رہی۔ تو ورنہ خیر خیرات و فاتحہ) درود۔

جذبات کامل

جناب کامل صدیقی سہسوانی

ناکام تمنا سے وہ برگشتہ ہوا ہے — بدلی ہوئی دنیائے محبت کی فضا ہے
کیا لطف کی امید کروں تجھ سے ستمگر — کیا لطف و کرم تو نے کبھی مجھ پہ کیا ہے
صحرا سے بھی بیزار ہے گلشن سے بھی نفریں — اس وحشت دل کا مرے عالم ہی نیا ہے
اس درجہ وہ خوددار ہوئے ہیں ارے توبہ — یعنی نہ محبت میں وفا ہے نہ جفا ہے
خالی نہیں حسرت کا برسنا سر محفل — شاید کہ کوئی زیست سے بیزار ہوا ہے
بیمار محبت کو سکوں موت نے بخشا — اے چارہ گرو آج سے اب ختم دعا ہے
بھرپور پڑے ہاتھ کوئی تیغ نظر کا — اے دشمن جاں دل کی طرف دیکھتا کیا ہے
اب منع نہ کر پینے سے اے واعظ مشفق — یہ دیکھ لے چھائی ہوئی وہ کالی گھٹا ہے
ہستی پہ تکبر نہ کر اے کامل ناداں — اس عالم فانی میں کہیں کوئی رہا ہے

ایک نوجوان موت کے پھندے سے کیسے بچا؟

میری درد بھری کہانی

ہندوستان کے جنگلوں اور پہاڑوں میں رہنے والے فقیروں مہاتماؤں نے وہ کارنامے کر دکھائے ہیں جنکو دیکھکر آج کل کے سائنسدان اور ڈاکٹر حیران ہیں آجکل کسی ایک بیماری کا علاج جب ڈاکٹر لوگ نہیں کر سکتے تو اس کو لاعلاج قرار دیدیتے ہیں۔ پرانے زمانے کے فقیر ننگ دھڑنگ جنگلوں میں رہنے والے مردوں کو زندہ کر دینے کی طاقت رکھتے تھے۔ انکے کرشمے ایسے ہیں کہ ایکدفعہ تو مردہ کو بھی اٹھایا جا سکتا ہے گو زمانہ بدل چکا ہے لیکن پھر بھی ہندوستان کا نام روشن کرنیوالے سچے فقیر موجود ہیں۔ آپ میری کہانی سنئے جوانی کی غلط کاریوں اور کم فہمی کی بدولت بری صحبت کا شکار ہو کر طرح طرح کی بیماریوں میں پھنس کر اپنے ہاتھوں اپنی جوانی برباد کر بیٹھا اور طاقت مردی سے محروم ہو گیا۔ جریان احتلام اور سرعت انزال وغیرہ نے جسم کو کھوکھلا کر دیا۔ چہرہ زرد پڑ گیا آنکھیں اندر کو دھنس گئیں۔ دل دھڑکنا سر چکرانا سستی نامردی وغیرہ امراض میں مبتلا ہو گیا جریان احتلام اور سرعت انزال وغیرہ سے تنگ آکر مایوس ہو گیا۔ مشہور مشہور ڈاکٹروں حکیموں اور اشتہاری دواؤں پر صحت کیلئے دھن کو برباد کر کے زندگی سے مایوس ہو بیٹھا۔ میری خوش قسمتی سمجھئے کہ سری نگر کشمیر جانا پڑا ان ہی دنوں میں ایک عرس تھا میں بھی وہاں چلا گیا، وہاں ہزاروں فقیر آتے ہیں۔ ایکدن شام کو سیر کرتا کرتا ایک پہاڑی کے کنارہ پر جا نکلا۔ سردی زیادہ بڑھ گئی تھی وہاں اچانک سامنے جو دیکھا تو ایک درویش پہاڑی سے میری طرف آتے دکھائی دیئے چہرہ پر پورا پورا جلال تھا جب میرے نزدیک آ گئے تو مجھکو سردی سے کانپتا ہوا دیکھکر پوچھا بیٹا کیا سردی زیادہ لگتی ہے پہلے تو میں ڈرا پھر حوصلہ کر کے دھیمی آواز میں کہا جی ہاں، مجھ پر ترس کھا کر انہوں نے ایک سبز رنگ کی بوٹی کھانے کو دی۔

پیارے ناظرین! اس خدائے وحدہ لاشریک کو حاضر ناظر جان کر سچ کہتا ہوں کہ ایک منٹ نہ گذرا تھا کہ میرا جسم آگ کی طرح گرم ہو گیا۔ اس معجزہ کو دیکھکر میں نے فقیر کے پاؤں پکڑ لئے اور میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے تو انہوں نے ہمدردی سے پوچھا بیٹا شام کے وقت جنگل میں اکیلا اور رونے کا سبب۔ میں نے تمام دکھ بھری کہانی سچ سچ کہدی۔ اس سچے فقیر نے مجھے حوصلہ دیا اور مجھکو اپنے ساتھ اپنے مقام رہائش پر جہاں وہ اترے ہوئے تھے لے گئے اور کہا کہ اگر تم سچے دل سے عہد کرو کہ بری باتوں سے بچو گے اور دنیا کی بھلائی کرو گے تب تمہارا بھلا ہو سکتا ہے میں نے ہاتھ جوڑ کر سچے دل سے اقرار کیا اس پر اس سچے فقیر نے مجھکو ایک دوائی کھانے کی اور ایک مالش کی دو نسخے لکھوا دیئے اور کہا اب بیٹا تم جاؤ اور بیفکر ہو کر اپنے جیسے دکھیوں کا بھلا کرو۔ ناظرین یقین کریں کہ مجھکو اس فقیر کی اچانک ملاقات سے اسقدر فائدہ ہوا کہ خود بخود میرے دل میں جوش پیدا ہونا شروع ہو گیا۔ میں نے واپس آ کر فقیر کے کہنے کے مطابق دونوں دوائیاں تیار کر کے استعمال کرنی شروع کر دیں جبطرح میرا یقین تھا کہ اسکی پہلی ہی خوراک نے اپنا کرشمہ دکھانا شروع کر دیا۔ آپ یقین جانیئے کہ پانچ چھ دن بعد ہی کایا پلٹ گئی سب تکلیفیں دور ہو کر بجلی کیطرح طاقت و جوش پیدا ہو گیا اور میں اپنے آپکو ایک قابل فخر مرد خیال کرنے لگا۔ گو ضبط کرنا دشوار تھا پھر بھی بموجب حکم مرشد کے پندرہ دن دوائی جاری رکھی۔ دودھ مکھن گھی۔ خوب ہضم ہونے لگا۔ زیادہ لکھنا خلاف تہذیب ہے گیارہ سال ہو چکے ہیں جبتک کسی دوائی کی ضرورت نہیں پڑی خدا کی مہربانی سے تین تندرست اور خوبصورت نور نظر ہیں جبتک میں دوائی سے ہزاروں دکھیوں کا بھلا ہوا ہے سینکڑوں مرادیں پوری ہو چکی ہیں سورج مشرق کی بجائے مغرب کو نکل سکتا ہے مگر اس دوائی کا اثر خالی جاتا نہیں دیکھا اسی لئے مرشد سے کئے ہوئے وعدے اور دنیا کی بھلائی کیلئے اس دوا کا شہرہ گھر گھر جا کر رہا ہوں۔ ہر قسم کی سستی، نامردی، کمزوری پیشاب میں شکر آنا، جریان احتلام اور رگوں پٹھوں کی کمزوری کیلئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے غرض جسم کی خفیہ بگڑی ہوئی حالت کو درست کر کے دور ہو کر نئی جوانی کی سی طاقت اور جوش پیدا ہوتا ہے۔ دوائی میں کسی قسم کی مضر صحت چیز نہیں ہے۔ مالش سے کسی قسم کا آبلہ یا پھنسی نہیں ہوتی ہر موسم میں کھانے کے لائق ہے جوان کیا بوڑھے فائدہ اٹھا سکتے ہیں تندرستی اور جوانی کا لطف لے سکتے ہیں۔ بڑھاپے میں لوہے کی لاٹھ بنکر جوانی جیسا مزہ آ سکتا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ اس دوائی کے بعد عمر بھر کسی دوائی کی ضرورت نہیں پڑیگی۔ قیمت پندرہ دن کی ترکیب ایک خوراک صحت کیلئے کافی ہیں دو روپیہ عار طلاء برائے مالش دو روپیہ آٹھ آنہ عار ۸۔ چونکہ مجھکو اسکا پایلٹ دوائی نے موت کے منہ سے بچایا تھا اسلئے اپنا ایمان سمجھکر اسکی اشاعت کر رہا ہوں اور قیمت صرف خرچہ و لاگت پر رکھی گئی ہے۔ دونوں دوائیاں ایک ساتھ منگوانے پر محصول ڈاک معاف (ضروری گذارش) شکی مزاج حضرات میری دوائی طلب نہ کریں کیونکہ جو شخص ہر چیز کو بے یقینی کی نگاہ سے دیکھتا ہے وہ موقعہ پر ہیرے کو پتھر سمجھ کر کھو بیٹھتا ہے جسکو اس دوائی سے فائدہ نہ ہو دوائیاں کم جان کر قیمت واپس منگالے دریا ہے ہی آپکا ایمان بھی ہو کہ اگر اس تحریر سے بڑھکر نکلے تو اس فقیر کے نام کی جھر گھر گھر پہنچا دیں کہ مجھکو اور کسی کیلئے نہ لکھے ورنہ ہی کوئی بھائی ضرورت سے پہلے منگوا لے۔

شرطیہ علاج اور شرطیہ وعدہ۔ ہندو کو دھرم اور مسلمان کو ایمان کی قسم ہے کہ اگر میری دوائی کے استعمال سے حسب منشاء فائدہ نہ ہو تو علیحدہ تحریر بھیجکر قیمت واپس منگوا لیں عدم صحت کی صورت میں کسی کا پیسہ رکھنا گناہ سمجھتا ہوں اگر کوئی صاحب اب بھی اس واسطے فائدہ نہ اٹھائیں تو انکی قسمت ہزاروں تعریفی خطوط سرٹیفکیٹ موجود ہیں جن کے لکھنے والے عام صاحبان کے علاوہ کئی وکلا حکیم وغیرہ بڑے بڑے ڈاکٹروں حکیموں و ویدوں کی رائے ہے کہ یہ جادو کی گولیاں ہیں۔

ضروری اطلاع۔ یاد رہے کہ میری دوائی صرف نامردی سستی جریان احتلام سرعت کمزوری اور لاغری اور جریان الرحم و لیکوریا کیلئے مخصوص ہے۔ یہ امراض خواہ کسی سبب سے ہوں جلق یا کثرت مباشرت عادت بد سے سب کے لئے یکساں مفید ہے۔ سوزاک آتشک سے پیدا کی ہوئی کمزوری کیلئے اس کا استعمال کرنا طاقت کا بیجا کرنا ہے اور مادر زاد نامردی کے سوا میری دوائی ہر بیماری کے لئے اکسیر ہے۔

ملنے کا پتہ۔ صوفی ایم اے خاں۔ ناہن۔ انبالہ

کہانی کا فلسفہ

از جناب ڈاکٹر ایم ضیاء الدین صاحب امرتسری

(۱)

بچے نے جونہی زبان کھولی، بولا "قصہ کہو!"

نانی اماں سنانا شروع کرتی ہیں "ایک تھا شہزادہ، ایک نواب زادہ اور ایک تھا سوداگر کا بیٹا" بچے کے اُستاد نے بلند آواز سے ڈانٹا: "تین چوکے بارہ"

استاد کی چیخ سے کہیں بلند اور زبردست چیخ ہے دیو کی!

"میں ماؤں کھاؤں...... آدم بو، ہمسایوں کے رٹنے کی آواز بچے کے کان تک نہیں پہونچی۔

جو لوگ بچوں کے ساتھ ہمدردی رکھتے ہیں۔ وہ بچوں کو اندھیری کوٹھڑی میں بند کرکے سنجیدہ طور پر سمجھاتے ہیں —— "دیکھو بچے، "تین چوکے بارہ" سو یہ تو ایک حقیقت ہے! اور وہ شہزادہ نواب زادہ، سوداگر کا بیٹا سب جھوٹ ہے۔

لڑکے کا دل اس اثنا میں جغرافیائی تخیل سے آزاد ہو چکا تھا۔ مگر پھر بھی تین چوکے بارہ کی حقیقت بچے کے پیچھے پیچھے سفر کرتی ہے۔ لیکن منجول کی کشتی کے پتوار بچہ کے تخیل کے سمندر کو عبور کرانے سے قاصر ہیں۔

خیر خواہ سمجھے کہ یہ تو صریح شرارت ہے۔ اس بچے کو بید سے خوب پیٹنا چاہیئے۔

نانی اُستاد کے اس رویہ کو دیکھکر انگشت بدنداں رہ گئی لیکن مشکل کچھ آسان ہوتی ہوئی نظر نہ آئی۔ قصہ خواں صاحب تشریف لے آئے۔ اور آسن جاکر بیٹھ گئے۔ ایک شہزادی کی جلا وطنی کا قصہ شروع ہوا

"جس وقت دیو کی ناک کاٹی جا رہی تھی، بچے کے خیر خواہ نے کہا اس بات کا تو کوئی ثبوت نہیں۔ جس بات کا ثبوت ہر جگہ مل سکتا ہے۔ وہ تین چوکے بارہ ہے۔

اسی اثنا میں ہنوماں جی چھلانگتے ہیں۔ اور اس قدر بلند کہ تاریخ میں اس کا جواب نہیں۔ "مدرسے" سے اسکول اور اسکول سے کالج تک لڑکے کے دل کو کل حکمت کے ذریعہ تربیت کیا جاتا ہے۔ کیمیاوی عمل کشید و تقطیر کے ذریعہ اس کے دل کو کتنا ہی صاف کیوں نہ کیا جائے۔ لیکن یہ بات "قصہ کہو" اس کے دل سے محو نہیں ہوتی۔

معلوم ہوا کہ انسان صرف بچپن ہی میں نہیں بلکہ تمام عمر قصہ کہانیوں میں ہی پلتا ہے۔ اسی لئے اس دنیا میں انسان کے گھر گھر ہر زمانے میں ہر تحریر میں اس قدر قصے کہانیاں جمع ہو جاتی ہیں کہ انسان نے اس دنیا میں جو کچھ جمع کیا ہے۔ یہ کہانیاں اس سے کہیں زیادہ ہیں۔

جو ہمارے دانا اس بات کو اچھی طرح سے سمجھ نہیں لیتے۔ کہ قصہ گوئی اس دنیا کے خالق کا آخری جنون ہے کسی سمجھائے بغیر سزا دینا اور اسی طرح راہ پر لانے کی کوشش کرنا بے کار ہے۔

ایک دن تھا کہ باری تعالیٰ اپنے کارخانے میں بیٹھے آگ سے پانی اور پانی سے مٹی بنانے میں مصروف تھے۔ بھاپ کے بوجھ سے بیقرار دھاتیں پتھر او پر تلے رکھے جاتے تھے۔ چاروں طرف خام مادہ بکھرا ہوا تھا۔ اس دن خالق کائنات کو دیکھ کر کسی کو شبہ تک نہ ہوا۔ کہ اس فعل میں بھی کچھ بچپن ہے وہ تھا کارخانے کا کام دھندا۔ گھاس پیدا ہوئی۔ درخت اُٹھ کھڑے ہوئے۔ حیوان چلنے پھرنے لگے۔ پرندوں نے اڑنا شروع کیا کوئی تو زمین پر۔ پا بہ زنجیر ہاتھ باندھے کھڑا ہے۔ کوئی آزاد زمین کی وسعت پر اپنی نسل کو ترقی دیتا چلا جا رہا ہے۔ کوئی فضا میں پر کھولے سورج کے حضور میں اپنے نغمہ نذر کر رہا ہے۔ کوئی پانی کی تہ کے نیچے خاموش رقص میں مصروف ہے۔

غرضکہ اس دن خالق کائنات کے چنچل کا کسی کو شبہ تک نہ ہوا۔

اسی طرح بہت سا زمانہ گذر گیا۔ دفعتاً خالق باری کو ایک نئی بات سوجھی انچاس قسم کی ہواؤں کو طلب کیا۔ ان سب کو ملا کر انسان بنایا۔ اتنی مدت بعد یہ قصہ پھر شروع ہوا۔ بہت سے دن اس کے علم و عرفان کی تحصیل میں کٹے۔ فنون میں مہارت حاصل کی۔ اس کے بعد ادب کا دور آیا۔ خالق نے انسان کو قصہ کہانیوں میں پرورش کرنا شروع کیا۔ حیوان کی زندگی کا مقصد تھا۔ کھانا۔ پینا۔ اور نسل کو ترقی دینا۔ انسان

کی زندگی کا مقصد قرار پایا۔ قصے کتنے دکھ درد بھرے واقعات ہیں محبت ہے۔ عشق ہے۔ عداوت ہے۔ برا۔ بھلا۔ کتنی مار پیٹ، شوق و ذوق ہے۔ محنت کے ساتھ طبیعت کا لگاؤ۔ خوشی کے ساتھ رنج و غم۔ .... ندیاں جس طرح بہتے پانی کے دھارے ہیں۔ ویسے ہی انسان کی تہذیب کے دور قصے کہانیوں کا بہاؤ ہیں۔ ان کا تصادم ہیں۔ —

اسی لئے جب دو دوست آپس میں ملتے ہیں۔ تو یہی پوچھتے ہیں "کہو بھائی کیا خبر ہے"، ہاں تو پھر اس کے بعد، اچھا؛ پھر کے ساتھ پھر کے موتی پرو پرو کر دنیا میں انسان کے بنائے ہوئے قصوں کی مالا پروئی جا رہی ہے۔ اسی کو کہتے ہیں "آپ بیتی"۔ اسی کو کہتے ہیں تاریخ خالق کی تاریخ۔ انسان کی آفرینش کے قصے بھی دونوں انسان کی دنیا کے جزو ہیں۔

انسان کے لئے صرف راجہ اشوک یا اکبر بادشاہ ہی کا قصہ سچ نہیں وہ شہزادہ جو ہفت قلزم کا سفر کرتا ہے۔ ہفت اقلیم کی دولت کی تلاش میں ہے وہ بھی سچ ہے۔ اور وہ ہنومان جو خالق کی عبادت میں سدا غرق ہے۔ اس کی سیدھی سادی کہانی بھی سچ ہے۔ اور وہ ہنومان جو گندھمان پہاڑی کو ایک ہاتھ پر اٹھا کر ہوا میں اڑتا ہوا لے آتا ہے وہ بھی درست ہے انسان کے لئے جس طرح اورنگ زیب سچ ہے دیو جن بھی سچ ہے۔ کسی کا تاریخی ثبوت کم ہے۔ کسی کا زیادہ تاریخی نقطہ نظر سے نہیں۔ بلکہ قصہ کی رو سے انسان کے لئے قصہ کا ثبوت سب سے بڑا ثبوت ہے۔ خدا کی ادبی دنیا میں انسان کا وجود ایک قصہ ہے۔ اس لئے نہ تو صرف وہ مادہ سے بنایا گیا ہے اور نہ محض حقیقت سے۔

بہت سی کوششوں کے بعد ہی خواہ استاد یہ بات پیدا ہوئی کہ اپنے پند و نصائح کو اس نے قصوں کی صورت میں کہنا شروع کیا۔ یعنی قصے۔ اور اخلاق کو ملا دیا لیکن اس ازلی نقص کی بنا پر جو کہ انسان میں موجود ہے یہ کام اچھی طرح نبھ نہ سکا اور قصہ کی مٹی پلید ہوئی۔ "بچے کے لئے کوئی کام نہیں، لیکن شوق طرح طرح کے ہیں۔ نصیحت کا اثر اس پر کچھ کم ہے۔ پند و نصیحت قصہ میں خرافات کی طرح باقی رہ جاتی ہے۔

رباعیات

حضرت امجد حیدرآبادی

شاداں نہ فراوانہ سے فرشی کو مری
پستی میں ملا ہے ترم ابد ترقی کو مری
آیا ہوں سخن چن کے اے رب غفور
وہ شبنم نہ بنے سپید پوشی کو مری

حضرت نسیم مرحوم

اب زیر تپش مہر سے شباب آپہنچا
پیشانی پہ جلد وقت خواب آپہنچا
پیری کی دوپہر ڈھلی دن ڈھلنے
ہنگام غروب آفتاب آپہنچا

جوش ملیح آبادی

یہ کس کا تبسم ہے فضا میں ساقی
یہ کس کی جوانی ہے گھٹا میں ساقی
یہ کون بجا رہا ہے شیریں بربط
بھیگی ہوئی بارش کی ہوا میں ساقی

بشیر احمد صاحب

فطرت کا سخن ہے بے ہنر تا خوش رہ
گر ذوق حقیقت ہو تو مدہوش رہ
مطرب ہے خدا راز ہے اس کی دنیا
بیدار جو سنتا ہے تو خاموش رہ

مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی مرحوم

دیوانہ قفس جو جوش آرزو ہوگا
دیوانہ بکھیرے گا لا عرش تک
ان دو سے جو بہتری کو رہا ہے کا فراق
وہ عشق کے واسطے ہے بہتر ہوگی

میرزا یگانہ لکھنوی

آنکھیں ہیں تو انکار حقیقت مشکل
دل میں ہے مزہ تو ترک لذت مشکل
دیوانۂ عشق کیا کرے گا توبہ
توبہ آسان مگر ندامت مشکل

مولانا عابد حسین عابد جاجموی

دیوانے کو دیتا ہے آغاز بہار
اک جوش جذبات ہے انداز بہار
کیوں کر نہ ترغیب بہار دے من زنے
عابد ترا شوق ہی ہے ہمراز بہار

ابوالاعظم انصری

ایام جوانی ہیں اے قلب حزیں
ہو جائے بہار تو نظاروں میں حسیں
زاہد جو سمجھتا ہے سمجھے زاہد
بچاؤ سے دنیا کی بچی ہی نہیں

ماں

مندرجہ ذیل افسانہ مسٹر محمود احمد بی اے دہلوی کی کاوشِ بلیغ کا نتیجہ ہے۔ مسلم کرداروں کے ساتھ دیہاتی زندگی کے مناظر جس خوبصورتی سے سپردِ قلم کئے گئے ہیں وہ قابلِ تحسین ہیں۔ ماں کی محبت بیٹے کی لاپروائی نے افسانے میں جان پیدا کر دی ہے۔ کردار نگاری اور پس منظر میں اصلیت کا بہت خیال رکھا گیا ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ مسٹر محمود آئندہ بھی مشہور کے صفحات کو اپنے گراں قدر مضامین سے زینت بخشتے رہیں گے۔

(ایڈیٹر)

چاند کی آخری تاریخ تھی اور دسمبر کا مہینہ۔ سردی کا یہ عالم تھا کہ دانت سے دانت بج رہے تھے۔ لوگ سرِ شام ہی سے اپنے اپنے گھروں میں گرم کپڑے اور چیتھڑے گدڑے پہنے بیٹھے تھے۔ قصبہ میں مزدوروں کی جھونپڑیاں۔ اور غریبوں کے کچے مکانات میں جھاڑ جھنکاڑ تنکے اور جنگل سے چنی ہوئی لکڑیاں جل رہی تھیں۔ کہیں کہیں دو دو چار چار مزدور ایک جگہ بیٹھے آگ تاپ رہے تھے۔ آٹھ ہی بجے سے قصبہ شہرِ خموشاں کا منظر پیش کر رہا تھا زمیندار کے مکان کے سامنے کچے مکان نہیں۔ ایک چھپر میں ایک غریب بڑھیا اپنے بچے کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ بیوگی کے مصائب و آلام میں اس کے لئے اگر کوئی شعاعِ امید ہے۔ تو یہی اس کا نونہال۔ مل میں لاکھوں آدمی کام کرتے ہیں۔ لاکھوں گز کپڑا روزانہ تیار ہوتا ہے۔ ہزاروں من کوئلہ روزانہ جلایا جاتا ہے۔ لیکن یہ غریب مزدور گاڑھے اور گزی کے لباس کے بھی شرمندۂ احسان نہیں۔ ان کو سیر دو سیر کوئلے بھی میسر نہیں آتے کہ فطرت کے عطیات کی تھوڑی بہت قدر کریں ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ مل کوئلہ اور لکڑی کی بھٹی نہیں ہے۔ بلکہ جیتے جاگتے انسانوں کی دہکتی ہوئی جہنم ہے اس میں مشینیں کپڑا تیار نہیں کرتیں۔ بلکہ غریبوں کا تجزیہ نفس کرتی ہے۔ بڑھیا کا لڑکا بھی مل میں ملازم ہے۔ شہر سے قریب ہونے کی وجہ سے اس کا میل جول دو چار شہریوں سے ہو گیا ہے۔ اور ان کی صحبت نے اس کو گنجفہ۔ چوسر۔ تاڑی اور عورت سے آشنا کر دیا ہے۔ دن بھر کام کرنے کے بعد سب مزدور اپنے اپنے گھر آجاتے ہیں لیکن وہ منچلے نوجوان جن کے چہروں پر ابھی شباب ہے۔ اور خون میں گرمی۔ تاڑی خانوں اور کسبی خانوں کی راہ لیتے ہیں۔ اور بے چارے سوا اس کے کر بھی کیا سکتے ہیں۔ دنیا کے سارے عیش اور آرام ان کے لئے حرام ہیں دنیا کی تمام آسائشوں کے دروازے ان پر بند اور دنیا کی تمام سوسائٹیاں ان سے نالاں۔ شکور ایک کسبی کے ہاں تاڑی کے نشہ میں چور پڑا ہے اور اس کی غریب ماں اس کے انتظار میں بیٹھی سوکھ رہی ہے۔ گاؤں قصبہ میں گھنٹہ کا کیا کام۔ اٹکل سے اس نے اندازہ لگایا کہ اس وقت ۹ بجے ہوں گے۔ جاڑے میں رات کے نو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا بارہ ۱۲ بجے ہیں۔ الاؤ میں آگ دھیمی ہونی شروع ہوئی اور بڑھیا دم بدم سمٹتی سمٹتی آخر دیوار کا سہارا لیا اور دونوں گھٹنے اپنے شانوں سے ملا کر کچھ سوتی کچھ جاگتی۔ پھر اپنے لڑکے کا انتظار کرنے لگی۔ لڑکے کا انتظار کس قدر دل شکن اور روح فرسا ہوتا ہے اس کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جن کو کبھی اس قسم کے انتظار سے سابقہ پڑا ہو۔ خالی اور اکیلے بیٹھے بیٹھے اس نے اپنے خیالات کی محفل آرائی شروع کر دی۔ خیال بھی کیا عجیب چیز ہے برسوں کے گذرے ہوئے فسانے ایسے معلوم ہوتے ہیں۔ گویا کل ہی کی باتیں ہیں۔ فانوسِ خیال گھومتا رہا اور بڑھیا کو اپنی جوانی اور شباب کا ہنگامہ پرور زمانہ یاد آگیا۔ اسی گاؤں میں اس کا باپ زمیندار کا گوالہ تھا۔ باپ کے ساتھ گائے بکریاں چرانا اور جھاڑی بوٹی سے بیر بن چن کر کھانا۔ ندی کنارے ڈوبتے ہوئے سورج کو دیکھنا۔ شکورہ کے باپ سے ملاقات اور اچانک ملاقات سراسیمہ ہو کر اس کا بھاگنا اور بھاگتے میں چندری

گڑگڑانا۔ اور پھر اس کا اور زیادہ پریشان محجوب اور شرمندہ ہونا۔ ہچکی پہ ہچکی لگا ہیں۔ بڑھا بڑھا سانس۔ پاؤں کی لرزش چہرہ کا اضطراب۔ غفورا کا چندری دینا اور کہنا کیسی پیاری صورت ہے! جی چاہتا ہے اپنے دل میں بٹھالوں۔ کیوں رہے۔ پریشان کیوں ہو۔ میں کوئی غیر تو نہیں ہوں۔ تمہارے چچا کا لڑکا اور تمہارا بھائی ہوں۔ رو کیوں گئیں کیوں؟ اچھا اب میں تم سے کبھی کچھ نہ کہوں گا۔ جاؤ۔ اس اجازت کے باوجود بھی اس کے پاؤں نہ اٹھنا غفورا کے ساتھ اس کی شادی۔ امید اور آرزوؤں کا ہجوم تمناؤں کا اضطراب۔ شادی مرگ۔ چار سالہ ازدواجی زندگی شکورا کی پیدائش۔ غفورا کی لاانتہا محبت قربانی اور بے نفسی۔ غفورا کا زمیندار کی جان بچانے کے لئے ڈاکوؤں سے گھمسان کی لڑائی اور بالآخر اس کی موت یہ تمام چیزیں اس کے کل ہی کے واقعات معلوم ہوتے تھے۔ غفورا کی موت کے تصور نے اسے دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیا تھا۔ ہجوم نا امیدی پیہم۔ اور اچھے دنوں کی یاد نے اس کو بیتاب اور بے چین کر دیا۔ اس نے لاکھ ضبط کیا لیکن منہ سے ایک چیخ نکلی۔ ٹوٹتے ہوئے دل کی صدا درد انگیز بھی تھی اور ولولہ خیز بھی۔ رات کے ساڑھے دس بجے ایک بیوہ کی چیخ اپنے سرتاج اور اپنے جگر گوشہ کی یاد میں جتنی پُر درد اور پرتاثیر ہوتی کم تھا۔ پاس ہی ایک چھپر میں شبراتی کی ماں سردی میں اپنے بچے کو لپٹائے بیٹھی تھی۔ آنکھوں کا نیند کا خمار اور اعضا دن بھر کی محنت اور مشقت سے چور تھے۔ لیکن سردی کی وجہ سے نیند نہ آتی تھی۔ بڑھیا کی چیخ نے گویا اسے چونکا دیا۔ اس نے اپنی تھرتھراتی ہوئی آواز میں کہا کیا ہوا شکورہ کی ماں ارے کیوں روتی ہے پگلی۔ مصیبت میں ہمدردی زخم کے لئے نشتر ثابت ہوتی ہے۔ شبراتی کی ماں کی پرخلوص لیکن الھڑ تسلی نے رہی سہی بندشیں بھی توڑ دیں وہ سیل غم جو دل سے آنکھوں تک آپہنچا تھا۔ اب ہونٹوں پر مچلنے لگا۔ اور بڑھیا کی ہچکی بندھ گئی۔ آس پاس کے مزدور اپنی اپنی جھونپڑیوں سے نکل آئے۔ عورتوں نے گھر میں جا کر دیکھا بڑھیا گھٹنوں میں سر دیئے زار و قطار رو رہی ہے۔ خالہ۔ چاچی، مامی کہہ کہہ کر ان سب نے بڑھیا کو تسلی دینی شروع کی۔ اور ساتھ ہی ساتھ اس آہ و زاری کا سبب بھی دریافت کیا۔ تو بڑھیا نے روتے روتے بتایا کہ شکورا اب تک نہیں آیا" میرا لال ہمیشہ ۸ بجے آجاتا ہے۔ آج نہ معلوم کیا بات ہوئی۔ ہائے وہ تو کبھی دیر سے گھر آتا ہی نہیں۔

ایک عورت! آجائے گا چاچی اتنی نراش کیوں ہوتی ہو۔ بچہ ہی ہے کہیں کسی تماشے میں چلا گیا ہوگا۔

دوسری عورت! اور کیا آج کل کے بچوں کو تو الہٰی بس کھیل تماشہ سے ہی فرصت نہیں۔ سیانا بچہ ہے اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ میری ماں اکیلی پڑی ہوگی۔

بڑھیا۔ ہائے میں کیا کروں۔ کہاں ڈھونڈھوں۔ اے میرے لال کے دشمن بہت ہیں اس کی آئی مجھے آجائے۔ یا اللہ تیرے کدھر جاؤں ہائے میرے لال تو کہاں ہے۔ بڑھیا پھر زار زار رونے لگی۔ سامنے زمیندار کا عالیشان بالاخانہ تھا۔ اس نے اپنی کھڑکی سے سر نکالا۔ اور کرخت مگر پھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ ارے یہ کیا غل مچا رکھا ہے۔ تم لوگوں نے راتوں کی نیند بھی حرام کر دی ہے۔ کیا ہوا؟ ایک مزدور نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا۔ حضور آج شکورا اجل سے ابھی تک نہیں آیا۔ اس کی ماں رو رہی ہے۔ زمیندار نے حقارت آمیز لہجہ میں کہا نہیں آیا تو ہوا کیا۔ آجائے گا۔ اور نہ بھی آیا تو کیا یہ بستی میں کسی کو سونے بھی نہ دے گی۔ کیا اس کا انوکھا اور نرالا لڑکا ہے۔ بدمعاش کہیں کا! بڑھیا کو ایسا معلوم ہوا جیسے اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی ہو اور سر پر آسمان ٹوٹ پڑا ہو۔ اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا "جاؤ بھیّا۔ تم سب جاؤ میں اپنے لال کو خود ہی ڈھونڈ ڈھونڈ کر لے آؤں گی۔ مزدوروں، اور غریبوں ہمدردی تہذیب یافتہ لوگوں کے اظہار ہمدردی سے کچھ مختلف ہوتی ہے۔ کوئی بھی بڑھیا کو تنہا چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوا۔ بجوا اور ننوا نے فوراً ہی کہا۔ چاچی تو اتنی نراش کیوں ہوتی ہے۔ ہم ابھی اس کا کھوج لگا لائیں گے۔ تو شانت ہو۔ ارے تھوڑا سا جل تو پلا دے اسے او جموا کی ماں۔ جمو کی ماں نے بڑھیا کو پانی پلایا اور بجوا اور ننوا یہ دونوں شکورا کی تلاش میں چل دیئے۔ آس پاس کے مزدور بھی اپنی اپنی جھونپڑیوں میں جا بیٹھے۔ عورتیں بھی ایک ایک کر کے رخصت ہو گئیں بڑھیا نے پھر سوچنا شروع کیا۔ شکورا کہاں گیا دو چار منٹ وہ سکتہ کے عالم میں مبہوت بیٹھی رہی۔ یکایک اٹھی۔ اپنی پھٹی پرانی گدڑی اوڑھی۔ اور شکورا کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی۔ گھر سے نکلنے کو تو وہ نکل آئی۔ لیکن اب جائے کہاں۔ سارے بازار بند تھے۔ اکّا دکّا کوئی چلتا پھرتا نظر آتا تو اس سے پوچھ لیتی۔

"کیا تم نے شکورا کو کہیں دیکھا ہے" "دنیا میں کسے اتنی فرصت ہے کہ دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہو۔ یہاں تو ہر شخص خود نفسی نفسی پکار رہا ہے۔ کون سنتا اور سنتا بھی تو جواب کیوں دیتا اور کیا دیتا۔ دو چار راہ گیر یہ کہتے ہوئے خاموشی سے گذر گئے کہ "نہیں کیا معلوم" بڑھیا ایک درخت کے نیچے کھڑی ہو گئی۔ چاند نے ابھرنا شروع کر دیا تھا اور ہلکی ہلکی شعاعیں درخت کے پتوں سے چھن چھن کر اس کے لباس پر پڑ رہی تھیں۔ درختوں کے پتے چاندی روشنی میں اس کی گدڑی پر خوشنما بیل بوٹے بناتے معلوم ہوتے تھے۔ وہ کھڑی رہی۔ ادھر ادھر نظر دوڑاتی پھر مایوس ہو کر کھڑی ہو جاتی۔ دو چار قدم آگے جاتی پھر واپس آجاتی حیران تھی کہ کہاں جائے اور کیا کرے۔ چاند کی روشنی اب بڑھ رہی تھی گرد وغبار کی سڑکیں نقرئی دریا کی لہریں معلوم ہوتی تھیں پاس ہی سے ایک کتے نے سردی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی بڑھیا کانپ گئی۔ کتے کی آواز نے اور کتوں کو بھی جواب غفلت سے چونکا دیا۔ اور وہ سب متحد طور پر فطرت کی ستم ظریفی پر آوازے کسنے لگے۔ بڑھیا نے یہ منظر کب دیکھا تھا۔ گھبرائی اور درخت سے چمٹی کھڑی رہی بزم تھوڑی دیر میں۔ بھوں بھوں۔ بھوں۔ بھوں برخاست ہو گئی اور معزز اراکین نے اپنے اپنے گھروں کی راہ لی۔ بڑھیا اب بھی درخت سے چمٹی کھڑی تھی۔ دور سے اسے ایک سایہ سا آتا دکھائی دیا۔ اپنے بیٹے کی محبت میں دیوانی بڑھیا سایہ کے لباس اور رفتار پر غور کئے بغیر آگے بڑھی اور شکورا۔ میرا پیارا شکورا کہہ کر لپٹ گئی۔ آنے والا بستی کا ایک پڑھا لکھا مولوی تھا۔ لاحول ولاقوۃ کہہ کر اس نے بڑھیا کو الگ کیا۔ لغویت، حماقت بیگی۔ تجھے دکھائی نہیں دیتا میں مولوی عبدالرحمن۔ نام سن کر بڑھیا کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے اور چہرے پر امید و ناامیدی کا ایک رنگ آنے اور ایک رنگ جانے لگا۔ مولوی صاحب نے پھر کہا "اس دنیا میں نہ معلوم کیا ہونے والا ہے۔ گھر کی بیٹھنے والی عورتیں اب سر بازار لوگوں کے سر پڑنے لگی ہیں۔ لاحول ولاقوۃ اللہ کی بندی گھر میں بیٹھ خداوند تعالے نے ارشاد فرمایا ہے کہ عورتیں گھروں کی زینت ہیں۔ بازار میں نکلیں گی تو گرد وغبار سے ان کی روح خراب ہو جائے گی۔"

بڑھیا نے کچھ سنا کچھ نہیں اور ایک طرف کو چل دی۔ مولوی صاحب نے بھی بڑبڑاتے لاحول پڑھتے اپنے گھر کی راہ لی۔ بڑھیا چلتے چلتے پھر ایک جگہ رک گئی پھر واپس آئی اور پھر آگے کو بڑھی۔ اضطراب کا برا ہو اسے ایک جگہ قیام نہ تھا۔ تھوڑی دیر بعد دور سے اسے پھر کوئی آتا دکھائی دیا۔ مولوی صاحب کی ملاقات نے اسے ہوشیار کر دیا۔ وہ اسی جگہ ٹھٹھک گئی۔ اور دور سے آنے والے کو بغور دیکھتی رہی۔ تصور کی بدولت اس کو آنے والے کی رفتار۔ لباس۔ چال۔ ڈھال شکورا کا سا معلوم ہوتا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ ضبط کئے کھڑی ہی رہی۔ آنے والا قریب آیا۔ چاند کی روشنی میں بڑھیا کا لباس اسے بہت خوشنما معلوم ہوا۔ لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھا اور بڑھیا کو لپٹ گیا۔

"آج تو خوب ملیں۔ مدت سے تمہاری تلاش میں تھا۔ آخر مجھ میں ایسا کونسا عیب ہے جو تم مجھ سے کھچی کھچی رہتی ہو۔ بولو۔ میری پیاری میرے دل کی ٹھنڈک بولو چپ کیوں ہو۔ آج مجھے معلوم ہوا کہ تمہیں بھی مجھ سے محبت ہے۔ آؤ میرے ساتھ چلو۔ ہم تم اب کبھی جدا نہ ہوں گے"۔ بڑھیا غصہ کے مارے کانپ گئی۔ شراب کی بدبو سے اس کا دماغ اڑنے لگا۔ اور وہ بے آپے ہو کر بولی نامراد اپنی ماں بہنوں کو جا کر لپٹا لے۔ موا سوئر کہیں کا۔ پیاری ہوگی تیری ہتی سہتی۔ لو حرامی کی باتیں۔ یہ کہہ کر بڑھیا نے پورا زور لگا کر آنے کو دھکا دے دیا۔ دیکر بھاگتی چلی گئی۔ شراب کے نشہ میں چور بدمست مے نوش کو ہوش ہی کیا تھا۔ ذرا سے جھٹکے سے الگ جا پڑا۔ پاس ہی پڑے ہوئے پتھر سے سر ٹکرایا اور خون کا ایک فوارہ جاری ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لعل بدخشاں کی بارش ہو رہی ہے۔ بڑھیا بھاگتی چلی گئی۔ ہانپتی کانپتی اپنے گھر پہنچی۔ شکورا کا بستر ٹٹولا، اور شکورا کو پا کر دل ہی دل میں خدا کا شکر بجالائی۔ لیٹے ہوئے لحاف کا کونا اٹھایا "آ گیا موئے سانڈ غارت ہوئے۔ تجھے مرگ بھی نہ آئی۔ سانپ نے نہ ڈسا۔ ریل کے نیچے نہ آ گیا۔" کہہ کر بڑھیا دروازے کی طرف بڑھی اور کنڈی لگا کر اپنے بستر پر دراز ہوئی صبح کو اس کی ماں نے اس کا سر بندھا دیکھا تو کہا۔ "اسے او سور کہاں سے یہ کیا کرلایا۔" "کچھ نہیں ماں گر پڑا تھا۔ چوٹ لگ گئی" کہہ کر شکورا گھر سے باہر نکل گیا۔

(محمود بی۔ اے دہلوی)

دامنِ گلچیں

ایک غارت گرِ حسن لاہور سے تحریر فرماتی ہیں۔ کہ میرے سرتاج سینما کے بہت شوقین ہیں، اور خصوصاً "پکار" کھیل کے بہت ہی دلدادہ ہیں اس کھیل میں کوئی نسیم بانو ایکٹرس ہے۔ بس یہ اس کے چشم و ابرو کے دلدادہ ہیں۔ اگرچہ اس کھیل کو سینکڑوں بار دیکھ چکے ہیں۔ مگر پھر بھی جس شہر میں یہ کھیل ہو رہا ہو وہیں پہنچتے ہیں۔ ابھی چند ہفتے ہوئے آپ کی دہلی کے کمار ٹاکیز میں "پکار" چل رہا تھا۔ یہ معلوم ہوتے ہی وہ مجھے تنہا چھوڑ کر دہلی چلے آئے۔ میں نے نسیم کی تصویر دیکھی ہے مجھے تو کوئی خاص بات اپنے سے بہتر نہیں دکھائی دی۔ موزونیت کے لحاظ سے میں ایک دلفریب جسم رکھتی ہوں۔ میرے لمبے بال شعلوں سے بھی زیادہ چمکیلے ہیں۔ آنکھیں غزال چین کی طرح بڑی بڑی اور ستاروں کی مانند روشن ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ وہ غیروں کی طرف التفات کرتے ہیں۔ میں ان سے محبت کی سائل ہوں لیکن وہ میری محبت کی تحقیر کرنے میں ہٹلر کی طرح بے باک ہیں۔ کیا آپ کوئی ایسی ترکیب بتائیں گے کہ وہ "پکار" نہ دیکھا کریں، اور سینما کا شوق بالکل چھٹ جائے۔

محترمہ؟ اگر آپ پیانو بجانا سیکھ لیں، اور نسیم کی طرح "زندگی کا ساز بھی کیا ساز ہے" اسی دلفریب ترنم کے ساتھ گایا کریں۔ تو یقیناً آپ کے شوہر نہ صرف تابعدار بن جائیں گے بلکہ آپ کی پرستش کرنے لگیں گے۔

اقبال احمد آگرہ سے تحریر فرماتے ہیں کہ میرے ہاں دو سال قبل ایک موٹا تازہ بچہ پیدا ہوا تھا جس کا عرفی نام میں نے "ڈبل روٹی" رکھ دیا تھا۔ اس سال جو بچہ پیدا ہوا ہے وہ بالکل اس کی ضد ہے یعنی بہت ہی نحیف کمزور اور دُبلا پتلا ہے۔ اس کا نام ابھی میں نے تجویز نہیں کیا ہے آپ کی رائے میں کیا نام رکھنا چاہیئے۔

اس مولود کا نام "بسکٹ" رکھ دیجئے اگر پسند خاطر ہو

بمبئی ٹاکیز کی مشہور فلم اسٹار دیویکا رانی کے نغماتِ محبت نوجوان طبقے کے دماغوں میں گونج رہے ہیں اور اس کی موہنی صورت پہ ہزاروں نوجوان جان و دل نثار کرنے کے لئے تیار ہیں۔ چنانچہ ایک دل پھینک شاعر نے اپنے جذبات محبت کو غزل کا جامہ پہنا کر پیش کیا ہے افسوس ہے کہ اس غزل کا ہمیں صرف مطلع معلوم ہوا ہے مطلع کی شان سے آپ پوری غزل کا اندازہ کر لیجئے۔ اور شاعر کی ہجراں نصیبی پہ دو آنسو بہا لیجئے۔ مطلع یہ ہے ؎

نہیں جاتی نظر کی فتنہ سامانی نہیں جاتی
ہمارے دل سے یادِ دیویکا رانی نہیں جاتی

ہم اس مصیبت میں شاعر صاحب کے پورے ہمدرد ہیں اور دعا کرتے ہیں۔ ع
اللہ کرے حسنِ صنم اور زیادہ۔

ہندا بن کے ایک ملک الکلام شاعر نے چند اشعار آبدار بغرض اشاعت ارسال فرمائے ہیں ہم نے اس سلک مروارید کی زیارت سے قارئینِ مشہور کو محروم رکھنا مناسب نہیں سمجھا لہذا سنتے جائیے اور شاعر کی بلاغت و فصاحت کی داد دیتے جائیے مطلع ارشاد ہے ؎

کس جگہ جاؤں میں یہ تھونا نصیبا لے کر ؂ پارک میں جاتے ہیں وہ گود میں کتا لے کر

سبحان اللہ۔ کیا بدنصیب شعر لکھ دیا ہے جس جگہ پڑھا جائے رونے کی آواز آنے لگے۔ دوسرا شعر سنیئے اور سر دھنیئے ؎

اپنی میں توند کی تعریف بھی لکھ دیتا ہوں ؂ پہلے گھی کا مجھے دیجئے کپا لے کر

واہ واہ۔ تعریف نہیں کی جا سکتی۔ کس قدر موٹا تازہ شعر کہہ دیا ہے۔ نہ ہوئے مولانا شوکت علی مرحوم ہو، اس کو کما حقہٗ داد دیتے۔ مزید گل افشانی ملاحظہ ہو ؎

زلزلہ شعر میں لانے کی ضرورت ہو اگر ؂ پھیر دو توند پہ ایک گرم کٹورا لے کر

اعجاز ہے اعجاز۔ کیا زلزلہ افگن شعر فرمایا ہے۔ بہار اور کوئٹہ کا دردناک حشر ہماری آنکھوں کے سامنے آگیا۔ مناسب ہوگا اگر شاعر صاحب اپنی توند کو جاپان لے جائیں اور ہندوستان پر کرم فرمائیں۔ تیسرے شعر کی جامدی شوخی ملاحظہ کیجئے ؎

کیا غرض آپ کو ہے کوئی اُٹھے یا بیٹھے ؂ ہم تو اب بیٹھ گئے ٹاٹ کا ٹکڑا لے کر

یہ شعر اس قابل ہے کہ ...... جس ٹاٹ کے ٹکڑے پر شاعر صاحب بیٹھ گئے ہیں اُسے گھسیٹ کر انہیں کے سر پر باندھ دیں۔ دیکھا آپ نے یہ ہے آجکل کی شعریت۔

چودھری سر چھوٹو رام نے ایک تقریر کرتے ہوئے اخبار نویسوں کی شان میں گدھے کا لفظ استعمال کر دیا تھا۔ بس پھر پنجاب کا سارا پریس چیخ اٹھا۔ اک قلمی طوفان برپا ہو گیا۔ لے دے اور ہند ہوئے۔ پنجاب کے انگریزی اخبار "ٹریبون" نے پوچھا ہے کہ پنجاب میں کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو سر چھوٹو رام کو یہ مشورہ دے کہ زبان کھولتے وقت بدتمیزی سے کام نہ لیا کریں۔

چونکہ اخبار نویسوں پر کام کا بہت بار رہتا ہے اس لئے باربرداری کیلئے پیغمبر بارگیر کی تمثیل ایک حد تک موزوں ہے سر موصوف نے کوئی ناموزوں بات نہیں کہی ہے۔ اور نہ ایسی کوئی نئی بات کہی ہے۔ جسے بڑے آدمی پہلے نہ کہہ چکے ہوں۔

سلطان عبد الحمید نے معزول ہونے کے بعد کہا تھا اگر میں یلدز محل میں لوٹ سکوں تو اخبار نویسوں کو ایک ہی قید خانے میں بند کر دونگا۔

ولیم سٹیڈ ایک انگریز کا ارشاد ہے کہ اخبار نویس کی صورت دیکھکر شیطانوں کا بابا دا ابلیس بھی کانپ جاتا ہے۔ ملکہ اسپین نے فرمایا تھا کیڑے مکوڑوں میں سے اخبار نویس بھی ہیں ۴۴

۴۴ - پرتگال کے معزول بادشاہ "مانویل" نے اخبار نویسوں سے کہا تمہیں نے مجھے برباد کیا ہے - آخری زار روس نے کہا تھا سے قلم تو نہایت خوبصورت ہے لیکن میری سلطنت میں تو شیطان سے بھی بدتر ثابت ہوا ہے + ان اقوال کی موجودگی میں سر موصوف نے گدھا کہہ دیا تو کیا قصور کیا؟



یہ صفحہ پڑھ کر مسکراہٹ اور ہنسی ہونٹوں پر کھیلنے لگتی ہے

(از ملا تکین دہلوی)

مالک نے برقی گھنٹی کا بٹن دبایا۔ نیا دیہاتی ملازم نہ آیا مالک دیر تک گھنٹی بجاتا رہا۔ لیکن جب ملازم باہر نہ آیا تو وہ خود اٹھ کر باہر گیا۔ دیکھا کہ ملازم اپنی کوٹھری میں سہما ہوا بیٹھا ہے۔

مالک نے ناراض ہو کر پوچھا۔ "تم یہاں کیا کر رہے ہو"؟

ملازم خوف کے مارے کانپنے لگا اور ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"سرکار! میری کوئی خطا نہیں۔ میں نے تو ہاتھ بھی نہیں لگایا یہ آپ ہی آپ بج رہی تھی۔

اسکول ماسٹر بچوں کو ایتھر کے متعلق سمجھا رہا تھا۔ اس نے پوچھا "وہ کونسی چیز ہے جو ہر طرف پھیلی ہوئی ہے؟ اور اگر ہم کمرے کا دروازہ بند کریں۔ تب بھی وہ اندر آجائے گی۔

ایک بچے نے جواب دیا۔ جلے ہوئے سالن کی بو"

باپ نے اپنے دونوں بچوں کو بلا کر پوچھا

"رات میرے کمرے کی کرسی کس نے توڑی"؟

ایک بچے نے جواب دیا "آپ کی کرسی خود بخود گر پڑی لیکن ہم دونوں میں سے کسی کے چوٹ نہیں لگی"

وہ عدالت میں اپنے دیوالہ کی درخواست دینے ٹیکسی میں گیا۔

مجسٹریٹ نے کہا "جب تم دیوالیہ ہو اور تمہارے پاس ایک پیسہ بھی نہیں، تو ٹیکسی میں بیٹھ کر درخواست دینے کیوں آئے، پیدل کیوں نہیں آئے"

دیوالیہ نے جواب دیا "یہ ٹیکسی ڈرائیور بھی میرا قرضخواہ ہے

ماں نے اپنے بچے کو اردو کا سبق پڑھاتے ہوئے اس سے پوچھا

"جس آدمی کی بیوی مر جائے اسے کیا کہتے ہیں"؟

بچے نے جواب دیا "خوش نصیب"!

ماں نے جھڑک کر پوچھا "تو نے یہ بات کس سے سنی"؟

بچے نے سہم کر جواب دیا "ابا جان سے"

ماسٹر نے بچے سے پوچھا "دو سیر کے مرغ کا وزن کیا ہوتا

بچے نے جواب دیا۔ "مجھے نہیں معلوم"!

ماسٹر نے دوبارہ پوچھا "نو بجے رات والی ٹرین کے بجے چ ہے"؟

بچے نے جواب دیا "نو بجے"!

"ٹھیک ہے۔ اب بتاؤ۔ دو سیر کے مرغ کا وزن کیا ہوتا

بچے نے کہا "سمجھ گیا۔ نو سیر"

پاگل خانہ میں ایک دیوانہ مٹی کے چھوٹے سے ڈھیر پر چڑھ کر اور لگا شور مچانے "میں راجہ ہوں۔ آج میں گدی پر بیٹھ رہا ہو میرے دربار یو جلد مجھے سلام کرو۔

دوسرا دیوانہ انگریزی ٹوپی کی جگہ مٹھائی کی ٹوکری سر پر ہوئے آگے بڑھا اور پہلے دیوانے سے انگریزی لہجہ میں بولا۔ میں ہوں میں نے تیری جانشینی منظور نہیں کی۔ پھر تو گدی پر کس گیا اتر نیچے"

ملزم نے گھڑی کی چوری کے الزام میں عدالت کے سامنے کیا گیا۔ اس کے خلاف ثبوت ناکافی تھا، مجسٹریٹ نے اسے بری ملزم نے مجسٹریٹ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے پوچھا۔

"جناب! اب مجھے گھڑی تو واپس نہیں کرنا پڑے گی

بڑے لڑکے نے گھونسہ تان کر کہا "تو ہی کل یہ کہہ رہا "میں تمہیں کچا چبا جاؤں گا"

چھوٹے لڑکے نے جواب دیا "ہاں میں نے کہا ضرور تھا

ازدواجی مسرتوں کا راز

(سید محمود سورج بی۔ اے)

حسن و عشق کی رنگین داستانیں ابتدائے آفرینش سے اب تک فضا میں گونج رہی ہیں۔ عورت اور محبت کی خاطر جو قربانیاں کی جا چکی ہیں ان کا خون اب تک شفق کی احمریں کرنوں میں ہویدا ہے۔ لیکن تجربہ اور مشاہدہ سے ثابت ہوتا ہے کہ شادی کے بعد بہت کم لوگ حقیقی مسرتوں سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ اور ایسے لوگوں کی اکثریت ہے جن کے حق میں ازدواجی زندگی ایک لاعلاج مصیبت بن جاتی ہے۔ خود میری زندگی (۳) کی ایک زندہ مثال ہے۔ اس کی متعدد وجوہ میں جن میں سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ آج تک عورت کی فطرت، ظاہری و باطنی خصائل کا راز کوئی معلوم نہ کر سکا اور نہ آئندہ اس کے انکشاف کی کوئی توقع ہے۔ جہاں تک انسانی عقل و خرد کا تعلق ہے مرد اپنے جذبات کو تسکین دینے اور نفرت سے بچتے رہنے کے لئے سیکڑوں اسباب و علل تلاش کر لیتا ہے۔ چنانچہ میں بھی اسی نظریہ کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ معلوم کرنے کی سعی کروں گا کہ آج کل کے نوجوان عورت کی فطرت سے کیوں ناواقف اور اس کی محبت سے حقیقی مسرت حاصل کرنے سے محروم رہتے ہیں؟

یہ تو حقیقت ہے کہ دورِ موجودہ کی عورتوں کو مردوں سے نفرت ہو گئی ہے اور اس نفرت میں کمی ہونے کی بجائے روز افزوں زیادہ ترقی ہی ہو رہی ہے۔ اس معاشرتی مسئلہ نے اس قدر اہمیت حاصل کر لی ہے کہ اب تقریباً روزانہ ہی رسائل و جرائد میں اس پر اظہارِ خیال کیا جا رہا ہے۔ مختلف حضرات نے اس سوال کو حل کرنے کی سعی کرتے ہوئے مختلف رائے پیش کی ہیں۔ مگر افسوس ان خیالات میں اس قدر تضاد ہے کہ اس سوال کا حل معلوم ہونے کے بجائے یہ اور زیادہ پیچیدہ ہو گیا ہے کہ اکثر حضرات عورت کو اس نازک اور خطرناک صورتِ حال کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ اُن کی رائے ہے کہ عورت نے آزادی کو بالکل غلط طریقہ پر استعمال کر کے نظامِ معاشرت کو درہم برہم کر دیا ہے۔ گھریلو زندگی ایک پریشان کن خواب بنتی جا رہی ہے۔ پہلے عورت کو شیطان کی خالہ کہا جاتا تھا لیکن اب وہ مجسم شیطان بن چکی ہے۔ بعض حضرات نے اس تفرقہ کی ذمہ داری مرد کے سر تھوپ دی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مردوں نے عورت کو غلط راستہ پر ڈال کر نسلِ آدم کی تباہی و بربادی کا سامان فراہم کر لیا ہے۔ مردوں کی حسن پرستی، ظاہر پرستی اور نفس پرستی نے عورت کو اس کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ مرد حقیقی اور روحانی مسرتوں کے حصول کے لئے نہیں بلکہ اپنے نفسانی جذبات کی تسکین کے لئے شریکِ حیات کی تلاش میں رہتے ہیں۔ اب آپ ہی انصاف کریں کہ ان دو متضاد آرا میں سے کونسی رائے صحیح اور قابلِ قبول ہے۔ میری رائے میں تو مرد اور عورت دونوں ہی اپنی اپنی جگہ اس پریشان کن صورتِ حال کے ذمہ دار ہیں۔

عورت کو مرد سے کیوں نفرت ہے؟ اس سوال کے جواب میں خواہ کچھ ہی کیوں نہ کہا جائے لیکن اس بات پر سب کو اتفاق ہے کہ اس کے دو بڑے وجوہ ہیں۔ سب سے پہلا یہ کہ عورت پر شک کیا جائے۔ اس پر انواع و اقسام کے الزام لگائے جائیں۔ اور محبت کی بیخودی میں اور کچھ نہیں تو اسے "بے وفا" ہی کہہ دیا جائے۔ اپنی ظاہری شکل و صورت کو بگاڑ دیا جائے۔ لباس خراب و بدنما اور بدوضع پہنا جائے۔ اور دوسری وجہ عورت پر زیادہ اعتماد اور بھروسہ کرنا ہے اپنی بیوی سے ہر بات کی توقع رکھنا۔ اور اُس کی فطرت کو سمجھے بغیر اُسے اپنے اشاروں پر چلانے کی کوشش کرنا اس کا انجام ہمیشہ بد ہی ثابت ہوتا ہے۔ کسی عورت پر اعتماد کرنے سے پہلے ضرورت ہے اس بات کی کہ اس کے رجحانات اور اس کے جذبات کا مطالعہ کیا جائے۔ یاد رکھئے وہ بہادر نوجوان جو تجارتی اصولوں کو محبت کی نازک اور لطیف فضا میں آزمانا چاہتا ہے ہمیشہ ناکام رہتا ہے۔

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ ہندوستانی نوجوان شادی سے قبل عورت کی فطرت۔ اس کی عادات و خصائل۔ اس کی طرز رہائش اس کے تمدن۔ اس کے رجحانات اور اس کے خیالات کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے ہیں۔ اور نہ ہمارے لغو اور بیہودہ رسم و رواج کی پابندیاں ان کو اس قسم کا کوئی موقعہ دیتی ہیں۔ جس کا نتیجہ ظاہر اور انجام یہ ہے کہ مرد اور عورت دونوں میں سے کسی ایک کو بھی حقیقی خوشی اور سچی مسرت نصیب نہیں ہوتی۔ بسا اوقات دیکھا گیا ہے کہ ایک کند ذہن جاہل، اور ایک ناکارہ عورت سے ایک ادیب۔ یا شاعر۔ یا لطیف حسیات رکھنے والے نوجوان سے شادی کر دی جاتی ہے جو اس کی زندگی کو نہ صرف خانگی زندگی کو بلکہ حقیقی زندگی کو بھی تباہ و برباد کر دیتی ہے۔ ملک و قوم کو ایک ایسے پھول سے محروم کر دیتی ہے جس کی خوشبو سے ان کا مشام جان معطر رہتا تھا ایک ایسی انمل بے جوڑ شادی اور اُس کے نتیجہ کے طور پر ایک برباد شدہ زندگی کا ایک نمونہ میں خود ہی ہوں۔ میں اپنے تلخ تجربات اور اپنی غم انگیز داستان حیات پھر کسی وقت قلمبند کرونگا اس وقت صرف یہی کہدینا کافی ہوگا کہ اگر کسی ایسے نوجوان کے ساتھ جسے علم و ادب سے فطرتی دلچسپی اور لگاؤ ہو دشمنی کرنی مقصود ہو تو اس کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ اس کی ایک جاہل پھوہڑ اور بد مزاج عورت سے شادی کر دی جائے۔ اس کے بعد یقیناً اُس کا زندہ رہنا یا کم از کم کوئی مفید زندگی بسر کرنا غیر ممکن ہو جائیگا۔

ایک جلد باز اور گرم مزاج شوہر کا بیان ہے کہ "میں خوبصورت بھی ہوں اور جوان بھی۔ میری آمدنی بھی کافی ہے۔ لیکن پھر بھی میں اپنی بیوی سے مطمئن نہیں۔ وہ مجھ پر حکومت کرنا چاہتی ہے اور میں اپنے جس کی وجہ سے ہم دونوں حقیقی خوشی سے محروم ہیں"

شادی سے قبل اور شادی کے بعد عورت کسی چیز کا جلد فیصلہ نہیں کر سکتی ہے کیونکہ وہ سمجھتی ہے کہ صنفِ نازک پر جو زبردست حملے مردوں اور نوجوانوں کی طرف سے ہو رہے ہیں وہ اب ناقابل برداشت ہو گئے ہیں۔ ازدواجی زندگی سے مردوں کے مقابلہ میں عورتوں کو بہت زیادہ نقصان اٹھانا پڑا ہے اس لئے عورت ہمیشہ اپنے رازکو پوشیدہ اور اپنے دل کی گہرائیوں میں چھپا کر رکھتی ہے۔ لیکن جب وہ محبت کرتی ہے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اس کے قدم کو جادۂ استقلال سے متزلزل نہیں کر سکتی ہے۔

ایسا بھی ہوتا ہے کہ عورت کو اپنے شوہر کی قابلیت پر پورا پورا اعتماد ہوتا ہے۔ لیکن اُسے اپنے اوپر اس بات کا پورا اعتماد نہیں ہوتا کہ وہ اپنے شوہر کو خوش بھی رکھ سکیگی یا نہیں۔ ایسی صورت میں مرد کو تھوڑی بہت بردباری اور سمجھداری کا ثبوت دینا چاہئے۔۔۔ اور اس بات کی کوشش کرنی چاہئے کہ عورت کے دل میں خود اعتمادی کا جذبہ پیدا ہو جائے۔

عورت ایک بے حد نازک اور لطیف جنس ہے۔ اس قدر نازک کہ معمولی ٹھیس سے بھی اس کے جذبات اور احساسات کو ناقابل تلافی صدمہ پہنچتا ہے اس لئے اس لطیف شے کے ساتھ زندگی گذارتے وقت اس کی نزاکت اور لطافت کو نہ بھولنا مردوں کو روحانی مسرتوں سے ہمکنار کر دیتا ہے۔ عورت جس قدر حسین ہوگی اسی قدر سبک مزاج اور زود رنج ہوگی۔ اسے عورت کی رعونت، تکبر اور نخوت سے تعبیر کرنا غلط ہے۔ بلکہ فطرت نے اس لطیف شے کو اسی اصول پر تخلیق کیا ہے۔ اس لئے اگر کسی حسین اور سبک مزاج عورت کی شادی ایک اکھڑ مزاج اور بد وضع مرد سے کر دی جائے تو اس کا انجام جو ہوگا اس پر کچھ لکھنے کی ضرورت ہی نہیں عورت اپنی بردباری۔ تحمل۔ استقلال اور قوت برداشت کے لئے کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ مگر اس کی فطرتی خوبیوں کو امتحان میں ڈالنا یا ان کو غلط طریقہ پر استعمال کرنا ازدواجی زندگی کو ناکام بنانے کی سعی کرنا ہے۔

طبی دنیا — سیلان الرحم

(از جناب حکیم ڈاکٹر علی کوثر صاحب چاندپوری)

یہ نہایت نامراد اور کثیر الوقوع بیماری ہے اور اسی بنا پر خوفناک بھی ہے کہ جن عورتوں کو یہ روگ لگ جاتا ہے ان کا شباب ان کا حسن وجمال، اور ان کی دلکشی ورعنائی غرض ہر ایسی خصوصیت جس کی موجودگی میں عورت، عورت کہی جاسکتی ہے فنا اور برباد ہوجاتی ہے۔ آجکل پچاس بلکہ نوّے فیصدی عورتیں اس بیماری میں مبتلا نظر آتی ہیں۔ جس میں کنواری لڑکیاں، جوان اور بوڑھی عورتیں سب ہی شامل ہیں۔ اس بیماری کو بہت آسانی سے "گھن" سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ جس طرح لکڑی کو گھن اندر ہی اندر کھاجاتا ہے اسی طرح یہ مرض عورت کی جملہ خصوصیات کو فنا کردیتا ہے۔

نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے۔ کہ سیلان الرحم کی بیماری جتنی عام ہے اسی کے علاج میں اتنا اہتمام روا نہیں رکھا جاتا۔ اور اطبا بھی اس کے ازالہ میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتے۔ خود مریضہ کی یہ کیفیت ہوتی ہے۔ کہ اوّل اوّل تو کچھ جہالت اور کچھ غربت کی وجہ سے وہ اسے بیماری ہی نہیں سمجھتی اور جب اپنی جسمانی کیفیت سے اس کو اپنے بیمار ہونے کا یقین ہوتا ہے۔ تو بڑی بوڑھی عورتوں کے بتائے ہوئے چٹکلوں کو استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن عام اصول علاج، اور صحت عامہ کی جانب قطعاً توجہ نہیں کی جاتی۔ وہی گندہ پاجامہ اور وہی خراب ناقص غذا، جو حقیقتاً مرض پیدا کرنے کا باعث ہوتی ہے جاری رہتی ہے اس لئے نسخہ چاہے کتنا ہی مفید ہو ان امور کی جانب سے چشم پوشی کرنے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ فائدہ نہیں ہوتا۔ آخر یہ بیماری کو ناقابل علاج سمجھ کر مریضہ مایوس ہوکر خاموش ہوجاتی ہے۔ اس سلسلہ میں نہایت دردناک داستانیں سننے میں آئیں اور نہایت المناک واقعات دیکھنے میں آئے ایک ایسی مریضہ میرے پاس آئی۔ جو دو سال قبل نہایت تندرست اور تنومند، حسین ومحبوب تھی۔ مگر اب اس کو دیکھ کر یہ سمجھنا بھی دشوار تھا کہ وہ مرد ہے یا عورت، حسن وجمال کا تو نشان تک باقی نہ رہا تھا۔ تعجب یہ ہے کہ پستان کی کلیاں بھی گھل گئی تھیں۔ اور سینہ مردوں کا سا ہوگیا تھا مسلسل چھ ماہ کے علاج سے مریضہ خدا کے فضل سے پھر صحیح معنوں میں عورت بن گئی یہ اور اسی قسم کے دوسرے واقعات نے ذہن ودماغ کو دعوت التفات دی کہ اس نامراد بیماری کے اسباب وعلامات اور طریقہ ہائے علاج لکھے جائیں تاکہ عام مرد اور عورتیں بغیر کسی مشورے کے اپنے گھر ہی میں ان سے فائدہ اٹھاسکیں

تعریف: سیلان الرحم ایک بیماری ہے جس میں عورت کی شرمگاہ سے سفید زردی مائل پانی نکلا کرتا ہے، اگرچہ یہ پانی اندام نہانی سے نکلا کرتا ہے مگر عام طور پر اس کو سیلان الرحم ہی کہتے ہیں، اصل واقعہ یہ ہے کہ یہ نام اس مرض پر اس وقت تو صادق آسکتا ہے۔ جب عنق رحم یعنے رحم کی گردن سے رطوبت آتی ہو دوسری صورتوں میں اسے سیلان الرحم کہنا مناسب نہیں اخراج رطوبت کے اعتبار سے سیلان الرحم پانچ قسم کا ہوتا ہے۔

(۱) جس میں اندام نہانی کے بیرونی حصے سے رطوبت نکلتی ہے۔

(۲) جس میں اندام نہانی کے اندرونی حصہ سے رطوبت خارج ہوتی ہے۔

(۳) جس میں خاص رحم کی گردن سے پانی نکلتا ہے۔

(۴) جس میں خاص رحم کے اندر سے رطوبت خارج ہوتی ہے۔

(۵) جس میں مبیض بیضہ سے رطوبت نکلتی ہے۔

سیلان الرحم اور دوسری بیماریوں میں فرق

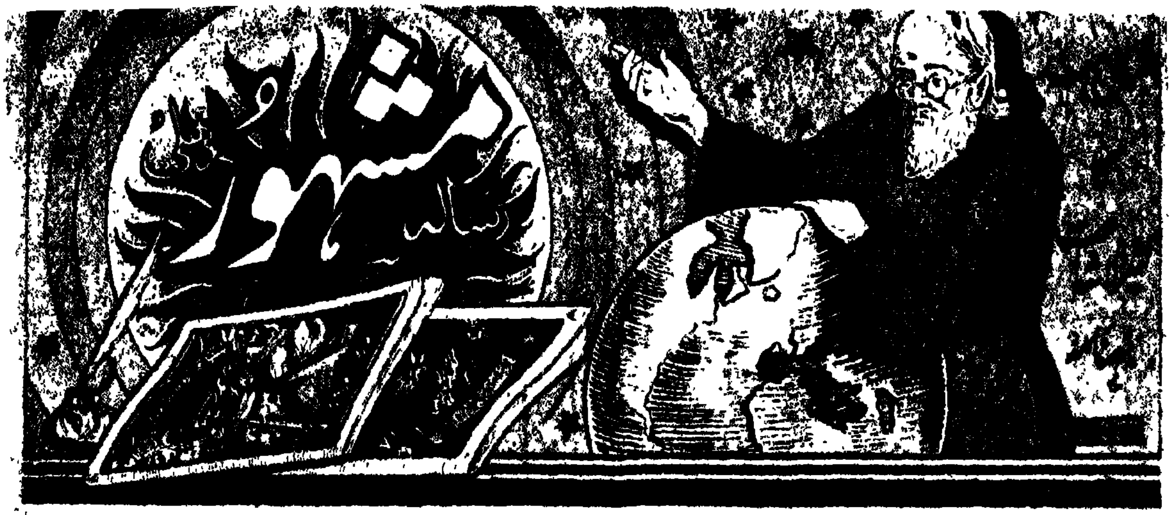
بعض اوقات اندام نہانی میں خراش ہوجاتا ہے۔ یا کوئی پھنسی نکل آتی ہے اور اس کی وجہ سے رطوبت بہنے لگتی ہے اس کو سیلان نہیں سمجھنا چاہیے کبھی زیادہ عرصہ تک مجرد رہنے کے باعث غدد برسولین بڑھ جاتے ہیں اور ان سے رطوبت بہنے لگتی ہے۔ ایسی صورت میں اس مرض کو سیلان فرج یا التہاب مہبل کہا جاتا ہے بعض اوقات خصیۃ الرحم سے رطوبات اخراج پاکر رحم میں آتی ہیں۔ اور اندام نہانی کی راہ سے خارج ہوتی ہیں۔ اس صورت میں اس کو جریان الرحم کہنا چاہئے۔ سوزاک میں بھی اندام نہانی سے پیپ خارج ہوا کرتی ہے لیکن سوزاک کی علامات اتنی واضح ہوتی ہیں کہ مریضہ خود بھی اس مرض کو سیلان الرحم نہیں سمجھ سکتی،

اسباب کبھی جراثیمی سمیت جو رحم، اندامِ نہانی اور خصیۃ الرحم کو ماؤف کر دیتی ہے۔ اسی مرض کے سبب ہوتی ہے۔ کبھی رحم کی اندرونی جھلی میں ریشہ دار ساخت پیدا ہو کر اس کی ذی نرت کو بڑھا دیتی ہے اور اسی وجہ سے رطوبت بہنے لگتی ہے اسی بنا پر ڈاکٹر صاحبان اس کو مستقل بیماری نہیں سمجھتے۔ بلکہ کسی بیماری کی علامت شمار کرتے ہیں۔ چنانچہ کمی خون۔ عام کمزوری کم عمری کے حمل، سیلان الرحم، ورم رحم، اندام نہانی کے ورم، سوزاک، یا آتشک، وجع مفاصل، سل یا نقرس کو اس کا سبب خیال کیا جاتا ہے، رحم کی بواسیر، یا زخم اور پھنسی بھی سیلان رطوبت کا سبب بن جاتی ہے۔ نزلہ، وبائی نزلہ، اور تپ محرقہ کے بعد سیلان الرحم کا عارضہ لاحق ہو جاتا ہے جس کی وجہ عام کمزوری اور کمی خون ہو سکتی ہے، غم و غصہ، ہراس، رنج و ملال کے باعث بھی یہ بیماری ہو جاتی ہے رحم کی رسولی اور کثرت استقاط کو بھی اس کا سبب کہا جا سکتا ہے قدیم نقطۂ نظر سے چاروں اخلاط میں سے کوئی نہ کوئی خلط اس کا باعث ہوتی ہے۔ رحم کی قوت غاذیہ کے کمزور ہو جانے اور رحم میں حیض کا مادہ سڑ جانے سے بھی سیلان الرحم ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں خود رحم خراب مواد کو خارج کرنے کی کوشش کیا کرتا ہے۔ حاذق طبیب ان نزاکتوں کو سمجھ کر بہترین علاج کر سکتا ہے۔ خراب مواد کو نکالنے میں طبیب کو کافی مدد دینی چاہیئے۔

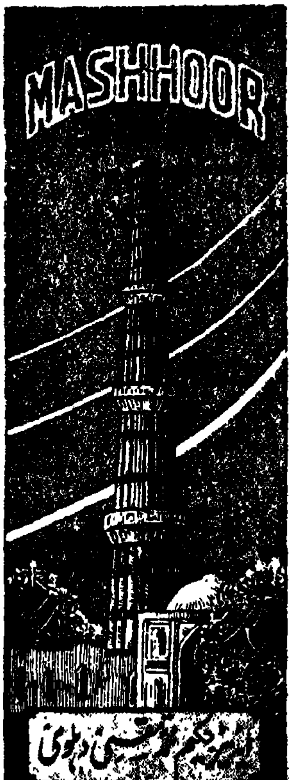
علامات اندامِ نہانی سے سفید زردی مائل رطوبت نکلتی ہے اندامِ نہانی میں خارش ہوتی ہے۔ پیڑو میں بھی درد محسوس ہوتا ہے مریضہ سست اور کاہل ہو جاتی ہے۔ کام کرنے سے جی چراتی ہے۔ ہر وقت مضمحل اور افسردہ رہتی ہے۔ پیشاب جلد جلد آتا ہے۔ نقاہت اور کمزوری ہوتی ہے ایام ماہواری درد کے ساتھ ہوتے ہیں۔ اس مرض کی موجودگی میں حمل کا ٹھہرنا مشکل ہوتا ہے۔ بعض اوقات زمانۂ حمل میں سیلان کی شکایت ہو جاتی ہے۔ اور اندامِ نہانی میں سخت خارش ہوتی ہے۔ رطوبت بھی زیادہ نکلتی ہے۔ پہلی قسم وہ مرض جس کا تذکرہ و تعریف جس کے ذیل میں کیا جا چکا ہے۔ نوجوان عورتوں کو ہوا کرتا ہے اور اندامِ نہانی کے بیرونی حصہ سے ایک لیسدار اور چپکیلی رطوبت نکلا کرتی ہے۔ جس سے اندامِ نہانی کے لب چپک جاتے ہیں۔ دوسری قسم کا مرض زیادہ عورتوں کو اکثر ہوا کرتا ہے مریضہ اندامِ نہانی میں جلن اور خراش کی تکلیف محسوس کرتی ہے اور پوری رطوبت خارج ہوتی ہے۔ اس کا رنگ سفیدی مائل ہوتا ہے تیسری قسم کا سیلان ادھیڑ عمر کی عورتوں کو جن کے چند اولادیں ہو چکی ہیں ہوا کرتا ہے۔ اس میں انڈے کی سفیدی کی طرح لیسدار اور شفاف رطوبت نکلا کرتی ہے۔ چوتھی قسم نوجوان لڑکیوں یا دلہنوں کو ہوا کرتی ہے۔ اس میں جو رطوبت رحم سے نکلتی ہے وہ بھی انڈے کی سپیدی کی طرح ہوتی ہے۔ مگر اس میں لیس زیادہ نہیں ہوتا۔ مگر بیماری جب پرانی ہو جاتی ہے۔ تو رطوبت کا رنگ گہرا زردی مائل ہو جاتا ہے پانچویں قسم کے مرض کی تشخیص ذرا دشوار خیال کی گئی ہے۔ اس لئے اس کی نسبت کچھ نہیں کہا جا سکتا، اگر جسم میں کوئی خلط غالب ہو تو اس کی شناخت کا طریقہ یہ ہے کہ رات کو سوتے وقت رحم میں تھوڑی روئی رکھدی جائے صبح کو نکال کر سایہ میں خشک کر کے دیکھا جائے۔ اگر اس کا رنگ سفید ہو تو سبب مرض بلغم کو خیال کرنا چاہئے۔ سرخ ہو تو خون کو، زرد ہونے کی صورت میں صفرا۔ اور سیاہی غالب ہونے کی حالت میں سودا کی، جب رحم کی غاذیہ کا ضعف باعث مرض ہوتا ہے تو رطوبت کا اخراج دورے کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔ نیز کمزوری، ورم اور نفخ کی شکایت بھی ہوتی ہے ایسی حالت میں اشتہا مفقود ہو جاتی ہے۔ اور مریضہ کی رنگت زرد ہو جاتی ہے

علاج صفائی اور مریضہ کی عام صحت کا بہت زیادہ خیال رکھیں۔ اندامِ نہانی کو نیم گرم پانی سے بار بار دھوتے رہیں۔ کپڑے صاف رکھیں، مریضہ کو آرام سے رکھیں اور دوا کے ذریعہ اصل سبب تلاش کر کے دوائی علاج شروع کریں اگر ضرورت لاحق ہوئی خلط غالب کے مطابق پہلے مریضہ کو مسہل دیا جائے۔ اور ابتداءً ایسی دوائیں عموماً استعمال کرائی جائیں۔ جیسے اندامِ نہانی اور رحم کی اچھی طرح صفائی ہو جائے اور گندہ رطوبت خوب صاف ہو جائے اس مقصد کے لئے یہ پوٹلی نہایت مفید اور لاجواب ہے۔ بائے برنگ کف دریا بہروزہ خشک نمک لاہوری۔ ہر ایک ۲ ماشہ باریک کر کے تین پوٹلیاں برابر کی بنائیں اور روزانہ ایک پوٹلی رحم میں رکھیں اس سے تمام گندہ رطوبت خارج ہو جائے گی، جب رطوبت اچھی طرح خارج ہو جائے۔ تو یہ نسخہ استعمال کریں۔ عود ہندی ناگرموتھا راسن رامک اقاقیا قرنفل۔ مازو ہر ایک ایک جزو مشک نصف جزو۔ کوٹ چھان کر آب مورد میں ملا کر فرزجہ کریں، یہ شیاف بھی رطوبت کو روکنے کے لئے مفید ہیں۔ اقاقیا۔ گلنار۔ سک مازو۔ ہر ایک ۷ ماشہ۔ پھٹکری سنبل الطیب ہر ایک ۳ ماشہ سب دواؤں کو باریک پیس لیں۔ اور ایک صاف کپڑے کو پانی میں بھگو کر اسکو دواؤں میں آسودہ کر کے رحم میں رکھیں۔

یہ سفوف سیلان الرحم میں مفید ہے ابہل جائفل راسن بہمن سرخ خولنجان، وج ترکی۔ ناگرموتھا جادتری، بالچھڑ۔ گنج ہر ایک ۳۳ ماشہ۔



FEBRUARY

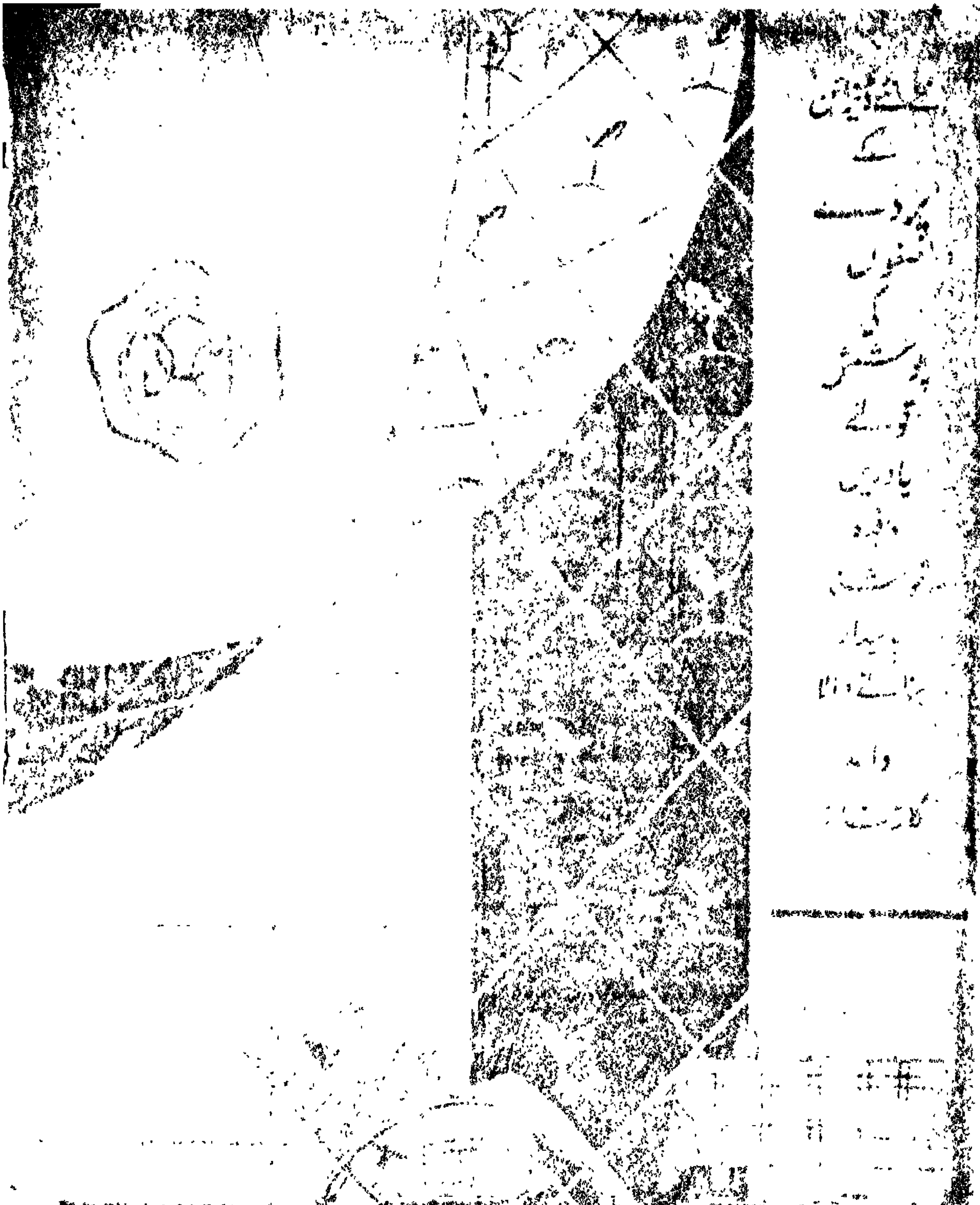


:: 1942 ::

غریب مزدوروں کے ہمدرد



مسٹر جوہن ایف بارنرس منیجنگ
ڈائریکٹر ڈالٹو کمپنی لمیٹڈ



ہندوستان کا کثیر الاشاعت ماہنامہ

رسالہ مشہور دہلی

ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے

ایڈیٹر۔ محمد تقی دہلوی

جلد ۴ — بابت ماہ فروری سنہ ۱۹۴۲ء — نمبر ۱

حکیم محمد تقی، ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے جید پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر رسالہ مشہور فراش خانہ دہلی سے شائع کیا۔



جامِ جمشید

غور و فکر کی ایک نئی صفِ ماتم

خونِ دل خود کن کہ شربے بہ ازیں نیست
آتش بہ جگر زن کہ کبابے بہ ازیں نیست

اگرچہ واقعہ کربلا کو آج سے بالکل ٹھیک تیرہ سو صدیاں گزر چکی ہیں لیکن اس کی شدتِ تاثر کا یہ عالم ہے گویا یہ حادثۂ عظیمہ ابھی واقع ہوا ہے۔ جہاں عشرۂ محرم آیا اور آہ و بکا کی صداؤں نے مجلسِ عزا شروع کیں۔ ادھر محرم کا چاند دکھائی دیا اور ادھر عالمِ اسلامی کا اضطراب والم کوہِ آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فغاں و درد کی لاتعداد بھٹیاں ہیں جو سلگ رہی ہیں اور دستِ ماتم کناں و چشم ہائے خونفشاں کے امتزاج سے "ہر خانہ بزمِ ماتم ہر کوچہ کربلائی" بن گیا ہے۔

آخر اس واقعہ میں کون سی ایسی خصوصیت ہے جو اس کثرت کے ساتھ بایں حزن و ملال یاد رکھا گیا ہے کہ اس کا بھلایا جانا ناممکن ہے۔ کیا اس جگر دوز سانحہ سے پہلے ظلم و جور، مظلومی اور بیکسی کے دردناک واقعات تاریخ کے دامن سے وابستہ نہیں ہیں۔ مگر آج ان کی یاد عوام تو علیحدہ رہے خواص کے دلوں سے بھی محو ہے۔

اگر اس امر کی تلاش و تجسس میں مطالعہ وسیع کیا جائے اور نظر کو حقائق و معنی کی دعوت دی جائے تو یقیناً اس راز کا انکشاف ہوتا ہے۔ واضح ہو کہ ماضی بعید میں جو واقعاتِ الم و درد صادر ہو چکے ہیں ان کا تعلق شخصیت تک محدود تھا لیکن اس واقعہ کا تعلق اسلام کی اصل حقیقت سے ہے جس کا ظہور تو سیدنا حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی ذات سے ہوا لیکن تکمیل سیدنا حضرت حسین علیہ السلام کی سرفروشی نے کر دی چنانچہ اسی نظریہ کو حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے اس طرح ظاہر فرمایا ہے

سر داد نہ داد دست در دستِ یزید
حقا کہ بنائے لا الٰہ است حسین

پس یہی وجہ ہے کہ واقعہ کربلا کو فرزندانِ اسلام قیامت تک نہیں بھول سکتے۔ بلاشبہ ہم میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو واقعۂ شہادت کے جزو کل پر گہری نظر نہیں رکھتے بلکہ آہ و بکا یا سینہ کوبی کرکے اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ اس سانحہ ہوشربا میں بصیرت کے لاکھوں مناظر پوشیدہ ہیں۔ یزید کی شخصی حکومت جمہوریت کو فنا کرنا چاہتی تھی۔ حق و صداقت کی آواز دبانا چاہتی تھی۔ اسوۂ ابراہیمی پامال ہو رہا تھا۔ ضرورت متقاضی تھی کہ جس حقیقت کا ظہور حضرت اسمٰعیل سے شروع ہوا تھا اب اس کی تکمیل کر دی جائے۔ چنانچہ خاندانِ نبوت نے پوری سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا اور اپنی قربانیوں کے خون سے زمینِ کربلا کو لالہ زار بنا دیا۔

بنا کردند خوش رسمے بخون و خاک غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

سیدنا حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت پر جس قدر لٹریچر شائع ہو چکا ہے دنیا کے کسی حادثۂ غم پر اس کا عشرِ عشیر ہماری نظر سے نہیں گزرا اور لطف یہ ہے کہ ہر سال اس لٹریچر میں اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے۔ بایں ہمہ ابھی یہ واقعہ اور تشنہ حقائق ہے۔ مثلاً ایک چیز آپ کے سامنے پیش کی جاتی ہے۔

سب جانتے ہیں اور یہ بالکل سامنے کی بات ہے کہ فوجِ یزید نے ۷ محرم سے آپ پر پانی بند کر دیا تھا تاکہ بھوک پیاس کی تکلیف سے آپ ہتھیار ڈال دیں۔ مگر آپ نے اپنے ہمراہیوں کو حکم دیا کہ کنوئیں کھود دیں۔ چنانچہ ۷۰، ۸۰ ہاتھ زمین کھود ڈالی لیکن ایک بوند پانی کی برآمد نہیں ہوئی۔ غور فرمائیے ایسا کیوں ہوا۔ جگر گوشۂ رسول کو پانی سے کیوں ترسایا گیا۔ اس باب میں مشیتِ الٰہی کیا تھی بلاشک نظر وسیع ہو تو اس سلسلہ کی کڑی ملا لینی کوئی دشوار نہیں۔ آپ کو علم ہوگا کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے مکہ کی وادی میں غلبہ پیاس سے ایڑیاں رگڑی تھیں وہ ظہور تھا قربانی کی حقیقت کا اور یہاں پانی کا نہ ملنا تکمیل تھی اسی قربانی کی۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے اپنی والدہ ماجدہ کے ساتھ ہجرت کرکے خانہ ویرانی کی

ابتدا کی تھی اور حسین علیہ السلام کے خیموں کا لٹنا اور عورتوں بچوں کا اسیر ہونا خانہ بربادی کا آخری مرحلہ تھا۔ حضرت اسمٰعیل کے گلے پر چھری رکھ دینا اگر ابتدائے حقیقت قربانی تھی تو سنان بن انس کا خنجر خوں آشام سے حسین علیہ السلام کا سر جدا کر دینا انتہائے حقیقت قربانی سمجھنا چاہیئے۔ بلکہ قتل کے بعد یہ سین بھی ملاحظہ ہو کہ عمر بن سعد نے حکم دیا کہ حسین کی نعش کو گھوڑوں کی ٹاپوں سے روندا جائے۔ چنانچہ اس کام کے لئے دس آدمی تیار ہو گئے اور گھوڑے دوڑا کر نعش اطہر کو پامال کر ڈالا۔

صفحات محدود ہیں اس لئے کسی ایک پہلو کی بھی تشریح نہیں کی جا سکتی۔ یہ دیکھئے کہ اس مجاہد اعظم نے ہماری پیروی کے لئے کیا نقش چھوڑا ہے ہم اسے دیکھیں، سمجھیں اور غور کریں۔ صرف ایک واقعہ ملاحظہ کیجئے۔ شب عاشورہ ہے۔ دشمن کا لشکر اسلحہ آراستہ کرنے میں مشغول ہے اور آپ نے پوری رات طاعت و عبادت میں گزار دی۔ حضرت زینب نے جب آنے والی مصیبت کا اندازہ کر لیا تو بے قرار ہو کر گریہ و زاری فرمانے لگیں۔ آپ نے یہ حال دیکھا تو فرمایا۔ اے بہن یہ رونا دھونا کیا مشیت الٰہی پر راضی بہ رضا ہونا چاہیئے۔ موت ہر زندگی کے لئے ضروری ہے پھر موت کے خیال سے اس قدر بے قرار ہونا مناسب نہیں۔ ہمیں ہر حال میں صبر و استقامت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑنا چاہیئے۔

بس اس اسوۂ حسینی کو سامنے رکھ لیجئے اور زندگی کی شاہراہ اسی عمل پر قائم کیجئے۔ یقیناً اولٰئک ھم الفائزون میں آپ بھی شامل ہوں گے۔

"مشہور" کے لئے مضامین

اس کثرت سے موصول ہوتے رہتے ہیں کہ ان کو دو ماہ کی تفاوت سے بھی شائع نہیں کیا جا سکتا حالانکہ اکثر مضامین اپنی ندرت۔ جدت۔ نئی معلومات اور بلند خیالی کے لحاظ سے ماسٹر پیس ہوتے ہیں۔

اس لئے مجھے کمال خجالت ہے کہ مضمون نگار احباب کے مضامین یا تو بہت دیر میں شائع ہوتے ہیں اور یا کسی کے ارمان کی طرح نکلنے سے رہ جاتے ہیں۔ اس تکلیف کا اس کے سوا کوئی علاج نہیں کہ رسالہ کا حجم بڑھا دیا جائے اور قیمت میں ایک روپیہ سالانہ کا اضافہ کر دیا جائے گذشتہ اشاعت میں "مشہور" کے معاونین کے عنوان سے

جو نوٹ لکھا گیا تھا اس سے متاثر ہو کر اکثر دردمند حضرات نے حسب توفیق کچھ پیش کش کرنی چاہی تھی۔ لیکن ہمارا مقصد یہ نہ تھا کہ ہم کوئی اعانتی فنڈ کھول رہے ہیں بلکہ یہ منشا تھی کہ اجتماعی حیثیت سے سب مل کر ایک ایک جدید خریدار مہیا کر دیں یا آئندہ عہ کی بجائے عہ سالانہ چندہ مرحمت فرمائیں ہمیں مسرت ہے کہ ہماری اس آواز پر اکثر حضرات نے لبیک کہی ہے اور بعض احباب نے ممتاز بکڈپو سے کتابیں طلب بھی فرمائی ہیں یقیناً اقتصادی مشکلات آج بہت بڑھ گئی ہیں اور ہر شخص ان کی وجہ سے پریشان ہے مگر علم و ادب کی خدمت کے لئے اتنا ایثار کچھ بڑی قربانی نہیں ہے۔ آخر ان مشکلات کے ہوتے ہوئے دنیا کے سب ہی کام جاری ہیں کوئی کام رک گیا ہو تو اسے بھی رک جانا چاہیئے ؎

غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
کیجئے ہائے ہائے کیوں روئیے زار زار کیوں

مولود مسعود

مولانا محمد ضمیر صاحب براکاتی اطلاع دیتے ہیں کہ ان کے عم محترم افضل الحکماء شفاء الملک مولانا حکیم سید ظہیر احمد صاحب برکاتی معالج خاص ہز ہائی نس نواب صاحب بہادر ٹونک کے ہاں فرزند ارجمند تولد ہوا ہے۔

ہم حکیم صاحب موصوف کی خدمت میں ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کرتے ہوئے دست بدعا ہیں کہ اللہ تعالیٰ مولود کو بلند اقبال اور صالح بنائے اس کے ساتھ ہی ضمیر صاحب یہ بھی اطلاع دیتے ہیں کہ اس خوشی میں عہ کی رقم اگر "مشہور" کا کوئی فنڈ ہو تو روانہ کر دوں ہماری رائے ہے کہ ضمیر صاحب کسی نادار طالب علم کے نام یہ رقم بھیجکر "مشہور" جاری کرا دیں اور دیگر مخیر حضرات بھی اس قسم کا ایثار کریں تو یہ ایک علمی خدمت ہوگی۔ "ایڈیٹر"

مولانا سید ظہور احمد صاحب وحشی سے ہمدردی

یہ خبر بہت تاخیر مگر انتہائی افسوس کے ساتھ شائع کی جا رہی ہے کہ ۲۸ دسمبر سنہ ۴۱ء کی شب کو ملک کے مشہور ادیب مولانا سید ظہور احمد صاحب وحشی کی اہلیہ محترمہ کا انتقال ہو گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

مولانا موصوف کی ذات گرامی سے "مشہور" کو قلبی تعلق ہے اس لئے اس حادثۂ غم میں ہم پوری طرح شریک ماتم ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو جنت عطا فرمائے۔ مولانا کو صبر کی تلقین گویا ایک محدث کو الف بے تے پڑھانا ہے۔ مولانا ہم سے زیادہ واقف ہیں کہ زندگی اضطراب کا نام ہے اور موت اطمینان کا نشان ہے ؎

جامی بروئے خاک چوں یک زندہ یافت نیست
خوش وقت مردگاں کہ تہہ خاک خفتہ اند

سر اکبر حیدری کا انتقال پُر ملال

قارئین "مشہور" نے اخبارات میں پڑھا ہوگا کہ ۸ جنوری سنہ ۱۹۴۲ء کو فالج کے حملے سے بمقام نئی دہلی سر اکبر حیدری کا انتقال ہوگیا۔ انتقال کے وقت آپ کی عمر ۷۰ سال کی تھی یعنی عمر طبعی کو پہنچکر سفر آخرت اختیار کیا۔ قاعدہ ہے عمر کتنی ہی وسیع ہو جائے مگر رحلت کا غم دوستوں اور عزیزوں کو ضرور ہوتا ہے اسی بنا پر ہندوستان کے طول وعرض میں سر موصوف کی وفات پر اظہار الم کیا گیا اور مرحوم کی ۴۰ سالہ خدمات کو سراہا گیا۔ ہمیں بھی اخباری برادری میں شامل ہونے کے باعث اس رسم کی تجدید کرنی ہے۔ لہٰذا مرحوم کے صاحبزادے اور انکی والدہ محترمہ کی خدمت میں ہم اپنی دلی ہمدردی پیش کرتے ہوئے دست بدعا ہیں کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور اعزا کو صبر کی توفیق دے۔

مسٹر مغنی کو ڈنر

مسٹر ایم۔ اے مغنی بی اے پروڈیوسر "اجالا فلم" کے دہلی تشریف لانے پر سب سے پہلے ادارۂ مشہور کی جانب سے ۱۰ جنوری سنہ ۴۲ء کو ایک شاندار دعوت طعام دی گئی اور تقریباً ایک سو معزز حضرات کو مدعو کیا گیا جس میں بیشتر حصہ مدیران اخبارات ورسائل کا تھا۔ کھانے کے بعد معزز مہمان کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے گئے اور تمام حاضرین سے تعارف کرایا گیا۔ خیر مقدم کے سلسلہ میں اکثر مقررین نے مغنی صاحب کے ادب وانشا کی قابلیت اور پبلسٹی خدمات کا اعتراف کیا۔ یہ تقریریں بہت پسند کی گئیں اور بار بار چیرز ہوتے رہے۔ آخر میں مغنی صاحب نے اپنے میزبان کا موزوں الفاظ میں شکریہ ادا کیا اور یہ دلچسپ صحبت کامیابی کے ساتھ ختم ہوگئی۔

احسان کا بدلہ احسان

یہ ایک مشہور مثل ہے۔ مگر اس زمانے کے حیرت انگیز انقلابات میں یہ سن کر آپ کو تعجب نہ کرنا چاہیئے کہ سچ مچ ایک گوشت پوست کے آدمی نے جس کا نام "احسان" ہے احسان کا بدلہ احسان کشی کے ساتھ دیا اس اجمال کی تفصیل ملاحظہ ہو۔

مسٹر مغنی بی۔ اے نے جو اکثر فلم کمپنیوں کی پبلسٹی خدمات انجام دیتے رہے ہیں یہ محسوس کرتے ہوئے کہ ہندوستان میں کوئی مسلم فلم کمپنی نہیں ہے "تاج محل پکچرز" کے نام سے ایک کمپنی قائم کی تاکہ مسلمانوں کا روپیہ جو فلم کمپنی پر ہن برسانے میں "مشہور" ہے اس کا کچھ حصہ اپنی ہی قوم کی جیب میں جائے۔

چونکہ مغنی سرمایہ دار نہیں ہیں اس لئے قدرتی طور پر انہیں کسی ایسے مسلم شخص کی ضرورت ہوئی جو سرمایہ لگا سکے۔ اسے بدقسمتی کہئے کہ مسٹر احسان جو خان بہادر سلیمان صاحب کے صاحبزادے ہیں سرمایہ لگانے کے لئے تیار ہوگئے اور طرفین میں ایک زبانی معاہدہ ہوگیا کہ مسٹر مغنی کو اس خدمت کے سلسلہ میں چھ سو روپیہ ماہوار کے علاوہ پچیس فی صدی منافع دیا جائیگا۔

مسٹر مغنی نے یہ سمجھ کر کہ مسلمان بدعہدی نہیں کرسکتا اس معاہدہ کو باضابطہ تحریر نہیں کرایا اور اپنی ایمانداری اور نیک نیتی کے ساتھ کام شروع کر دیا۔ چنانچہ "اجالا" فلم تیار ہوگئی، اور اس کی اسٹوری مغنی نے دلی کی صاف اور ستھری زبان میں خود ہی لکھی اور اس کام کے لئے موزوں اداکاروں کو اکٹھا کر لیا چنانچہ دنیائے فلم کی مشہور ایکٹرس مس نسیم محض مغنی کے تعلقات کی وجہ سے اس فلم کے اداکاروں میں شامل ہوگئی۔ کہا جاتا ہے کہ احسان صاحب نسیم پر لٹو ہوگئے اور مغنی کو علیحدہ کرنے کی ترکیبیں سوچنے لگے۔ مغنی نے اتنا ہی نہیں کیا بلکہ اپنے گہرے تعلقات کی وجہ سے شمالی ہند کے ڈسٹری بیوٹروں سے سوا لاکھ روپے کے آفر حاصل کر لئے۔

مسٹر احسان نے جب منافع کی کثیر دولت کا اندازہ کیا تو معاہدہ کو پس پشت ڈال کر ایک تار کے ذریعہ نوٹس دیکر مغنی صاحب کو علیحدہ کر دیا۔

بدعہدی کی یہ ایک ایسی بدترین مثال ہے جس کا جواب مشکل سے ملے گا اور اسی کے متعلق آج کل شمالی ہند کے تمام اخبارات میں ... ہو رہی ہے۔

ہم مسٹر احسان سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ ... ان کے خلاف جو کچھ اخبارات میں لکھا جا رہا ہے اگر صحیح نہیں ہے تو وہ کیوں تردید نہیں کرتے اور درست ہے تو انھیں لازم ہے کہ فوراً اپنے طرزِ عمل پر نظرِ ثانی کریں۔ ہمیں اس کا بعید نہیں ... مغل کی علحدگی کے بعد تاج محل پکچرز کی عمارت متزلزل نہ ہو جائے اور فلم مسلم کمپنی کا خواب ہمیشہ کے لئے تعبیر کا منت کش نہ ہو۔

بناسپتی گھی اور چربی ملا ہوا گھی

ہماری رائے

اس مسئلہ میں متعدد بار انھیں صفحات پر پبلک کی نظر سے گذر چکی ہے۔ ہم یقیناً اصلی گھی کے موئد ہیں لیکن جب خالص گھی کی بہم رسانی دشوار ہو تو چربی ملے ہوئے گھی سے بناسپتی گھی کو اس لئے مقدم سمجھتے ہیں کہ اس میں وٹامن ضرور ہوتا ہے اور ملاوٹی گھی کے خلاف بالکل بے ضرر۔ مگر وہ بناسپتی گھی جو ملک کے مستند کارخانوں کا تیار شدہ ہو۔

حکومت پنجاب نے بناسپتی گھی میں سرخ رنگ ملوا کر نا قابلِ استعمال بنا دیا ہے جس کے باعث چربی ملا ہوا گھی بکثرت فروخت ہو رہا ہے اور پبلک کی صحت پر برا اثر پڑ رہا ہے۔ اب ہمیں معاصر "وحدت" کے لکھنؤ نامہ نگار کی اس اطلاع سے حیرت ہوئی کہ یو۔پی کی گورنمنٹ بھی بناسپتی گھی میں رنگ ملانے کے مسئلہ پر غور کر رہی ہے اور لکھنؤ یونیورسٹی کے تحقیقاتی تجربہ خانے میں ہلدی کے رنگ کے متعلق دیکھ بھال کی جا رہی ہے اور اس گھی کو ہلدی سے رنگنے کے امکانات پر غور کیا جا رہا ہے۔

ہماری رائے میں مرض کا اصلی علاج یہ نہیں ہے بلکہ چربی ملے ہوئے گھی فروخت کرنے والوں کے خلاف ایسا قانون بنایا جائے کہ اس جرم کے ارتکاب کا کسی کو حوصلہ نہ ہو اور بناسپتی گھی کو جو لاکھوں آدمیوں کی غذا بن چکا ہے ہرگز رنگین نہ کیا جائے بلکہ اس کی فروخت اگر محدود ہی کرنی ہے تو اصلی اور خالص گھی کی بہم رسانی کا انتظام کرنا چاہیئے۔

مگر ہم جانتے ہیں کہ "راج ہٹ" اس مفید تجویز پر غور نہ کریگی اور وہی کرے گی جو اس کے دل میں آئے گا۔

خلقے بہ منت یک طرف آں شوخ رعنا یک طرف

مزدوروں کے ہمدرد

مسٹر جوہن ایف باؤ ٹرس ڈائرکٹر باٹا شو کمپنی کی جانب سے "باٹا نگر نیوز" کی ۲ر دسمبر سنہ ۱۹۴۱ء کی اشاعت میں ایک بیان شائع ہوا ہے جسے ہم نے حرف بہ حرف پڑھا۔ یہ بیان عام پبلک کے لئے بھی اطمینان بخش ہے اور بالخصوص باٹا شو کمپنی کے ان چھ ہزار ملازمین کے لئے ایک پیامِ مسرت ہے جو شب و روز محنت کر کے ہندوستان کی صنعتِ کفش سازی کو فروغ دے رہے ہیں۔

اس مضمون میں موصوف نے گذشتہ سال کے کاموں پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے لکھا ہے:-

"یہ میرے لئے اور سارے ہندوستان میں باٹا کے کام کرنے والے "خاندان" کے لئے بڑے اطمینان اور خوشی کی بات ہے کہ گذشتہ سال میں جو سخت ترین کام تھا ہم آپس میں پہلے سے زیادہ متحد رہے اپنے کاموں کو مضبوطی سے انجام دیتے رہے اور اپنے ہم وطنوں کی اور بنی نوع انسان کی خدمت کرتے رہے اور عالمگیر جنگ کے بڑھتے ہوئے ہنگامہ کے باوجود ہم اس قابل رہے کہ اپنے کارخانوں کو ہر روز مشغولِ کار رکھیں اور ہر چیز کی گرانی کے باوجود جوتوں کی قیمتوں کو عام پسند سطح پر رکھیں چنانچہ ہم نے گذشتہ سال کے دوران میں اپنی مصنوعات کو بہتر بنایا اور اس ملک کے باشندوں کو ایسے جوتے مہیا کئے جن کی قیمت موجودہ حالت کے پیش نظر بہت کم رہی"

بلاشک اس بیان کی سچائی میں سرمو فرق نہیں ہے یقیناً باٹا کمپنی نے سرمایہ دار دوکانداروں کی طرح پبلک کو نہیں لوٹا بلکہ معمولی اضافہ کے ساتھ جوتے فروخت کئے۔ آگے چل کر مسٹر موصوف نے جہاں ملازمین کی تعداد میں اضافہ کا اظہار کیا ہے وہاں باٹا نگر میں صحت بخش مکانات کی تعمیر کا بھی ذکر کیا ہے جو ملازمین کے آرام کے لئے بنوائے گئے ہیں۔ ان مکانات میں ہوا۔ پانی۔ روشنی۔ صفائی کا معقول انتظام ہے اور لکھا ہے کہ ہمارے

ساتھ کام کرنے والوں کے بچوں کی نشو و نما کے لئے یہ مکانات بہت ضروری ہیں نیز انھوں نے یہ بھی بتایا کہ موجودہ زمانے میں زندگی کے اخراجات بہت بڑھ گئے ہیں اس لئے کمپنی کے ڈائرکٹروں کی ایک میٹنگ میں جو ۲۲ دسمبر سنہ ۴۱ء کو ہوا تھا وار الاؤنس کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل مزید آسانیاں ملازموں کو عطا کی گئیں:۔

"جو ملازمین چھ ماہ سے زیادہ کمپنی میں کام کر چکے ہیں اور جن کی تنخواہ یا اجرت فی ہفتہ پچیس روپے تک ہے ان کو دس آنہ فی ہفتہ ۲/۱ ماہوار وار الاؤنس دیا جائیگا اور جو لوگ ایک سال سے زیادہ کام کر رہے ہیں اور ان کی تنخواہ یا اجرت مذکورہ بالا ہے تو ان کو اس وار الاؤنس کے علاوہ مزید الاؤنس اور دیا جائیگا جو ان کی دو ہفتہ کی تنخواہ کے برابر ہوگا۔ اس فیصلہ کا نفاذ سنہ ۴۲ء کے دوسرے ہفتہ سے عمل میں آئیگا۔"

یہ جذبۂ مزدور نوازی قابل ستائش ہے اور ہم اس فیصلہ پر مسٹر جوہن ایف بارٹرس کو پر جوش مبارکباد دیتے ہیں یقیناً انھوں نے ہز سردار "ٹامس باٹا" آنجہانی کے خیالات کی پوری طرح پیروی کی ہے اور وہ اس دور میں ایک ایسے انسان ہیں جن کے پہلو میں غریبوں کی مصیبت کا احساس رکھنے والا دل ہے اس بیان کے آخر میں مسٹر موصوف اپنے ملازمین سے اتحاد عمل کی درخواست کرتے ہیں جس کا جواب باٹا کے غریب مزدور بڑی خوشی کے ساتھ دیں گے۔

ہمیں یہ بھی بہ تحقیق معلوم ہوا ہے کہ کلکتہ کی ہنگامی حالت کے پیش نظر یو۔ پی اور پنجاب کے شہروں میں باٹا شو کمپنی اپنے کارخانے کھولنے والی ہے چنانچہ لاہور میں کئی لاکھ کے صرفہ سے ایک عمارت بھی مکمل ہو گئی ہے اور دیگر شہروں میں مسٹر جوہن ایف بارٹرس خود دورہ کر رہے ہیں تاکہ زمین حاصل کر کے عمارت تعمیر کرائیں۔

ہم مسٹر جوہن ایف۔ بارٹرس کی خدمت میں گزارش کرینگے کہ وہ کارخانوں کا افتتاح جلد سے جلد عمل میں لائیں اس لئے کہ ہندوستان کے ہزارہا مفلوک الحال کام سے لگ جائیں گے اور مسٹر موصوف کی جان و مال کو دعا دیں گے۔ ہمیں امید ہے کہ مسٹر موصوف کی تصویر "مشہور" کے سرورق پر دیکھ کر ہر غریب مزدور خراج عقیدت پیش کرے گا۔ (ایڈیٹر)

نذر جگر گوشۂ رسول کے حضور میں

رن میں گھوڑے سے گرا جس گھڑی عباس علی ... دی صدا جلد خبر آن کے لو ابن علی
نگۂ لطف و کرم سیّد عالی نسبی ... مرحبا سیّد مکی مدنی العربی
دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

تجھ پہ ہوتا ہوں فدا شمع امامت عالم ... مثل پروانہ ہوں بے تاب بصد رنج و الم
جلد ہو جلوہ نما قافلہ سالارِ حرم ... من بیدل بہ جمال تو عجب حیرانم
اللہ اللہ چہ جمال است بدیں بو العجبی

اے جگر بند علی راحت جانِ زہرا ... مرتبے سے ترے واقف نہیں ظالم اصلا
بخدا تو ہے جگر گوشۂ محبوب خدا ... نسبت نیست بذات تو بنی آدم را
برتر از عالم و آدم تو چہ عالی نسبی

مجھ کو خیمے میں نہ لے جاؤ شۂ نیک صفات ... ہوں خجل پیاس سے اطفال کی مولا ہیہات
یاد ہے پیاس میں بچوں کا یہ کہنا دن رات ... ما ہمہ تشنہ لبانیم توئی آب حیات
لطف فرما کہ زحد میگزرد تشنہ لبی

یا حسین ابن علی سرورِ عالی نسبی ... جز ترے کون مددگار سلیم عاصی
بخشوانا اسے اے ہاشمی و مطلبی ... سیدی انت حبیبی و طبیب قلبی
آمدہ سوئے تو قدسی پئے درماں طلبی

عقیدت مند
سلیم

طبقۂ نسواں اور اسلام

(از جناب یٰسین صدیقی صاحب)

اسلام نے عورتوں کو جو حقوق عطا فرمائے ہیں وہ اتنے وسیع ہیں کہ دنیا کے کسی ہادی، و مصلح نے آج تک پیش نہیں کئے بلکہ بے پردگی کی نام نہاد آزادی دے کر ہزار ہا بے شرمیوں کا دروازہ کھول دیا ہے۔

جناب یٰسین صدیقی صاحب نے نہایت کاوش کے ساتھ اس اہم موضوع پر خامہ فرسائی کی ہے امید کہ ناظرینِ مشہور توجہ کے ساتھ اس مضمون کا مطالعہ فرمائیں گے۔ "ایڈیٹر"

"جب یہ اظہر من الشمس ہے کہ مرد اور عورت دونوں باعتبار آفرینش ہم رتبہ اور مساوی الحق ہیں، تو کوئی وجہ نہیں کہ مردوں کو عورتوں پر بے جا ترجیح دی جائے اور خواہ مخواہ عورتوں کو مردوں کے مقابلہ میں حقیر خیال کیا جائے۔

اسلام نے جو حقوق۔ آزادی اور امتیازات طبقۂ نسواں کو عطا کئے ہیں اور خصوصیت کے ساتھ مرد اور عورت کے مابین جو خاکۂ مساوات ساڑھے تیرہ سو سال قبل پیش کر دیا ہے اس کی نظیر آج کے ترقی یافتہ زمانے کی مہذب ترین اور متمدن قوموں میں بھی نہیں مل سکتی ہے۔

قطع نظر اس سے کہ دنیا کی دیگر اقوام نے جو اپنے آپ کو آزادی اور مساوات کا علمبردار کہتی ہیں طبقۂ نسواں پر کیا سختیاں اور پابندیاں روا رکھی ہیں اور ان کی ظاہری آزادی کے پردے میں جس سے صرف ان کا علانیہ پھرنا اور دنیاوی تفریحات میں حسب دل خواہ شریک ہونا ہی مراد ہے۔ کس طرح ان کی حقیقی آزادی کا خون کیا ہے۔ میں ناظرین مشہور کے سامنے اسلام کے صرف چند قوانین پیش کروں گا جس سے معلوم ہوگا کہ اسلام نے عورتوں کو کس درجہ عزت دی ہے اور مردوں کے مقابلے میں انھیں کتنا مساوی الحق قرار دیا ہے۔

اسلامی قانون ہے کہ:-

(۱) مرد اور عورت دونوں نابالغی کی حالت میں کسی قسم کا معاہدہ کرنے کے قابل نہیں لیکن سن بلوغ پر پہنچکر دونوں خود مختار ہو جاتے ہو جاتے ہیں اور ہر قسم کا معاہدہ کرنے کے مجاز ہوتے ہیں۔

(۲) شادی کا مسئلہ بھی بالکل روشن ہے نکاح کے لئے مرد اور عورت دونوں کی رضامندی ضروری ہے۔

(۳) شادی کے بعد بھی عورت اپنی ذاتی ملک اور جائداد پر قابض اور متصرف رہتی ہے اور اسے ہر قسم کا اختیار۔ ہبہ۔ بیع۔ رہن۔ اور وقف حاصل رہتا ہے۔

(۴) عورت کا حق شادی کے بعد اپنے رشتہ داروں کی جائداد پر قائم رہتا ہے۔

(۵) خاوند کی جائداد میں بھی عورت کا حصہ ہے۔

(۶) ہر نیکی کا ثواب عورت کو ملتا ہے اور گناہ کی باز پرس بھی اس سے ہوگی۔

مندرجہ بالا قوانین اسلام پر مسلمانوں کا عمل ہے اور ہمیں فخر بھی ہے کہ جو امتیازات اور آزادی ہمارا مذہب عورت کو عطا کرتا ہے وہ کوئی دوسرا مذہب پیش نہیں کر سکے گا۔ لیکن جہاں تک حسن سلوک۔ حسن معاشرت حسن اخلاق۔ مہذب برتاؤ۔ انسانی ہمدردی۔ خلوص۔ انس اور محبت کا تعلق ہے ہماری کثیر تعداد اس سے نا آشنا ہے جس کا لازمی نتیجہ اکثر اور بیشتر ناخوشگوار واقعات کی صورت میں رونما ہوتا رہتا ہے اور سب سے بڑھ کر عورت ہی کی کم مائیگی عقل پر محمول کر کے اسے مورد الزام قرار دیا جاتا ہے حالانکہ اس کا سبب صرف عام مسلمانوں کا غیر مہذب، غیر تعلیم یافتہ بے تربیت اور بد اخلاق ہونا ہے۔ نا عاقبت اندیش مسلمانوں کی یہ خرابیاں جو اغیار کو اسلام اور قانون اسلام پر ناجائز اعتراضات کا موقع دیتی ہیں صرف تعلیم نسواں ہی کی مدد سے دور ہو سکتی ہے۔

دنیا کی ترقی یافتہ قوموں نے باوجودیکہ ان کا قانون عورت کا حقیقی

آزادی کا دشمن ہے عورت کی ظاہری ترقی کو اس حد معراج تک پہنچا دیا ہے جہاں وہ خود اپنی آزادی کو بھول جاتی ہے۔ ترکہ اور ورثہ و نیز دیگر حقوق سے محروم رکھنے ہوئے بھی آج عورت کی آسائش اور خوشی ہر شے پر مقدم ہے یہ دور تمدن عورت کو مرد کا خدمت گذار نہیں تصور کرتا بلکہ اسے مرد کا انیس و جلیس شریک عیش و غم سامان انبساط اور رونق مکان خیال کرتا ہے۔

یہ ترقی یافتہ تہذیب یقیناً عورت کی قدر و منزلت کو ایک حد تک بڑھاتی ہے۔ دنیا کی ترقی کا راز بظاہر زمانے کے ساتھ بڑھنے میں ہے لیکن مسلم قوم کو اپنی ترقی اور اپنے مستقبل کو شاندار بنانے کے لئے تیرہ سو برس پہلے کی تعلیم اور تہذیب کی جانب رجوع کرنا پڑیگا اور اسے اس تمدن۔ معاشرت۔ حسن سلوک اور اخلاص کو اپنا لائحہ عمل بنانا پڑیگا جس کی تعلیم اس کے ہادی اور رہبر نے عملی طور پر اسے دی ہے۔ **پیغمبر اسلام کا ارشاد ہے کہ:۔**

(۱) تم میں بہتر وہی شخص ہے جو اپنی بیوی سے بھلائی کرے۔

(۲) میں اپنی بیویوں کے حق میں سب سے بہتر ہوں۔

(۳) جس نے اپنی بیوی کی بدخلقی پر صبر کیا وہ اس ثواب کا مستحق ہوا جو حضرت ایوبؑ کو ان کے مصائب پر ملا۔

(۴) میں عورتوں کے معاملے میں خدا کا واسطہ دیتا ہوں۔ یہ تمہارے بس میں ہیں ان سے حسن معاشرت برتنا۔

(۵) میاں بیوی کے ساتھ کھانا کھاتے وقت ملائکہ ان پر درود بھیجتے ہیں

(۶) اپنے تئیں اور اپنے گھر والوں کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ یعنی اپنی عورتوں کو اصول اور قوانین اسلام سے آگاہ کرو ورنہ عورتیں مجاز ہیں کہ علماء کے پاس جا کر سیکھ لیں۔

میرے نزدیک بانی اسلام کا فرمان عورتوں کو قدر و منزلت کی معراج کو پہنچا دیتا ہے اور حسن سلوک کا اس سے زیادہ روشن سبق دنیا کا کوئی مصلح پیش نہیں کر سکتا۔ اگر اب بھی عورت کو جہالت کی تاریکی سے نکال کر ہم اپنا مستقبل شاندار نہ کر سکیں اور ہماری آئندہ نسلیں پھر جہالت کا شکار رہ جائیں تو ہمیں دنیا میں ایک زندہ قوم کہلانے کا حق ہی کیا۔

انتظام خانہ داری۔ وسعت خاندان۔ مجاہدہ نفس اور اولاد صالح یہ تمام باتیں صرف عورت پر منحصر ہے۔ ہمیں صرف اس نظریہ سے حقوق نسواں کا حامی نہیں ہونا چاہیئے کہ وہ ہمارے لئے آلۂ تفریح یا سامان عشرت ہیں بلکہ اس خیال سے کہ ان کے ساتھ حسن سلوک خلوص اور محبت سے اولاد صالح کی امید وابستہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مہذب اور تہذیب یافتہ ملکوں کی حکیمانہ طبائع عورت کی گرویدہ ہیں۔

اس سلسلہ میں عورت کے متعلق مختلف الخیال شخصیتوں کے نظریات پیش کرنا بھی ناظرین مشہور کے لئے خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

۱۔ عورتوں کا کام محض افزائش نسل ہے (شوپنہار)

۲۔ عورتوں کا فرض صرف بچے پیدا کرنا ہے جو سپاہی بن سکیں (ہٹلر)

۳۔ میں نے صرف جوزفائن کے سامنے سر تسلیم خم کیا۔ (نپولین)

۴۔ عورتوں نے قوموں کی قسمتیں بدل دیں (روسو)

۵۔ عورت کی جگہ گھر میں ہے اور اس کا فرض ٹھیک مانند سپاہی کی تفنن طبع (گوئرنگ)

۶۔ عورت ایک آسمانی ہستی ہے۔ (ایک شاعر)

۷۔ عورت مرکز محبت بن کر حسن اور دلکشی کی معراج پر پہنچ جاتی ہے (ایک عورت)

۸۔ عورت اپنی پوجا کرانے کی شائق ہے۔ (کالی داس)

۹۔ تند خو عورت دنیا کا بدترین عذاب ہے (حق گو)

۱۰۔ مرد کا فطری مرکز محبت عورت ہے (نامعلوم)

۱۱۔ عورت کے آنسوؤں میں دنیا کے عظیم ترین انقلاب ہیں۔ (کارلائل)

۱۲۔ عورت کا فرض خوبصورت بننا اور بچے جننا ہے (گیلس)

۱۳۔ عورت انسان اور فرشتہ سے جداگانہ مخلوق ہے (غزالی)

۱۴۔ عورت کا فرض ہے کہ وہ سپاہی تیار کرے۔ (مسولینی)

۱۵۔ عورت جتنی خوبصورت ہو اتنا ہی اس سے خوف زدہ رہو۔ (؟)

لیکن اسلام کی نظر میں

۱۶۔ **عورت کا لباس مرد اور مرد کا لباس عورت ہے۔**

عالم نسواں

چند لمحے گھر کے اندر

محترمہ ھدیٰ خانم شعراوی کے ایک اہم مضمون کا ترجمہ

محترمہ ھدیٰ خانم شعراوی مصر کی سحر طراز انشا پرداز خاتون ہیں ما یکون فی البیت (گھر کے اندر کیا ہونا چاہیئے) کے عنوان سے موصوفہ کا ایک نہایت مفید اور دلچسپ مضمون "العروسہ" میں شائع ہوا ہے اس مضمون کا عام فہم اور سلیس اردو ترجمہ مولینا زاہد القادری صاحب نے کیا ہے جسے ہم قارئین "مشہور" کی خدمت میں پیش کرتے ہیں امید کہ مسلم خواتین محترمہ ھدیٰ خانم کے مشورہ پر عمل پیرا ہونگی - (ایڈیٹر)

سوال کیا گیا ہے کہ ہم عیش و راحت کا سرمایہ کس طرح حاصل کر سکتے ہیں؟ اور ہماری زندگی میں فردوس کے نظارے کس طرح شامل ہو سکتے ہیں؟ اس سوال کا جواب آسان بھی ہے اور دشوار بھی، اگر ہم عمل کرنے کا فیصلہ کرلیں تو یہ آسان منزل ہے، اور اگر عمل کی دنیا سے دور رہنا چاہیں تو اس کا جواب سخت مشکل ہے۔

۲۰ شوال ۱۳۵۹ھ کو جب میں ایک نسوانی درسگاہ کا معائنہ کر رہی تھی۔ میری ایک عزیز خاتون نے مجھ سے یہ دریافت کیا کہ ہماری زندگی فردوس کا نظارہ کس طرح پیش کر سکتی ہے! میں نے اس وقت یہ جواب دیا تھا کہ ہماری اکثر معاشرتی خرابیوں کی ذمہ داری خود ہم پر ہے ہم آئے دن اس بات پر ماتم کرتے ہیں کہ ہمیں آسودگی خاطر حاصل نہیں ہے، لیکن کیوں؟ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ہم زندگی کے اکثر عنوانات کا گہری نظر سے مطالعہ کرتے ہیں۔ لیکن اگر کسی گوشہ کا مطالعہ نہیں کرتے تو وہ ہماری معاشرت ہے۔

ہماری لڑکیاں درسگاہوں میں تعلیم حاصل کرتی ہیں تاریخ جغرافیہ، ادب، ڈرائینگ، حساب کتاب سارے ہی مسئلے ہمارے سامنے آتے ہیں لیکن اگر کوئی عنوان محروم التفات رہتا ہے تو وہ معاشرت ہے۔ تحصیل علم سے فارغ ہونے کے بعد بھی ہماری لڑکیاں یہ نہیں جانتیں کہ ان کو معاشرت کی منزل کس طرح طے کرنی ہے! لہذا میں یہ تجویز کرتی ہوں کہ ہمارے نصاب تعلیم میں عنوان معاشرت کا بھی اضافہ ہونا چاہئے تاکہ آئندہ زندگی میں بیویاں اور مائیں بننے والی لڑکیاں اپنے فرائض اور اپنی ذمہ داریوں سے ناواقف نہ رہیں۔

اس سلسلے میں سب سے پہلا سوال یہ سامنے آتا ہے کہ ایک عورت کو بیوی یا ماں بننے کی ضرورت بھی ہے یا نہیں؟ عقل سلیم اس کا جواب دیتی ہے کہ ہر عورت کو بیوی اور ماں بننے کی ضرورت ہے اور ایسا ہونا قانون قدرت کے مطابق ہے۔ جو لڑکیاں تمام عمر غیر شادی شدہ رہنے کی کوشش کرتی ہیں عام طور پر یہ مشاہدہ ہوا ہے کہ وہ المناک حوادث کا شکار بن جاتی ہیں۔ پہلی مصیبت تو یہ سامنے آتی ہے کہ ان کی صحت خراب ہو جاتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ایسی بہت کم لڑکیاں ہیں جو اپنے کیرکٹر کی حفاظت کر سکتی ہیں لہذا تلخ مشاہدات کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ ہر لڑکی کے لئے بیوی اور ماں بننا ضروری ہے۔ جب طے شدہ حیثیت میں یہ بات ہمارے سامنے آتی ہے تو اب سوال یہ ہے کہ بیوی یا ماں کے فرائض سے ہمیں کیوں نا آشنا رکھا جاتا ہے؟ اور تعلیمی زمانہ میں کیوں ہمیں ان فرائض سے آگاہ ہونے کا موقع نہیں دیا جاتا۔

اسی لئے یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ ہماری درسگاہوں میں اور ہمارے تعلیمی لٹریچر میں تمدن و معاشرت کا عنوان زیادہ نمایاں ہونا چاہئے جس دن یہ تحریک کامیاب ہو جائے گی اسی دن ہماری معاشرتی خرابیوں کا طوفان بڑی حد تک کم ہو جائے گا۔

مشاہدات کی روشنی میں یہ ثابت ہوا ہے کہ معاشرتی زندگی کی اکثر تلخ خامیاں صرف اس لئے نمودار ہوتی ہیں کہ ہماری لڑکیاں قانون معاشرت سے آگاہ نہیں ہوتیں۔

میں آج زندگی کی چالیس منزلیں طے کرنے کے بعد اپنے حقیر مشاہدات کی بنا پر چند الفاظ کہنا چاہتی ہوں :-

لڑکیوں کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اِس بات کو سمجھیں کہ بحیثیت بیوی ہونے کے ان کا فرض کیا ہے۔

معاشرتی زندگی کا آغاز ہونے کے بعد ان کا اہم فرض یہ ہے کہ وہ اِس بات کا مطالعہ کریں کہ جس ہستی کے ساتھ نیا تعلق پیدا ہوا ہے اور جس کے ساتھ ان کو زندگی کا زیادہ حصّہ گزارنا ہے اس کی عادت وطبیعت کیا ہے؟ اس کی مزاجی کیفیت کیا ہے؟ وہ کن باتوں کو پسند کرتا ہے اور کن باتوں کو پسند نہیں کرتا؟ ان کیفیات کا مطالعہ کرنے سے فائدہ حاصل ہوگا کہ زندگی بسر کرنے کے لئے ایک راہِ عمل سامنے آجائے گی۔

جو ذہین اور ہوشیار لڑکیاں اس منزل کو طے کرلیتی ہیں وہ اطمینان وسکون کی سرمایہ دار بن جاتی ہیں اور ان کی معاشرتی زندگی میں آسودگیٔ خاطر کے جلوے نظر آتے ہیں، اور جو لڑکیاں اس منزل کو طے نہیں کرتیں چند روز تک ان کی زندگی خوش گوار رہتی ہے، لیکن کچھ عرصے کے بعد المناک حوادث کی گھٹائیں ان پر چھا جاتی ہیں۔ اور ان کی زندگی تلخ بن جاتی ہے اِس لئے اِس بات کی اشد ضرورت ہے کہ ہمارے نصاب تعلیم میں معاشرت کی کتابیں ضرور ہونی چاہئیں۔ تمام طور پر جو باتیں معاشرتی زندگی کو خوش گوار بناتی ہیں وہ یہ ہیں:-

ہر وقت پاک وصاف رہنا۔ لباس خواہ کتنا ہی سادہ ہو لیکن صاف ستھرا ہو۔ مکان کو صاف اور آراستہ رکھنا۔ مکان خواہ معمولی حیثیت کا ہو لیکن صفائی کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ گھر کے کاموں کو وقت کی پابندی کے ساتھ انجام دینا اور اسے ایک فرض سمجھنا۔ گھر کے انتظامات میں شوہر کی مرضی کا احترام کرنا۔ اور اسے شکایت کا موقعہ نہ دینا۔ یہ چند امور ہیں جن کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

بیان کے آغاز میں جن باتوں کی طرف لڑکیوں کو توجہ دلائی گئی ہے اگر لڑکے بھی ان باتوں کا لحاظ رکھیں تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ معاشرتی زندگی فردوس کا نظارہ پیش کرسکتی ہے۔ اور اگر کسی نے بھی ان باتوں کا لحاظ نہ رکھا تو زندگی یقیناً المناک ہوگی۔

ساقی

از حضرت ادیب مالیگانوی

حضرت ادیب مالیگانوی ملک کے ایک ممتاز اور مشہور شاعر ہیں انکے کلام کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ نہایت شستہ صاف اور کسی نہ کسی پیغام کا حامل ہوتا ہے چنانچہ ذیل کے اشعار میں جابجا اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ باطل کو مٹا دو اور حق کی جستجو میں خود مٹ جاؤ۔ وہ محبت کو دنیا کی تمام مصیبتوں کا واحد علاج سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ انسانی آبادی جو خدا کا ایک کنبہ ہے آپس میں صلح و آشتی کے ساتھ رہے اور مل جل کر زندگی کا سفر طے کرے۔ ایڈیٹر

کب تلک غم کا نہ اُلٹے گا ورق اے ساقی
دے زمانے کو محبت کا سبق اے ساقی

گرد باطل سے ہے، آئینۂ عالم دھندلا
کسی گوشے سے دکھا جلوۂ حق اے ساقی

ذکر تن کا نہیں ویران ہے مَن کی دُنیا
سینۂ اہلِ نظر کیوں نہ ہو شق اے ساقی

انجمن ہو گئی جب ربط و کشش سے محروم
غیر ممکن کہ رہے نظم و نسق اے ساقی

ہائے یہ بزم امارت کے چھلکتے ہوئے جام
اُف یہ پیشانئ غربت کا عرق اے ساقی

عقل سے ہو نہ سکا تشنگئ دل کا علاج
روئے تہذیب ہے اس شرم سے فق اے ساقی

دامنِ عشق میں پنہاں ہے "سکونِ آدم"
عشق ہے چارۂ اندوہ و قلق اے ساقی

دہر میں خونِ مشقت سے ہے تزئینِ چمن
آج بے پردہ ہے یہ راز ادق اے ساقی

کتنی صورت سے برستا ہے تباہی کا غبار
کتنے چہروں پہ شگفتہ ہے شفق اے ساقی

دے وہ اک "ساغر معمورِ تجلی" مجکو !
جس سے روشن ہو دلِ سادہ ورق اے ساقی

تو وہ خاک اس انساں کو سمجھتا ہے ادیب
جسکے سینے میں ہے وسعت نہ عمق اے ساقی

شرفِ انسانی کا پس منظر

(بابو محمد جان صاحب انجم وزیر آبادی)

میں ایک مشہور زر پرست، متکبر و مغرور جراح کی دوکان پر بیٹھا تھا۔ موسم برشگال تھا۔ اس لئے جراح صاحب مکان کی دوسری منزل میں بیٹھ کر مریضوں کو دیکھ رہے تھے۔ باہر برکھا خوب زوروں پر تھی۔ پانی کی لڑیاں مکان اور دوکان کی چھپروں پر گرتیں تو ان کی ٹپ ٹپ سے ایک دلسوز نغمہ فضا میں پھیل جاتا۔ ساتھ ہی ہوا کے تیز و تند جھونکے شائیں شائیں کرتے ہوئے گزرتے اسی شورشش میں مریضوں کی ہائے ہو دب کر رہ جاتی۔

آخر بارشس تھم گئی۔ مطلع صاف ہوا۔ شاہ خاور چھٹے ہوئے بادلوں کی اوٹ سے اس طرح نمودار ہوا جس طرح کسی مہ پیکر نازنین نے نہا کر بال اپنے چہرہ سے ہٹا دیئے ہوں۔

میری توجہ جراح اور مریضوں کی طرف مبذول ہوئی اور یہی ماحول میرے خیالات کا موضوع بن گیا۔ مریضوں میں سے کوئی ٹانگ پہ پٹی باندھے تھا۔ کوئی بازو پر۔ کوئی کان کے زخم سے گریاں، تو کوئی ناک کے زخم سے نالاں۔

جراح صاحب سب سے پہلے متمول آدمیوں کی طرف متوجہ ہوتے ان سے مخاطبہ۔ میاں جی۔ چچا جی۔ سیٹھ جی اور خاں صاحب کے القابات سے ہوتا۔ لپک لپک کر ان کی طرف بڑھتے۔ روپیہ پر روپیہ جراح صاحب کے قدموں پر گرتا گیا جسے جراح صاحب بے اعتنائی سے مرہم کے ڈبوں اور گندی پٹیوں کے انبار ہی میں پھینکتے گئے۔ جراح صاحب کا طائر مزاج عرش معلےٰ سے بھی اوپر پرواز کر رہا تھا۔

جس مکان میں تشریف فرما تھے۔ ان کا اپنا تھا۔ علاوہ ازیں دو چار اور مکانات جو ہر طرح عالیشان کہلانے کے مستحق تھے جراح صاحب کی اپنی ملکیت میں تھے۔ جراح صاحب کو دوڑ میں شامل ہونے والے گھوڑوں کا بھی بے حد شوق تھا۔ چنانچہ تین چار گھوڑے اسی قسم کے پال رکھے تھے۔ غرضیکہ جراح صاحب کے پاس سوائے ہمدردی کے دنیاوی نعمتوں کی کوئی کمی نہ تھی۔

میں ماحول کا جائزہ لے رہا تھا اور خیالات کے بحر ناپید کنار میں مستغرق تھا۔ ناگہاں ایک درد بھری آواز نے مجھے چونکا دیا۔ یہ آواز ایک مریض کی تھی جو ایک خوش رو نوجوان تھا۔ چہرہ سے متانت اور شرافت ٹپک رہی تھی مگر بے حد غریب تھا۔ اس کے ہاتھ کے انگوٹھے پر زہریلی قسم کی پھنسی تھی اور وہ بار بار شدت درد سے بے چین ہو رہا تھا۔

میرے دل میں گوناگوں خیالات آئے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ جراح صاحب اس مریض کی طرف متوجہ نہیں ہوتے کیا وہ غریب ہے اس لئے غریب ہے تو پھر کیا۔ انسان تو ہے۔ انسانیت کو امارت و غربت سے کیا سروکار۔ انسان کو انسان سے انس ہونا چاہیئے۔ مگر جراح صاحب کو غریبوں سے ہمدردی ہوتی بھی تو کس طرح جبکہ میرے دیکھتے ہی دیکھتے ایک ادھیڑ عمر کی دیوی تشریف لائیں۔ بوڑھی گھوڑی لال لگام حسن و شباب کا زمانہ ایک رنگیں خواب کی طرح سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگ چکا تھا مگر وہ ابھی تک جڑاؤ طلائی زیوروں سے مزین تھیں اور ایک بھڑکیلی ساڑھی زیب تن کئے ہوئے تھیں۔ ہاتھ کی انگلی پر شاید مچھر یا چیونٹی نے کاٹا ہوگا۔ کیونکہ اس سے زیادہ عارضہ ان کو نہ تھا مگر پیسہ کے بل بوتے پر جراح صاحب کے پاس آکر اظہار کلفت کر رہی تھیں۔ جراح صاحب، آؤ ماتا جی۔ اماں جی کہہ کر اٹھے اور سبز رنگ کے مرہم سے ان کی انگلی پر لیپ کر دیا۔ اور انہوں نے پانچ روپیہ جراح صاحب کی نذر کر دیئے۔

بھلا جراح صاحب غربا کی طرف کب اور کیوں متوجہ ہوتے اسی اثنا میں ایک اور آواز آئی جو بازار میں ایک تانگہ میں بیٹھے ہوئے آدمی کی تھی۔

میاں صاحب چلیئے، خان صاحب آپ کو یاد فرما رہے۔ جراح

صاحب مریضوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر اس پیام رساں کے ساتھ بنگلہ میں چلے گئے۔ مجھے موقع مل گیا میں اس مصیبت زدہ نوجوان کے پاس بیٹھا۔ اس کے بازو کو دبانا شروع کر دیا۔ وہ بولا۔ مہربانی بابو صاحب۔ بھگوان آپ کو آنند رکھے، آپ تکلیف نہ کریں۔ میں نے کہا۔ بھیا۔ تکلیف کاہے کی۔ میں کونسی جوتے تیرانے لگا ہوں۔ آپ کا بازو دبائے دیتا ہوں ممکن ہے آپ کے درد میں کمی واقع ہو جاوے۔ وہ بولا بابو صاحب بازو دبانے سے سر دست میری تکلیف میں اور اضافہ ہوگا۔ آپ کے محبت بھرے الفاظ میرے لئے کافی ہیں۔ میں نے کہا شاید آپ کے زخم کا آپریشن ہوگا۔ اس لئے جراح صاحب توقف فرما رہے ہیں کہ مریضوں سے نپٹ کر آپکا آپریشن کیا جاوے۔

وہ ایک آہ سوزاں بھر کر بولا۔ کاش جراح صاحب بجائے میرے زخم کے میری غریبی کا آپریشن کر دیں وہ میرے حال سے اس لئے بے نیاز ہیں کہ میں غریب ہوں۔ آہ بھگوان کسی کو غریب نہ کرے۔ غریبی بذات خود ایک گناہ ہے۔ ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے گرتے ہوئے آنسوؤں نے اس کی دلی کیفیت کی ترجمانی کی۔ حسن اتفاق سے میری جیب میں کچھ نقدی تھی۔ میں نے ایک روپیہ نکال کر اسے دیا کہ اگر یہی بات ہے تو لو یہ روپیہ جراح صاحب کی نذر کر دینا مزید حالات سے انکشاف ہؤا کہ وہ ایک اچھے خاندان کا چشم و چراغ ہے مگر آسیائے فلک نے اسے پیس کر رکھ دیا۔ عیش و نشاط کے اوراق اس کی کتاب زندگی سے الگ ہو چکے ہیں۔ آج کل ایک پرائیویٹ فرم میں بطور چپراسی ملازم ہے صرف بارہ روپیہ ماہوار کی تنخواہ سے اپنا اور بال بچوں کا پیٹ پال رہا ہے۔ میرے استفسار پر اس نے اپنا نام شیام سندر بتایا۔

ایک گھنٹہ بعد جراح صاحب تشریف لے آئے شیام سندر سیڑھیوں کے قریب ہی بیٹھا ہؤا تھا۔ اور وہ نقرئی سکہ اس کے ہاتھ میں تھا۔ جراح صاحب کی عقاب نظریں بھانپ گئیں جس طرح گدھ مردار پہ آگرتی ہے بعینہ اسی طرح شیام سندر کی طرف لپکے اور بولے کیوں لالہ جی کیا تکلیف ہے آپ کو۔ شیام نے تمام واقعہ بیان کر دیا جراح صاحب نے فرمایا گھبرایئے نہیں ابھی آپریشن کئے دیتا ہوں مادہ کا اخراج ہو جانے سے تمہیں سکون حاصل ہو جائے گا۔ میں نے شیام کا ہاتھ تھاما۔ جراح صاحب خاموش رہ نہ سکے بول اٹھے۔ بھیا خواہ مخواہ تکلیف اٹھا رہے ہو۔ اسے چھوڑ دو میں آپریشن کئے دیتا ہوں اس کے بعد تحکمانہ لہجہ میں بولے۔ اے۔ سیدھے کھڑے رہو۔ بازو کو جنبش نہ دو۔ منہ دوسری طرف موڑ لو۔ میں نے عرض کیا میاں صاحب میں اس شخص کو بخوبی جانتا ہوں۔ اس کی سوانح حیات ایک فسانہ لئے ہوئے ہے۔ جس کا اظہار اس وقت بے محل ہے۔ بہرکیف میری دلی ہمدردی اس کے ساتھ ہے۔ اس لئے آپریشن کے وقت میں پاس ہوں گا اور شیام کو ہر ممکن امداد دونگا۔ آپریشن مفید ثابت ہؤا۔ میں نے شیام کو تانگہ میں بٹھا کر اس کو گھر تک پہنچا دیا جب تک اسے آرام نہ آیا۔ میں دفتر جاتے وقت روزانہ اس کا حال دریافت کر کے جاتا۔ بالآخر وہ تندرست ہو گیا۔ اب اس کا معمول تھا کہ روزانہ بلاناغہ صبح یا شام مجھے دفتر میں ملنے آتا۔ میں پوچھتا شیام تم کیوں روزانہ تکلیف اٹھا کر آتے ہو۔ وہ جواب دیتا۔ بابو جی آپ کے درشن اور سلام کو آتا ہوں، یہ کہکر ہنس دیتا۔ ارے بھائی کوئی میں دیوتا ہوں جو میرے درشن کو آتے ہو۔ وہ انکساری سے کہتا بابو جی آپ میرے لئے دیوتا ہیں۔ وقت گزرتا گیا ہم دونو ایک دوسرے سے قریب تر ہو گئے۔

ایک دن حسب معمول میں دفتری کام میں محو تھا۔ چند یوم پیشتر خوب موسلا دھار بارش ہو چکی تھی۔ اب مطلع صاف تھا اور سورج خوب تیزی سے چمک رہا تھا۔ ناگہاں ایک تڑاخ کی آواز سنائی۔ اور ساتھ ہی چھت سے روشنی نمودار ہوئی۔ میں نے نظر اوپر اٹھائی تو پیام اجل نظر پڑا۔ چھت کی شہتیر ٹوٹ کر دو حصوں میں منقسم ہو کر نیچے آ رہی تھی۔ نہ پائے رفتن نہ تاب ماندن۔ میرے حواس باختہ ہو گئے۔ بھاگنے کا ہوش نہ رہا۔ خوف زدہ ہو کر کرسی پر بیٹھا ہؤا۔ ایک طرف ہی جھک گیا۔

بعد کا مجھے کچھ علم نہیں۔ ہاں اتنا یاد ہے کہ جب مجھے ہوش آیا تو ایک بڑے ہسپتال میں چارپائی پر دراز تھا۔ میرا نمبر تھا میرے جسم پر جا بجا پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور بازو ٹوٹ جانے کی وجہ سے ان پر پلاسٹر لگا ہؤا تھا۔ جس شخص کو میں نے سب سے پہلے دیکھا وہ شیام تھا۔ وہ خاموش کھڑا تھا میں اسے دیکھتا رہا۔ دوسرے دن میرے ایک آفس فیلو کی زبانی معلوم ہؤا کہ مجھے چھت کے نیچے

سہاگ کی راتیں۔ خلوت کی باتیں

بے حد کیف آور۔ روح پرور اور نشاط انگیز ہوتی ہیں اور جب تک شباب نہیں ڈھلتا ان سہانی راتوں اور مزیدار باتوں کا نشہ بھی نہیں اترتا کسی نے خوب کہا ہے ۔ یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے۔

سچ مچ سہاگ کی پہلی رات

گویا بادشاہی ہے۔ مگر یہ بادشاہت نظام سقہ کی حکومت کی طرح بہت ہی مختصر ہوتی ہے اس لئے خوش نصیب ہیں وہ مرد۔ جو آغاز شباب میں اپنی رکھوالی آپ کر کے ان پر بہار راتوں کو بہشت زار بنا لیتے ہیں اور بدبخت ہیں وہ مرد۔ جو خلاف فطرت افعال کے مرتکب ہو کر اس رات کی بے پایاں لذتات محروم رہتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ سہاگ کی پہلی رات سے بڑھ کر حدیثِ عیش میں کسی اور رات کو فضیلت نہیں۔ لیکن اسے کیا کیجیے کہ آج کل ۸۰ فی صدی نوجوان بری صحبتوں میں رہ کر قوت مردمی کو برباد کر چکے ہیں اور وہ اس رات کے کیف و سرور سے محروم ہیں اور یہ بھی سمجھتے ہیں کہ ہم جس مصیبت میں مبتلا ہیں شاید وہ زندگی کے ساتھ ہی ختم ہو تو ہو

امید کی کرن

لیکن ناامیدی کفر ہے۔ ہم ایسے تمام لوگوں کو مشورہ دیں گے کہ وہ اپنی ازدواجی لذتوں سے شاد کام ہونے کے لئے ایک نہایت مقوی ٹانک

جوش

استعمال کریں۔ یہ اعضائے رئیسہ۔ دل دماغ جگر کی قوتوں کو از سر نو بحال کریگا۔ گردوں کو گرم اور قوی کریگا اور مادہ تولید بکثرت پیدا کرے گا حرارت غریزی کو برانگیختہ کریگا نہایت ممسک مقوی وبہی دوا ہے قیمت فی بکس ۳ روپے جس میں ۴۲ حبوب ہیں ایک حب صبح ایک شام پاؤ سیر دودھ کے ہمراہ استعمال کیجیے

زور

اس کے ساتھ ہی عضو مخصوص کی جملہ خرابیوں کے لئے زور سے بہتر کوئی طلا نہیں مل سکتا۔ کجی۔ لاغری کوتاہی اس کے استعمال سے دور ہو جاتی ہے اگر صرف سستی اور ذکاوت حس بڑھی ہوئی ہے تب بھی یہ طلا مفید ثابت ہوگا بہرحال یہ دونوں نادر دوائیں آپ کو جواں مرد بنانے کی پوری صلاحیت رکھتی ہیں۔ تجربہ ضرور کیجیے۔ قیمت فی شیشی ۳ روپے ہر دو نوں دوائیں ایک ساتھ منگانے والے کو محصول ڈاک معاف۔

ملنے کا پتہ:۔ مشہور دواخانہ فرانتخانہ دہلی

عالم ہمہ افسانہ ما دارد و ما ہیچ

افضل خاں اور روشن آرا کی داستان معاشقہ

ایک تاریخی رومان!

یہ تاریخی فسانہ بہت دلچسپ ہے لیکن صابر صاحب کو ان تاریخی کتب کا حوالہ دینا چاہئے تھا جن سے یہ واقعہ اخذ کیا گیا ہے (اڈیٹر)

آپ نے افضل خاں کا نام تو سنا ہوگا! وہی بیجاپور کا شیر دل جرنیل جسے سیواجی نے انتہائی مکاری اور دغابازی سے کام لے کر زہر بجھے بچھے سے مار ڈالا تھا۔ مگر میں یہاں اس واقع کو بیان نہیں کرونگا بلکہ یہاں بیجاپور کے اس خالی مقبرے کا ذکر مقصود ہے جسے بہت سے لوگ نہیں جانتے کہ کس کا ہے یہ افضل خاں کا مقبرہ نہیں ہے۔ اس کا مقبرہ پرتاپ گڈھ میں ہے جہاں وہ مر کر گرا تھا۔ بلکہ یہ خالی مقبرہ ان مقبروں میں سے ایک ہے۔ جو اس کی چوسٹھویں بیگم روشن آرا کے لئے تیار کیا گیا تھا۔

جب افضل خاں کو بیجاپور کے حکمران کی طرف سے سیواجی کی سرکوبی کے احکام ملے۔ تو وہ خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ کیونکہ وہ ایک عرصہ سے مرہٹوں کی اس کش کارروائیوں کو پرخطر نگاہوں سے دیکھ رہا تھا وہ بہادر، نڈر اور شیر دل جوان تھا۔ ہمیشہ جنگ وجدال کا متمنی تھا۔ اس کی خواہش تھی بادشاہ اسے اس نئے فرقے کے قلع قمع کا حکم دے تو وہ ہمیشہ کے لئے اس خطرناک گروہ کا خاتمہ کر کے رکھ دے۔ آخر اسے حسب خواہش یہ احکام مل گئے۔ مگر ایک نجومی نے عین وقت پر اس کے بڑھتے ہوئے حوصلوں کا یہ پیشین گوئی کر کے خون کر دیا۔ کہ وہ اس مہم پر روانہ نہ ہو۔ ورنہ زندہ واپس نہ آ سکیگا۔

مگر میں ضرور جاؤنگا" افضل خاں ہنس کر بولا "بہر دبیغبر سپاہی موت سے نہیں ڈرتے۔ اور اس قسم کی قیاسی باتیں بہادروں کو فرائض کی انجام دہی سے روک نہیں سکتیں۔ ایک سپاہی کی انتہائی عزت میدانِ جنگ میں مرجانا ہے۔ اور میں اس اعزاز کا ہمیشہ سے متمنی رہا ہوں۔

اس دن کے بعد سے جب وہ اس مہم کی تیاریوں میں لگا ہوا تھا۔ یہ پیشین گوئی رہ رہ کر اس کے دماغ میں چکر لگاتی رہتی تھی۔ اس وہم نے یہاں تک ترقی کی۔ کہ اسے اس کی صحت پر یقین ہو گیا۔ اس نے اس کا فاطمہ بیگم سے ذکر کیا۔ جو اس کی پہلی بیگم تھی اور آج تک برابر اس کی ہمراز وغمگسار رہی تھی۔

"پیاری! اگر میں میدان جنگ سے واپس نہ آ سکا۔ تو تم سب کا کیا ہوگا!"

اس شیر دل خاتون نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے جواب دیا "ہمیں بھی اپنے ساتھ لے چلئے۔

"کہاں! میدان جنگ میں!" افضل خاں حیرت سے چیخ کر بولا

"نہیں میدان جنگ میں نہیں" فاطمہ سنجیدہ لہجے میں بولی۔ اس کی خوبصورت روشن آنکھیں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ بلکہ اس مقام کی طرف جو میدان جنگ سے بہت دور اور الگ تھلگ واقع ہے جہاں خدائے قدوس نے ہر ایک ذی روح کے پہنچنے کا فیصلہ کر رکھا ہے ... میدان جنگ کی طرف کوچ کرنے سے پہلے ہمیں مر جانے دیجئے تاکہ آپ کی پیشوائی اور ہمنشینی کے لئے ہماری روحیں آپ کی منتظر رہیں۔

افضل خاں لرز اٹھا۔ فاطمہ بیگم نے کتنا زہرہ گداز ارادہ اور نظریہ پیش کیا تھا اچھا تو۔ دلفن آرا کا کیا ہوگا!" اس نے اپنی سب سے چھوٹی نوعمر بیگم کے بارے میں پوچھا۔ جو بیچاری ابھی منزل شباب تک بھی نہ پہنچی تھی "کیا اس نوشگفتہ کلی کو بھی پھول بننے سے پہلے ہی موت کے ظالم پنجوں میں سسکنا ہوگا! کیا اسے بھی شاندار مستقبل کی خبریں یادکو سینے میں دبائے ہوئے اس عالم سے رخصت ہونا ہوگا اور اس کے دلکش قد وقامت کو بھی ...... تنگ لحد میں قید ہونا ہوگا

کیا اسے سورج کی عالمتاب روشنی سے محروم ہوکر قبر کی تاریکی میں پناہ گزیں ہونا ہوگا۔!!!

"لیکن اگر سورج ہی دوبارہ طلوع نہ ہو" فاطمہ بولی "تو کیا سرد ہوائیں گل کی نرم و نازک پتیوں کو بکھیر کر نہ رکھ دینگی"؟!

فاطمہ کی تجویز کیا تھی۔ تو افضل خاں کا حکم تھا۔ جس کا بجا لانا فرد کو ہر حال لازمی تھا۔ تمام بیگمات رضامند ہوگئیں۔ جب اس کا ذکر روشن آرا بیگم سے کیا گیا۔ تو اس نوعمر دلہن بیگم نے بھی خوشی سے اسے قبول کر لیا۔ کہ نوعمری میں ہی ملک عدم کی طرف کوچ کر جانا اس زندگی سے بہتر ہے۔ جو شوہر کی عدم موجودگی میں تنہا رہ کر بسر کرنا ہوگی۔ مستقبل جو تاریکیوں کا مخزن ہے اس کا انتظار کرنا فضول تھا۔

اب فاطمہ بیگم نے تمام معاملے کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس نے معماروں کو حرم سرائے پاس ہی چونسٹھ مقبرے تیار کرنے کا حکم دیدیا۔ اور مرنے کے لئے حرم سرا میں ایک چھوٹا سا عمیق تالاب منتخب کیا گیا۔ یہ ڈرامہ تو عرصہ ہوا کھیلا جا چکا ہے۔ مگر وہ تالاب اور مقبرے آج بھی شکستہ حالت میں موجود ہیں۔ اور ان میں سے ایک مقبرہ اب بھی خالی ہے۔

مقبرے تیار ہوگئے۔ اور پھر اس قابل یادگار دن کی صبح نمودار ہوئی۔ جس دن افضل خاں کو رخصت ہونا تھا۔ ایک عظیم الشان دعوت دینے کے بعد افضل خاں اپنی بیگمات کو روتا ہوا چھوڑ کر اپنے دیوقامت ہاتھی پر سوار ہوکر اپنی مہم پر روانہ ہوگیا۔ اس کی روانگی گویا اپنی اس کی بیگمات کو خودکشی کا اشارہ تھا۔ رنگدار ملبوسات زیب تن کئے ہوئے اور اچھی طرح نقاب اوڑھے ہوئے وہ یکے بعد دیگرے تالاب کی طرف بڑھیں اور اس میں کود پڑیں۔

فہرست میں تریسٹھویں روشن آرا تھی۔ سرو قد اور متناسب اعضا حسینہ۔ وہ سیاہ رنگ کے بھاری بھرکم لباس میں ملبوس تھی۔ وہ اسی طرح نقاب ڈالے ہوئے فاطمہ بیگم سے بغل گیر ہوئی۔ اور پھر تالاب میں کود گئی۔ مگر جب اس کی لاش نکالی گئی۔ اور کفن پہنانے کے لئے اس کا لباس اتارا گیا۔ تو یہ دیکھ کر سب کو حیرت ہوئی کہ وہ روشن آرا نہ تھی۔ بلکہ اس کی دایہ کی نوعمر پوتی تھی۔

"اف! اس نے دھوکہ دیا" فاطمہ ہونٹ چبا کر بولی۔ اس نے کتنی ہی صلواتیں سنانے کے بعد حکم دیا۔ کہ اسے کسی دوسری جگہ دفن کر دو۔ اور چونسٹھویں مقبرے کو خالی رہنے دو۔ جبتک کہ روشن آرا بیگم خود ہی اسے پُر نہ کردے" یہ کہتے ہی وہ تالاب کی سیڑھیاں اتر کر کود گئی اور ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئی۔

وہ لڑکی جس نے کمال جوانمردی سے اپنی قربانی دی تھی۔ وہ روشن آرا کی بوڑھی دایہ کی پوتی تھی۔ بوڑھی دایہ جس نے اسے پال پوس کر اتنا بڑا کیا تھا۔ بھلا اس نوعمری میں خودکشی کی اس بے وقت حرکت کو کب گوارا کر سکتی تھی۔ اس لئے اس نے کچھ عرصہ پہلے ہی اسے کوئی دوا پلا کر بیہوش کر دیا۔ اور اس کی جگہ اپنی پوتی کو روانہ کر دیا۔

جب روشن آرا کی آنکھ کھلی۔ تو اس نے اپنے آپ کو ایک تنگ و تاریک سی کوٹھڑی میں لیٹے ہوئے پایا۔ اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ اور پاس ہی کہیں پانی کے زور زور سے چلنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

یہ شاید بعد از موت قبر کی تاریکی ہے۔ یہ سوچتے ہی وہ چیخ کر اٹھ بیٹھی۔ مگر یہ قبر کا تنگ کونہ نہ تھا۔ بلکہ جیسے ہی وہ چیخی کیمپ کا پردہ اٹھا اور اس کی بوڑھی دایہ ہاتھ میں چراغ لئے ہوئے اندر داخل ہوئی۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں گلاس تھا۔

"اماں!" روشن آرا نے امید و بیم کے لہجے میں چلا کر کہا "یہ کیا ہے میں کہاں ہوں! تم نے یہ کیا کیا؟"

"خاموش رہو میری بچی!" دایہ نے سنجیدگی و نرمی سے جواب دیا اور پھر سرد شیریں شربت کا گلاس اس کے لبوں سے لگا دیا "تم محفوظ ہو اور اپنے نامور شوہر کے کیمپ میں ہو۔ بیجاپور یہاں سے تین دن کی منزل پر ہے"

روشن آرا نے شربت کا ایک ہی گھونٹ پی کر گلاس کو ایک طرف ہٹا دیا "اپنے شوہر کے کیمپ میں! اف ماں! کیا انہیں معلوم ہے کہ میں یہاں ہوں...... وہ میرے بارے میں کیا خیال کرینگے......!!!"

"ذرا چپ بھی تو رہو" بوڑھی دایہ اس کی بے چینی اور احساس پشیمانی کو مٹانے کی غرض سے بولی "انہیں اس کا علم نہیں۔ کہ تم یہاں ہو۔ البتہ اب میں جا کر انہیں بتا دونگی۔ اگر......"

"تم فوراً مجھے ان کے پاس لے چلو" روشن آرا نے عزم صمیم کے ساتھ کہا "اس جرم بے وفائی کے عوض اگر کسی کو ان کے قہر و غضب کا نشانہ بننا پڑے۔ تو وہ میں ہی کیوں نہ ہوں۔ آپ کیوں بنیں"

اس نے یہ کہہ کر انتہائی عجلت کے ساتھ اپنا لباس درست کیا اور افضل خاں کے کیمپ کی طرف بڑھی۔ اس کے پہرہ دار اور محافظ بوڑھی دایہ کو اچھی طرح جانتے تھے۔ اس لئے کسی نے بھی مزاحمت نہ کی افضل خاں شام کے کھانے کے بعد تنہا آرام کر رہا تھا۔ اور جب کیمپ کا پردہ اُٹھا۔ تو اس نے نگاہ اوپر اٹھائی۔ تو حیرت اور مسرت سے چیخ اٹھا بوڑھی دایہ ایک طرف ہٹ گئی۔ اور افضل خاں نے روشن آرا کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ میری تمناؤں کی جان: میرے ارمانوں کی شمع: میری امیدوں کے ستارے!! وہ شاعرانہ لہجے میں بولا۔ یہ بہت ہی نیک شگون ہے۔ اب مجھے اس نجومی کی لغو گوئی اور بکواس پر بالکل یقین نہیں رہا۔ اگر تم موت سے گلو خلاصی کرا سکتی ہو۔ تو میں اس کے بیرحم پنجوں سے کیوں نچ نہیں سکتا

یہ خبر آناً فاناً تمام لشکر میں پھیل گئی۔ اور ان لوگوں کو یہ سن کر سخت حیرت ہوئی۔ جنہیں نجومی کی پیشین گوئی پر یقین کامل تھا۔ افضل خاں کی طرح ان کے عقائد میں نمایاں تبدیلی ہوگئی۔ اور انہیں اپنی فتح کا پختہ یقین ہوگیا۔ روشن آرا کی آمد نے افضل خاں کے حوصلوں کو دہ چند کر دیا اب اسے مرنے کا بھی خوف نہ تھا۔ روشن آرا نے تمام حالات بے کم و کاست اس کے سامنے بیان کر دئے۔ وہ ہنس کر بولا جان تمنا! اگر تمہاری جان خدائے بزرگ و برتر نے اس طرح بچا دی ہو۔ تو میں پوچھنے والا کون ہوں اس کی مصلحتوں کو کون سمجھ سکتا ہے۔ تم ضرور زندہ ہو۔ اور میں چاہتا ہوں کہ معبود حقیقی تمہیں ابدالا باد تک قایم رکھے۔ اس نو عمری میں مرنا ایک ناقابل برداشت ظلم ہے پیاری!" وہ اسے سینے سے لگاتے ہوئے بولا "اگر خدا نخواستہ مجھ کو شکست بھی ہو۔ تو تم خودکشی کی کوشش نہ کرنا۔

افضل خاں نے اس کے بعد اس کی محافظت پر ایک ہزار جری سپاہیوں کا ایک دستہ مقرر کر دیا۔ اور اس کے لئے خاص طور پر ایک زرہ بکتر تیار کروا دیا۔ اور اپنے ہاتھوں سے اس نے پہنا دیا۔ اب وہ بالکل ایک مسلح سوار معلوم ہوتی تھی۔ ان تیاریوں سے افضل خاں کو ایک طرح اطمینان ہوگیا۔

"تمہارے محافظ" وہ کہنے لگا۔ تمہارے لئے دشمنوں کی صفیں چیر کر راستہ بنا دینگے۔ چاہے وہ اس کوشش میں مر کیوں نہ جائیں۔ مگر پیاری تم ان کے ساتھ چلی جانا۔ وہ تمہیں بحفاظت تمام جہاں جانا چاہو گی پہنچا دینگے مجھ سے وعدہ کرو۔ کہ تم ضرور ان کے ہمراہ چلی جاؤ گی۔ تم خدا اور اسکے رسول کو حاضر ناظر جان کر قسم کھاؤ۔ کہ تم بلا وجہ اپنی جان جوکھوں میں نہ ڈالو گی۔ اور نہ ہی خودکشی کا ارتکاب کر کے میری روح کو دکھ پہنچاؤ گی۔

روشن آرا نے اشک آلودہ آنکھوں کے ساتھ قسم کھا کر وعدہ کرلیا۔ افضل خاں کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا۔

اب ہم اس ڈرامے کے تیسرے ایکٹ کی طرف آتے ہیں۔ افضل خاں زمین پر مردہ پڑا ہے۔ اس کا بھاری ہوا جسم "باگھ ناکھ" نے چیر کر رکھ دیا ہے۔ "باگھ ناکھ" دو خفیہ زہریلے پنجے تھے۔ جو سیوا جی نے اپنے دونوں ہاتھوں میں پہن رکھے تھے۔ اور جنہیں وہ اپنی قمیص کے دامن میں چھپا کر لایا تھا۔ اور اس کے سینے میں ایک لمبا خنجر بھونکا ہوا تھا۔ افضل خاں کے گرتے ہی گرد و نواح کی پہاڑیوں میں چھپے ہوئے مرہٹے نیزہ بردار اور سپاہی بیجاپور کے کیمپ پر چڑھ دوڑے۔ اور گھمسان کی لڑائی ہونے لگی۔

روشن آرا اس زہرہ گداز اور لرزہ خیز خبر کو سنتے ہی دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ بوڑھی دائی نے بڑی مشکل سے اسے چپ کیا۔ اور اسے اس کا کیا ہوا وعدہ یاد دلایا۔ اس نے رخصت ہونے سے پہلے مرحوم کے لئے دعائے خیر کی۔ اور اپنی دایہ کے ہمراہ مسلح سواروں کی محافظت میں جنگل کی طرف بڑھی۔ وہ کیمپ سے بمشکل نصف میل گئے ہونگے کہ مرہٹوں کے دو مسلح دستوں نے ان پر حملہ کر دیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے معرکہ کارزار گرم ہوگیا۔

تعداد کے لحاظ سے حملہ آور محافظ دستے سے پانچ گنا تھے۔ مگر بیجاپور کے جوانمردشجاعت و بہادری میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے اس دن اس مٹھی بھر بہادروں نے اس بے جگری سے داد شجاعت دی۔ کہ مشکل ہی سے چشم انسان نے دیکھی ہوگی۔ وہ خشک پتوں کی طرح کٹ کٹ کر گر رہے تھے۔ مگر اپنے سردار سے کئے ہوئے عہد پر قائم اس کی بیگم کی حفاظت پر تلے ہوئے تھے۔ اور ایک قدم پیچھے ہٹنا جرم سمجھتے تھے۔

اب صرف تین سو سوار رہ گئے تھے۔ لڑائی شباب پر تھی بیجاپوری دستے کی بے مثل بہادری نے آخرکار دشمنوں کی صفوں کو چیر کر رستہ بنا ہی لیا اور روشن آرا بیگم کو اشارہ کر دیا۔ کہ وہ فوراً نکل جائے۔ جب تک وہ دشمن کو روکے رکھتے ہیں۔ جب روشن آرا بخیر و خوبی ایک محفوظ مقام پر پہنچ گئی۔ تو ان جواں مردوں میں سے ایک بھی باقی نہ تھا۔

روشن آرا جنگل میں گھس گئی۔ اور نیم مردہ بڑھیا کو سہارا دیتے

دیتے ہوئے لڑکھڑاتے قدموں سے ایک ندی کے کنارے پہنچ کر وہ بیہوش ہو کر گر پڑی۔ چند ہی منٹ میں اسے ہوش آگیا اس نے اس روز جس مستقل مزاجی اور ہمت کی مثال پیش کی۔ بہت کم عورتوں سے اس کی امید ہو سکتی ہے۔ اس گھنے جنگل میں ایک نیم جان بڑھیا کی ہمنشینی۔ بھوک اور تکان سے چور۔۔۔ وہ ضبط نہ کر سکی۔ اور عالم بے بسی میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ بوڑھی دایہ   کرنے لگی۔

مگر ان دونوں کو خواب میں بھی خیال نہ تھا۔ کہ خدائے پاک نے ان کی خلاصی اور رہائی کا سامان کر دیا ہے۔ اور عنقریب ان کی مصیبتوں کا خاتمہ ہوا چاہتا ہے۔ ندی کے دوسرے کنارے جھاڑیوں کے عقب سے دو تیز نگاہوں نے ان کی بیچارگی کا تماشہ دیکھا۔ وہ دوڑتا ہوا اپنے آقا حمیدالدولہ جو مغلیہ فوج کا ایک افسر اعلیٰ تھا کے پاس پہنچا۔ جو اپنے دستے کے ہمراہ ندی سے ذرا ہٹ کر خیمہ زن تھا۔

حمید نے فوراً اپنا ایک لفٹنٹ بھیجا۔ کہ وہ ان دونوں کو کیمپ میں لے آئے۔ گو روشن آرا نے اپنے لباس کی رعایت سے اپنے آپ کو ایک سپاہی ثابت کرنا چاہا۔ مگر حمیدالدولہ کی تیز نگاہوں نے اس کی صنف کا راز معلوم کر لیا۔ پھر بھی اس نے اس کے اس عذر کو قبول کر لیا۔ جو کہ روشن آرا نے پیش کیا تھا۔ کہ وہ اپنی دایہ کے ہمراہ دوسرے گاؤں جا رہا تھا۔ کہ دونوں راستہ بھول گئے۔ اور اس جنگل میں گھر گئے۔ حمیدالدولہ نے خادموں اور خیمے کا انتظام کر دیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ رخصت کے وقت اس نے یہ بھی کر دیا۔ کہ وہ رات کے کھانے پر روشن آرا کا منتظر رہے گا۔

کھانے کے دوران میں اس نے روشن آرا کو شہزادہ کہہ کر خطاب کیا۔ اور جب بعد از طعام جام جواہر نگار ان کی بغل میں رکھ کر خادم رخصت ہو گئے۔ تو حمید نے غور بھری نگاہوں سے ان پیاری پیاری کنول کی سی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا "شہزادی!"

"شہزادی!" روشن آرا چونک کر بولی "میں شہزادی نہیں"

"مجھے اور غلط فہمی میں مبتلا کرنے کی کوشش نہ کرو" وہ اس کی طرف جھک کر بولا "کیا یہ پیاری پیاری خوبصورت آنکھیں مجھے اس بات کا یقین دلانے کے لئے کافی نہیں۔ کہ ان اشک آلود آنکھوں نے آج سے پہلے کبھی میدان جنگ کی شکل نہیں دیکھی۔ اور نہ ہی ان رسیلے اور گلاب کی پتیوں طرح نرم و نازک ہونٹوں نے کبھی میدان جنگ کی خشکی اور تشنگی کا مزہ چکھا ہے۔ یہ خوبصورت ننھے ننھے ہاتھ اس بات کے شاہد ہیں کہ ان میں تلوار اٹھانے کی طاقت نہیں۔ اور یہ دیدہ زیب اور سبک زدہ پیکر میدان جنگ کی شمشیر افگنی کی تاب لانے والا نہیں۔ چلو اس ظاہر داری کو ختم کرو۔ اور مجھے صاف صاف بتا دو۔ کہ تم کون ہو!"

اس کی تیز اور مقناطیسی نگاہوں کی تاب نہ لاتے ہوئے اور اس کے مشفقانہ سلوک اور مہربانی نے روشن آرا کو مجبور کر دیا کہ وہ اس سے تمام حال بے کم و کاست کہ دے۔

حمیدالدولہ روشن آرا کو اس کے باپ کے گھر بنگال میں لے آیا اور وہاں کچھ عرصہ بعد دونوں کی شادی ہو گئی۔

(رحمت علی صابر)

حضرت ادیب مالیگانوی سے خطاب

(از جناب نصرت صاحب بھوپالی)

تشبیہ آپ کی "مشہور" میں نظر آئی
تو یاد احمد آباد[1] عود کر آئی

کبھی وہ دفتر پیغام[2] آپ کا آنا
وہ گفتگوئے محبت کے پھول برسانا

وہ بیٹھنا مرا کالج میں آپ کے نزدیک
غزل سنانے کی کرنا وہ آپ سے تحریک

"گروہی" کی نظم سنانا وہ آپ کا ہنس کر
وفور خندہ سے وہ سب کا ہونا زیر و زبر

نوازشات وہ مجھ پر حکیم محسن[3] کی
وہ خاص ربط محبت وہ اک خلوص دلی

شباب و حسن کی وہ بارشیں خدا کی پناہ
کہ غرق موج حسن تھی ہر ایک نگاہ

وہ ساریوں کی لطافت وہ موٹروں کا ہجوم
کہ جس کی دید سے ہو شادماں دل مغموم

وہ یاد ہے مجھے منظر "نگینہ واڑی[4] کا"
کہ موج زن تھا ہر اک سمت جس کے کانکریا[5]

وہ سب کے ساتھ وہ تفریح یادگاروں کی
وہ سیر چاندنی راتوں کے آبشاروں کی

مشاعروں کی وہ شرکت وہ دوستوں کا ہجوم
وطن کی یاد سے بھی میرا دل نہ تھا مغموم

بنایا جانا وہ صدر مشاعرہ مجھ کو
وہ خواہ میری خوشی اس میں ہو کہ نہ ہو

مگر وہ حضرت انجم[6] کا بارہا اصرار
وہ میرا خاطر احباب سے دلی اقرار

ادیب جب مجھے وہ عہد یاد آتا ہے
دل حزیں کو مرے کوئی گدگداتا ہے

کہاں گیا وہ زمانہ کہ جس کی یاد حسیں
ہنوز دل میں ہے اک خاص کیفیت کی امیں

خیال پر نہیں پابندئ بعید و قریب
یہ پوچھتا ہوں میں بعد سلام شوق ادیب

فضائے نور میں یوں جذب ہو گئے ہیں آپ
کہ کوئی ربط نہیں جیسے بزم ہستی سے

مگر مجھے تو ابھی تک ہے جستجوئے سکوں
بتائیے دل مضطر کا کیا علاج کروں

[1] احمد آباد گجرات [2] روزنامہ پیغام احمد آباد [3] حکیم محمود حسن صاحب محسن ٹونکی [4] ایک نہایت خوشنما باغ [5] ایک مشہور تالاب [6] حضرت انجم بدایونی [7] شعر ادیب کی تعلیق

نیا سال

"ڈرامچہ"

از جناب سردار سیاحی شاد خوشتر

(اس ڈرامہ کا کچھ پلاٹ بابو بنکم چندر چٹرجی ناولسٹ کے ایک مضمون سے ترجمہ کیا گیا ہے)

کردار

رمیش .... ایک خوبصورت نوجوان

کیلاش .. .. تیس سال عمر کا ایک مرکارہ

پاش .... رمیش کا ایک دوست

ستارہ . .... رمیش کی بیوی

پہلا سین

نظارہ

وقت صبح نو بجے

جگہ۔ رمیش کا پرائیوٹ کمرہ۔

(رمیش ایک خوبصورت کمرے میں آرام کرسی پر بیٹھا ہے اور رسالہ مشہور کا مطالعہ کر رہا ہے۔ کبھی کبھی لبوں پر ذرا سی مسکراہٹ بھی نمایاں ہوتی ہے اتنے میں دروازے پر دستک ہوتی ہے۔)

آواز۔ کھٹ ..... کھٹ ..... کھٹ

رمیش۔ کون ہے باہر؟

آواز۔ میں ہوں کیلاش ..... آپ کے نام کی ایک چھٹی ہے۔

رمیش دروازہ کھول کر لفافہ لے لیتا ہے اور فوراً ہی چاک کرتا ہے اور آہستہ آہستہ پڑھتا ہے ......

لاہور ۳۱ دسمبر ۱۹۴۱ء

ڈیر رمیش تسلیم!

نوازش نامہ ملا۔ شکریہ۔ آپ نے لکھا ہے کہ "تم خط کا جواب دینے میں بہت سستی کرتے ہو۔ مثل مشہور ہے۔ الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ بھئی ذرا غور کرو کہ اگر میں ایک دن کی تاخیر کرتا ہوں تو آپ پورے سال بھر کے بعد جواب دیتے ہیں۔ میں یہ خط ۱۹۴۱ء کو لکھ رہا ہوں اور آپ اس کا جواب ۱۹۴۲ء میں دیں گے اور جب کہوں گا کہ "آپ نے میرے خط کا جواب پورے ایک سال کے بعد دیا ہے تو قسمیں کھاؤ گے اور کہو گے کہ میں نے تو دوسرے دن ہی خط لکھ دیا تھا" خیر آپ کی مرضی۔ امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔

زیادہ آداب

فقط

بی۔ اے سلیم

رمیش سلیم کا خط پڑھ کر ہنستا ہے۔ اور اتنے میں پاش داخل ہوتا ہے

پاش۔ گڈ مارننگ مسٹر رمیش {"Good morning! mr. Ramish"}

رمیش۔ گڈ مارننگ۔ ہو دو یو ڈو مسٹر پاش۔ {Good morning. How do yo do?}

پاش۔ او۔ کے پلیز۔ (O. K. Please.)

(بڑے پرتپاک طریق سے مصافحہ کرتے ہیں)

رمیش۔ آئی وش یو اے ہیپی نیو ایر۔ {I wish you a happy new year}

پاش۔ دی سیم ٹو یو! (The same to you.)

دونوں کا چند اور باتیں کرنا اور پاش کا چلے جانا۔

اور ستارہ کا پردے کے پیچھے سے نکلنا۔

ستارہ۔ پیارے یہ کون تھا؟

رمیش۔ یہ میرا ایک عزیز دوست پاش تھا

ستارہ۔ وہ تم سے ہاتھا پائی کیوں کر رہا تھا۔

رمیش۔ کب۔؟

ستارہ۔ میں نے تو خود آنکھوں سے دیکھا ہے کہ اس نے زور سے تمہارے ہاتھ کو پکڑ کر جھٹکا دیا۔ اور پھر تم نے بھی اسے زور زور سے

دبایا۔ کیا اسے ہاتھا پائی نہیں کہتے۔

رمیش: تو رش! تم اسے ہاتھا پائی کہتی ہو۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ محبت کی نشانی ہے۔ اسے اردو میں مصافحہ اور انگریزی میں شیک ہینڈ shake hand کہتے ہیں۔

ستارہ۔ محبت کی نشانی ہے۔ تب تو خدا کا شکر ہے کہ تم مجھ سے محبت نہیں کرتے ورنہ ہر روز ... میرے ہاتھ ہی مروڑتے رہتے ....
خیر کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟

رمیش۔ معمولی سی۔ صرف اس کا ناخن لگ گیا ہے۔ مگر کوئی ہرج نہیں۔

ستارہ۔ (ہاتھ دیکھ کر) ماس چھل گیا ہے۔ خون بہہ رہا ہے۔ کمبخت موا صبح سویرے ہی آدھمکا ہے ..... لیکن اس سے تمہیں بھی نصیحت آجائے گی۔ آئندہ یہ "ہاڈو ماڈو" کھیل ہرگز نہ کھیلنا۔

رمیش۔ سچ ہے بیوقوف ہی ہوتے ہیں۔ آخر گاؤں والی ہی ہو نا اسی لئے تو تم گنوار اور دیہاتی کہلاتی ہو (جیب سے سگرٹ نکال کر سلگاتا ہے۔)

ستارہ۔ تو کیا یہ کھیل نہیں تھا؟

رمیش۔ (سگرٹ کا کش لگا کر) نہیں۔ اس نے "ہاڈو ماڈو" نہیں کہا تھا۔

ستارہ۔ "تو پھر؟"

رمیش۔ (منہ سے دھواں نکال کر) ہو ڈو یو ڈو"

ستارہ۔ خوب تو اس کا کیا مطلب؟

رمیش۔ آپ کا مزاج کیسا ہے؟

ستارہ۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔

رمیش۔ کیسے؟

ستارہ۔ فرض کرو کہ اس نے ... آپ سے پوچھا کہ آپ کا مزاج کیسا ہے تو تم جواب دیتے کہ اچھا ہے۔ لیکن تم نے پھر وہی "ہاڈو ہاڈو" کہہ دیا۔ تو کیا یہ کھیل نہیں ٹھہرا؟

رمیش۔ تم اگر پڑھی لکھی ہوتیں تو تمہیں معلوم ہوتا کہ یہ تہذیب کی نشانی ہے۔ لیکن تم تو بالکل بودم بے وال ہو۔

ستارہ۔ اچھا اگر بات کو دہرانا ہی تہذیب کی نشانی ہے تو اگر ہمارا ننھا کام میں غفلت کرتا ہے اور آپ اسے نالائق کہتے ہیں اور وہ جواب میں تمہیں نالائق کہہ دے تو کیا یہ طریقہ تہذیب ہوگا

رمیش۔ اری بیوقوف یہ بات نہیں ہے۔ صرف انگریزی میں "ہو ڈو یو ڈو" کے جواب میں "ہو ڈو یو ڈو" ہی کہنا چاہئے۔ یعنی آپ کا مزاج کیسا ہے کے جواب میں ہی آپ کا مزاج کیسا ہے کہنا چاہئے۔ انگریزی طریقہ ہے۔
(منہ سے سگرٹ کا نیلگوں دھواں نکالتا ہے اور ٹہلتا ہے۔)

ستارہ۔ (ہاتھ باندھ کر) ایک بات۔

رمیش۔ ہاں ہاں کہو کیا بات ہے؟

ستارہ۔ تم کئے دن بیماری میں مبتلا رہتے ہو اور میں دن میں کئی مرتبہ آپ کا حال پوچھتی ہوں کہ طبیعت کیسی ہے۔ تو پھر اب جب حال پوچھا کروں تو "ہو ڈو یو ڈو" کہہ کر ٹال نہ دیا کرنا۔ میرے لئے تم مہذب نہ بنو۔

رمیش۔ نہیں۔ نہیں۔ یہ نہیں ہوگا لیکن مائی ڈیر تم کو یہ تمام سمجھ لینی چاہئیں۔

ستارہ۔ یہ بہت مشکل ہے پیارے ..... لیکن یہ تو بتاؤ کہ پاش کے اتنے جلد آنے اور واپس چلے جانے کا مطلب صرف کھیل ہی نہ تھا۔ تو کیوں آیا تھا وہ؟

رمیش۔ آج نئے سال کا پہلا دن ہے اس لئے وہ مبارکباد دینے آیا تھا۔

ستارہ جھوٹ بالکل جھوٹ۔ نیا سال تو پہلی چیت سے شروع ہوتا ہے لیکن آج پوہ کی اٹھارہویں ہے۔ یہ نیا سال کیسے ہو سکتا ہے؟

رمیش۔ آج یکم جنوری ہے اس لئے آج ہی نیا سال شروع ہوتا ہے

ستارہ۔ ہاں کیوں نہ ہو۔ ہمارے باپ دادا کا سال شروع ہوتا تھا چیت سے تمہارا شروع ہوتا ہے پہلی جنوری سے۔ تمہارے لڑکے کا شروع ہوگا پہلی بساکھ سے خوب۔ خوب۔

رمیش۔ دیوانی ہے دیوانی۔ سمجھتی نہیں کہ راج انگریزوں کا ہے اس لیے ہمیں انہی کے حساب کے مطابق سال شروع کرنا چاہئے۔

بیوی: تو کیا ہائیکورٹ کا فیصلہ ہے۔ سال ضرور یکم جنوری سے شروع کرو؟

رمیش۔ ہاں دفتروں میں یہی قاعدہ ہے۔

ستارہ۔ لیکن گھروں میں تو نہیں ہے تم دفتروں میں جا کر سمجھ لینا کہ آج نیا سال ہے گھروں میں تو سرکار کا حکم نہیں ہے۔

رمیش۔ (اکڑ کر) ضرور ہے۔

ستارہ۔ لیکن میں نیا سال چیت سے گنتی ہوں۔ مجھے تو کوئی نہیں پکڑتا .... خیر مجھے اس سے کیا غرض۔ لیکن یہ شراب کا ہے کو منگوائی

ہے ؟ -

رمیش ۔ پینے کے لئے خوشی کا دن جو ٹھہرا۔ دوستوں کو بلوا کر پارٹی کریں گے۔ اسی لئے تو آج دفتر دن میں چھٹی ہے۔

ستارہ ۔ تو کیا شراب کے بغیر خوشی نہیں ہو سکتی

رمیش ۔ نہیں۔ ہرگز نہیں۔

ستارہ ۔ اسی لئے تو میں اور سوال کرنے سے ڈرتی ہوں۔

رمیش ۔ کہو، اور کیا پوچھتی ہو؟

ستارہ ۔ میں پوچھتی ہوں کہ یہ سب چیزیں۔ کیک۔ سنگترے۔ سیب گاجر انار۔ پستہ۔ گوشت۔ مچھلی۔ انڈے۔ بادام امرود۔ حلوا پوری۔ مربے۔ قلاقند۔ مٹھائی وغیرہ صرف تین دوست مل کر کھاؤ گے؟

رمیش ۔ نہیں! یہ صاحب لوگوں کو ڈالی بھیجیں گے۔

ستارہ ۔ لیکن لوگ کیا سمجھیں گے۔ رام۔ رام۔ یہ ہرگز نہ کرنا۔۔۔۔ بدنامی ہوگی۔

رمیش ۔ کیا کہیں گے لوگ؟

ستارہ ۔ لوگ کہیں گے کہ یہ اپنے باپ کے شرادھ پر صاحب لوگوں کو انڈے مچھلی اور شراب کھلاتے ہیں۔

رمیش ۔ (ڈانٹ کر) "ڈونٹ ٹاک نانسینس۔"

{ستارہ کا ڈر کر بھاگنا۔ اور رمیش کا حیران ہونا۔ اور وکیل سے جا کر پوچھنا کہ "کیا ہندو خاوند بھی اپنی بیوی کو طلاق دے سکتا ہے۔"}

ہکلی بیگم

ہمارے پڑوس میں مرزا قدرت اللہ بیگ کی اہلیہ محترمہ ہکلی بیگم بڑی نیک مزاج اور ہنس مکھ خاتون تھیں۔ ان کے ہکلے پن کا شہرہ تمام محلے میں تھا۔ محلہ کی اکثر سمجھ دار لڑکیاں جان بوجھ کر ان کو چھیڑتی رہتی تھیں تاکہ یہ کوئی بات کریں اور ہکلائیں۔

خدا کی شان انھیں ایک مرتبہ شدید سیلان الرحم کی شکایت ہو گئی اور اس مرض کی وجہ سے ان کے چہرہ کی دلفریبی۔ ہونٹوں کا تبسم اور اعضا کی چستی سب جاتی رہی ہر وقت مغموم اور فکرمند سی رہنے لگیں۔ یہ انقلاب مزاج دیکھ کر وہ ہمجولیاں جو خوش طبعی کے لئے آیا کرتی تھیں۔ بہت پریشان ہوئیں اور محلہ کی بوڑھی عورت حجن نامی کو یہ سارا واقعہ سنایا اور کہا تم اپنی ترکیب سے معلوم کرو کہ یہ ماجرا کیا ہے حجن نے دوسرے روز آکر اتار چڑھاؤ کی باتیں کیں اصل حقیقت معلوم ہو گئی جب مرض معلوم ہو گیا تو مشہور دواخانہ دہلی سے "دوائی کیلہ" منگا کر اسی حجن نے چند روز کھلائی۔ خدا نے اپنا فضل کیا اور مرض بالکل دور ہو گیا۔ اب پھر وہی پہلی سی شوخی اور مزاج میں شگفتگی پیدا ہو گئی۔ ایک روز بہت سی ہمجولیاں جمع تھیں اور سب مل کر پوچھ رہی تھیں بوا سچ بتانا! یہ تم نے کیا دوا کھائی جس سے طبیعت بحال ہو گئی ہکلی بیگم نے سادگی کے ساتھ جواب دیا

دوائی کے کے کے لا

اس پر ایک فرمائشی قہقہہ پڑا اور ہکلی بیگم کچھ جھینپ گئیں لیکن ان ہنسنے والی عورتوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ سیلان الرحم کی شکایت ۹۰ فی صدی عورتوں کو لاحق ہے اس مرض کی وجہ سے تندرستی، جوانی، اولاد تینوں چیزوں سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے عورتوں کے پوشیدہ امراض بالخصوص سیلان الرحم کے لئے "دوائی کیلہ" جو مشہور دواخانہ دہلی کی پیٹنٹ اور کامیاب دوا ہے اکسیر اور تریاق ہے قیمت میں خوراک عہ محصول ڈاک ۸/

سلہ۔ آج ہی ایک کارڈ لکھ کر طلب فرمایئے اور اپنی مستورات کو استعمال کرایئے ہزاروں بانجھ عورتوں کو بھی اس دوا نے بامراد کیا ہے۔

قطعات

از شاعرِ فطرت شناس مولانا عامر عثمانی صاحب

مولانا عامر عثمانی صاحب ان نوجوانوں میں سے ایک ہیں جن پر قوم کے اچھے مستقبل کا انحصار ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کی طبیعت عجیب گوناگوں دلچسپیوں کا مجموعہ ہے یعنی وہ ایک طرف فقہ حدیث منطق فلسفہ کے خارزاروں سے الجھے ہوئے ہیں تو دوسری طرف شعر و ادب کے مرغزاروں سے دل بہلاتے ہیں۔ ابھی ان کا ایک افسانہ "جذبِ ناتمام" مشہور کے دو نمبروں میں شائع ہو کر خراجِ تحسین وصول کر چکا ہے۔ اب ذیل کے چند قطعات جو مزدور کی بےکسانہ حالت کا مرقع ہیں آپ ہی کی طبعِ موزوں کا نتیجہ ہیں۔ امید کہ قارئین دلچسپی کے ساتھ مطالعہ فرمائیں گے۔ (ایڈیٹر)

۱

قمار خانۂ حیات

نوجواں مزدور نے پائی نہ جب راہِ معاش
کر دیا اس طرح خود ہی جامِ ہستی پاش پاش
جیسے کوئی سوختہ قسمت جواری پھاڑ دے
زندگی کے کھیل میں ہاری ہوئی بازی کا تاش

۲

دارِ حیات

دھوپ سے جھلسے ہوئے ہونٹوں پہ آہ دلخراش
بھوک سے بہکی ہوئی نظروں میں پیہم ارتعاش
چار جانب فاقہ کش بدحال کنبہ کا ہجوم!
ہائے وہ عالم کہ جب مزدور ہو صاحبِ فراش

۳

الزامِ حیات

آرزو کی بےکسی پر خندہ زن فکرِ معاش
آہ کی ٹھوکر سے ہر جامِ تمنا پاش پاش
زہر سے لبریز جامِ زندگی مزدور کا
اور پھر بھی سیٹھ کی نظروں میں دزد و بدقماش

۴

جرمِ حیات

آہ کے کاندھوں پہ رکھی ہے تمناؤں کی لاش
پی رہا ہے زندگانی کا لہو فکرِ معاش
اور کیا کہیے کہ بس یہ ہی خطا مزدور کی
کر رہا ہے قلزمِ دولت میں شبنم کی تلاش

مذاحیہ

ارے جی

(از جناب کوثر صاحب چاندپوری)

جانتے ہیں "ارے جی" اردو کا بہت پرانا لفظ ہے ممکن ہے اس کا پہلا جزو گستاخانہ ہو مگر جی کے ساتھ مل کر اس کی وہی کیفیت ہو گئی ہے جو رملوے کی گڑ میں مل کر ہو جانی چاہئے۔ بحیثیت مجموعی یہ نہایت شیریں، بہت میٹھا اور حد درجہ ناز آفریں لفظ ہے، مگر ہے اسی قسم کے الفاظ میں جن کی تذکیر و تانیث نہ تو دہلی کے اصولوں پر متعین ہو سکتی ہے نہ لکھنوی قواعد سے؛ بات یہ ہے کہ ویسے تو ارے جی بالکل یگانی ساخت اور ترتیب کا لفظ ہے اور اس لحاظ سے خود بخود اس سے نہ صرف نسوانیت بلکہ ایک خاص قسم کے حسن و جمال کا جلوہ بھی نظر آتا ہے لیکن اس کا استعمال مرد اور عورت دونوں کے لئے ہو سکتا ہے۔ چنانچہ دیکھ لیجے کسی خالص ہندوستانی تہذیب کے گھر میں جا کر جہاں بیوی اپنے شوہر کو صرف "ارے جی" کہہ کر مخاطب کرتی ہے۔ اور شوہر بھی بیوی کو "ارے جی" کہہ کر بلاتا ہے۔

ارے جی ذرا سنو تو کہاں جا رہے ہو؟

میں تو پکانے کو پوچھ رہی تھی، شام کو کیا کھاؤ گے؟

ارے جی بتاتے تو جاؤ کبھی آ کر جھنجلاؤ میرے اوپر!

ارے جی، چلتے چلتے رک جائینگے اور دو منٹ مگر کھڑے ہو کر سوچینگے کہ شام کو کیا کھانا چاہئے بدقسمتی سے یہ سوال اس وقت ہوتا ہے جب بھوک بالکل نہیں ہوتی اور پیٹ بھرا آدمی کیا بتا سکتا ہے۔ وہ شام کو کیا کھائے گا۔ یہ تو بھوکے انسان ہی کا کام ہے کہ چھ گھنٹے پہلے سوچنے لگتا ہے۔ اسے کیا کھانا چاہئے اس لئے ارے جی کو اس مسئلہ پر بالکل اتنا ہی غور کرنا پڑیگا جتنا ایسی قسم کے لیڈروں کو ہندو مسلم اتحاد کا کوئی فارمولا تیار کرتے وقت کرنا پڑا کرتا ہے۔ پھر بھی یہ مسئلہ یوں ہی رہ جائیگا اور وہ عینک کو دستی سے صاف کرتے ہوئے فرمائینگے،

آپ ہی کچھ پکا لیجے میری سمجھ میں تو نہیں آتا کیا کھانا چاہئے!

سمجھ میں نہیں آتا یہ بھی خوب رہی کھائینگے آپ پھر سمجھ میں نہ آنے کی کیا وجہ؟

بہرحال گھر کے ان نازک ترین مسائل میں جن کا تصفیہ سیکڑوں لڑائیوں، بھوک ہڑتالوں، سمجھوتوں اور ملاقاتوں کے بعد بھی صحیح طور پر ... نہیں ہو سکتا۔ ایک یہ کیا پکنے والا مسئلہ بھی ہے جو روزانہ دو بار میاں بیوی اور اگر موجود ہوں تو بال بچوں نیز ماں باپ کے زیر بحث آتا ہے اور ہمیشہ اختلاف رائے کی وجہ سے بغیر کسی فیصلہ کے گھر کے کسی ایک لیڈر کے کہنے سے عارضی صلح کے طور پر کچھ نہ کچھ پک جاتا ہے اور سب کھا لیتے ہیں، ارے جی کبھی نہیں بتا سکتے کہ وہ شام کو کیا کھائینگے پھر بھی کھاتے وقت سب کچھ کھا لیتے ہیں، جب کوئی ایسے "ارے جی" جنکی نیت پر کبھی بدگمان بیوی کو کبھی شبہ نہ ہوا ہو اور جنہوں نے عمر میں ایک مرتبہ بھی سینما نہ دیکھا ہو رات کو ۹ بجے ڈرتے ڈرتے گھر میں قدم رکھتے ہیں تو صحن میں کھڑے ہو کر چاروں طرف دیکھنے کے بعد، فرماتے ہیں

ارے جی کہاں ہو؟

کیا سو گئیں؟

اُدھر سے سوال ہوتا ہے، کہاں جا کر بیٹھ گئے تھے،

ارے جی فرماتے ہیں ——— ارے جی کیا بتائیں دو تین دوست مل گئے تھے اٹھنے ہی نہیں دیا انہوں نے، میں تو کئی دفعہ پیچھا چھڑا کر بھاگا مگر ہر مرتبہ انہوں نے زبردستی بٹھا بٹھا لیا۔

دیکھئے اس "ارے جی" کا کرشمہ میاں، بیوی کے درمیان کس طرح مخاطبت کا کام دے رہا ہے۔ بات یہ ہے کہ بعض الفاظ ہی خدا نے اس قسم کے پیدا کر دئے ہیں جو مرد اور عورت دونوں پر صادق آ سکتے ہیں۔ مثلاً محبوب،

صرف محبوب کے لفظ سے کون سمجھ سکتا ہے مخاطب مرد ہے یا عورت اگرچہ بعض مولوی قسم کے استادوں نے عورت کے لئے محبوبہ کا لفظ ایجاد کر دیا ہے۔ مگر یہ تو دیسی ہی بے تکی سی بات ہے جیسے ہم ارے جی

کی تانیث کا کام "اری جی" سے لینے لگیں۔

شوہر کے مفہوم میں ارے جی کا استعمال اتنا زیادہ ہوگیا ہے کہ گھر میں آنے جانے والے منشی کریم الدین صاحب کی بجگہ، انہیں صرف ارے جی سمجھنے لگتے ہیں ہمارے محلہ میں ایک صاحب رہتے ہیں جو عام طور پر منشی جی مشہور ہیں مگر گھر میں ارے جی کہلاتے تھے ایک دن ایک عورت آئی جو اکثر آتی رہتی تھی اور آتے ہی گھر والی سے پوچھنے لگی ——

کیوں جی کیا تمہارے ارے جی نہیں ہیں گھر میں؟ خط پڑھوائی

کون ارے جی انہوں نے غیر محسوس تبسم کے ساتھ پوچھا

وہی لڑکوں کے ابا!

اسی طرح ایک بزرگ سسرال گئے ملازمہ جو سالہا سال سے انہیں ارے جی کے نام سے جانتی تھی دیکھ کر گھر میں آگئی اور سادگی کے ساتھ اعلان کر دیا۔ ارے جی آگئے! تو لوگ اس نام سے انہیں نہ جانتے تھے متحیر ہوئے کون ارے جی؟ جب معلوم ہوا وہ صرف ایک شوہر یا لڑکوں کے اباجی تو یہ لفظ وہاں بھی داخل لغت کر لیا گیا۔ گویا ارے جی ہر عمر اور ہر مذہب کے شوہر کا مفہوم ادا کرنے کی غرض سے نہایت مکمل اور جامع لفظ ہے نہ پھر اس کی مصنف اردو کی نصف لغت یعنی عورت ہے،

ہمارے اہل ملک نے بیوی کے سیکڑوں نام تجویز کر رکھے ہیں کوئی اسے بیگم کہتا ہے، کوئی بیوی، کسی نے گھر والی نام رکھ لیا ہے۔ کسی نے گھر کے لوگ، کوئی بچوں کی ماں کہتا ہے، کوئی وہ یا اُن وغیرہ سے موسوم کرتا ہے مگر شوہر کے لئے ارے جی سے بہتر کوئی لفظ اردو زبان نے ابھی پیدا نہیں کیا اگرچہ وہ اور ان کی ضمیر متا شوہروں پر بھی بقول شخصے لاگو ہیں تاہم ارے جی تو بالکل مطابق حال ہے، اس لئے ہم ہندوستان بھر کے شوہروں سے عام اس سے کہ وہ کتنے ہی بچوں کے باپ ہو یا کتنی ہی بیویوں کے شوہر ہوں دردمندانہ اپیل کرینگے کہ وہ اس لفظ سے اپنی بیویوں کو مخاطب کرنا چھوڑ دیں اور مفہوم کی برجستگی کے لحاظ سے صرف اپنے ہی لئے اس کو مخصوص کر لیں۔

گھر میں ارے جی کی وہی حیثیت ہوتی ہے جو کسی انگریز ماتحت کے مقابلہ میں ہندوستانی افسر کی ہوا کرتی ہے۔ ضابطہ میں تو اسے سب اختیار ہوتے ہیں مگر عملاً وہ غریب اپنے بچوں کی گوشمالی بھی نہیں کر سکتا اگر شامت اعمال سے کبھی یہ نوبت آجاتی ہے تو بچہ چاہے کتنا ہی بڑا ہو روتا ہوا ماں کے پاس چلا جاتا ہے اور وہ وہیں سے چلا کر کہتی ہیں۔

ارے جی، تم نے مار دیا کیا ان کو؟

اب ارے جی ہیں کہ بیٹھے ہوئے اپنے پر تو دانت پیس رہے ہیں مگر جواب دینے کی ہمت نہیں ہوتی اور ہو بھی کیونکر ماں کے چہیتے بچہ کا مار دینا کوئی معمولی حادثہ ہے اور سچ پوچھئے تو بچے سب ہی شوہر کے مقابلہ میں چہیتے ہوتے ہیں آخر وہ خود ہی کہینگی۔

ارے جی دیکھنا مجھے تمہاری یہی بات اچھی نہیں لگتی ہر وقت مارنا ہر وقت پیٹنا بچے نہ ہوئے کوئی گھاس پھوس ہو گئے جب دیکھو بیٹھے گھور رہے ہیں ذرا سی خطا پر بچوں کو مار مار کر بھس بنا دیا جاتا ہے واہ صاحب واہ!

صرف ایک طمانچہ مارنے اور بھس بنا دینے میں قیمے اور پسندے کا سا فرق ہے اس لئے اب ارے جی کو

بوقت ضرورت چو نماند گریز
دست بگیر د سر شمشیر تیز۔

کے اصول پر اپنی صفائی میں کچھ نہ کچھ کہنا ہی پڑیگا۔

اگر میں نے ذرا انگلی لگا دی تو ایسی کیا آفت آگئی تم نے تو سارا گھر سر پر اٹھا لیا اتنی سی بات پر!

ارے جی کیا کہا گھر سر پر اٹھا لیا، یہی تو نہیں کرتی اگر یہ کیا کرتی تو آج آپ اتنی بات منہ سے نہ نکالتے۔ مجھ جیسی صابر اور شاکر عورت کوئی ہو تو سہے۔ دن رات میری چھاتی پر مونگ دلی جاتی ہے مجھے بات بات پر ٹوکا جاتا ہے، طعنے دیئے جاتے ہیں مگر مجھ اللہ کی بندی کے منہ سے کبھی اف تو نکل جائے۔ ایسا کلیجہ کسی کا ہو تو پہلے، اور صاحب انہیں تو میں نے تو جینے پیٹ میں رکھا ہے یہ نہیں ہو سکتا کہ میرے ہوتے کوئی انہیں کڑی نگاہ سے دیکھ سکے،

یہی معاملہ ملازمہ کے ساتھ ہوتا ہے تنخواہ تو اسے دی جاتی ہے ارے جی کی جیب سے مگر اختیار ایک رتی بھر بھی نہیں۔ وہ بیوی کے اشاروں پر چلتی ہے مگر ارے جی کے منہ میں نوالہ اٹک جاتا ہے اور ہچکیوں پر ہچکیاں آنے لگتی ہیں اس وقت وہ پانی بھی مانگتے ہیں تو اس کے کان پر جوں بھی نہیں رینگتی اگر ملازمہ چائے کے برتن اچھے دھو کر نہ لائے اور صفائی کی اہمیت کے خیال سے ارے جی کوئی پیالی یا طشتری یا چمچہ کشتی میں

زبردستی دے ماریں اور سخت لہجہ میں ملازمہ سے کہدیں مردار تو اندھی ہے کیا تجھے سوجھتا نہیں یہ پلیٹ پر تو نے سیاہی سے اپنا پورا انگوٹھا لگا دیا ہے یہ حلوہ اب میرے کس کام کا رہا؟

تو وہ باورچی خانہ میں بیٹھی بیٹھی پکار کر کہینگی "ارے جی" کیا ہو گیا؟

ہوتا کیا یہ تمہاری ماما کو رو رہا ہوں، کوئی کام جی لگا کر نہیں کرتی برتن دھوتے ہیں یہ معلوم ہوتا ہے ویسے ہی لاکر رکھدیئے ہیں۔

پھر اتنی سی بات پر اتنا غصہ، تم مجھ سے کہہ لیا کرو جو تمہیں کہنا ہو اکرے بوا غریب کی شامت تو چاکر وہ تو بات کرنا بھی نہیں جانتی دیکھوں کہاں لگا ہے انگوٹھا بوا کا ——— تمہیں پہچاننا بھی نہیں آتا تمہاری جان کی قسم یہ تو میرا ہے!

تمہارا ہے تو خیر!

ارے جی کے لفظ میں نیازمندی اور فرمانبرداری کا کوئی ایسا معنوی مفہوم پوشیدہ ہے کہ یہ لقب پاتے ہی آدمی سخت ترین نیازمند اور اطاعت شعار بن جاتا ہے۔ آخر جب نام اور تخلص کا اثر پڑ سکتا ہے تو اس قسم کے القاب و آداب جو گھروں میں بعض خوش قسمتوں کو مل جایا کرتے ہیں اس سے کب خالی ہو سکتے ہیں۔

(بقیہ صفحہ ۴۴ یہ ہے)

دو سو سال پہلے حضرت جہانگیر کی مجلسیں گرم ہوتی تھیں اور زیب النساء کا کلام خاص توجہ سے سنا جاتا تھا" مگر فراز ادیب صاحب کی یہ "تحقیق" لائق تعریف ہے امید ہے آئندہ سال ان کو "اردو کانفرنس" کا صدر ضرور بنایا جائے گا۔ تعجب ہے خواجہ محمد شفیع صاحب نے اب تک ان "فاضل محترم" کو اردو مجلس کے لئے دعوت نہیں دی۔

اشارات

(از جناب قمر تسکین صاحب مدیر آرٹسٹ ڈویک بمبئی)

یہ اشارات اپنے اندر ایک طویل داستانیں اور بے پناہ جذبات رکھتے ہیں۔ جناب قمر تسکین صاحب نے جامعیت کے ساتھ اختصار کی یہ ایک اچھی مثال پیش کی ہے۔ امید ہے کہ وہ منزل پر پہنچکر دوسروں کے لئے نشان راہ ثابت ہونگے

(ایڈیٹر)

۱

ایک بھکارن کی عزت لی گیا آس سے بار بار پوچھا جاتا ہے تیری گود میں کس کا لڑکا ہے؟ کیا وہ کہدے کہ اِس حرامی کا باپ تمہارا قومی لیڈر یا مندر کا پنڈت ہے۔

۲

شانتی کو اپنے حسن پر بڑا ناز تھا کہتی تھی کسی راجہ سے بیاہ کروں گی شادی کے بہت سے پیغام آئے۔ اس میں رادھے کا پیغام بھی تھا یہ گاؤں کا سب سے بدصورت اور غریب لڑکا تھا۔ رادھے کے پیغام پر سب ہنس پڑے رادھے نے بھی سُنا اور اپنی تحقیر پر کچھ نہ کہا۔ ابھی صبح نہ ہونے پائی تھی کہ شانتی کے چیچک نکل آئی۔

۳

اُس نے اپنی بہن کا خط پڑھا بھیا میں بہت بیمار ہوں ہوسکے تو پانچ روپے بھیج دو۔ اُس نے اپنی پھٹی ہوئی قمیص کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور بیڑی کا بجھا ہوا ٹکڑا نکال لیا۔

۴

انہوں نے ملنے کا وعدہ کیا تھا وہ آج خوب نہایا دھویا تیل ڈالا۔ بالوں میں کنگھی کی اور اپنا بہترین لباس پہنکر سجنی کی نگریا جانا ہے" گنگناتا ہوا جانے لگا دفعتاً آواز آئی "بیٹا یہ آدھ سیر باجرا پسوا لا گھر میں شام کے کھانے کو کچھ نہیں ہے" یہ اُسکی بوڑھی ماں کی آواز تھی۔

۵

مندر میں دیوی کی مورتی کے چرنوں میں طرح طرح کے پھولوں پھلوں اور مٹھائیوں کے تھال دھرے تھے۔ باہر مندر کے دروازے پر ایک بھکارن اپنے شیر خوار بچے کو سینہ سے لگائے بھوک سے نڈھال اور بے ہوش پڑی تھی۔ تفو بر تو اے چرخ گردوں تفو

۶

رات شہر کے مشہور سوداگر کی لڑکی شانتا کا بیاہ تھا صبح سنا گیا ان کے ایک نوکر نے خودکشی کرلی کس کے کارن؟

۷

اس نے سوچا تھا کہ بی۔ اے۔ کے بعد وہ ایک ادیب۔ عالم۔ مفکر اور مصنف بنیگا مگر آج وہ اپنے ہی کالج میں چپراسی ہے۔

۸

سماج نے انہیں نہ ملنے دیا وہ آنسو بہا بہا کر چپ ہوگئے لڑکی کے گھر سے جس روز بارات چلی اسی روز لڑکے کے یہاں سے ارتھی اٹھی مگر موڑ پر "رام رام ست ہے" کی آواز شادی کی شہنائی میں مدغم ہوگئی ساتھ ہی ارتھی اور بارات پر نچھاور کئے ہوئے پھول بھی۔

۹

قلعہ کی فصیل پر فتح کا پرچم لہرا رہا تھا اور میدان جنگ میں گدھ اور جنگلی درندے مردہ سپاہیوں کا گوشت نوچ رہے تھے۔

تمنّا

(از جناب ایم۔ اسلم صاحب لاہور)

محترمی۔ اسلم صاحب ملک کے نامور ادیب اور انشا پرداز ہیں ذیل کا مضمون آپ کی رشحاتِ فکر کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔ مگر ہم اسے ادبِ لطیف کا ایک اچھا نمونہ کہینگے۔

اس ادبی نگارش میں معصیت انگیز تمنّا اور گناہ آلود آرزو سے بچنے کے لئے اسلم صاحب کو ویرانے کی تلاش ہے اور اس تلاش کی فرضیت کے لئے انہوں نے سرآمد مفتیان عظام حضرت غالب علیہ الرحمۃ کے اس فتوے کو پیش کیا ہے۔ کہ

رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو

مفتیٔ اعظم کی اس رائے کے بعد کون ہے جو ویرانہ پسندی سے انکار کر سکتا ہے۔

(ایڈیٹر)

جہاں آبادی ہو وہاں رونق بھی ہوگی اور دلبستگی کا سامان بھی
پریم اور محبت کے ساغر بھی چلتے ہونگے۔ لیکن
مجھے تو ویرانہ پسند ہے!
کیوں؟
میرے دل میں کوئی ارمان نہیں۔

ویرانہ! وہ ویرانہ جس کی فضا زندگی کی آلودگیوں سے پاک ہو
جہاں معصومیت ہو۔ بیکسی ہو۔
قاتل کا خنجر شاید اتنا خوفناک نہ ہوگا۔ جتنی کسی کی ایک نگاہ نیم باز
یا تبسم صاعقہ بار!
ایک متاعِ دل پر ڈاکہ ڈالنے والی
دوسرا دامنِ صبر و تحمل جلا دینے والا!
حیف! صد حیف! دل دونوں کا طلب گار۔ افسوس!
دل کسی اور کا دیوانہ
اور
میں دیوانۂ دل!
یہ نادان اسی آغوش کو ڈھونڈتا ہے۔ اسی آغوش کے لئے
مچلتا ہے۔ جہاں کم زندگی ہو۔

عورت! قدرت کی ایک نفیس ایجاد!
عورت کی آغوش محبت۔ انسان کی مسرت کی انتہا! لیکن
آرزو گناہ آلود!
تمنّا معصیت انگیز!
گناہ کی آرزو۔ بازیٔ طفلانہ؟ یا ثمر حیات کی پختگی۔؟
لیکن
اس کی تاثیر؟
شباب کی امنگیں۔ جوانی کے ولولے۔ عصیاں اور نفس پروری

حزن و ملال سے ہر کہ ومہ گریزاں! کیوں؟
دل کی نگری اس سے سونی سونی نظر آتی ہے۔ اور تمنّا!
محروم!!!
لیکن ویرانے میں نہ کسی کی آغوش محبت۔ نہ حزن و ملال کا کھٹکا
نہ تمنّا کا ماتم اور نہ دل کے مچلنے کو کسی کی نگاہ نیم باز اور نہ ہستی کو جلانے
والا کسی کا ....۔ تبسم صاعقہ بار
صرف ایک معصومیت یا بیکسی۔ اور اب تمنّا ہے تو یہ ہے کہ ؎
رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو!

عقد ثانی

(از جناب شوکت حسین صاحب عرفانی نہالوی)

مولوی اشفاق علی سیدھے سادے پرانے خیال کے مسلمان تھے انہیں نئی روشنی کی ہوا بالکل نہیں لگی تھی وہ مذہبی احکام کی سختی کے ساتھ پابندی کرتے تھے اس لئے ان کا تعلیم نسواں سے مخالف ہونا پسند اں تعجب کی بات نہ تھی۔ ان کی عمر چالیس سے اوپر اور ان کے زہد و تقوی کی شہر بھر میں دھوم تھی۔ ان کی پہلی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا اس کے ایک سال بعد انہوں نے دوسرا نکاح کیا تھا۔ پہلی بیوی سے ایک جوان لڑکا اور ایک جوان لڑکی موجود تھی۔ دوسری بیوی سے کوئی اولاد نہ تھی اب اس کی امید بھی کچھ منقطع ہو چکی تھی۔

ابھی آفتاب کو طلوع ہوئے تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا۔ مولوی صاحب یاد الٰہی میں ہمہ تن مشغول تھے ان کی بیوی ہاتھ میں ایک رنگین لفافہ لئے ہوئے پاس آئیں۔ مولوی صاحب اس کی پیروں کی آہٹ سے چونکے بیوی نے لفافہ ان کے سامنے ڈال دیا اور یوں گویا ہوئی۔

"ذرا اسے کھول کر تو دیکھو"!

مولوی صاحب عینک سنبھال کر بولے یہ کس کا خط ہے

بیوی نے کہا پڑھو تو سہی سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔

مولوی صاحب نے لفافہ کھول کر پڑھنا شروع کیا خط کا مضمون حسب ذیل تھا۔

"جان سے پیارے! واللہ تم کیسے بے مروت ہو بس جی بس تمہاری محبت دیکھ لی۔ اگر میں تم سے خفا ہو جاؤں تو کیا تم مجھے نہیں مناؤ گے؟ یا یونہی چھوڑ کر چلے جاؤ گے؟ کل میں نے محبت نامہ بھیجا تھا۔ جواب اس وقت تک غائب کیوں؟ بس یہی وجہ خفگی کی تھی۔ پھر جب میں تم سے ملی تو تم نے سیدھے منہ بات تک نہیں کی۔ مگر کیا تمہیں معلوم نہیں تھا کہ میں تم سے کیوں ناراض ہوں اگر نہیں سمجھے تو مجھ سے دریافت کیوں نہیں کیا۔ تمہارے یہاں سے چلے جانے کا مجھے از حد صدمہ ہوا آج تمام دن نہ کھانا کھایا نہ پانی پیا۔ تمہاری راہ دیکھتی رہی۔ مگر تمہاری چاند سی صورت ایک مرتبہ بھی نظر نہیں آئی آخر خود ہی اپنا غرور توڑ کر یہ خط لکھ رہی ہوں اگر تم ہی میرے دل کی بات نہ سمجھے تو اور کون سمجھے گا۔ پیارے تم مجھ بدنصیب سے کیوں بے رخی کر رہے ہو کچھ تو حال دل بیان کرو"

مولوی صاحب نے خط غور سے پڑھا لیکن سمجھ میں کچھ نہ آیا چند لمحوں کے بعد اپنی بیوی سے باطمینان سوال کیا ---"یہ خط کس کا ہے؟"

بیوی۔ آمنا کا۔

مولوی صاحب۔ آمنا کا؟

بیوی ناراض ہو کر۔ جی ہاں آپ کی نازونعم میں پلی ہوئی دختر کا نگوڑی نے تمام عزت خاک میں ملا دی۔ برادری میں بولنے کے قابل نہ رہے۔ میں تو سب کچھ پہلے ہی سے جانتی تھی۔ کہ جب سے ایسی چلانا آیا ہوا ہے۔ زیور پہننا اور پان کھانا------

مولوی صاحب نے قطع کلام کر کے سوال کیا۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ اس کا خط ہے؟

بیوی ناک بھوں چڑھا کر بولی...اس نگوڑی کا نہیں تو کیا میرا ہے۔ پھونس پر آگ کیوں ڈالتے ہو۔ کیا اب بھی کوئی شبہ رہ گیا۔ خدا جانے کب سے یہ کوتک کر رہی تھی۔ ہائے سارے خاندان کی ناک کٹ گئی۔ جڑ سے کٹ گئی۔ مولوی صاحب نے خط بیوی کو واپس کر دیا اور بولے کچھ غلط فہمی ہوئی ہے ورنہ ایسی بات ناممکن ہے۔

بیوی۔ جی ہاں۔ ناممکن ہے۔ کیوں نہیں بالکل ناممکن ہے۔ آپ سیدھے سادے مسلمان ہیں آپ کو نیک بیوی مل گئی بس سب کو بی بی مریم سمجھنے لگے۔ اسی اثنا میں گھر کی خادمہ دوڑی ہوئی آئی اور بیوی سے بولی۔ بی بی چلو! آمنا آپا کی حالت بہت زیادہ خراب ہوتی جا رہی ہے۔

بیگم خادمہ کے ساتھ چلی گئیں۔

(۲)

یہ مسلم امر ہے کہ مولوی صاحب ٹھنڈے دل و دماغ کے آدمی تھے عموماً کسی معاملہ کی نسبت جلد رائے قائم نہیں کرتے تھے ہاں اتنی بات ضرور تھی کہ جو بات ان کے دل میں بیٹھ جاتی وہ مشکل سے نکلتی۔ اس کا ذکر اوپر کیا جاچکا ہے کہ مولوی صاحب تعلیم نسواں کے خلاف تھے چنانچہ ان کا دل ملامت کرنے لگا کہ تعلیم کی وجہ سے لڑکی کے چال چلن میں فرق آگیا۔ اور دل ہی دل میں اپنے لڑکے کو گالیاں دینی شروع کیں جس نے ان کی بیوہ۔ لڑکی کو پڑھنا لکھنا سکھایا۔ باوجود تنبیہہ کرنے کے ان کا لڑکا کہتا تھا کہ تعلیم سے اس کا دل صاف ہو جائے گا۔ اور اس کا زمانہ نہایت عمدہ طریقہ سے کٹ جائیگا۔

(۳)

زہرہ کے شوہر کا نام مظفر علی تھا وہ کالج میں تعلیم پاتا تھا گرمیوں کی چھٹی ہوئی اس لئے اپنے گھر آگیا تھا اور ۲ ماہ کے بعد آیا تھا۔ زہرہ لکھی پڑھی اور نہایت عقلمند عورت تھی۔ وہ ہفتہ میں دو بار اپنے شوہر کو خط لکھا کرتی تھی اور ان خطوں میں بالعموم اپنی سہیلی کا ذکر کیا کرتی تھی اس لئے گھر آکر مسٹر مظفر کا دل اس معاملے میں مزید معلومات کا طالب تھا۔

پہلے روز اس معاملہ پر گفتگو نہ ہوسکی مگر دوسرے روز رات کے دس بجے جب خلوت ہوئی تو مظفر بولا۔ ہاں اپنی سہیلی کا کوئی خط تو دکھاؤ۔

زہرہ۔ واہ میں کیسے دکھا سکتی ہوں۔

مظفر۔ کیوں نہیں دکھا سکتیں۔

زہرہ۔ کسی کو دکھانے کی سخت ممانعت ہے۔

مظفر۔ واہ! کیا میں کوئی غیر ہوں! مجھ سے کیا چھپاتی ہو۔ مجھے ضرور دکھانے پڑیں گے۔

زہرہ۔ اچھا تو پہلے ان سے دریافت کر لوں۔

مظفر۔ اگر انھوں نے اجازت نہ دی۔

زہرہ۔ تو پھر کیسے دکھا سکتی ہوں۔

یہ سن کر مسٹر مظفر ناراض ہوگئے اور منہ بنا کر بولے اچھا مجھ سے نہ دکھاؤ۔ ہم کون؟ تمھاری تو سب کچھ وہی ہیں۔

زہرہ نے اس کا جواب نہ دیا اور بات یہیں رہ گئی۔

(۴)

مسٹر مظفر اپنی دھن کے بڑے پکے تھے۔ چنانچہ اگلے روز رات کو پھر وہی قصہ لے بیٹھے۔ دولہن سے بولے "کیوں جی حکم مل گیا" دولہن نے جواب دیا۔ نہیں۔ انھوں نے ہاتھ جوڑ کر کہا ہے کہ ہرگز ہرگز کسی کو میرے خط نہ دکھانا ...... ورنہ ......

اب تو مسٹر مظفر علی کو غصہ آگیا مگر زہرہ دانش بر جان درویش جا درست منہ لپیٹ کر پلنگ پر لیٹ گئے۔

زہرہ یہ کب دیکھ سکتی تھی۔ اسے ہار ماننی پڑی۔ اٹھی الماری کھولی اور اس میں سے خطوں کا ایک بنڈل نکالا۔ اس کے بعد شوہر کو اٹھایا ستایا اور خط اس کے سامنے ڈال دیئے۔ لو پڑھ لو کسی طرح تمھاری ضد بھی پوری ہوگی۔

مظفر علی نے خطوں کا بنڈل اٹھا کر دور پھینک دیا معاف کرو اب مجھے ان کی ضرورت نہیں۔

اب زہرہ بھی خفا ہوگئی اور فرش پر بیٹھ کر آہ وزاری شروع کردی۔ مظفر اٹھے اور زہرہ کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور کہا اب تم بھی غصہ کو تھوک دو۔

یہ سن کر وہ اور بھی زار زار رونے لگی بڑی مشکل سے مظفر اس کو منانے میں کامیاب ہوا۔ اب مظفر نے خط نکالا اور بولا تمھاری سہیلی کا خط تو نہایت پاکیزہ ہے۔

زہرہ اس تعریف سے بہت خوش ہوئی اور بولی بالکل مردوں کا سا خط ہے۔

مظفر۔ اچھا تو تم ان میں سے دو چار عمدہ خط نکال کر دکھلاؤ۔

زہرہ نے ایک خط نکالا اور بولی لو اس کو پڑھ لو۔

مظفر نے اسے پڑھا اسی اثنا میں اس کی بیوی نے دو چار خط اور نکالے اور مظفر نے ایک ایک کر کے پڑھا مگر یکایک مظفر کے چہرہ کا رنگ زرد ہوگیا۔ زہرہ تاڑ گئی۔ چنانچہ اس نے سوال کیا۔ کیوں کیا بات ہے۔

مظفر۔ دیکھو اب تمہیں اپنی سہیلی کا ساتھ چھوڑنا پڑیگا۔

زہرہ۔ کیوں؟ کس لئے؟

مظفر اگر میں اصل حال سے واقف نہ ہوتا تو ضرور یہی سمجھتا کہ یہ خط کسی عورت نے کسی ایسے مرد کو لکھا ہے جس کی محبت نے اسے دین و دنیا سے فراموش اور دیوانہ بنا دیا ہے۔

زہرہ (مسکرا کر) کہیں دشمن دیوانے تو نہیں ہو گئے۔

مظفر (متانت سے) مذاق کی بات نہیں! مجھے حد سے زیادہ تعجب بلکہ افسوس ہے یہ مانا کہ سہیلیاں اپنی سہیلیوں کو خط لکھا کرتی ہیں مگر ایسے الفاظ میں نہیں۔ زہرہ نے کچھ جواب نہ دیا اور چپ ہو گئی کیونکہ وہ بات کو طول دینا نہیں چاہتی تھی۔ مگر مسٹر مظفر کا سلسلۂ خیال کہیں سے کہیں جا پہنچا۔ انھوں نے دل میں کہا۔ اس میں حیرت کی کونسی بات ہے۔ وہ عورت ہے۔ اور جوان عورت۔ پھر بیوہ! مگر یہ حالات خطرہ سے خالی نہیں۔ ابھی تو خیریت ہے کہ وہ فرضی عاشق یا شوہر کو خط لکھتی ہے۔ مگر ان جذبات کس قدر گہرے ہیں اصل اور نقل میں بالکل فرق نہیں، خدا خیر کرے اگر مجاز حقیقت کا رنگ اختیار کرے تو غضب ہی ہو جائیگا۔

جوان بیٹی اور پھر بیوہ کو گھر میں بٹھائے رکھنا اور اس کا نکاح نہ کرنا سخت ظلم و ناانصافی ہے۔ یہ دینی ہے جس کی سزا رسوائی کے سوا کچھ اور نہیں۔ بڈھے مولوی نے اپنی تو شادی کرلی مگر جوان بیٹی کی طرف سے آنکھ بند کرلی خدا اس کو نیک ہدایت دے۔ اسلام نے نکاح ثانی کی تاکید کی ہے اور اس کے فائدے دیکھ کر غیر مسلمانوں نے بھی اسے اختیار کرلیا ہے۔ مگر افسوس کہ مسلمان تاریکی میں پڑے ہوئے ہیں۔ خاص کر ایسے لوگ جو اپنے کو زاہد اور متقی سمجھتے ہیں اور پرہیزگار کہلاتے ہیں۔ افسوس!

(۵)

یہ کہنا مشکل ہے کہ زہرہ کو آمنا سے زیادہ محبت تھی یا آمنا کو زہرہ سے۔ یہ بلا مبالغہ ایک دوسرے پر فریفتہ تھیں ان کے خط عاشقانہ طرز کے ہوتے تھے جن میں پیار و سہاگ اور ناز و ادا کے ذکر، خیر اور روٹھنے منانے کے سوا اور رکھا ہی کیا تھا۔

وہ جب باہم ملتی تھیں تو پہروں پیار محبت کی باتیں اور شکوہ شکایات کرتی رہتی تھیں کوئی اور عورت آجاتی تو یہ خاموش ہو جاتیں۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ زہرہ اپنے شوہر کے آجانے کی وجہ سے آمنا کے پاس نہ آسکی۔ اس روز آمنا نے بالکل کچھ کھایا پیا نہیں۔ اور جب زہرہ آئی تو اسے بڑی مشکل سے منا سکی۔ آمنا کی عمر اٹھارہ سال سے زیادہ نہ تھی۔ وہ صاف رہتی تھی اس کے ہاتھوں میں سونے کی ایک ایک چوڑی تھی مگر کوئی کپڑا رنگ دار نہ تھا سپید تھے کیونکہ وہ بیوہ تھی۔

پرسوں شام زہرہ آمنا سے ملنے آئی مگر وہ غصہ سے منہ پھلائے بیٹھی رہی پھوٹے منہ سے ایک بات نہ کی حتیٰ کہ اسے اٹھ کر جانا پڑا۔ مگر اس کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری ہوئے زہرہ اور آمنا کے مکانوں کی چھتیں آمنے سامنے تھیں یہ بالاخانہ سے ہر روز ایک دوسرے کو دیکھ لیا کرتی تھیں۔

آمنا پرسوں ہزار دفعہ کوٹھے پر گئی مگر زہرہ کی شکل ایک بار بھی نظر نہ آئی۔ بس اسے یہی غصہ تھا۔

زہرہ کے چلے جانے کے بعد آمنا نے اسے ایک خط لکھا مگر اسے مکتوب الیہ کے پاس پہنچنے سے پیشتر ہی اسے دوسرے نے آدبایا اور مکتوب الیہ کے پاس روانہ نہ ہوسکا۔

(۶)

مولوی اشفاق علی کا دل ابھی شبہات سے پر تھا آمنا اب بالکل تندرست ہے وہ خلاف توقع اچھی ہو گئی اگر مر جاتی تو مولوی صاحب کے دل کی آرزو پوری ہو جاتی۔ ان کے نزدیک ایسی ناشدنی عورت کا مرنا ہی اچھا تھا۔ مولوی صاحب کے دل میں خط کا غبار رہتا وہ بار بار گھر کے لوگوں سے اس کا تذکرہ کرنا چاہتے تھے مگر پھر رہ جاتے آخر آج اپنی بوڑھی بہن سے دل کی بات کہہ ڈالی خط نکال کر اس کے سامنے ڈال دیا۔ بہن نے اسے پڑھا اور اس کے بعد بولی۔ بس یہی بات، یہ تو کچھ نہیں تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔

یہ الفاظ سن کر مولوی صاحب کو کچھ کم حیرت نہیں ہوئی کیا یہ معمولی بات ہے۔

بہن۔ بالکل معمولی۔ یہ خط تو اس نے اپنی سہیلی زہرہ کو لکھا ہے آپ زہرہ کو جانتے ہیں۔

مظفر علی کی دلہن۔ دونوں میں بہت محبت ہے اور اتنی بے تکلف ہیں کہ روزانہ ایک دوسرے کو اسی قسم کے پرچے لکھا کرتی ہیں۔ اب مولانا کی آنکھوں سے پردہ اٹھا اور جان میں جان آئی اور خدا کا شکر ادا کیا۔ مولوی صاحب نے آمنا کا دستیاب شدہ خط دوبارہ پڑھا

تذکرۂ وفا

(از جناب دھرمپال گپتا وفا ایڈیٹر تیج ویکلی دہلی)

حسن کے رنگ و بو سے آج پریم نگر بسائے جا
صورت ابر نوبہار گلشن دل پہ چھائے جا

خرمن صبر و ہوش کو، دل کی طرح جلائے جا
میرا جو حال ہو سو ہو، برق نظر گرائے جا

جل کے ترے فراق میں خاک تو ہو چکا ہوں میں
تیرا خدا بھلا کرے، خاک بھی اب اڑائے جا

وقت اخیر ہے مرا، دیکھ لوں اک نظر تجھے
جانے سے روکتا ہے کون، رخ سے نقاب اٹھائے جا

عشق کا فرض اولیں حسن کی رازداریاں
ضبط الم کا ہوش رکھ، چوٹ پہ چوٹ کھائے جا

دیدۂ غم نواز سے گوہر اشک گر چکے
ہنس کے مرے مزار پر پھول بھی اب چڑھائے جا

ذوق سجود ہی میں ہیں عشق کی سربلندیاں
ہوش میں ہو کے بے نیاز اپنی جبیں جھکائے جا

کچھ بھی کمی نہ حسن کے حوصلۂ جفا میں ہو
صبر شکیب عشق کو شوق سے آزمائے جا

رہرو عشق ہے اگر، منزل حسن تک پہنچ
پاؤں اگر جواب دیں، دل کی تڑپ بڑھائے جا

عشق وفا کا تذکرہ کیوں ہو زبان خلق پر
قبر کا ٹھوکروں سے آج نام و نشاں مٹائے جا

مکتوب رموزی

(از ملا رموزی)

محترم مدیر مجلۂ "مشہور دہلی"

بعد سلام مسنون آنکہ معلوم ہو کہ یہاں پر خیریت تو کیا ہاں خیر وعافیت تھوڑی بہت ضرور ہے خیریت چونکہ رات دن کے چوبیس گھنٹوں کی پرامن حالت کو کہتے ہیں اور خیر وعافیت مہینہ بھر کی عام حالت کا نام ہے اس لئے خیریت کا حال یوں مرتب نہیں کہ جس طرح آپ کی طرف کھانے پینے اور عام استعمال کی چیزوں کی قیمت میں دن میں دس دس نرخ تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور جنگ کے متعلق عوام میں بارہ بارہ نئی اور غیر معتبر خبریں پھیلتی رہتی ہیں بالکل اسی طرح میرے ہاں بغیر پروانہ اجازت کے زکام اور کھانسی کا حال ہے کہ ہر طرح کی طبی احتیاط کے باوجود زکام اور کھانسی سے اچھے اچھے شریف گھرانے محفوظ نہیں، اب اسی میں اگر بیویاں بھی نازک مزاج نکل آئیں اور دوائیں گراں تو ایسی بیویوں کا مضمون نگار شوہر صرف ...... حکیم کے مطب کا ہو کر رہ جاتا ہے۔

دیگر احوال یہ ہے کہ بد قسمتی سے اردو کے اخباروں رسالوں اور کتابوں کی مقبولیت اور اشاعت صرف عوام تک ہے اور عوام میں بجز اکا دکا کے ذہن رسا اور عقل اعلیٰ ہوتی نہیں یہ تو صرف

سے چل چل رے نوجوان

قسم کا مصرع ہوتے ہیں اس لئے ان کو چھوڑ کر ان لوگوں پر بھی نظر ڈالئے جو اردو کے اشعار اخبار رسالے اور کتابوں کے کام میں لگے ہوئے ہیں میری رائے میں ایسے اشخاص جو اگر جنگی بھرتی میں کام آجاتے تو بہتر تھا اس لئے کہ ان میں کسی کتاب یا مضمون پر داد و تعریف جاپانی حملہ سے زیادہ عجیب چیز سمجھی جاتی ہے، چنانچہ اردو کے جس بڑے سے بڑے اخبار اور رسالے کو جا ہوا اٹھا کر دیکھ لو اس میں ہر چیز پر اظہار رائے کا طریقہ بیحد مضمحل افسردہ محدود اور پامال ہوگا اور حد سے سوا مختصر، بلکہ بعض علمی نام کے پرچوں کا یہ طریق تھا بھی ان کا کمال علم و انشاء سمجھا جاتا ہے لہذا ایسے خشک اور محدود طریق تعریف کے مقابل اگر کوئی طویل، جامع شکریہ شائع کر دیا جائے تو یہ تنگ دماغ اس کو مبالغہ قرار دیتے ہیں، حالانکہ اس کی علمی وجہ یہ ہے کہ مغلوب غلام اور کم ذہن قوموں کو زوال اس لئے ہوتا ہے کہ ان کی دماغی وسعتیں اور علمی حقائق سمجھنے اور تفصیل و شرح کہنے اور لکھنے والی صلاحیتیں سلب کر لی جاتی ہیں اسی لئے ان میں کسی چیز کو کافی اور کامل احاطے اور جامعیت سے سمجھنے کی قوت جس طرح کمزور ہو جاتی ہے اسی طرح اس کی تعریف و تشریح کے الفاظ کا ذخیرہ محدود ہوتا ہے جیسا کہ جناب نے اپنے مطب میں مریضوں کے بیمارداروں کو دیکھا ہوگا کہ بیان تو کرنا چاہتے ہیں مرض اور مریض کی طویل شرح مگر سمجھ اور الفاظ کی قلت کے باعث حال بیان کرتے وقت لکنت اور اول فول پن سے آپ کو تھکا دیتے ہوں گے حتیٰ کہ بعض بیمار دار تو آپ کے دیئے ہوئے الفاظ کی مدد سے اپنے مریض کا حال پورا کرتے ہوں گے۔ اسی طرح اردو کے مشاعروں میں دیکھا ہوگا کہ رات بھر اشعار تو بے شمار قسم کے اختلاف مفہوم کے سنتے رہتے ہیں مگر داد کے یکساں اور محدود الفاظ صبح تک نہیں بدل سکتے جو اصل میں قوم کے غیر علمی اور غیر قادر الکلام ہونے کی دلیل ہے مگر اللہ تعالیٰ کے کرم سے ملا رموزی کو شعور کامل کے ساتھ الفاظ اور وضع الفاظ کی غیر محدود دولت بھی عطا ہوئی ہے اس لئے جب وہ کسی ... رائے زنی کرتا ہے تو صفحات کا غذ چیخ اٹھتے ہیں یہ عام عہد زوال و بیچارگی میں مزاج و خواص بھی افسردہ و مضمحل پیدا ہوتے ہیں جن کا مجموعی اثر تنگ دلی بغض و حسد اور کینہ ہے، لہذا آپ چاہیں خزانے پر خزانے بھیجتے رہیں وہ صرف لفظ "بہت بہت شکریہ" کہہ کر رہ جائیں گے۔

دیگر احوال یہ ہے کہ اردو میں فن تنقید اور اصول تنقید پر

کسی ایک ہندوستانی نے اپنے ذاتی غور اور کمال قابلیت سے کوئی کتاب لکھی نہ کسی نے ذاتی کمال عقل سے کسی چیز کے جانچنے کے ضوابط وضع کئے اب آپ فرمائیں گے کہ اور یہ جو اخباروں اور اردو کے رسالوں میں کتابوں رسالوں اخباروں، لیڈروں، مضامین نگاروں اور شاعروں پر آئے دن تنقیدیں شائع ہوتی ہیں تو کیا یہ بھاڑ جھونکا جاتا ہے تو میں کہوں گا کہ جی ہاں بھاڑ جھونکنے سے بھی بدتر کیونکہ بدقسمتی سے اردو کا زیادہ کام عوام کے ہاتھ میں ہے اور ان غریبوں میں ذوق بلند اور عقل اعلیٰ کا فقدان ہوتا ہے لہذا اردو کی تنقیدوں کے دو حصے ہیں ایک وہ جو یورپ کے اصول تنقید کی نقل ہے یعنی اردو کے نقاد صاحب نے کسی یورپی ضابطہ تنقید کو سامنے رکھا اور جس پر بھی اس ضابطہ سے اس پر تنقید فرما دی۔ دوسری قسم کے نقاد وہ ہیں جن کو کسی سے کچھ نہ ملا، یا کسی کی شہرت و مقبولیت سے جلے تو جو جی میں آیا وہ لکھ دیا اور سمجھے کہ حق تنقید ادا ہو گیا، تیسرا گروہ وہ فارغ باختہ ہے جو تنقید کے یہ معنے سمجھے ہوئے ہے کہ ہر چیز کی نصف تعریف کر دو اور نصف برائی اور بس، یہ ہیں وہ بنیادی ضوابط اردو میں کسی پر تنقید لکھنے کے۔ لیکن تنقید کی سب سے ابتدائی ذمہ داری بھی اردو میں آج تک کسی نے نہ سمجھی مثلاً کسی اردو کے مورخ پر جب تنقید کی تو غیر مورخ ہندوستانی نے، اردو کے شاعر پر تنقید کی تو غیر شاعر ہندوستانی نے، اردو کے اخبار نویس پر تنقید کی تو غیر اخبار نویس نے اور یہ خرابی ہے اس کی کہ اردو میں لکھنے والوں سے کوتاہیوں میں بازپرس کا کوئی قاعدہ نہ کسی نقاد کو فن تنقید میں ہی۔ اسے کرنا پڑتا ہے بس اخبار اپنے اور تنقیدیں اپنی لہذا جو جس نے چاہا اور جیسا چاہا لکھا اور احباب نے اس لفظ کے ساتھ شائع کر دیا کہ "نقادیت مشہور اہل قلم ہیں۔"

دیگر اقوال یہ ہے کہ آپ نے مشہور کی جنوری والی اشاعت میں "اخبارات اور رسائل" کے عنوان سے بعض سودمند مشورے دیئے ہیں ان میں جناب نے یہ بھی لکھا ہے کہ

"فن صحافت کو دیانتداری کے ساتھ شروع کیا جائے تو نہ صرف یہ کہ ایک عمدہ تجارت کے ذریعہ معاش پیدا کیجا سکتی ہے بلکہ قوم و ملک کی بہترین خدمت ہے۔"

سو اس بارہ میں میری اتنی ترمیم اور شامل فرما لیجئے کہ "بشرطیکہ اس کام کو دو قابلیتوں کے لوگ کریں، ایک وہ جو اخبار نویسی کی فطری اور لاجواب قابلیت کے مالک ہوں، اور دوسرے وہ جو اخبار کو تجارتی اصول پر چلانے کے ماہر ہوں، پس اگر ایک اخبار میں ان دو قابلیتوں کے دو علیحدہ علیحدہ اشخاص نہ ہوں گے کامیابی محال ہے۔ کیونکہ ان دونوں قابلیتوں کا کسی ایک ہی ایڈیٹر یا مالک اخبار میں جمع ہونا تو ممکن ہے مگر عملاً محال، میرے تجربے میں تو اس وقت اردو کے اخباروں اور رسالوں کی تباہی کا راز صرف "غیر موزوں ارکان اخبار" ہیں اور بس۔

دوسرے آں جناب نے اردو کے شعراء پر جو کچھ ارقام فرمایا ہے اس میں اتنا اضافہ اور فرما لیجئے کہ خصوصیت سے غزل کی شاعری ہنوز عوام کے حلقے سے بلند نہیں ہو سکی ہے یعنی غزل میں "شاعر عوام" تو بہت ہیں مگر "شاعر خواص" ایک نہیں، اسی لئے اردو کی آج تک کی غزل میں جو کچھ ہے وہ عوام کے احساسات ہیں، اور عوام کے واردات، عوام کے جذبات ہیں، اور عوام کے ذوقیات اسی لئے غزل کے الفاظ استعارات بندشیں و ترکیب میں نہ کوئی ندرت ہے نہ اضافہ، اس لئے کہ فارغ شاعر خود پامال و فرسودہ محن سے متاثر ہے اس لئے وہ عجیب جوش و ولولہ لائے تو کہاں سے اور فارغ ہے غیر علمی اس لئے نئے نئے اور پُر شوکت الفاظ کس مقدرت کے اثر سے ڈھالے، لہذا اردو کی غزل تو اسی وقت غزل ہوگی جب اس میں کوئی خدا ہی سے ملی ہوئی قابلیت کا شاعر غزل پیدا ہو۔

ادھر مذاق غزل اس درجہ محدود اور بوڑھا ہو چکا ہے اور اس کا نقطۂ نظر اس درجہ فدویانہ نمک خوارانہ، اور حقیر فقیر کمترین ہے کہ اگر کوئی نادر غزل کہے بھی تو سمجھے کون! اور ہاں خوب یاد آیا کیوں حکیم صاحب یہ کیا بات ہے کہ شدید سردی ہی میں امرود اور نارنگی کا دور ہوتا ہے اور گھر کی خالہ جان، نانی جان، پھوپی جان اور پردادی قسم کی عورتیں نوجوان لڑکیوں اور بچوں کو کھلائے جاتی ہیں کہ دیکھو امرود اور نارنگیاں نہ کھانا ورنہ سردی ہو جائے گی، کیونکہ الحمدللہ کہ ہماری دیسی عورتیں اب بھی نمونیہ کو تسلیم نہیں کرتی ہیں بلکہ وہ تو نمونیا کو بھی سردی ہی کہتی ہیں اور ہاں وہ خوب یاد آئی کہ دیکھا حکیم صاحب آپ مسلمانوں

سپاہی کا خط اپنی محبوبہ کے نام

(از جناب صابر کوئیگومی)

صابر صاحب کے اس خط کو "محبت" اور "فرض" کے درمیان ایک صراط سمجھئے یقیناً وطن کی حفاظت ہر سپاہی کا فرض ہے۔ اور حسن وعشق کی رومان انگیزیاں اکثر فرض کی راہ میں حائل ہوتی رہتی ہیں لیکن تاریخ شاہد ہے "کہ فرض ہی ہمیشہ محبت پر غالب رہا ہے اس خط کی آخری دو سطریں بہت خوب ہیں۔

"ایڈیٹر"

سپاہی کی زندگی کی پردرد کہانی تم سے نہ سنی جائیگی۔ فرزانہ! اس کی کہانی کا انجام تو تمھارے بدن کے رونگٹے کھڑے کردے گا مجھے ہوش نہ رہا۔ میں کب اور کس طرح ہسپتال پہنچا۔ اور کتنے دن اس تاریک گوشہ میں پڑا ہوا فریب زیست کھاتا رہا۔ ہاں اتنا مجھے ہوش ہے کہ میرے سارے اعضا معطل ہوچکے تھے۔ صرف سانس کی بے ترتیب آمدورفت باقی تھی کہ نرس کی توسط سے مجھے تمھارے کئی خطوط ملے۔ جو ایک بنڈل کی صورت میں جمع کئے گئے تھے۔ اور میں نے انھیں بغیر پڑھے تمھارے جذبات انگیز تحریر کا اندازہ لگالیا۔ تم نے وہ سب لکھا ہوگا جو ایک محبوب ترین شوہر کی جدائی میں اس کی چاہنے والی بیوی لکھ سکتی ہے۔

ارادہ تو یہی تھا کہ تمہیں اپنا حال لکھ کر نہ بھیجوں مگر تمہارے ان مسلسل خطوط نے میرے پائے استقامت کو ڈگمگا دیا۔ بڑی منت کے ساتھ میں نے نرس کو مجبور کیا کہ میرے آنسوؤں کو تم تک پہونچا دے۔ نرس بھی عورت ہے۔ اور اس کے سینے میں تم جیسا لطیف دل موجود ہے۔ اس نے کمال مہربانی سے میرے بے ربط الفاظ کے جملے بنا بنا کر خط کی صورت میں تم تک پہونچایا۔

ہاں۔ تو آج سے تین مہینے پہلے حسرت و یاس کے عالم میں اسٹیشن پر تم سے وداع ہوکر ٹرین میں سوار ہوا۔ اور پھر ایک طویل بحری راستہ طے کرکے سرحدی مقام پر پہونچا۔ جہاں دور تک کوہستانی سلسلہ پھیلا ہوا وحشتناک طور پر دعوت اجل دے رہا تھا۔ بحری بیڑوں کی حفاظت توپوں کا نصب کرنا۔ بمب گیر طیاروں کی زد سے اپنے آپ کو بچانا۔ گویا موت سے بازی لگانا ہے۔ فرزانہ! تم یہ خیال کرتی ہوگی کہ سپاہی موت سے ڈرتا ہے۔ نہیں میری محبوب ترین بیوی! یہ نہیں۔ مجھے تم تک اپنی خیریت نہ بھیجنے کی معذرت چاہتی ہے۔ تم سمجھو گی سپاہی کبھی محبت کرنا نہیں جانتے اس چیز کو آج میں تم سے منوانا چاہتا ہوں۔ فرزانہ! محبت ہی سر فروشی کا جذبہ پیدا کرتی ہے اگر قوم و ملک کی محبت نہ ہو تو ایک سپاہی جنگ کے آتش کدہ میں کبھی کود نہیں سکتا۔

کیا محبت کا خدا! اس سے بھی زیادہ ایثار چاہتا ہے۔ میرے خیال میں سپاہی اپنی زندگی کا سودا جس مسرت کے ساتھ کرتا ہے شاید دنیا بہت کم ایسی شاندار مثال پیش کرے۔

میری فرزانہ! تم کہوگی چند مقررہ سکوں کے عوض تم نے سپاہیانہ پیشہ اختیار کیا۔ درست ہے۔ مگر سرفروشی والی بات رہ جاتی ہے۔ اب حوصلہ کن جذبہ جو موت کے خونخوار ساحلوں سے ٹکرانے کے لئے اس کی سپاہیانہ جوش وخروش کو ابھار سکتا ہے فتح وشکست کے حدود سے گذر کر بھی چین نہیں لینے دیتا۔

حسن وشباب کی رنگینیوں سے۔ ساغر کی کھنک اور رنگ و بو کی چہل پہل میں رہ کر بھی وہ تلواروں کی جھنکار کو کبھی فراموش نہیں کرسکتا

بہادر سپاہی صرف ایک مرتبہ مرنے کے لئے زندہ رہتا ہے۔ موت کے خوشگوار الفاظ سنتے سنتے اس کے کان آشنا ہوچکے ہیں۔

وہ اپنے دل اور روح کی طرح وطن کے ذرہ ذرہ کو آزادانہ مسرت میں ڈوبا ہوا دیکھنے کی تمنا رکھتا ہے۔ اور یہی جذبہ ایثار رگ گلو کو خون آشام تلواروں سے گلے ملنے کے لئے ابھارتا ہے۔

جہاد۔ فتح۔ کامرانی۔ تشدد و مدافعت کی خاطر سپاہی اپنے خون کا آخری قطرہ بہا دینے سے پیچھے نہیں ہٹتا۔ وہ اپنے لئے عزت، شہرت دولت نہیں بلکہ آزادی کی دیوی کے آگے اپنا سب کچھ قربان کرسکتا ہے تمہیں جذبات کی فروتنی پر زیادہ حیران نہیں ہونا چاہیئے۔ تم سوچتی ہوگی ایک بے حس دل میں اتنا ایثار کا مادہ کہاں سے آگیا۔

سچ کہنے میں مجھے ذرا بھی عار نہیں۔ یہ سب کچھ میں نے تم سے سیکھا ہے تمہاری چھوٹی چھوٹی قربانیاں اب اجتماعی شکل میں نمودار ہو کر مجھے درس ایثار دے رہی ہیں۔

میں نے جس طرح سے اپنے آپ کو دشمن کے مقابلے میں بہادرانہ حیثیت سے پیش کیا ہے اس کے لئے ... سے میری آنکھیں چھنے لگی ہیں میرے دونوں بازو بم کے زہریلے اثرات سے معطل ہو چکے ہیں اور میں ایک مجبور انسان کی طرح ہسپتال کی تاریک زندگی بسر کر رہا ہوں۔ پھر بھی میں اپنے آپ کو خوش نصیب اور کامران انسان سمجھتا ہوں۔

اچھی فرزانہ۔ میں نے قطعی طور پر فیصلہ کر لیا ہے کہ اس وقت تک سرزمین پر قدم نہ رکھوں گا جب تک اس کا ذرہ ذرہ آزادی کا نغمہ نہ الاپے۔

خط طویل ہو رہا ہے۔ استقلال کے ساتھ دل کو تھامے رہنا اشکوں کو فضول رائیگاں نہ کھونا۔ دعاؤں میں بڑا اثر ہوتا ہے۔ مجھے تمہاری صحت کا بڑا خیال رہتا ہے۔ اس لئے تمہاری آغوش محبت میں دو سپاہی زادوں کی زندگیاں ہیں۔ اور یہ زندگیاں بھی کبھی آزادی کی راہ میں قربان ہوں گی۔ اچھا خدا حافظ۔

"تمہارا جانباز شوہر"
"جمال"

(بقیہ صفحہ ۱۷ سے)

سے نکالنے والا سب سے پہلا شخص شیام تھا۔ جو اس دن تم سے چٹھی لکھوانے آیا تھا۔ ہسپتال میں بھی تمہیں وہی اٹھا کر لایا۔

جب تک میں ہسپتال میں رہا۔ شیام بلا ناغہ روزانہ مجھے اوقات ملاقات میں ملنے آتا۔ سچ پوچھئے تو اس کی ہمدردی اور مہربانی سے میں بہت جلد صحت یاب ہو گیا۔ میں نے محبت بھری نظر سے شیام کو دیکھا۔ اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ شیام آپ نے میری جان بچائی میں آپ کا احسان تادم زیست فراموش نہیں کر سکتا۔

شیام نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا شکریہ کی ضرورت نہیں بابوجی! مجھے وہ دن یاد ہے جس روز آپ نے میرا آپریشن ساتھ ہو کر کرایا اور ایک بیکس کی دستگیری کی تھی۔ پرماتما کا شکر ہے کہ آج اس نے مجھے اپنے محسن کی خدمت کا شرف بخشا۔

(بقیہ صفحہ ۳۶ سے)

اور وہ بھی اسی نتیجہ پر پہنچے حتیٰ کہ انھوں نے آمنا کے عقد ثانی کا فیصلہ کر لیا اتنے میں خادمہ ایک خط لائی جو کہ مظفر اور اس کی دلہن نے لکھا تھا جس میں آمنا کے عقد ثانی کا مشورہ تھا۔

(۷)

آمنا کے عقد ثانی کو عرصہ چھ ماہ کا گزر گیا وہ اپنے شوہر مسٹر امجد سے خوش ہے اسے زہرہ سے محبت ہے مگر پہلی سی کہاں۔ کیونکہ عارضی محبت کی جگہ حقیقی محبت نے لے لی تھی یعنی زہرہ کی جگہ امجد نے لے لی۔ زہرہ کو یہ سب کچھ معلوم ہے چنانچہ جب وہ آمنا سے ملتی تو از راہ شرارت و شوخی اس بات کا اشارہ کیا کرتی تھی۔ آمنا مسکرا کر نگاہیں نیچی کر لیتی ہے۔

(بقیہ صفحہ ۳۹ سے)

کی دماغی غفلت کہ انہوں نے جنوری ۱۹۳۲ء کے شروع ہوتے ہی مسلمانوں کو مبارکباد کے پیغامات اس طرح لکھے گویا یہ اسلامی سنہ شروع ہوا!؟ افسوس کہ مسلمانان ہند میں ۹۹ کیا بلکہ پورے سو فیصدی ہی عیسوی سال کو مناتے اور اسلامی سال کے آغاز کو غم کا سال کہہ کر رہ جاتے ہیں۔ پس جس قوم کو اپنی تاریخ سے اتنی واقفیت ہو اس قوم کو اگر میری غزل بھی سنائی جائے تو وہ غریب کیا سمجھے گی؟ زیادہ والسلام

تجلیاتِ حقّی

(از جناب محمد متین الحق صاحب حقّی دہلوی انسپکٹر ایکسائز ڈسٹرکٹ کمشنر وغیرہ)

کیوں چھا گئی فضائے جہاں پر خوشی نہ پوچھ
کیوں آگئی کسی کے لبوں پر ہنسی نہ پوچھ

کس طرح بزمِ حُسن سے آیا ہوں سرنگوں
کس طرح چشمِ شوق کی دنیا لٹی نہ پوچھ

نازک ہے آبگینہ سے بھی حُسن کا مزاج
محشر میں مجھ سے جلوہ گہہ نازکی نہ پوچھ

کچھ یہ خیال سا ہے کہ دیکھا تھا یار نے
پھر کیا ہوا، خبر نہیں، تو بعد کی نہ پوچھ

کیوں پوچھتا ہے، کیسے گذرتی ہے زندگی
اے جانِ زندگی، تو مری زندگی نہ پوچھ

دُنیا فریب، اور غمِ دنیا فریب کیوں
ہو گی جہانِ حُسن کی پردہ دری نہ پوچھ

حقّی! جب عرضِ حال پہ آپنے کہا کہ "جی"
دو دل لگی میں اور بھی میری لگی نہ پوچھ

زِندگی

(از جناب حضرت وحید صاحب بنارسی)

ناکمل رہ گیا عنوانِ بابِ زندگی — جل گئی غم کے شرر سے کتابِ زندگی
جان دیدی ہجر میں جس نے امیدِ وصل پر — سچ تو یہ ہے اسکو کہیے کامیابِ زندگی
ٹھہر جا مست چھیڑا ہی ذوقِ نشاطِ کائنات — ایک بیکس ہو رہا ہے کامیابِ زندگی
جھوم کر کہتی ہے عالم میں انا الحق کی صدا — دار کے سائے میں کھینچی ہے شرابِ زندگی
ظلمتیں بڑھتی چلی ہیں پھر نئے انداز سے — پھر بطرزِ نو چمک اے آفتابِ زندگی
اسکی رنگت دیکھتے ہی موت بھی شرما گئی — کسقدر خوش رنگ تھا رنگِ نقابِ زندگی
ہو نشاط و غم بقدرِ ذوق ورنہ دہر میں — بج رہا ہے ایک ہی دُھن میں ربابِ زندگی
اُنکی ہمت کے صلے کو اُنکے دل سے پوچھیے — دیکے دل جو مول لیتے ہیں عذابِ زندگی
خرمنِ جذباتِ فطرت کو بھی بھڑکاتا ہوا — صاعقہ بردوش آیا انقلابِ زندگی

صُورتِ سیماب تڑپے گی وحید اب حشر تک
برق نے دیکھا تھا اک دن اضطرابِ زندگی

آرزو

۸۴

(از جناب حبیب الرحمٰن خان صاحب حبیب جبلپوری)

عشق ہی ہو ناکامیابِ آرزو
دل ہو وقفِ اضطرابِ آرزو

[illegible]
[illegible] ربابِ آرزو

[illegible]
[illegible] جوابِ آرزو

[illegible]
[illegible] حبابِ آرزو

[illegible]
[illegible] کتابِ آرزو

[illegible]
[illegible] آرزو

داغِ دل داغِ جگر داغِ فراق
ہیں عنوانِ کتابِ آرزو

[illegible]
[illegible] جوابِ آرزو

[illegible]
[illegible] خرابِ آرزو

دامنِ گلچیں

بمبئی کی ایک فلم ایکٹریس صاحبہ نے عیار ڈائریکٹروں کے خلاف ایک زہر آلود مضمون لکھا ہے:-

اس مضمون میں یہ تہذیب جدید کی "ساحرہ" لکھتی ہیں۔

میں اپنے دس برس کے تجربہ کے بعد یہ کہتی ہوں کہ بہت کم فلمساز اور بہت کم ڈائریکٹر نیک چلن ہیں۔ و... زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو بظاہر بھولے بھالے ہیں لیکن در اصل بدمعاش ہیں۔

مضمون کے آخری حصے میں یہ محترمہ لکھتی ہیں۔

ایک رات کا ذکر ہے کہ میں بے خبر سو رہی تھی۔ میں نے یہ دیکھا کہ ڈائریکٹر صاحب بے تکلف میرے کمرے میں آگئے اور مجھے شوق میں ڈوبی ہوئی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

سوال یہ ہے کہ: جب آپ "بے خبر" سو رہی تھیں تو پھر آپ نے یہ مظاہرۂ عشق کس طرح دیکھ لیا ؟-

---

بیان کیا جاتا ہے کہ رائے پور (بنگال) میں ایک ایسی انجمن قائم ہوئی ہے جس کا مقصد عورتوں کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا کرنا ہے۔ اس انجمن کی رُکنیت کا شرف حاصل کرنے کے لئے مندرجہ ذیل شرائط کی پابندی ضروری ہے۔

(۱) عورت کا ذکر محبت کے ساتھ نہیں کیا جائیگا۔

(۲) عورت کی طرف للچائی ہوئی نگاہ سے دیکھنا سنگین جرم ہے۔

(۳) شادی کی ہمیشہ مخالفت کی جاتے گی

(۴) جس جلسے میں عورتیں شریک ہوں گی اس کی شرکت سے پرہیز کیا جاے گا۔

اس انجمن کے صدر صاحب نے ایک "فاضلانہ خطبہ" میں ارشاد فرمایا ہے عورت رنج و غم، تفکرات، اور پریشانیوں کا سرچشمہ ہے۔ عورت کے ساتھ محبت کرنے کے نتائج اس کے سوا کچھ نہیں کہ مرد اپنی بہترین قابلیتوں کا خاتمہ کر دے اور اپنے دل و دماغ کو رنج و غم کے حوالے کر دے۔

انجمن کے اغراض و مقاصد اور صدر صاحب کے "سنسنی خیز" خطبہ کے پڑھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس انجمن کے "ارکانِ محترم" عورتوں کی "اطاعت و فرمانبرداری" سے تنگ آچکے ہیں۔ آل انڈیا خواتین کانفرنس کو اس "انجمن" کا جلد سے جلد "خیر مقدم" کرنا چاہئے۔

لاہور کی مس نینسی جیمس نے اخبار کے ایک نمائندے کو اطلاع دی ہے کہ ۱ر جنوری کی شب کو جب کہ میں اپنی ایک سہیلی کے مکان پر سو رہی تھی، رات کے دو بجے تھے گھٹائیں چھا رہی تھیں۔ بادل گرج رہے تھے۔ ہوا چل رہی تھی۔ ننھی ننھی بوندیں پڑ رہی تھیں۔ سردی حد سے زیادہ تھی اس ہولناک وقت میں ایک چور میرے لحاف کے اندر گھس گیا۔ اس کی حرکت سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے اسے دبوچ لیا اور اس کے ایک گھونسا بھی رسید کیا لیکن وہ نکل کر بھاگ گیا۔

دوسری اینگلو انڈین ایکٹریس مس جون بیری نے پولس میں رپورٹ کی ہے کہ ۱ر جنوری کی شب کو جب کہ میں مسز قلبی کے مکان پر سو رہی تھی اور ہلکی ہلکی بارش بھی ہو رہی تھی رات کے دو بجے ایک شخص میرے بستر میں گھس آیا اور میرے شور مچانے پر ملزم بھاگ گیا۔

معلوم ہوتا ہے ۱ر جنوری کی شب کو کالے کالے بادلوں سے صرف چوروں کی بارش ہوئی تھی۔

ایک "سحر طراز" ادیب صاحب "مشرقی تہذیب" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

آج سے دو سو سال پہلے ہندوستان مشرقی تہذیب کا گہوارہ تھا۔ یہاں قدیم تہذیب کے جلوے نظر آتے تھے حضرت جہانگیر کے زمانہ میں شعر و شاعری کی مجلسیں گرم ہوتی تھیں۔ اہل کمال کو بڑے بڑے انعامات دیے جاتے تھے۔ زیب النساء کا کلام خاص توجہ سے سنا جاتا تھا۔

(بقیہ صفحہ ۱۳ پر)

لطائف وظرائف

(از ملا نمکین دہلوی)

سارجنٹ۔ (سپاہی سے) تم بیمار ہو۔ کیا چھٹی چاہتے ہو

سپاہی۔ جی ہاں

سارجنٹ۔ کیا بیماری ہے

سپاہی۔ رات کو سوتے سوتے چلنا شروع کر دیتا ہوں

سارجنٹ۔ تو چھٹی کی کیا ضرورت ہے تمہیں رات کے پہرے پر لگا دیا جائیگا۔

میں نے کسی جگہ پڑھا ہے کہ ریڈیو سے جراثیم بھگائے جاسکتے ہیں ہونگے۔ مگر یہ اسی وقت ممکن ہے جب جراثیم ریڈیو سن بھی سکیں

ایک فلم کا معرکہ آرا منظر پردے پر دکھایا جارہا تھا۔ ناظرین بڑے ذوق شوق سے خاموش بیٹھے دیکھ رہے تھے دفعتاً ہیروئنے ہیرون کے طمانچہ مارا۔ تمام ہال میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ایک چھوٹے بچے کی آواز سنائی دی

امی جان یہ آپ کی طرح پلٹ کر تھپیڑ کیوں نہیں مارتی

مالی ادہر ادہر گھوم کر باغ کی نگرانی کر رہا تھا یکایک اس نے سیب کے ایک درخت کی شاخوں میں سے دو ٹانگیں لٹکی ہوئی دیکھیں۔ مالی نے چلا کر کہا "سیب چرانے آیا ہے" بدمعاش تو ہے کون

ایک خوفزدہ چہرہ پتوں میں سے نمودار ہوا اور مالی کو جواب ملا میں چوری کرنے نہیں آیا ہوں"

جھوٹ مت بول۔ بتا تو یہاں کس لئے آیا تھا۔

معاف فرمایئے جناب۔ میں ابھی ابھی اپنے بھائی کے ہوائی جہاز میں سے گر پڑا ہوں لڑکے نے جواب دیا۔

ایک شخص ایک دوکان پر حجامت بنوانے گیا۔ حجام سے استرا اتنی بے احتیاطی سے چلایا کہ چہرہ کی جلد کئی جگہ سے کٹ گئی۔ خون کی روک تمام کیلئے حجام ہر زخم پر کاغذ کا ایک ٹکڑا کاٹ کر چپکا دیتا۔ جب حجامت ہو چکی تو خریدار نے ایک چونی اس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔ تم جیسے ماہر حجام کیلئے یہ چار آنے بہت کم ہیں کیونکہ تم بیک وقت حجام۔ قصاب اور آرٹسٹ ہو۔ یہ خریدار مشہور مسخرہ چارلی چپلن تھا۔

ایک انگریز عورت جہاز سے اتری۔ دفتر کسٹم کے افسر نے پوچھا محترمہ آپ کے پاس کوئی پالتو جانور تو نہیں "بالکل نہیں" عورت نے جواب دیا افسر نے ذرا سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ تو کیا مجھے یہ سمجھنا چاہیے کہ آپ کے کوٹ کے نیچے جو دم نکل رہی ہے وہ آپ کی ہے۔

ایک ننھا لڑکا اسکول جا رہا تھا اور خدا سے دعا کرتا جاتا تھا۔ خداوندا مجھے دیر سے اسکول نہ پہنچانا اچانک اس کے پاؤں کو ٹھوکر لگی اور وہ گر گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھا اور بولا "مگر دھکے تو نہ دو اللہ میاں"

جہاز کے مسافروں کی رہنمائی کے لئے ایک افسر تختۂ جہاز پر کھڑا کہہ رہا تھا۔

پہلا درجہ بائیں طرف۔ دوسرا درجہ دائیں طرف

ایک نوجوان لڑکی گود میں شیرخوار بچہ کو لئے ہوئے داخل ہوئی اور ایک منٹ کے لئے رک گئی۔ افسر نے ملائمت سے پوچھا

محترمہ۔ پہلا یا دوسرا

وہ شرما کر بولی نہ پہلا نہ دوسرا میں تو محض اسکی نرس (دایہ) ہوں

طبی دنیا

بینائی کو خطرہ

(از جناب حکیم مقرب حسین صاحب مقرب دہلوی)

ہر شخص جانتا ہے کہ دنیا میں بصارت سے بڑھکر کوئی نعمت نہیں۔ اس لئے بصارت کی حفاظت میں ہمیں پوری تندہی کے ساتھ احکامات طبی پر عملدرآمد کرنا چاہیئے۔ یہ موضوع چونکہ بہت ضروری ہے اس لئے ناظرین "مشہور" کے لئے کوشش کے ساتھ مختلف طبی کتابوں سے معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ امید کہ آپ توجہ کے ساتھ مطالعہ فرمائینگے۔ (مقرب دہلوی)

شیخ بو علی کی کتاب قانون کی تیسری جلد میں لکھا ہے کہ تین اُمور سے نظر میں فتور آتا ہے۔

(ایک) افعال و حرکات جو عمل میں آئیں۔

(دو) غذائیں یعنی جو چیزیں کھائیں جائیں

(تین) غذاؤں کا تصرف (یعنی ان کے ضرر سے بچنا)

افعال میں، جماع کی کثرت سے بینائی کو نقصان پہنچتا ہے چمکتی چیزوں پر بہت دیر تک نظر کرنے سے بھی آنکھوں کو ضرر پہنچتا ہے بہت باریک کام کرنا یا باریک لکھے ہوئے کو تامل کے ساتھ پڑھنے سے بھی بینائی کو نقصان پہنچتا ہے۔

پیٹ بھرے پر سونا۔ یعنی کھانا کھاتے ہی سو جانا بینائی کے لئے مضر ہے۔ اتنی دیر ضرور جاگے کہ کھانا ہضم ہو جائے۔

قبض کا ہونا۔ نمکین چیزیں اور تیز چرچری چیزیں کھانے سے بینائی کمزور ہو جاتی ہے۔

وہ قے جو معدہ کو صاف کرتی ہے آنکھ کو نفع پہنچاتی ہے اور اور وہ قے جو دماغ کے مواد کو حرکت دیتی ہے آنکھ کو ضرر پہنچاتی ہے بہت رونا بھی ضرر پہنچاتا ہے۔ بہت سونا بھی نقصان کرتا ہے۔ فصد بہت کھلوانا اور پے درپے پچھنے لگانا بھی بینائی کو نقصان پہنچاتا ہے۔ غذاؤں میں گندنا۔ پیاز۔ لہسن تلسی جنگلی۔ سویا۔ مسور کی دال کل چیزیں مضر کرتی ہیں اور غذاؤں کا تصرف یہ ہے اگر کھائی جائیں تو ان کے فساد اور کثرت بخارات سے بچا جائے۔ یعنی غذا کھانے کے بعد ایسی مصلح دوا یا عمل کیا جائے کہ غذا کی مضرت سے محفوظ رہے۔

جب آنکھ سرمگیں بغیر سرمہ لگائے نظر آئے اور اس کی وجہ رطوبات کی زیادتی ہو تو ایسی آنکھ شب رات کو بینائی بہت کم ہو جائیگی۔ اس واسطے کہ اندھیرے کا دیکھنا اس بات کا محتاج ہے کہ جو چیز دیکھی جائے اس پر غور کیا جائے پس جب ایسی آنکھ کا آدمی دیکھنے پر آمادہ ہوتا ہے تو وہ رطوبت جو آنکھ میں ہوتی ہے آنکھ میں بھر کر پردہ سا بن جاتی ہے اسی وجہ سے اشیاء رات کو صاف طور پر دکھائی نہیں دیتیں۔

برخلاف کرنجی آنکھ کے جس کی بینائی رات کو سوا ہو جاتی ہے آنکھوں کے امراض چار قسم کے ہوتے ہیں ایک تو وہ جو مزاجی مادے ہیں جن کے پیدا ہونے سے مزاج بگڑ جاتا ہے۔ دوسرے مزاجی سادے ہیں یعنی وہ امراض جو بغیر مادے کے حادث ہوتے ہیں اور مزاج میں خلل آتا ہے۔ تیسرے ترکیبی ہیں یعنی وہ مرض جن سے آنکھ کی ترتیب میں فرق پیدا ہوتا ہے۔ چوتھے وہ امراض ہیں جو تفرق اتصال سے عارض ہوتے ہیں۔ جن سے ورم ظاہر ہوتا ہے پس ان امراض میں جو مادۂ فاسد سے ہوں مادوں کا نکالنا ہی علاج ہے اور جو امراض بغیر مادے سے ہوں ان کا علاج فقط تبدیل مزاج ہے اور وہ امراض جن سے آنکھ کی ترکیب میں فرق آتا ہو تبدیل ہیئت ہے۔ جیسے جحوظ العین میں یعنی ابھرنا آنکھ کا اور اگر کوئی زخم یا ناسور ہو تو اس کے علاج کی یہ صورت ہے کہ زخم بھریں اور گوشت کو پیدا کریں۔ پس جہاں استفراغ کی حاجت ہو اور مادہ نکالنے کی ضرورت ہو تو آنکھ کے فاسد مادہ فاسد کو یا تو کسی اور جانب پھیر دیں۔ یا مادہ کے کھینچنے کی تدبیر کریں اور آنکھ کے مادے کو بدن کی جانب کھینچنا اچھا ہے۔ مثلاً اگر آنکھ دموی مادہ سے بھری ہوئی ہو اور بدن میں بھی مادہ وہی ہو تو بدن کی جانب مادہ کو لائیں اور آنکھ کو اس کے ضرر سے بچائیں۔

وہ حالات مرض جن سے مریض کی موت کا حکم لگایا جا سکتا ہے

(اول) جس مریض کی آنکھوں میں بغیر آشوب غایت تیرگی یا سیاہی آجائے یا بے اندازہ سرخی آجائے تو سمجھ لینا چاہیے کہ اس کی موت کا وقت آگیا ہے کیونکہ آنکھوں کی تیرگی دلالت کرتی ہے کہ آنکھوں میں سردی آگئی ہے اور سرخی دلالت کرتی ہے کہ دماغ میں اور اس کی جھلیوں میں مادہ خون آگیا ہے جس کی وجہ سے مریض جانبر نہیں ہو سکتا۔

(دوئم) جب آنکھوں کی سفیدی نیند میں نظر آئے اور یہ صورت کبھی صحت کی عادت میں نہ پائی جائے اور نہ کسی استفراغ کے بعد ہو تو اس صورت میں بھی ہلاکت کا قوی امکان ہے اس لئے کہ یہ ضعف دماغ کی علامت ہے۔

(سوئم) جب تپ محرقہ میں کسی مریض کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو جائیں اور زبان پر پھنسیاں نکل آئیں تو سمجھنا چاہیے کہ مری اور معدہ میں زخم پڑ گئے ہیں۔ جس کے باعث مریض کی ہلاکت یقینی ہے۔

(چہارم) جب بیمار کے بدن میں کوئی زخم پرانا ہو اور پھر وہ سبز یا سیاہ ہو گیا ہو تو یہ علامت بہت بری ہے کیونکہ جو عضو پہلے ہی ماؤف ہو گیا ہے وہ ہر عضو سے پہلے مر جاتا ہے اور یہ حرارت غریزی کے ضعف کی وجہ ہے۔

(پنجم) جس مریض کو تیز بخار ہو اور باہر سے بدن سرد ہو اور اس کے ساتھ پیاس بھی ہو تو ایسی تپ موت کی نشانی ہے اس واسطے کہ یہ صورت ظاہر کرتی ہے کہ بدن کے اندر ورم ہے جس سے مریض اس قدر بے قرار ہے اور یہ حرارت اس ورم کی طرف لوٹ کر جاتی ہے اور پیاس لگاتی ہے اور خون بھی اسی ورم کی طرف جاتا ہے اور باطن بدن کو جلاتا ہے۔

(ششم) جب مریض کو تیز بخار اور قوی حرارت ہو اور اس بخار کے سبب یہ کیفیت بھی ہو کہ حرارت تسکین پائے اور بدن اچھا ہو جائے تو سمجھنا چاہیے کہ اس حالت میں مریض کی موت جلد آنے والی ہے اور وجہ یہ ہوتی ہے کہ حرارت بدن کے اندر گھس جاتی ہے پس اندر ہی اندر جلاتی ہے اور قوت حیوانی مادہ مرض کے دفع کرنے کو آمادہ تو ہوتی ہے مگر اپنے میں طاقت نہیں پاتی لہذا جب قوت حیوانی ساقط ہو جائیگی تو بے شک مریض کو موت آجائے گی۔

(ہفتم) جب پیشاب میں گندی بو آئے اور بیماری بھی گرم پائی جائے تو اس سے یقین کر لیا جائے کہ حرارت غریزی فنا ہو رہی ہے اور جگر میں سردی ایک بیگانی گرمی کے ساتھ پیدا ہوتی ہے اس لئے موت یقینی ہے۔

(ہشتم) سیاہ رنگ کا پیشاب جبکہ اس کا پھوک دانہ دار ہو اور بلبلوں سے مشابہت رکھتا ہو اور اس کے ساتھ شر سیف میں تناؤ اور درد بھی پایا جاتا ہو تو ایسا پیشاب بھی موت کی نشانی ہے۔

(نہم) وہ استسقا جو امراض حادہ سے پیچھے تپ اور الم کے ساتھ ہو، مریض کو مار ڈالتا ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ جب جگر کی سردی سے استسقا ہو تو اس قوت میں جو خون پیدا کرتی ہے ضعف پیدا ہو تو اس کی شفا گرمی پہنچانے سے اور گرم دواؤں کے عمل میں لانے سے ہوگی اور جب ہم ایسی دواؤں کا استعمال کرینگے تو ظاہر ہے کہ تپ اور الم کی قوت بڑھ جائیگی اور اگر ہم تپ کے سبب سے سرد دواؤں کا استعمال کریں گے تو استسقا بڑھ جائیگا۔ اور دونو حالتوں میں زندگی مخدوش ہے۔

(دہم) جب کسی شخص کو سوکھی کھانسی کے ساتھ بخار آئے اور اور بخار جا کر کھانسی رہ جائے تو یہ صورت اس امر پر دال ہے کہ جوڑوں میں پھوڑے پیدا ہوں اور ان کی وجہ سے ممکن ہے کہ مریض جانبر نہ ہو سکے۔

حسین عورت کے دِل میں جگہ

وہی مرد حاصل کر سکتا ہے جس کی قوت باہ اعلیٰ پیمانے پر ہوگی۔ اور جو چیز بارش کے قطروں کی طرح مسلسل قوت باہ پیدا کرتی ہے وہ

عرق ماءُ اللحم جدید

تیار کردہ "مشہور دواخانہ" دہلی ہے! اس عرق کا ہر قطرہ جزو بدن ہو کر خون کی بوند بن جاتا ہے اور پھر یہ خون کی بوندیں جسم کی کہنگی اور فرسودگی کو منٹوں میں تازگی اور شادابی سے تبدیل کر دیتی ہیں یہی وجہ ہے کہ اِس عرق کے پینے والے جوان ہوں تو نوجوان اور بوڑھے ہوں تو جوان بن جاتے ہیں یوروپ کے ڈاکٹر اعادہ شباب کے لئے سرتوڑ کوشش کر رہے ہیں مگر ابھی تک وہ کامیاب نہیں ہوئے لیکن آپ کی طب یونانی نے اِس عرق کے ذریعہ اعادہ شباب کا عمل مکمل کر دیا۔ اس عرق کے فوائد یہ ہیں (۱) اعضائے رئیسہ کو تقویت دیتا ہے (۲) خون اور گوشت پیدا کرتا ہے (۳) قوت مردانہ کو کمال پر پہنچاتا ہے (۴) چہرے کا رنگ نکھارتا ہے۔ (۵) روح کو قوی کرتا ہے۔

لہٰذا آج ہی منیجر مشہور دواخانہ دہلی کو خط لکھ کر عرق ماءاللحم جدید کی بوتل منگا کر لطف جوانی اُٹھائیے۔ **قیمت:۔** فی بوتل چار روپے آٹھ آنے (للعہ) علاوہ محصول ڈاک +

نوٹ:۔ تین بوتل کے خریدار کو محصول معاف ۔۔۔۔ اسٹیشن کا نام ضرور لکھنا چاہیئے +

رباعیات

حکمت سے نہ تھی شانِ مشیت خالی
علت سے نہ تھی زمن میں علالت خالی
سوچا کہ اگر ہو گئے عابد بھی شہید
رہ جائے گی آغوشِ سیادت خالی

حیدر دہلوی

جو شمع تھی پروانہ ہوئی جاتی ہے
ہر زلف رسا شانہ ہوئی جاتی ہے
تحلیل کی رو میں ہر حقیقت اے جوش
فریاد۔ کہ افسانہ ہوئی جاتی ہے

جوش ملیح آبادی

راحت کا ہر اک جان کی ساماں بن جا
ہو درد جہاں تو وہیں درماں بن جا
اتنی تو مری مان ہی لے اے اخگر
صورت میں ہی سیرت میں بھی انساں بنجا

اخگر مراد آبادی

ارباب قیود تجھکو کیا دیکھیں گے
خواہان نمود تجھ کو کیا دیکھیں گے
رویت کیلئے شرط ہے میدان فنا
پابند وجود تجھ کو کیا دیکھیں گے

شاد عظیم آبادی

سودائی و دیوانہ ہوا جاتا ہوں
عبرت کا ایک افسانہ ہوا جاتا ہوں
وارفتگیٔ شوق کا عالم یہ ہے
ہر جلوہ سے بیگانہ ہوا جاتا ہوں

عابد شاہجہانپوری

وہ ذات منزہ ہے جو آب و گل سے
خلوت سے الگ ہی نہ جدا محفل سے
نام آتا ہے در پردہ زباں پر شاکر
رہتا ہے کہاں! پوچھ یہ میرے دل سے

شاکر میرٹھی

جی بھر کے وہ آنکھوں میں سماتے جاتے
رہتے شوکت کو آزماتے جاتے
رونا تو یہ ہے کہ ہائے مانند نظر
کچھ دیر لگی نہ ان کو آتے جاتے

شوکت بلگرامی مرحوم

سوز و ساز

از رشحات قلم رفیق غازی، سیالکوٹی۔

بشیر عہد طفولیت سے ہی میلوں اور ہنگاموں سے دور بھاگتا تھا وہ خود حیران تھا کہ اس کی طبیعت محفل عیش و مسرت سے کیوں محظوظ نہیں ہوتی۔ اس کے ہم عصر اکثر اس کے متعلق پوچھا کرتے لیکن وہ ہمیشہ انہیں کسی نہ کسی بہانے ٹال دیتا۔ اب جب کہ حمید کی شادی تھی جو بشیر کا ساتھ کھیلا دوست اور قریبی رشتہ دار تھا۔ اگر کسی رشتہ دار کی شادی ہوتی تو شاید شرکت نہ کرتا لیکن دوستی کے تعلقات دیرینہ کی بناء پر اس نے ایسا کرنا مناسب نہ سمجھا کہ حمید کو ناراض کرکے اس کے شیشۂ دل کو ٹھیس پہنچائے۔ سو اس نے حمید کو لکھ دیا کہ وہ برات سے ایک روز قبل لاہور پہنچ جائے گا۔

چاندنی ہر سو چھٹکی ہوئی تھی۔ بشیر ایک کونے میں رضائی اوڑھے دبکا پڑا تھا۔ کوئی گیارہ کا عمل ہوگا کہ اس کے کانوں میں ڈھولک کی گھمبیر آواز سنائی دی جو بتدریج بڑھتی چلی گئی۔ ساتھ ہی ایک دلآویز نسوانی آواز جذب سماعت ہوئی۔ آواز سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی تھی۔ وہ حیران تھا کہ عیش و نشاط کی با مسرت اور پُر کیف گھڑیوں میں یہ دلخراش گانا کیوں؟ کاش! کسی کے پہلو میں حساس دل ہوتا جو ان معنی خیز اشعار کو سمجھتا۔ لیکن کون ایسا تھا جو اس گانے کو قلبی احساسات کے زیر اثر بہ نظر غور دیکھتا۔ اس پر ایک اختلاجی کیفیت رونما ہوئی۔ مضطرب ہوکر اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا تاکہ معلوم کرسکے کہ وہ کون ایسی حرماں نصیب حسینہ ہے جو غم و یاس کی اتھاہ پہنائیوں میں غرق ہو کر گا رہی ہے۔ معاً اسے یہ شعر سنائی دیا۔

"ماہی پیڑ و نڈا جاندوں۔ ہس کے جے لایاں سن
ہائے ماہیا تے ہس کے نبھا جاندوں"

شعر کیا تھا گویا دکھی دل کی پکار، کسی جاں بلب کے دردانگیز نالے، کسی فریادی کی غم و رنج میں ڈوبی ہوئی لرزاں آواز تھی قلبی حسیات کا ترجمان شعر، فضا کی ترنم زا خنک ہوا میں جذب ہو کر رہ گیا۔ "ہائے ماہیا" کہنے کو تو چند سیدھے سادے الفاظ ہیں لیکن اس کا ایک ایک لفظ جہان غم و یاس کی تہ میں لپٹا ہوا ہے۔ آشفتہ سر دوسرے کمرے میں داخل ہوا جہاں چند رنگین مزاج نوجوان حمید کے گرد حلقہ باندھے ہنسی مخول میں محو تھے۔ جونہی اس نے کمرے میں قدم رکھا "آیئے آیئے" کا شور بلند ہوا۔ لیکن بشیر الٹے پاؤں پھرا۔ ابھی قدم باہر ہی رکھا تھا کہ رشید نے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "چلو بھائی! برآمدے میں چل کر بیٹھیں" دونوں ساتھ والے برآمدے میں جا بیٹھے۔ بشیر نے رشید کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "سنو! یہ لڑکی کس قدر خوش الحان ہے!" "ہاں" رشید نے کہا "کون ہے کیا تم جانتے ہو؟" بشیر نے بہ نگاہ استفسار اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "یہ بیچاری حمید کی منگیتر طلعت ہے۔ وہ مظلومہ جسے آج حمید کی آغوش محبت میں جذب کیا جانا تھا۔ جس نے حمید کے ساتھ اپنی زندگی کے پُر کیف لمحات گزارنے تھے۔ لیکن ایسا نہ ہوسکا۔ اس کی امیدوں اور آرزوؤں کو حمید اور اس کے والدین نے کچل ڈالا۔ اس کی وہ رنگین دنیا، جو اس نے حمید کے مشورے سے بنائی تھی ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی۔ وہ تصورات جو شب و روز اس کی دلبستگی کا سامان تھے نقش باطل کی طرح مٹ گئے۔ دل ٹوٹ گیا لیکن لوح دل پر حمید کی تصویر ویسے ہی منقش تھی۔ حمید نے اسے ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا لیکن وہ لمحہ بھر کے لئے فراموش نہ کرسکی۔

انسان پر جب مصیبت آتی ہے تو ہزار ہا صدمات اور گوناگوں تکالیف کی مظہر ہوتی ہے۔ کسے معلوم تھا کہ طلعت کی منگنی جو نہایت تزک و احتشام سے حمید کے ساتھ کی جا رہی ہے ادھوری رہ جائے گی نہ کسے خبر تھی کہ مسلسل نقصان مایہ طلعت کے والد کو مفلس و قلاش بنا دیگا تقاضائے وقت کے ساتھ ساتھ طلعت کا والد مسعود غریب الحال ہوگیا۔ اس کے بکیس و مجبور ہونے کے باوجود بھی لوگ یہی خیال کرتے کہ بھائی امیر ہے اور پھر اسی بھائی کی بدولت روپوں میں کھیل رہا ہے۔ بھائی

کا دکھ دے گا تو ضرور اس کی مفلسی و بیکسی کو ڈھانپ لیگا۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ بیوی فازنہ نے کے ساتھ ساتھ بھائی نے بھی بے رخی اختیار کرلی اس نے غریب بھائی کے سر پر شفقت کا ہاتھ نہ رکھا۔ جاہ و حشمت اور دولت و ثروت کے غرور میں آس بھائی سے جو اپنی متاعِ عزیز تک سے گریز نہ کرتا تھا اس قدر بے اعتنا اور روکھا ہوگیا کہ مفلس بھائی کا رشتۂ امید ٹوٹ گیا۔ آرزوؤں بھرا دل پاش پاش ہوگیا۔ دنیا اندھیر ہوگئی۔ دل کی ساری کائنات ادبار کے تیز رو جھکولوں میں منتشر ہوکر رہ گئی۔ ایسا کاری زخم آیا جس کا اندمال ناممکن ہوگیا۔ یہ جانکاہ صدمہ دل ہی کے بجائے دل آزار ثابت ہوا۔ جسے وہ برداشت نہ کرسکا اور بسترِ مرگ پر آخری دم توڑنے لگا۔

وقت گزرتا گیا۔ ماں مدت سے مرچکی تھی۔ باپ کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا۔ ادبار زدہ طلعت مریض بھائی کے سہارے زندگی کے تلخ دن پورے کرنے لگی۔ خیر جو کچھ ہوا خدائی حادثات کی وجہ وہ فقرہ مکمل نہ کرسکا۔ کسی کے پاؤں کی آہٹ سنائی دی اور اسی لمحہ کسی نے پکار کر کہا: "طلعت! کیا جارہی ہو؟" "ہاں بہن! رات کافی ہوچکی ہے۔ لیکن بھائی بیمار ہے جاکر دیکھ بھال کروں گی۔" "اچھا تو کل برات کے ساتھ چلوگی نا؟" "نہیں بہن! بھلا کیسے جاسکتی ہوں۔ بھائی کی حالت دن بدن بدتر ہوتی جارہی ہے۔ اگر میں برات کے ساتھ چلی گئی تو بھائی کی دیکھ بھال کون کریگا۔ اور پھر میرے پاس ایسے نفیس کپڑے ہی کہاں جو پہن کر برات کے ساتھ جاؤں گی۔" آخری فقرہ گلوگیرانہ آواز میں ادا کیا اور سلام کے بعد آگے بڑھی۔ مہتابی میں زرد چہرہ نمایاں طور پر نظر آرہا تھا۔ سادہ لباس غربت کی عریاں تصویر تھی۔ رشید نے بشیر کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا "بیچاری کا بھائی دق کی بیماری میں مبتلا ہے۔ حالت ناگفتہ بہ ہے۔ عنقریب وہ بھی زندگی سے ہاتھ دھولیگا اور ایک گناہ کبیرہ حمید کے والد کی لوحِ تقدیر پر ثبت کردیا جائے گا۔" "وہ کیسے!" بشیر نے حیران ہوکر پوچھا۔ رشید نے سگریٹ سلگایا اور یوں گویا ہوا۔

آج سے چالیس برس قبل طلعت کا والد، مسعود شہر میں امتیازی حیثیت رکھتا تھا۔ ہزاروں روپے کی تجارت تھی۔ خدا کی دی ہوئی ہر نعمت موجود تھی۔ عیش و آرام سے زندگی بسر ہورہی تھی۔ اسوقت محمود ابھی بچہ تھا۔ بھائی نے محمود کو اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ حصول تعلیم کے بعد اعلیٰ عہدہ پر ممتاز کرادیا۔ شادی پر ہزاروں روپیہ صرف کیے۔ اور اس کے بعد بھی ہر طرح سے ممد و معاون رہا۔ ہمیشہ آرزومند رہتا کہ بھائی کو کہیں کوئی صدمہ لاحق نہ ہو۔ جس سے شیشۂ دل کو ٹھیس لگے اور شکستہ ہوکر بکھر جائے۔ سو ہمیشہ بھائی کی آسودگی میں کوشاں رہتا۔ چنانچہ اپنے بیٹے کی منگنی بھتیجی عفت سے کردی اور طلعت کی بھتیجے حمید سے۔ اس سے مقصود یہ تھا کہ یہ ہمارے بعد مل جل کر رہیں اور زندگی کو خوش و خرم گزاریں۔ لیکن ایسا نہ ہوسکا اس کی تمام خواہشات تقدیر کی ایک ہی ٹھوکر نے کچل کر رکھدیں حوادث زمانہ نے اسے غریب و مفلس بنادیا۔ وہ مطمئن تھا کہ جب تک اس کا بھائی زندہ ہے اسے کوئی اندیشہ نہیں۔ اس نے بھائی کے آگے دستِ غربت دراز کیا لیکن ٹھکرادیا گیا۔ بھائی سے ایسی امید تو نہ تھی۔ اسے کامل وثوق تھا کہ وہ بھائی جس کی زندگی کے پودے کو اس نے خونِ تمنا سے سینچا ہے کبھی بھی ایسا برتاؤ نہ کریگا۔ لیکن اس کی امیدوں کے سراسر خلاف ہوا۔ آمدنی کی کوئی سبیل نہ تھی محنت و مشقت سے معذور تھا۔ اور پھر فوراً ہی بھائی کا عفت کی شادی دوسری جگہ کردینا۔ یہ پیہم صدمات جانکاہ اور ناقابلِ برداشت تھے۔

کلیم بوڑھے باپ کا سہارا، ضعیف العمری اور نقاہت کے زمانہ میں آنکھوں کے لیے اجالا اور باعثِ ضیا تھا۔ اپنی منگیتر کی شادی ہوجانے پر اسے ازحد قلق ہوا۔ وہ اندر ہی اندر گھلنے لگا حتّٰی کہ مرضِ دق میں مبتلا ہوگیا۔ باپ کی دنیا تیرہ و تار ہوگئی۔ اس کا رہا سہا سرمایۂ حیات لٹ گیا۔ آخر اس جانگداز صدمے کو سینے میں چھپائے اس دنیا سے بہت دور چلا گیا۔ دونو بہن بھائی بیکسی کی حالت میں مصیبت زدہ زندگی کا ماتم کرنے کے لیے رہ گئے۔ چونکہ ذریعۂ معاش کی تمام راہیں مفقود تھیں اس لیے کلیم اپنی بہن کے باقیماندہ زیورات بیچکر اپنا اور اپنی بے بس بہن کا پیٹ پالنے لگا لیکن کہاں تک مفلوک الحالی نے گھر تاک لیا۔ مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ بادِ صرصر کے ایک ہی جھونکے نے دو معصوم پودوں کی زندگیوں کو نیست و نابود کرکے رکھدیا۔ دو کمسن راہ گیر منزلِ مقصود تک پہنچنے سے پیشتر ہی لٹ گئے۔ آخر یہاں تک نوبت پہنچ گئی کہ اگر صبح کو کھالیا تو شام کو فاقہ کرنا پڑا۔ طلعت نے اپنی بیکسی اور فاقہ مستی کی کہانی چھپا

کوسنانی چاہی لیکن مظلومہ کی آہوں میں خودداری کی جھلک نمایاں ہوئی۔ وہ چچا جس نے اس کے رفیق زندگی کو چھین کر اسے دربدر کی ٹھوکریں کھانے کے لئے چھوڑ دیا اس کی حسرتوں اور آرزوؤں کا اس کے سامنے خون کرکے رکھدیا۔ کیا اس کے پاس فریادی بنکر جائے۔ ہرگز نہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔ معاً اسے خیال آیا۔ کیوں نہ وہ حمید کے پاس جائے وہ حمید جو لمحہ بھر کی مفارقت میں بھی سیماب وار مضطرب و بیقرار رہتا تھا۔ چنانچہ وہ حمید کے پاس آنسوؤں اور آہوں کی طوفاں بدوش لہروں میں سمٹی ہوئی داستان پُر الم لیکر فریادی ہوئی۔ اس نے عاجزی سے کہا "حمید! تمہاری راندۂ درگاہ جفاکار زمانے کی ٹھکرائی ہوئی معصوم طلعت، آج مفلسی و بیکسی کے ہاتھوں مجبور حاضر ہے اور اپنی داستان غربت کی شنوائی کی منتظر۔ حمید! تمہاری طلعت دامن غربت پھیلائے تیری ترحم آمیز نگاہوں کی طلبگار ہے۔" "بیٹھ جاؤ۔ طلعت!" حمید نے نرم لہجہ میں کہا۔ "حمید! میں وہی طلعت ہوں جو کبھی گہوارۂ امارت میں مستانہ وار جھومتی تھی وہ طلعت جس کے آرام و آسائش کے لئے سینکڑوں روپے نچھاور کئے جاتے تھے۔ آج وہی ایک وقت کے کھانے کے لئے غیر کی دست نگر ہے۔ وہ حمید جو کبھی میرا تھا اور ملے بغیر ایک لمحہ چین سے نہ بیٹھتا۔ مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بھول گیا جہاں تقدیر کے ظالم ہاتھ نے زندگی کا اثاثہ چھین لیا وہاں سہاگن ہونے سے پہلے ہی بیوہ بنا دیا۔ حمید! تم نے میری انمول زندگی کو کھلونہ سمجھ کر سپرد خاک کر دیا۔ بیشک میں اسی قابل تھی۔ سچ ہے۔ دولت ہی انسان کا سب کچھ ہے۔ جب دولت ہی بیگانہ وشی اختیار کر لی۔ تو عزیزوں اور رشتہ داروں سے کیا امید؟" "ایسا مت کہو۔ طلعت! میں مجبور تھا۔ یہ سب کچھ خلاف امید اور میری خواہش کے سراسر برعکس ہؤا۔ خیر جو بیت چکی سو بیت چکی۔ قسمت کا نوشتہ رد نہیں کیا جا سکتا۔ تقدیر کا فیصلہ اٹل ہے۔ طلعت!"

طلعت نے سرد آہ بھری اور کہا "حمید! میں اس دولت میں سے اپنا حصہ لینے آئی ہوں جو میرے ماں باپ نے تمہاری باپ پر عہد طفولیت میں صرف کی تھی۔" حمید سینے میں ایک حساس دل رکھتا تھا۔ طلعت کی مصیبت زدہ زندگی سے بیحد متاثر ہؤا۔ اشکوں کا سیلاب امڈ آیا۔ ضبط کے ٹانکے ٹوٹ گئے۔ آخر نم آلود آنکھوں کو صاف کرکے یوں گویا ہؤا "طلعت! کلیم کی صحت کیسی ہے؟" طلعت نے پھٹے پرانے دامن سے آنسو پونچھے اور کہا "کیا پوچھتے ہو حمید، اس اوبار زدہ کا حال جس کی زندگی کے پودے کو دیمک لگ چکا ہے بھلا وہ کب تک زندہ رہ سکتا ہے۔ آخر ایک روز اس کی زندگی کا چراغ بجھ ہی جائے گا۔ کوئی صورت نظر نہیں آتی کہ وہ" وہ آگے کچھ کہہ نہ سکی۔ اس کی آواز بھرّا گئی۔ حمید نے تسکین و تشفی دینے کی کوشش کی لیکن بے سود کیونکہ تاریک مستقبل کا بھیانک نقشہ روبرو تھا۔ وہ جانتی تھی کہ بہت جلد یا دفعتاً اسے اپنی آغوش میں ابدی نیند سلا دیگی۔ حمید نے پچاس روپے کے نوٹ دیئے اور مطمئن کیا کہ وہ ہر ممکن اس کی خبرگیری کریگا۔ طلعت جانے لگی تو حمید نے کہا "طلعت! پرسوں میری برات ہے۔ ضرور آنا۔" طلعت نے اثبات میں سر ہلایا اور چلی گئی۔

بشیر جو سر جھکائے داستان الم سُن رہا تھا۔ اُس نے کہا "اچھا تو وہ آج اپنے وعدے کے مطابق آئی تھی۔" "ہاں بشیر! اپنے غیر مندمل زخموں پر نمک افشانی کرنے آئی یا محض حمید کی خوشی کے لئے۔ بہرحال وہ پیکر وفا حمید کی یاد سے ایک لمحہ بھی غافل نہ رہی۔" ابھی فقرہ مکمل ہی کیا تھا کہ گھڑیال نے دو بجائے۔ رشید اور بشیر طوفان غم سینے میں لئے جا کر سو رہے۔

دوسری صبح کولوٹولہ سٹریٹ کے ایک عالیشان مکان کی کھڑکیوں اور دروازوں میں سے سورج کی زرّین شعاعیں چھن چھن کر سامنے ایک خستہ کوٹھڑی کی تاریکی کو دور کر رہی تھیں اور ایک نوجوان بستر مرگ پر پڑا دم توڑ رہا تھا۔ ناگہاں نوجوان کے لبوں کو حرکت ہوئی اور نحیف آواز میں پاس بیٹھنے والی حسینہ سے پوچھا "آج حمید کی شادی ہے؟" "ہاں" مہ جبیں نے کہا۔ اس کے زرد گالوں پر آنسو تھرا رہے تھے۔ اتنے میں باجوں کی ترنم ریز جھنکار نے خاموش فضا میں کیف پیدا کر دیا۔ نوجوان نم آلود نگاہوں سے مہ جبیں کو دیکھ رہا تھا کہ فرشتۂ اجل نے اس کی آنکھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیں۔ مہ جبیں نے دونوں ہاتھوں سے سر پیٹ لیا اور اس کی دردو کرب میں سمٹی ہوئی دلخراش آواز، باجوں کی کیف زا جھنکار میں جذب ہو کر رہ گئی۔

نقد و نظر!

ائے دید

یہ کتاب پروفیسر سجاد مرزا بیگ مرحوم کی ابتدائی تصنیف ہے لیکن انتہائی تمام جزیات پر حاوی
یہ عام قاعدہ ہے کہ قصص انسان کو بالطبع مرغوب ہیں اس لئے جو
ں فطرت ہیں مشکل مسائل کو قصہ کے پیرائے میں بیان کر جاتے ہیں۔
نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ مسائل جو لیکچروں کی سماعت کی تاب نہیں لا
تہ اس طریقہ سے پوری طرح دلنشین ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اس
ب میں بھی اخلاق۔ معاشرت۔ تمدن وغیرہ کے مسائل قصہ کے
ئے میں بیان کئے گئے ہیں جنہیں پڑھ کر کارآمد اور مفید معلومات
ل کی جا سکتی ہیں۔ فاضل مصنف نے جیسا کہ قدیم رواج ہے
ں کتاب کا آغاز بھی حمد و نعت سے کیا ہے مگر آپ ذرا اس حمد و نعت
اختصار کو دیکھیے جو صرف ایک شعر ہے مگر ایسا شعر جس پر طوالت
ہزار ہا اوراق قربان ہیں وہ یہ ہے ؎

زلاف حمد و نعت اولاست بر خاک ادب خفتن
سجودے می تواں کردن۔ درودے می تواں گفتن

سبحان اللہ۔ تعریف نہیں کی جا سکتی جتنی مرتبہ ثانی مصرعہ کو
ھیئے۔ بس درود پڑھیئے اور سجدے کیجئے۔ اس مثال سے آپ کو یہ
ر کرانا ہے کہ فاضل مصنف نے بے جا طوالت سے کام نہیں لیا
بلکہ اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے زندگی کے اکثر اہم مسائل حل کر دیئے
ں۔ اس کتاب کی دوسری خوبی یہ ہے کہ پڑھنے والوں کو صحیح اردو
ماتی ہے اور ان اصطلاحات و محاورات سے روشناس کراتی ہے
بان کی جان ہیں۔ لہٰذا ہم سفارش کرتے ہیں کہ اردو کے حامی
خصوص ناظرین "مشہور" اس کتاب کا ضرور مطالعہ کریں۔ حجم ۱۵۰
حات سائز ۲۰×۳۰/۸ قیمت صرف ۱ر علاوہ محصولڈاک

ملنے کا پتہ

رفی صفوۃ اللہ بیگ۔ سجاد منزل دہلی یا ممتاز بک ڈپو
ش خانہ۔ دہلی

شہنشاہیت

جناب گوبند سہائے جی۔ بی کام سابق پرائیویٹ سیکرٹری وزیر مال حکومت یو۔پی کی ہندی کتاب موسومہ "سنسار کی راج نیتی میں سامراج واد کا ننگا ناچ" کا "شہنشاہیت" اردو ترجمہ ہے جسے جناب مظفر شاہ خاں صاحب ظفر یوسفی نے کمال سلاست و بلاغت کے ساتھ کیا ہے اور مکتبہ برہان دہلی نے اسے شائع کر کے اردو داں پبلک پر احسان کیا ہے۔ اس کتاب میں شہنشاہیت کی پوری تاریخ کے ساتھ شہنشاہیت پرستوں کے کارناموں کو بتفصیل بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ کتاب ہذا کے نو ابوابوں سے یہ مقصد بخوبی ظاہر ہوتا ہے۔ پہلا دوسرا تیسرا باب شہنشاہیت ہی کے متعلق مخصوص ہے جس میں شہنشاہیت کی پیدائش اس کی تہذیب اور اس کے متعلق لینن کی رائے کا بھی اظہار کیا گیا ہے۔ چوتھے باب میں ۱۹۱۴ء کی عالمگیر جنگ کے اسباب بیان کئے ہیں۔ پانچویں باب میں اشتراکیت اور بالشویک انقلاب پر نظر ڈالی ہے۔ چھٹے باب میں فاتحین کی فریب کاریوں کا اظہار کیا ہے۔ ساتویں باب میں فسطائیت اور نازیت تحریک کے اسباب و علل بیان کئے ہیں۔ آٹھویں باب میں نتیجہ کے طور پر اس ہونے والی جنگ کی پیشین گوئی کی ہے جو حرف بہ حرف پوری ہو رہی ہے۔ نویں باب میں ۱۹۳۵ء سے لے کر ۱۹۳۸ء تک خاص خاص بین الاقوامی واقعات دکھائے ہیں۔

غرض کتاب ہر لحاظ سے مفید اور قابل مطالعہ ہے اس کے مطالعہ سے بین الاقوامی سیاست کا شعور پیدا ہو سکتا ہے لہٰذا ہمارا مشورہ ہے کہ اس کتاب کا ضرور مطالعہ کیا جائے۔ قیمت عہ ر
ضخامت ۲۰۰ صفحے، سائز ۲۰×۳۰/۱۶ مجلد

ملنے کا پتہ: مکتبہ برہان۔ نئی دہلی

صہبائے سخن

(از جناب محمد خورشید حسن صاحب نازش حیدری دہلوی)

پھر خیالِ عارضِ روشن زہینِ دل کرے
حسن پھر کوئی صحیفہ عشق پر نازل کرے

کیوں نہ دردِ عشق کو تیرے گوارا دل کرے
موجِ دریا سے کنارہ کس طرح ساحل کرے

بے تکلف وہ یہاں آئے مجھے غافل کرے
میں کسی قابل نہیں ہوں وہ کسی قابل کرے

اوّل اوّل اُن کا رازِ حسن ہو رسوائے عام
آخر آخر میری چشمِ شوق میں منزل کرے

دیدۂ حسرت سے کیوں بہ جائے پانی کی طرح
وہ لہو جس کو جگر پیدا بصد مشکل کرے

تُو تو کیا اے شعلۂ پیکر! میری چشمِ جستجو
خرمنِ برباد سے بھی بجلیاں حاصل کرے

حُسنِ بے پردہ سے تم بھی داد دینا عشق کی
خون پروانے کا جب شمعِ سرِ محفل کرے

چودھویں شب کی بساطِ چرخ تیری رہ گذر
اپنے نقشِ پا سے پیدا تو مہِ کامل کرے

جان آنکھوں میں دمِ نظارہ آنی چاہیئے
ایسے نازک وقت میں کون اعتبارِ دل کرے

آکے پستی میں جو دیکھے آدمیت کا وقار
ہر فرشتہ خود کو اہلِ عجز میں شامل کرے

مجھ سے ناکامِ ازل کا جس نے پردہ رکھ لیا
نازشؔ ایسی خاک پر رحمت خدا نازل کرے

وہ راتیں

(از جناب سید محمود احمد صاحب ضمیر البرکاتی دہلوی)

وہ راتیں اُف وہ راتیں جب سبق ہوتا تھا الفت کا
وہ راتیں اُف وہ راتیں جب بیاں ہوتا تھا قدرت کا
نہ نفرت کی شکایت تھی نہ شکوہ تھا محبت کا
نہ شکوہ کی تمنا تھی نہ ارماں تھا شکایت کا
"وہ راتیں" اور "وہ باتیں" اور "وہ تعلیمی ملاقاتیں"
خلوص و صدق میں ڈوبی ہوئی باہم مدارتیں

حقیقت میں وہی شب حاصلِ صد نوجوانی تھی
یہیں سے رونما عشق و جوانی کی کہانی تھی
نگاہوں میں دو جانب ایک نوید شادمانی تھی
مری اُس پر اور اُس کی میرے دِل پر حکمرانی تھی
محبت کی مسلسل وارداتیں[1] یاد آتی ہیں
"وہ راتیں یاد آتی ہیں" "وہ باتیں یاد آتی ہیں"

ہمارے اور اُن کے درمیاں صرف ایک الفت تھی
نہ پردہ تھا ہمارا اور نہ پردہ کی ہدایت تھی
نہ لکھنا جانتی تھی اور نہ رسم خط کتابت تھی
رہی کی کیا ضرورت تھی محبت کی ضرورت تھی
مجھے ماہرؔ[2] کے مصرع پر وہ باتیں یاد آتی ہیں
"وہ راتیں یاد آتی ہیں وہ راتیں یاد آتی ہیں"

---

[1] واردات (عربی) جمع ہے۔ اردو میں اسکی جمع وارداتیں کردی گئی۔ ایسی جمع الجمع اردو اشعار میں بہ کثرت موجود ہیں۔
[2] مولانا ماہر صاحب قادری کا مصرع ہے "وہ راتیں" الخ (ضمیر)

تنقید و تبصرہ

ڈاکٹر، کسوٹی، تاج محل اور سنگم ہماری نظر میں

ڈاکٹر

نیو تھیٹرس لمیٹڈ کلکتہ کی یہ لاجواب تصویر ہے جو جگت سینما دہلی میں پچھلے ہفتہ سے ارباب علم و ادب کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے۔

افسانہ کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک رئیس اعظم کا نوجوان لڑکا ولایت سے ڈاکٹری کی سند حاصل کرکے ہندوستان آتا ہے اور اپنی زندگی غریبوں کی خدمت کے لئے وقف کر دیتا ہے۔ اسی غریب نوازی کے سلسلے میں اس کی ملاقات ایک اچھوت لڑکی سے ہو جاتی ہے جو اپنے بلند کیرکٹر کے لحاظ سے عفت و عصمت کی دیوی تھی۔ ڈاکٹر امرناتھ اس اچھوت لڑکی کے ساتھ شادی کرلیتا ہے، لیکن "سماج کے ٹھیکیدار" اس کی اس حرکت کو ناقابل معافی قرار دیتے ہیں۔ سماج کی بے عنوانیوں سے تنگ آکر ڈاکٹر امرناتھ گھر سے باہر نکل جاتا ہے۔ اور ایک چھوٹے سے گاؤں میں زندگی بسر کرتا ہے۔

اس گاؤں میں ڈاکٹر امرناتھ نے ایک شفاخانہ قائم کرلیا تھا جس میں غریبوں کا علاج مفت کیا جاتا تھا۔ اور جس میں اس کی "اچھوت بیوی" ایک نرس کی حیثیت سے خدمات انجام دیتی تھی۔

کچھ عرصہ کے بعد ڈاکٹر امرناتھ کے ایک لڑکا پیدا ہوا اور اسکی ولادت کے موقع پر اس کی اچھوت بیوی کا انتقال ہوگیا۔

مرنے والی عورت نے اپنی زندگی کی آخری ساعتوں میں خدا سے یہ دعا مانگی تھی کہ میرا بچہ اپنی آئندہ زندگی میں ایک لائق ڈاکٹر بن جائے اور مخلوق کی خدمت انجام دے۔ بارگاہ الہی میں اس کی دعا قبول ہو جاتی ہے اور اس کا بچہ ایک نامور ڈاکٹر بنتا ہے۔

اس بچے کی شادی بھی ایک پست خاندان میں ہوتی ہے اور وہ سماج کے جور و ستم کو دفن کر دیتا ہے۔

تصویر اس قدر دلچسپ ہے کہ بار بار دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ موسیقی اور اداکاری کے لحاظ سے لاجواب ہے۔

پنتا، بھارتی، پنکج، چودھری، اور نیمو نے اداکاری کا بہترین نمونہ پیش کیا ہے۔

کسوٹی

نیشنل اسٹیڈیوز لمیٹڈ بمبئی کی مایہ ناز اور دلکش تصویر "کسوٹی"، جس کا شمالی ہند میں بے چینی کے ساتھ انتظار کیا جا رہا تھا ۱۲ر جنوری ۴۲ء کو موتی ٹاکیز دہلی میں ریلیز کر دی گئی۔

مشہور افسانہ نگار مسٹر عذرا میر اور مشہور ڈائرکٹر مسٹر چندر ٹھاکر نے اس تصویر کو دلچسپ اور کامیاب بنانے میں بہترین قابلیت کا ثبوت پیش کیا ہے۔

افسانے میں ماں کی محبت، وفادار بیوی کی جاں نثاری اور ایک طوائف کی فریب کاری کو نہایت ہی عبرت انگیز انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

کسوٹی کی ترتیب و تدوین لاجواب ہے۔ مکالمے اور گانے دلکش اور ادبی ہیں۔

مس روز، مسٹر پرہلاد، مسٹر ستیش اور رسنالینی دیوی نے جذبات کی ترجمانی کا حق ادا کر دیا ہے۔

کسوٹی کے لائق ڈائرکٹر مسٹر راجیندر ٹھاکر ایک روشن خیال ادیب اور ماہر فن ڈائرکٹر ہیں۔

موصوف نے ہندوستانی فلموں کا معیار بلند کرنے کی جو کامیاب کوشش کی ہے وہ یقیناً لائق ستائش ہے۔ افسانہ نگار مسٹر عذرا میر کی جدت طرازیاں بھی محتاج تعارف نہیں ہیں۔ وہ اپنے ہر افسانے میں کوئی نہ کوئی جدت ضرور پیش کرتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ان کے اکثر ڈرامے سو فیصدی کامیاب ہوئے ہیں۔

"کسوٹی" ہر لحاظ سے ایک کامیاب تصویر ہے اور ہمیں یقین ہے کہ اس سال کی تصویروں میں یہ ایک امتیازی حیثیت حاصل کرے گی۔

تاج محل

موہن پکچرز لمیٹڈ کا یہ تاریخی فلم ۳۰، جنوری سنہ ۴۲ء کو منروا ٹاکیز میں پہلی مرتبہ دکھایا گیا۔ اس فلم کے متعلق مسلمانوں کے ایک طبقے میں ایک ہلچل سی ہو رہی تھی اور پوسٹر بازی ہو رہی تھیں کہا جا رہا تھا کہ اس فلم میں اعلیٰحضرت شاہجہاں نور اللہ مرقدہٗ کی اہانت کا دل آزار پہلو ہے چنانچہ اس پروپیگنڈے کی وجہ سے اس فلم کا بہت شہرہ ہو گیا۔ یعنی مخالفوں کے ہاتھوں اس کی خوب پبلسٹی ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ افتتاح کے روز سخت جدوجہد کے بعد بھی ٹکٹ نہ مل سکے۔

ہماری رائے میں میسرز رمنک لال موہن لال کو مخالفین کا مشکور ہونا چاہئے۔

اس فلم میں اول سے آخر تک کوئی ایسی بات نہیں ہے جو مسلمانوں کی دل آزاری کا باعث ہو۔

تاریخی مناظر کے اعتبار سے اس فلم کا جواب مشکل ہے۔ مکالمے بھی بہت اچھے ہیں گانے بیحد دلچسپ ہیں۔ مزید براں اس فلم کی یہ معیاری خصوصیت ملاحظہ ہو کہ مسٹر رستم مودی نے اسے اپنے سینما ہال میں چلایا جس میں سکندر جیسا معیاری فلم چل رہا تھا۔

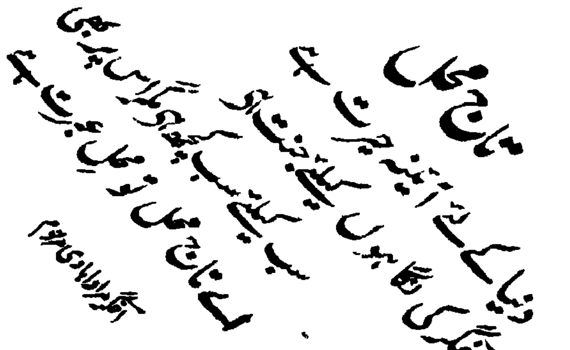
اداکاروں نے اپنا اپنا پارٹ نہایت خوبی سے ادا کیا ہے

ریکارڈنگ عکاسی سب اپنی اپنی جگہ پر لاجواب ہیں بہ حیثیت مجموعی فلم دیکھنے کے قابل ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس فلم کے دیکھنے سے ہندو مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق کی اسپرٹ پیدا ہو گی جس کی آج کل سخت ضرورت ہے۔

سنگم

یہ فلم ۳۰، جنوری سنہ ۴۲ء کو کمار ٹاکیز میں ریلیز کی گئی اس فلم کے لئے ہمیں خاص طور پر مدعو کیا گیا تھا۔ اسٹوری رائٹر مسٹر ڈی۔ ایس۔ فنانڈیکر ہمارے دلی شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے انسانی نفسیات کو سمجھ کر بہت اچھی کہانی لکھی۔ اصل چیز کہانی ہے اگر اس میں کوئی الجھن نہیں ہے اور ہمارے معاشرت و تمدن سے بیگانہ نہیں ہے تو ضرور کامیاب ہو گی یہ گویا بنیاد ہے اور اس کے بعد سارا کام عمارت ہے بنیاد کی پائیداری پر عمارت کا قیام منحصر ہوتا ہے اس لئے ہمارا فلمی کمپنیوں کو مشورہ یہی ہے کہ وہ پہلے بہترین اسٹوری رائٹر کی خدمات حاصل کریں۔

اس فلم میں مایا کا پارٹ مینا کشی نے بہترین طریقے پر ادا کیا ہے۔ اور ڈائرکٹر ونایک نے مادھو کی اداکاری کا حق ادا کر دیا ہے وہ سین بھی قابل دید ہے جب کسانوں کی مصیبتیں دیکھ کر مادھو اور نکار بابو کی کوٹھی پر پہنچا اور زمیندار صاحب پر دباؤ ڈالا۔ لگان چھوڑ دے مگر کسان خود ہی مرعوب ہو کر نرم پڑ گئے۔ ہماری رائے میں یہ فلم اصلاحی اعتبار سے بہت کامیاب ہوگا اور ملک کے غریب طبقے میں بہ نظر پسندیدگی دیکھا جائیگا۔ گانے بھی دلچسپ ہیں۔



(دُنیائے فلم کی اہم اِطلاعات)

دل کے آنسو

لاہور سے اطلاع موصول ہوئی ہے کہ مس شانتا آپٹے پنچولی آرٹ پکچرز کی نئی فلم "دل کے آنسو" میں بطور ہیروئن کام کرنے کے لئے ۱۵ جنوری کو لاہور پہونچ چکی ہیں۔ ڈائریکشن کے فرائض مسٹر موتی گڈوانی انجام دیں گے۔ پروڈکشن انچارج مسٹر رام نرائن بی۔ اے مقرر ہوتے ہیں۔ افسانہ ہندوستان کے مشہور ادیب مسٹر امتیاز علی تاج نے لکھا ہے۔ میوزک ڈائرکٹر ماسٹر غلام حیدر ہیں۔ اداکاروں میں شانتا آپٹے کے ساتھ مسٹر غلام محمد، ایم اسمٰعیل، مس منورما اور مس اختر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ تصویر صنعت فلمسازی کا ایک مایۂ ناز شاہکار ثابت ہوگی اور ایک ایسی تصویر ہوگی جس پر ہندوستانی فخر کریگا۔

مسٹر امتیاز علی تاج نے اس فلم کے مکالمے خاص توجہ اور محنت سے لکھے ہیں۔

سنگم

نوبتک پکچرز کی نئی تصویر "سنگم" کمار ٹاکیز دہلی میں ۳۰ر جنو ۱۹۴۱ء کو ریلیز کردی گئی۔

مکالمے اور گانے دلکش ہیں۔ مس مینا شنی، وتسلا، مسٹر ما اور و نایک نے اداکاری میں اپنے کمال فن کا اچھا نمونہ پیش کیا ہے

نئی روشنی

نیشنل اسٹیڈیوز کی دلکش تصویر "نئی روشنی" جگت دہلی میں عنقریب ریلیز ہونے والی ہے بیان کیا جاتا ہے کہ اس تصو ترتیب لاجواب ہے۔ مکالمے اور گانے بھی دلچسپ اور روح افزا ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ "نئی روشنی" مشہور ڈائرکٹر مسٹر محبوب شاہکار ہے۔ مس سردار اختر، حسن بانو، امرناتھ، کنھیالال اور مسٹر نے اداکاری کا اچھا نمونہ پیش کیا ہے۔

میری دنیا

مشہور کیرکٹر ایکٹر مسٹر مظہر خاں نیشنل آرٹسٹ کے اس میں خاص توجہ اور محنت کے ساتھ اس تصویر کو ڈائرکٹ کر ہیں۔

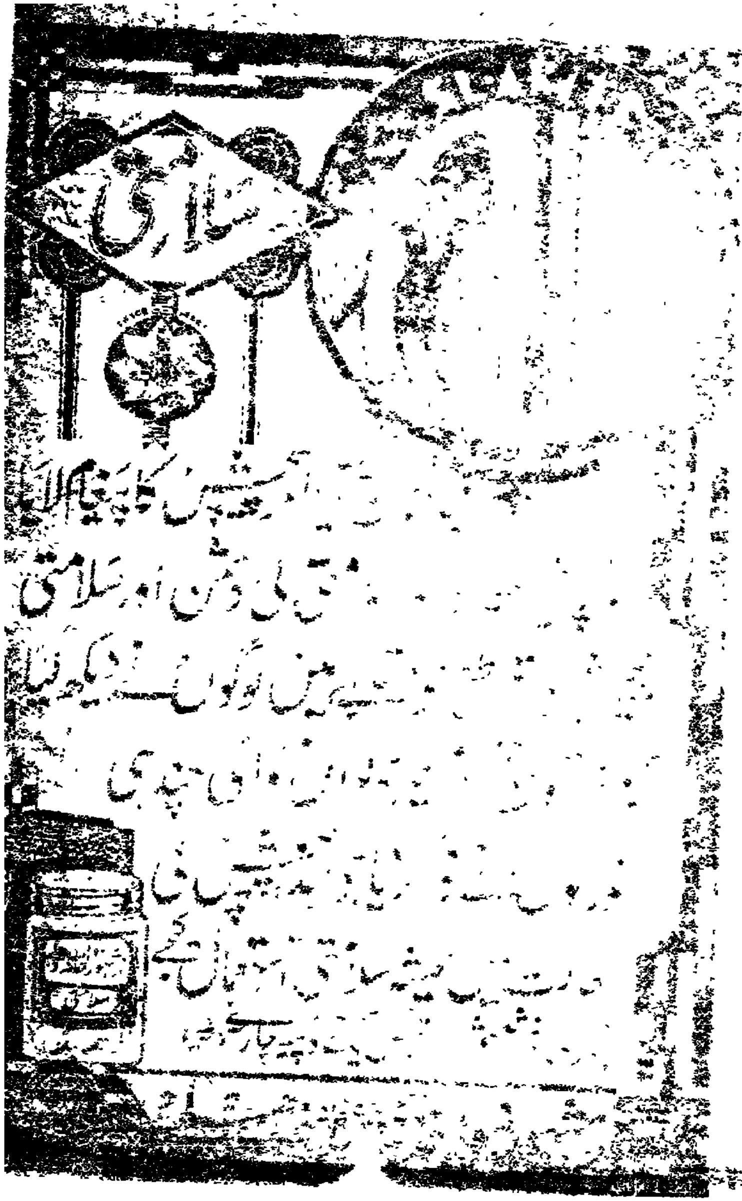
کہا جاتا ہے کہ یہ تصویر اس قدر دلچسپ ہے کہ اس کی تصویروں میں خاص درجہ حاصل کرے گی۔

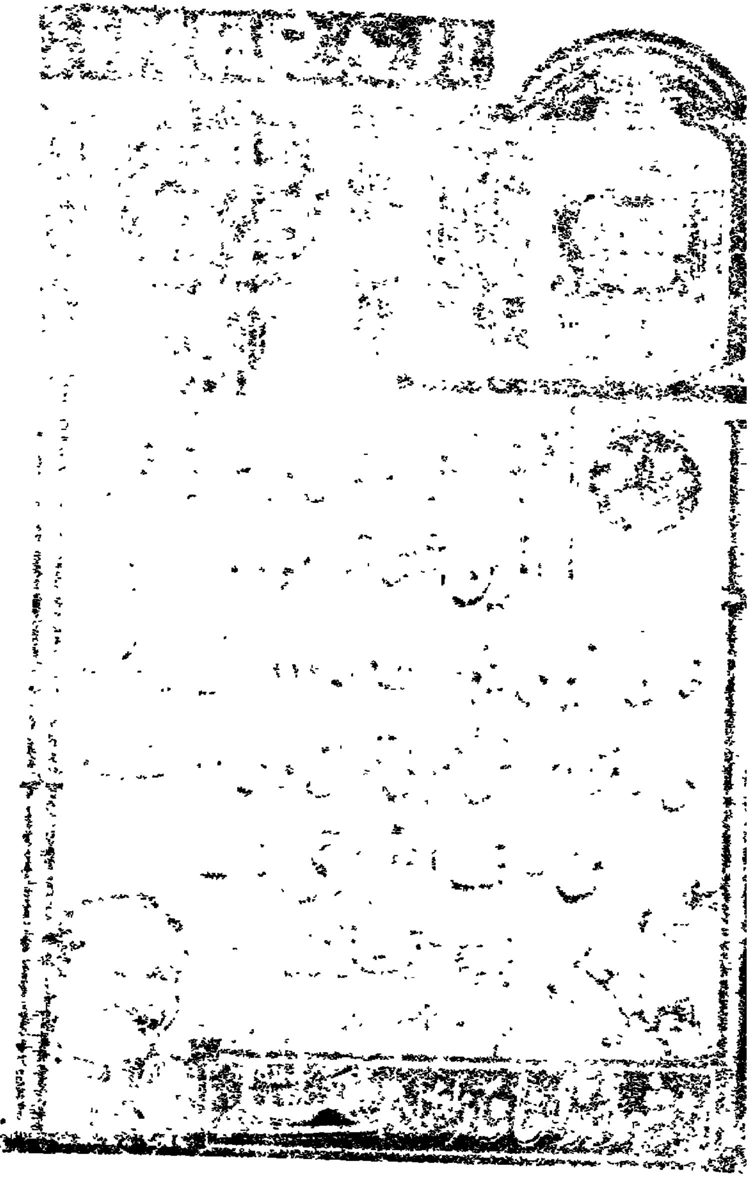
"سوسائٹی" کو بورڈ آف سنسر نے پاس کردیا

بمبئی سے اطلاع موصول ہوئی ہے کہ ہند پکچرز کی بہترین تصویر "سوسائٹی" کو بورڈ آف سنسر بمبئی نے پاس کردیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ "سوسائٹی" بہت کامیاب تصویر ہے۔ جسے دنیائے علم و ادب دیکھ کر حیران رہ جائے گی۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ موسیقی اور اداکاری کے لحاظ سے بھی یہ تصویر لاجواب ہے۔

مس ستارہ، رفیق غزنوی، شیام، راج کماری، اور مسٹر نذیر نے بہترین کام کیا ہے۔





THE

BOMBAY LIFE ASSURANCE COY. LTD.

Bombay Life Building 45, 47, Church gate Street

FORT, BOMBAY.

ہندوستان کے باشندوں کا شاندار مستقبل

بیمہ کی پالیسی میں پوشیدہ ہے

آدمی بلالحاظ یانی کا

کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کل کیا ہونے والا ہے۔ موت ایک نہ ایک دن ہر شخص کو آنی ہے پس عقلمندی یہی ہے کہ جلد سے جلد زندگی کا بیمہ کرالیا جائے تاکہ آنے والے خطرات کا پوری طرح مقابلہ کیا جائے۔ بمبئی لائف انشورنس کمپنی سنہ ۱۹۰۸ء سے قائم ہے اور سنہ ۱۹۰۹ء سے لیکر سنہ ۱۹۴۰ء تک تقریباً بیمہ کا ایک کروڑ روپیہ بیواؤں کو۔ یتیم بچوں کو۔ یا مرنے والے کے دیگر وارثوں کو تقسیم کر چکی ہے اور اس وقت کمپنی کا نقد سرمایہ ۱،۴۷،۰۴۲۴ روپیہ ہے یہ کمپنی اپنی "سلور جوبلی" بھی منا چکی ہے اور اس نے اپنے پالیسی ہولڈروں کو جو رعائتیں دے رکھی ہیں وہ دیگر کمپنیوں میں آپکو نظر نہ آئینگی۔

معلومات کیلئے پراسپکٹس طلب فرما کر ملاحظہ کیجئے۔

اسپیشل ایجنٹ صوبہ دہلی و شملہ کیلئے میسرز پی۔ ایل۔ کھلا اینڈ کمپنی ۴۲ ہنومان روڈ نیو دہلی

یا

ایجنٹ :- مسٹر ایم۔ سی۔ اہلو والیہ ۱۶ کرزن روڈ اینکسی۔ نیو دہلی